URDU LITERATURE SERIES

ABEY-HAYAT

BY

MAULANA MOHAMMAD HUSAIN AZAD

آب حیات

مصنّفہ

شمس العلماء مولانا مولوی محمد حسین آزاد

ALLAHABAD

RAM NARAIN LAL BENI MADHO

PUBLISHERS & BOOKSELLERS

آبِ حیات

از

شمس العلماء مولانا محمد حسین آزاد دہلوی

رام نرائن لال بینی مادھو
پبلشرز و بک سیلر
۲۔ کٹرہ روڈ، الہ آباد

سنہ ۱۹۶۲ء

فہرست مطالب کتاب آب حیات

بسم اللہ الرحمن الرحیم ۵

دیباچہ

آزاد ہندی نہاد کے بزرگ فارسی کو اپنی تیغ زبان کا جوہر جانتے تھے۔ مگر تخمیناً سو برس سے کل خاندان کی زبان اردو ہے۔ بزرگوں سے لے کر آج تک زبانوں کی تحقیقات میں کمال سرگرمی اور جستجو رہی۔ اب چند سال سے معلوم ہوتا ہے اس ملک کی زبان ترقی کے قدم برابر آگے بڑھا رہی ہے۔ یہاں تک کہ علمی زبانوں کے عمل میں دخل پیدا کر لیا۔ اور عنقریب بارگاہِ علم میں کسی درجۂ خاص کی کرسی پر جلوس کیا چاہتی ہے۔ ایک دن اسی خیال میں تھا اور دیکھ رہا تھا کہ کس طرح اس نے ظہور پکڑا۔ کس طرح قدم بقدم آگے بڑھی۔ کس طرح عہد بعہد اس درجہ تک پہنچی۔ تعجب ہوا کہ ایک بچہ شاہجہانی بازار میں پھرتا ملے۔ شعراء اُسے اٹھالیں اور ملکِ سخن میں پال کر پرورش کریں۔ انجام کو یہاں تک نوبت پہنچے۔ کہ وہی ملک کی تصنیف و تالیف پر قابض ہو جائے +

اس حالت میں اس کے عہد بعہد کی تبدیلیاں اور ہر عہد میں اسکے باکمالوں کی حالتیں نظر آئیں جن کی وقت بوقت کی تربیت اور اصلاح نے اس بچہ کو اُنگلی پکڑ کے قدم قدم آگے بڑھایا اور رفتہ رفتہ اس درجہ تک پہنچایا کہ جو آج حاصل ہے۔ صاف نظر آیا کہ ہر عہد میں وہ جُدا جُدا رنگ بدل رہا ہے اور اس کے باکمال تربیت کرنے والے وقت بوقت ترکیب اور الفاظ سے اس کے رفتار و اطوار میں اصلاحیں کر رہے ہیں۔ چنانچہ اس لحاظ سے پانچ جلسے سامنے آئے کہ مسلسل اور متواتر قائم ہوئے اور برخاست ہوئے۔ ایک نے دوسرے کو رخصت کیا اور اپنا رنگ نیا جمایا۔

یہاں تک کہ پانچویں جلسہ کا بھی دور آیا جو کہ اب پیش نظر موجود ہے۔ ہر ایک جلسہ میں صدر نشین اور ارکان انجمن نظر آئے کہ جن میں عہد بعہد کے بزرگوں کی رفتار گفتار، وضع لباس جدا جدا ہے۔ مگر اصلاح کے قلم سے کسی کا ہاتھ خالی نہیں اور اس کام کو ہر ایک اپنا فرض سمجھے ہوئے ہے۔ باوجود اس کے اہلِ مجلس بھی شوق کے دامن پھیلائے ہیں اور قبول کے ہاتھ سینوں پر رکھے ہیں۔ زبانِ مذکور کی ہر جلسہ میں نئی صورت نظر آئی۔ کبھی بچہ۔ کبھی لڑکا۔ کبھی نوجوان۔ مگر یہ معلوم ہوا کہ دیکھتا ہے تو اُنہیں کی آنکھوں سے دیکھتا ہے اور بولتا ہے تو اُنہیں کی زبان سے بولتا ہے +

غرض کہ اس زبان کے رنگ میں ان کے رفتار۔ گفتار۔ اوضاع۔ اطوار بلکہ اُس زمانہ کے سارے چال چلن پیش نظر تھے جس میں اُنھوں نے زندگی بسر کی۔ اور کیا کیا سبب ہوئے کہ اس طرح بسر کی۔ ان کے جلسوں کے ماجرے اور حریفوں کے وہ معرکے جہاں طبیعتوں نے تکلف کے پردے اٹھا کر اپنے اصلی جوہر دکھا دیئے۔ ان کے دلوں کی آزادیاں۔ وقتوں کی مجبوریاں۔ مزاجوں کی شوخیاں۔ طبیعتوں کی تیزیاں۔ کہیں گرمیاں کہیں نرمیاں۔ کچھ خوش مزاجیاں۔ کچھ بے دماغیاں۔ غرض یہ سب باتیں میری آنکھوں میں اس طرح عبرت کا سُرمہ دیتی تھیں گویا وہی زمانہ اور وہی اہل زمانہ موجود ہیں +

چونکہ میں نے بلکہ میری زبان نے ایسے ہی اشخاص کی خدمتوں میں پرورش پائی تھی۔ اس لئے ان خیالات میں دل کی شگفتگی کا ایک عالم تھا کہ جس کی کیفیت کو کسی بیان کی طاقت اور قلم کی زبان ادا نہیں کر سکتی۔ لیکن ساتھ ہی افسوس آیا کہ جن جوہریوں کے ذریعہ سے یہ جواہرات مجھ تک پہنچے۔ وہ تو خاک میں مل گئے۔ جو لوگ باقی ہیں وہ بجھے چراغوں کی طرح ایسے ویرانوں میں پڑے ہیں کہ ان کے روشن کرنے کی یا اُن سے روشنی لینے کی کسی کو پرواہ نہیں۔ پس یہ باتیں کہ حقیقت میں اثبات ان کے جوہر کمالات کے ہیں۔ اگر اسی طرح زبانوں کے حوالے رہیں تو چند روز میں

صفحۂ ہستی سے مٹ جائیں گی۔ اور حقیقت میں یہ حالات نہ مٹیں گے بلکہ بزرگانِ موصوف دنیا میں فقط نام کے شاعر رہ جائیں گے۔ جن کے ساتھ کوئی بیان نہ ہوگا جو ہمارے بعد آنے والوں کے دلوں پر یقین کا اثر پیدا کر سکے۔ ہر چند کلام ان کے کمال کی یادگار موجود ہیں۔ مگر فقط دیوان جو بکتے پھرتے ہیں بغیر ان کے تفصیلی حالات کے۔ اس مقصود کا حق پورا پورا نہیں ادا کر سکتے۔ نہ اُس زمانہ کا عالم اس زمانہ میں دکھا سکتے۔ اور یہ نہ ہوا تو کچھ بھی نہ ہوا +

سودا اور میر وغیرہ بزرگان سلف کی جو عظمت جو ہمارے دلوں میں ہے وہ آج کل کے لوگوں کے دلوں میں نہیں۔ سبب پوچھئے تو جواب فقط یہی ہے کہ جس طرح ان کے کلاموں کو ان کے حالات اور وقتوں کے واردات نے خلعت اور لباس بن کر ہمارے سامنے جلوہ دے رکھا ہے۔ اس سے ارباب زمانہ کے دیدہ و دل بیخبر ہیں اور حق پوچھو تو انہی اوصاف سے سودا۔ سودا۔ اور میر تقی۔ میر صاحب ہیں ورنہ جس کا جی چاہے یہی تخلص رکھ دیکھے۔ خالی سودا ہے تو جنون ہے، اور نرا میر ہے تو گنجفہ کا ایک پتّا +

میرے دوستو زندگی کے معنی کھانا پینا۔ چلنا۔ پھرنا۔ سو رہنا اور منہ سے بولے جانا نہیں ہے۔ زندگی کے معنے یہ ہیں کہ صفات خاص کے ساتھ نام کو شہرت عام ہو۔ اور اُسے بقائے دوام ہو۔ اب انصاف کرو کیا یہ تھوڑے افسوس کا موقع ہے کہ ہمارے بزرگ خوبیاں بہم پہنچائیں۔ انہیں بقائے دوام کے سامان ہاتھ آئیں۔ اور اس پر نام کی زندگی سے بھی محروم رہیں۔ بزرگ بھی وہ بزرگ کہ جن کی کوششوں سے ہماری ملکی اور کتابی زبان کا لفظ لفظ اور حرف حرف گرانبار احسان ہو۔ انکے کاموں کا اس گمنامی کے ساتھ صفحۂ ہستی سے مٹنا بڑے حیف کی بات ہے۔ جس مرنے پر ان کے اہل و عیال روئے وہ مرنا نہ تھا۔ مرنا حقیقت میں ان باتوں کا مٹنا ہے جس سے انکے کمال مرجائیں گے۔ اور یہ مرنا حقیقت میں سخت غمناک حادثہ ہے +

ایسے بزرگان باکمال کے رویئے اور رفتاروں کا دیکھنا انہیں ہماری آنکھوں کے سامنے زندہ کر دکھاتا ہے اور ہمیں بھی دنیا کے پیچیدہ رستوں میں چلنا سکھاتا ہے اور بتاتا ہے کہ کیونکر ہم بھی اپنی زندگی کو اتنا طولانی اور ایسا گراں بہا بنا سکتے ہیں۔ اس کے علاوہ نئے تعلیم یافتہ جن کے دماغوں میں انگریزی لالٹینوں سے روشنی پہنچتی ہے وہ ہمارے تذکروں کے اس نقص پر حرف رکھتے ہیں کہ ان سے کسی شاعر کی زندگی کی سرگذشت کا حال معلوم ہوتا ہے۔ نہ اس کی طبیعت اور عادات و اطوار کا حال کھلتا ہے۔ نہ اس کے کلام کی خوبی۔ اور صحت و سقم کی کیفیت کھلتی ہے۔ نہ یہ معلوم ہوتا ہے کہ اس کے معاصروں میں اور اس کے کلام میں کن کن باتوں میں کیا نسبت تھی۔ انتہا یہ ہے کہ سال ولادت اور سال فوت تک بھی نہیں کھلتا۔ اگرچہ اعتراض ان کا کچھ اصلیت سے خالی نہیں۔ مگر حقیقت یہ ہے کہ اس قسم کی معلومانیں زیادہ تر خاندانوں اور خاندانی باکمالوں اور ان کی صحبت یافتہ لوگوں میں ہوتی ہیں۔ وہ لوگ کچھ تو انقلاب زمانہ سے دل شکستہ ہو کر تصنیف سے ہاتھ کھینچ بیٹھے۔ کچھ یہ کہ علم اور اور اس کی تصنیفات کے انداز روز بروز کے تجربہ سے رستے بدلتے ہیں۔ عربی فارسی میں اس ترقی اور اصلاح کے رستے سالہا سال سے مسدود ہو گئے۔ انگریزی زبان ترقی اور اصلاح کا طلسمات ہے۔ مگر خاندانی لوگوں نے اول اول اس کا پڑھانا اولاد کے لئے عیب سمجھا۔ اور ہماری قدیمی تصنیفوں کا ڈھنگ ایسا واقع ہوا تھا کہ وہ لوگ ایسی واردانوں کو کتابوں میں لکھنا کچھ بات نہ سمجھتے تھے۔ ان چھوٹی چھوٹی باتوں کو زبانی جمع خرچ سمجھ کر دوستانہ صحبتوں کے نقل مجلس جانتے تھے اس لئے وہ ان رستوں سے اور ان کے فوائد سے آگاہ نہ ہوئے۔ اور یہ انہیں کیا خبر تھی کہ زمانہ کا ورق الٹ جائے گا۔ پرانے گھرانے تباہ ہو جائیں گے۔ ان کی اولاد ایسی جاہل رہے گی کہ اُسے اپنے گھر کی باتوں کی بھی خبر نہ رہے گی۔ اور اگر کوئی بات ان حالات میں سے بیان کرے گا تو لوگ اس سے سند مانگیں گے۔ غرض خیالات

وجہ تسمیہ کتاب

مذکورہ بالا نے مجھ پر واجب کیا کہ جو حالات ان بزرگوں کے معلوم ہیں یا مختلف تذکروں میں متفرق مذکور ہیں انھیں جمع کر کے ایک جگہ لکھوں اور جہاں تک ممکن ہو اس طرح لکھوں کہ ان کی زندگی کی بولتی چالتی پھرتی چلتی تصویریں سامنے آن کھڑی ہوں اور انھیں حیات جاوداں حاصل ہو۔ الحمد للہ کہ چند روز میں جس قدر پریشان خیالات تھے بترتیب جمع ہو گئے۔ اسی واسطے اس مجموعہ کا نام آبِ حیات رکھا اور زبانِ اردو کی عہد بعہد کی تبدیلی کے لحاظ سے پانچ دَور پر تقسیم کیا اس طرح کہ ہر ایک دَور اپنے عہد کی زبان بلکہ اس زمانہ کی شان دکھاتا ہے۔ خدا کی درگاہ میں دُعا ہے کہ بزرگوں کے ناموں اور کلاموں کی برکت سے مجھے اور میرے کلام کو بھی قبول عام اور بقائے دوام نصیب ہو۔ آمین یارب العالمین ؛

فہرست مطالب

دیباچہ

بندہ آزاد محمد حسین
عفی اللہ عنہ

زبانِ اُردو کی تاریخ

اتنی بات ہر شخص جانتا ہے کہ ہماری اُردو زبان برج بھاشا سے نکلی ہے۔ اور برج بھاشا خاص ہندوستانی زبان ہے لیکن وہ ایسی زبان نہیں کہ دنیا کے پردے پر ہندوستان کے ساتھ ہی آئی ہو۔ اس کی عمر آٹھ سو برس سے زیادہ نہیں ہے اور برج کا سبزہ زار اس کا وطن ہے۔ تم خیال کروگے کہ شاید اس میراثِ قدیمی کی سند سنسکرت کے پاس ہوگی۔ اور وہ ایسا بیج ہوگا کہ یہیں پھوٹا ہوگا اور یہیں پھولا پھلا ہوگا۔ لیکن نہیں۔ ابھی سُراغ آگے چلتا ہے۔ سب جانتے ہیں کہ ہندوستان اگرچہ بے ہمتی اور آرام طلبی کے سبب سے بدنام رہا مگر باوجود اس کے مہذب قوموں کی آنکھوں میں ہمیشہ سے کُھبا رہا ہے۔ چنانچہ اس کی سرسبزی اور زرخیزی اور اعتدال ہوا نے بلائے جان ہو کر ہمیشہ سے اسے غیر قوموں کی گھڑدوڑ کا میدان بنائے رکھا ہے۔ پس دانائے فرنگ کہ ہر بات کا پتا پتال تک نکالنے والے ہیں۔ انھوں نے زبانوں اور قدیمی نشانوں سے ثابت کیا ہے کہ یہاں کے اصلی باشندے اور لوگ تھے۔ ایک زبردست قوم نے آکر آہستہ آہستہ کل ملک پر قبضہ کر لیا۔ یہ فتحیاب غالباً جیحون۔ سیحون کے میدانوں سے اُٹھ کر۔ اور ہمارے شمالی پہاڑ اُلٹ کر اس ملک میں آئے ہوں گے۔ اُس زمانہ کے گیت اور پُرانی پُرانی نشانیاں دیکھ کر یہ بھی معلوم کیا ہے کہ وہ لوگ دل کے بہادر۔ ہمت کے پورے۔ صورت کے وجیہ۔ رنگ کے گورے ہوں گے۔ اور اس زمانہ کی حیثیت کے بموجب تعلیم یافتہ بھی ہوں گے۔ موقع کا مقام اور سرسبز زمین دیکھ کر یہیں زمیں گیر ہوئے۔ اس قوم کا نام ایرین تھا اور عجیب نہیں کہ ان کی زبان وہ ہو جو اپنے اصل سے کچھ کچھ بدل کر اب سنسکرت کہلاتی ہے۔ یہی لوگ ہیں جنھوں نے ہندوستان میں آکر راجہ مہاراجہ کا خطاب لیا۔ ایران میں تاج کیانی

پر درفش کاویانی لہرایا۔ اپنے مذہب کا نادر طریقہ لے کر چین کو نگار خانہ بنایا۔ یونان کا طبقہ حکمت سے الگ جمایا۔ روما کی عالمگیر سلطنت کی بنیاد ڈالی۔ اندلس پہونچ کر چاندی نکالی۔ یورپ سے خبر آئی کہ کہیں دریا سے مچھلی نکالتے نکالتے گوہر سلطنت پائے۔ کہیں پہاڑوں سے دھات کھودتے کھودتے لعلِ بے بہا نکال لائے۔ تب اصلی رہنے والے کون تھے؟ اور اُن کی زبان کیا تھی؟ قیاس سے معلوم ہوتا ہے کہ جیسے پنجاب میں اب قطعہ قطعہ کی زبان کہیں کچھ کچھ۔ اور کہیں بالکل اختلاف رکھتی ہے۔ اور یہی حال اور اضلاع ہند میں ہے۔ اسی طرح اس عہد میں بھی اختلاف ہوگا۔ اور اس عہد کی نامی زبانیں وہ ہوں گی جن کی نشانی تامل۔ اوڑیا اور تلنگو وغیرہ اضلاع دکن اور مشرق میں اب تک یادگار موجود ہیں بلکہ اس حالت میں بھی اُن کی شاعری اور انشا پردازی کہتی ہے کہ یہ گُٹھلی کسی لذیذ میوہ کی ہے۔ اور سنسکرت سے اسے لگاؤ تک نہیں +

فتحیابوں نے ہندوکش کے پہاڑ اُتر کر پہلے تو پنجاب ہی میں ڈیرے ڈالے ہوں گے۔ پھر جوں جوں بڑھتے گئے ہوں گے اصلی باشندے کچھ تو لڑتے مرتے دائیں بائیں جنگلوں کی گود اور پہاڑوں کے دامن میں گھستے گئے ہوں گے۔ کچھ بھاگے ہوں گے۔ وہ دکن اور مشرق کو ہٹتے گئے ہوں گے۔ کچھ فتحیابوں کی غلامی اور خدمتگاری میں کام آئے ہوں گے۔ اور وہی شودر کہلائے ہوں گے۔ چنانچہ اب تک بھی اُنکی صورتیں کہے دیتی ہیں کہ یہ کسی اور بدن کی ہڈی ہیں +

مدت دراز تک ایرین بھائیوں کے کاروبار ہندوستانی بھائیوں کے ساتھ ملے جُلے رہے ہوں گے۔ یہی سبب ہے کہ ایران کی تاریخ قدیم میں مہ آباد اور اُس کے زمانہ کی تقسیم برہما کے زمانہ سے اور اُس کے رسوم و قواعد سے مطابقت دکھاتی ہے۔ اور چاروں برنوں کا برابر پتہ لگتا ہے۔ یہاں بُدّھ نے اُنھیں توڑا۔ وہاں زرتشت کے مذہب نے اُسے جلا کر خاک کیا۔ مگر ہندوؤں نے بُدّھ کے بعد پھر اپنے حال کو

سنبھال لیا۔ ایرانی اپنی بدحالی کو نہ سنبھال سکے +

چار برنوں کا ہونا فائدہ سے خالی نہیں۔

چاروں برنوں کی تقسیم اور اُن کا الگ تھلگ رہنا دور کے دیکھنے والوں کو غرور کے لباس میں نظر آیا۔ مگر حق پوچھو تو یہ کچھ بُری بات نہ تھی۔ اسی کی برکت ہے کہ آج تک چاروں سلسلے صاف صاف الگ الگ چلے آتے ہیں۔ جو ہندو ہوگا ماں باپ دونوں کی طرف سے خالص ہوگا۔ اور برابر اپنی قوم کا پتا بتا سکے گا جو دوغلا ہوگا اس کا سلسلہ الگ ہو جائے گا۔ اگر یہ قیدیں اس سختی کے ساتھ نہ ہوتیں تو تمام نسلیں خلط ملط ہو جاتیں۔ نجیب الطرفین آدمی چاہتے تو ڈھونڈھے نہ ملتا۔ فتحیابوں کی ان سخت قیدوں نے آپس کی بندشوں میں عجیب طرح کے پھندے ڈالے۔ چنانچہ جب نسلوں کی حفاظت کا پورا بندوبست کر چکے تو خیال ہوا کہ شودروں کے ساتھ آٹھ پہر۔ بات چیت رہنے سہنے اور لین دین کرنے میں بزرگوں کی زبان دوغلی ہو جائے گی۔ اس واسطے کہا کہ ہماری زبان زبان الٰہی ہے اور الٰہی عہد سے اسی طرح چلی آئی ہے۔ چنانچہ اُس کے قواعد اور اصول باندھے اور ایسے جانچ کر باندھے جن میں نقطہ کا فرق نہیں آسکتا۔ اسکی پاکیزگی نے غیر لفظ کو اپنے دامن پر ناپاک دھبا سمجھا اور سوا برہمن کے دوسرے کی زبان بلکہ کان تک گذرنا بھی ناجائز ہوا۔ اس سخت قانون نے بڑا فائدہ یہ دیا کہ زبان ہمیشہ اپنی اصلیت اور بزرگوں کی یادگار کا خالص نمونہ نمایاں کرتی رہے گی۔ برخلاف ایرانی بھائیوں کے اُن کے پاس زبانی سند بھی نہ رہی +

زبان کے بھی قانون باندھے گئے۔

اسی بنیاد پر فتحیابوں کی بلند نظری نے اس کا نام سنسکرت[1] رکھا جس کے معنے آراستہ پیراستہ۔ صنعتی۔ منزّہ۔ مصفّا۔ مقدّس جو چاہو سمجھ لو۔ اُن کے قواعد زبان بھی ایسے مقدّس ہوئے کہ بزرگانِ دین ہی اُسے پڑھائیں تو پڑھائیں بلکہ اس طرح پکار کر

سنسکرت کی وجہ تسمیہ

[1] سن کمل اور کیرت بنائے ہوئے کو کہتے ہیں۔ سنسکرت مہذّبوں کی بنائی ہوئی تھی۔ پراکرت کے معنے ہیں جو طبیعت سے نکلے۔ پس پراکرتیں وہ زبانیں ہیں جو طبیعت (نیچر) نے اپنی اپنی زمین میں پیدا کیں +

پڑھنا بھی گناہ ہوا کہ شودر کی کان میں آواز پڑے۔ اس زبان کا نام دیو بانی ہوا یعنی زبان الٰہی۔ زبانِ شاہی وید کے سنہ ترتیب جس سے اُس عہد کی زبان کا پتہ لگے چودہ سو برس قبل سنہ عیسوی خیال کرتے ہیں۔ اس وقت ان فتحیابوں کی باتیں اس ملک اور ملک والوں کے ساتھ ایسی سمجھ لو جیسے ہندوستان میں پہلے پہلے مسلمانوں کی حالتیں اُن کے سنسکرت زبان کے مخرج اور تلفظ یہاں کے لوگوں میں آکر کچھ اور ہوگئے ہوں گے۔ اس لئے گھروں اور بازاروں میں باتیں کرنے کو قطعہ قطعہ میں پراکرت زبانیں خود بخود پیدا ہوگئی ہوں گی۔ جیسے اسلام کے بعد اُردو۔ چنانچہ ماگدی (پالی) سورسینی مہاراشٹری وغیرہ قدیمی پراکرتیں اب بھی اپنی قدامت کا پتا بتاتی ہیں۔ اُن کی سیاہی میں سیکڑوں لفظ سنسکرت کے چمکتے نظر آتے ہیں۔ مگر بگڑے ہوئے ہیں دیکھا پرکت کے معنی ہیں طبیعت۔ اور جو طبیعت سے نکلے۔ چنانچہ ہیم چند لغات سنسکرت کا جامع بھی یہی کہتا ہے۔ اس کے علاوہ سنسکرت مہذب اور مقدس اور پراکرت غیر مہذب لوگوں کو کہتے ہیں۔ پس ایسی ایسی باتوں سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ فہمیدہ لوگ تھے ہر بات کو خوب سمجھتے تھے اور جو کچھ انھوں نے کیا سمجھ کر کیا ہے۔

وید کے سنہ ترتیب

راجہ بھوج کے عہد کی ناٹک پستکیں کہتی ہیں کہ ان عہدوں میں علمی۔ کتابی۔ اور درباری زبان تو سنسکرت تھی۔ مگر چونکہ معاملہ خاص و عام سے پڑتا ہے اس لئے گفتگو میں پنڈتوں کو بھی پراکرت ہی بولنی پڑتی تھی۔ پراکرت صاف سنسکرت کی بیٹی معلوم ہوتی ہے۔ کیونکہ اس میں ہزاروں لفظ سنسکرت کے ہیں۔ اور ویسے ہی قاعدے صرف و نحو کے بھی ہیں۔

سنسکرت کی اتنی حفاظت ہوئی پھر بھی منوسمرتی ویدوں کی ترتیب سے کئی سو برس بعد لکھی گئی تھی۔ اس میں اور ویدک کی زبان میں صاف فرق ہے۔ اور اب اور بھی زیادہ ہوگیا۔ لیکن چونکہ سلطنت اور معتبر تصانیف پر مذہب کا

چوکیدار بیٹھا تھا۔ اس لئے نقصان کا بہت خطرہ نہ تھا۔ کہ دفعتاً ۵۴۳ برس قبل عیسوی میں بدھ مذہب کے بانی شاک منی پیدا ہوئے۔ وہ مگدھ دیس سے اُٹھے تھے۔ اس لئے وہیں کے پراکرت میں وعظ شروع کیا۔ کیونکہ زیادہ تر کام عوام سے تھا۔ عورت مرد سے لے کر بچے اور بوڑھے تک یہی اُس دیس کی زبان تھی۔ اُن کی آتش زبانی سے مذہب مذکور ایسا پھیلنا شروع ہوا۔ جیسے بن میں آگ لگے۔ دیکھتے دیکھتے دھرم۔ حکومت۔ رسم و رواج۔ دین آئین۔ سب کو جلاکر خاک کر دیا۔ اور مگدھ دیس کی پراکرت کُل دربار اور کُل دفتروں کی زبان ہو گئی۔ اقبال کی یاوری نے علوم و فنون میں بھی ایسی ترقی دی کہ تھوڑے ہی دنوں میں عجیب و غریب کتابیں تصنیف ہو کر اسی زبان میں علوم کے کتب خانے سج گئے اور فنون کے کارخانے جاری ہو گئے۔ کہیں کہیں کونے گوشے میں جہاں کے راجہ وید کو مانتے رہے۔ وہاں ویدوں کا اثر رہا۔ باقی راج کے دربار اور علمی سرکار سب ماگدھی ہی ماگدھی ہو گئی۔ ان کے حوصلے وسیع ہو کر دعوے بڑھے۔ اور بآواز بلند کہہ دیا کہ ابتدائے عالم سے تمام زبانوں کی اصل ماگدھی ہے۔ برہمن اور کل انسان بات کرنے کے لایق بھی نہ تھے۔ اصل میں ان کی بھی اور قادر مطلق بودھ کی زبان بھی یہی ہے۔ اس کی صرف و نحو کی کتابیں بھی تصنیف ہوئیں۔ خدا کی قدرت دیکھو! جو لونڈی تھی وہ رانی بن بیٹھی۔ اور رانی مُنہ چھپاکر کونہ میں بیٹھ گئی ✦

ماگدھی زبان دیوبانی ہوگئی

زمانہ نے اپنی عادت کے بموجب (تخمیناً ۱۵سو برس بعد) بودھ مذہب کو بھی رخصت کیا اور اُس کے ساتھ اُس کی زبان بھی رخصت ہوئی۔ شنکر اچارج کی برکت سے برہمنوں کا ستارہ ڈوبا ہوا پھر اُبھر کر چمکا اور سنسکرت کی آب و تاب بھی شروع ہوئی۔ راجہ بکرماجیت کے عہد میں جو روشنی اس کی فصاحت نے پائی۔ آج تک لوگوں کی آنکھوں کا اُجالا ہے۔ اس سے بھی یہی ثابت ہوتا ہے کہ دربار سلطنت اور اعلیٰ درجہ کے لوگوں کو سنسکرت بولنا اعتبار و افتخار کی

پھر برہمنوں کا ستارہ چمکا

سند تھا۔ اور پراکرت عوام کی زبان تھی۔ کیونکہ اس عہد میں جو کالیداس ملک الشعراء نے شکنتلا کا ناٹک لکھا ہے۔ سبھا میں دیکھ لو بادشاہ۔ اُمرا۔ اور پنڈت سنسکرت بول رہے ہیں۔ کوئی عام آدمی کچھ کہتا ہے تو پراکرت میں کہتا ہے +

گیارہویں صدی عیسوی سے پہلے راجہ بھرت کے عہد میں برج کے قطعہ کی وہ زبان تھی جسے ہم آج کی برج بھاشا کی اصل کہہ سکتے ہیں۔ اس وقت بھی ہر قطعہ میں اپنی اپنی بولی عام لوگوں کی حاجت روائی کرتی تھی۔ اور سنسکرت تصنیفات اور خواص کی زبانوں کے لئے باعث برکت تھی کہ دفعتہً زمانہ کے شعبدہ بازنے ایک اور رنگ بدلا۔ یعنی اسلام کا قدم ہندوستان میں آیا۔ اس نے پھر ملک و مذہب کو نیا انقلاب دیا اور اسی وقت سے زبان کا اثر زبان پر دوڑنا شروع ہوا +

سنسکرت اور اصل فارسی یعنی ژند و استا کی زبان ایرین کے رشتہ سے ایک دادا کی اولاد ہیں۔ مگر زمانہ کے انفاق دیکھو کہ خدا جانے کے سو برس یا کے ہزار برس کی بچھڑی ہوئی بہنیں اس حالت سے آکر ملی ہیں کہ ایک دوسری کی شکل نہیں پہچان سکتی +

ہندوستانی بہن کی کہانی تو سُن چکے۔ اب ایرانی بہن کی داستان بھی سُن لو کہ اس پر وہاں کیا گذری۔ اوّل تو یہی قیاس کرو کہ اس ملک نے جو ایران نام پایا شاید وہ لفظ ایرین ہی کی برکت ہو۔ پھر بھی یہ کچھ تھوڑے تعجب کا مقام نہیں کہ جس طرح ہندوستانی بہن پر وقت بوقت بودھ وغیرہ کے حادثے گذرے اسی طرح اس پر بھی وہاں انقلاب پڑتے رہے۔ باوجود اس کے اب تک ہزاروں لفظ فارسی اور سنسکرت کے صاف ملتے جلتے نظر آتے ہیں +

ایرانی بہن جب اس ملک میں جاکر بسی ہوگی۔ اوّل تو مدّت تک اُن کے

مذہب رسم و رواج اور زبان جیسے تھے ویسے ہی رہے ہوں گے۔ مگر اس زمانہ کی کوئی تصنیف ہاتھ نہیں آئی۔ کچھ ٹوٹا پھوٹا پتا ملتا ہے تو زرتشت کے وقت سے ملتا ہے جسے آج تقریباً ۲۴ سو برس ہوئے۔ اس نورانی موحد نے شعلۂ آتش کے پردہ میں توحید کے مسئلہ کو رواج دیا۔ مذہب مذکور نے سلطنت کے بازوؤں سے زور پکڑا اور ایران سے نکل کر دو سو برس کے قریب اطراف و جوانب کو دباتا رہا۔ یہاں تک کہ یونان سے سکندر طوفان کی طرح اُٹھا۔ اور ایشیا کے امن و امان کو تہ و بالا کر دیا۔ جو مصیبت بودھ کے ہاتھ سے بید شاستر پر پڑی تھی وہاں وہی مصیبت ژنداستان پر آئی۔ چنانچہ جس آگ نے زرتشت اور جاماسپ کے متبرک ہاتھوں سے آتش خانوں کو روشن کیا تھا۔ جس کے آگے گشتاسپ نے تاج اتار کر رکھا جس کی درگاہ میں اسفندیار نے گرز اور تلوار چڑھائی وہ یونان کے آبِ شمشیر سے بجھائی گئی۔ اور آتش خانے راکھ ہو کر اُڑ گئے۔ افسوس یہ ہے کہ ژند و پاژند کے ورق ورق برباد کئے گئے اور ہزاروں کتابیں فلسفۂ الٰہی اور علوم و فنون کی تھیں کہ نابود ہو گئیں جب کہ یونانیوں نے ملک پر غلبہ پایا تو زبان نے زبانوں پر بھی زور دکھایا ہو گا۔ تھوڑے ہی دنوں میں پارتھیا والوں کا عمل دخل ہو گیا۔ وہ ایران جسے ہزاروں برس سے ملک گیری کے نشان سلامی اتارتے تھے۔ اور تہذیب و شائستگی اس کے دربار میں سر جھکاتے تھے۔ پانچ سو برس تک ظفریابوں کے قبضہ میں دبا رہا۔ اور ژند کی کتب مقدسہ ڈھونڈ ڈھونڈ کر فنا کی گئیں ✣

۲۰۰ء میں پھر تنِ بے جان میں سانس آیا اور ساسانیوں کی تلواروں میں قدیمی اقبال نے چمک دکھائی۔ ان بادشاہوں نے ملک و مملکت کی قدامت کے ساتھ بجھے ہوئے مذہب کو بھی روشن کیا۔ گرے ہوئے آتش خانوں کو پھر اُٹھایا۔ اور جہاں سے پھٹے پرانے اوراقِ پریشاں ہاتھ آئے۔ بہم پہنچائے۔ انہی کی کوششوں کی کمائی تھی۔ جو پھر ساڑھے چار سو برس بعد عَلَم اسلام کے آگے

قربانی ہوئی۔ اس معاملہ میں ہمیں نیک نیت پارسیوں کا شکریہ نہ بھولنا چاہیئے کیونکہ باوجود تباہی اور خانہ بربادی کے جو پرانا کاغذ کسی با اعتقاد کے ہاتھ آیا وہ جان کے ساتھ ایمان کو بھی لیتا آیا کہ بندر سورت گجرات وغیرہ ملکوں میں آج تک اسی نور سے آتش خانے روشن ہیں۔ جو کچھ اُن کے پاس ہے وہ اُن تصنیفات کا بقیہ ہے جو ساسانیوں کے عہد میں ہوئیں۔ کتب مذکورہ دونوں زبانوں کا لفظی اتفاق ہی نہیں ثابت کرتیں بلکہ اُن کے اتحاد و اعتقاد پر بھی شہادت دیتی ہیں۔ جو چار برن ہندؤں میں ہیں وہی ایران میں تھے۔ اجرام آسمانی کی عظمت واجب تھی۔ حیوانات بے آزار کا مارنا گناہ عظیم تھا۔ تناسخ کا مسئلہ دونوں میں یکساں تھا۔ آتش ۔ آب ۔ خاک ۔ باد ۔ ابر ۔ بجلی ۔ گرج ۔ ہوا وغیرہ وغیرہ اشیاء کے لئے ایک ایک دیوتا مانتے تھے۔ جس کے اظہار عظمت کے لئے خاص خاص طریقے تھے۔ یاد الٰہی کے زمزمے تھے جس کو وہ اپنی اصطلاح میں گاتھا کہتے تھے۔ یہ وہی لفظ ہے جس کے نام پر گیتا کتاب ہے۔ کیونکہ اس میں بھی یادِ الٰہی کے گیت ہیں۔ فارسی مروّجہ کے چند الفاظ تمثیلاً لکھتا ہوں کہ سنسکرت سے ملتے ہوئے معلوم ہوتے ہیں :-

فارسی	سنسکرت	فارسی	سنسکرت
پدر	پتر	برادر	بھراتر
پور	پُتر	دختر	دُوہِتر
مادر	ماتر	انگشت	انگشٹ
زانو	جانو	پا	پاؤ
بار	بھار	بیم	بھَے
بوم	بھوم	خاشاک	کُشیا
اسپ	اشو	خر	کھر

ایرانی بہن پر ایران میں پہلے اسلام کے ہاتھ سے وہ صدمہ گزرا تھا جو کہ یہاں دوسو برس بعد گزرا اور اس سے اس کی حیثیت بالکل بدل گئی تھی۔ بہرحال یہاں وہ ایسی حالت کے ساتھ پہونچی کہ عربی اور ترکی الفاظ اور بہت سی لفظی اور ترکیبی تبدیلیوں کے سبب سے اُس کی صورت نہ پہچانی جاتی تھی۔ یہاں جو مسلمان آئے وہ آپس میں وہی رائج الوقت فارسی بولتے تھے اور ہندوؤں سے ہندی الفاظ ملا جُلا کر گزارہ کر لیتے تھے +

ادھر سنسکرت تو دیوبانی یعنی زبان آسمانی تھی۔ اس میں ملکشوں کو دخل کہاں بلکہ البتہ برج بھاشا نے اس بِن بُلائے مہمان کو جگہ دی۔ دھرم وان ہندو سالہاسال تک ملیکش بھاشا سمجھ کر غیر زبان سے مُتنفّر رہے مگر زبان کا قانون دھرم اور حکومت کے قانون سے بھی سخت ہے کیونکہ اسے گھڑی گھڑی اور پل پل کی ضرورتیں مدد دیتی ہیں جو کسی طرح بند نہیں ہوتیں۔ غرض آٹھ پہر ایک جگہ کا رہنا سہنا لین دین کرنا تھا۔ لفظوں کے بولے بغیر گزارہ نہ کر سکے۔ دو قوموں کے ارتباط میں ایسا اختلاط ضرور ہوتا ہے اور اس کے کئی سبب ہیں۔ اوّل تو یہ کہ اکثر نئی چیزیں ایسی آتی ہیں جو اپنے نام اپنے ساتھ لاتی ہیں (۲) اکثر معانی ایسے ہوتے ہیں کہ اُنہیں انہی کی زبان میں کہیں تو ایک لفظ میں ادا ہو جاتے ہیں۔ ترجمہ کریں تو ایک فقرہ بنتا ہے۔ پھر بھی نہ وہ مزا آتا ہے نہ مطلب کا حق ادا ہوتا ہے۔ اس صورت میں گویا قانون زبان اور آئین بیان مجبور کرتا ہے کہ یہاں وہی لفظ بولنا چاہیے۔ دوسرا لفظ بولنا جائز نہیں (۳) جو لوگ اکثر غیر ملکوں میں سفر کرتے ہیں وہ اس لطف کو جانتے ہیں کہ جب دو غیر زبان والے ایک جگہ رہتے سہتے ہیں تو کبھی کام کاج کی شدّت مصروفیت میں۔ کبھی اُسی عالم میں ضروری بات جلدی کہہ دینے کی غرض سے کبھی آسانی سے مطلب سمجھانے کو ایک دوسرے کے لفظ خواہ مخواہ اس طرح بول جانے پڑتے ہیں کہ بے اس کے گزارہ نہیں ہوتا (۴) پھر

جب ایک جگہ رہ کر شیر و شکر ہوتے ہیں تو اکثر پیار اور محبت سے کبھی آپس کی دل لگی کے لئے ایک دوسرے کے لفظ بول کر جی خوش ہوتا ہے۔ جس طرح دوست کو دوست پیارا ہوتا ہے اسی طرح اس کے لفظ بھی پیارے معلوم ہوتے ہیں۔ یا یوں سمجھو کہ جس طرح وطن دار اپنے مہمانوں کے رہنے کو جگہ دیتے ہیں اسی طرح ان کی زبان مہمان لفظوں کو جگہ دیتی ہے۔ (۵) بڑی بات یہ ہے کہ فتحیابوں کے اقبال کی چمک ان کی بات بات کو بلکہ لباس دستار۔ رفتار۔ گفتار کو بھی ایسی آب و تاب سے جلوہ دیتی ہے کہ وہی سب کی آنکھوں میں بھلے معلوم ہوتے ہیں اور لوگ اُسے فقط اختیار ہی نہیں کرتے بلکہ اُس پر فخر بھی کرتے ہیں پھر اُس میں بہت سے فوائد بھی عقلی دلائل سے پیدا کرتے ہیں ٭

اسلام نے آتے ہی اختلاط الفاظ کی بنیاد ڈال دی تھی

اُس زمانہ کی عہد بعہد کی ہندی تصنیفیں آج نہیں ملتیں۔ جن سے وقت بوقت اس کی تبدیلیوں کا حال معلوم ہو۔ البتہ ۱۱۹۳ء میں شہاب الدین غوری نے رائے پتھورا پر فتح پائی تو چند کوی (ایک نامی شاعر) نے پرتھی راج راسا لکھا۔ اسے دیکھ کر حیرت ہوتی ہے کہ زبان مذکور نے کتنا جلد عربی فارسی کے اثر کو قبول کر لیا۔ ہر صفحہ میں کئی کئی لفظ نظر آتے ہیں۔ ساتھ ہی یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ اس وقت میں یہاں کی بھاشا بھی کچھ اور بھاشا تھی۔ میں نمونہ تصنیف مذکور کا دکھاتا ہوں :۔

[७७] पत्त उठि महल। प्रिथीराज मांगिआरोढावि वाजीय
[५६] पत्त परथरादिगारपैगा मरदपलाह करीम कैवार
स्रुरतान जलालदीन जाया सुरिगान सहाबदीव अलहउपाया
मुसलमान मदानि दानभीमद तिइरनीक हैरक ह न्नागौ पातिशाह
सैतान परवरेदेव रौदीवान हुउयाजादव निनैरमंडपा षतक आ-
लम अलौई जीवरै वडुवामवीई हजराति षुदायषेअआस
मरदांम्लसिध वासवाह सांई देय चादरउचाई।
इतने मुलक को करमानयेस कजलविलास कैलास रो-
हबंप्यारगषर [५२] पत्त पावनाति प्रिथीराज वांहदीवि सुलितानं
कीसलाम तिहिंवारपरी अंगुलि सुलितानं ॥

یہ اگرچہ مختلف جگہ کے ٹکڑے ہیں۔ مطلب ان کا اصل کتاب کے دیکھنے سے کھلتا ہے مگر حرف شناس آدمی بھی اتنا جان سکتا ہے کہ یہ لفظ عربی فارسی کے اس میں موجود ہیں۔ محل۔ پروردگار۔ پیگام (پیغام) کریم۔ سُرطان (یعنی سلطان) بات شاہ (بادشاہ) دیوان۔ خلک (خلق)۔ عالم۔ ہجرت (حضرت)۔ ملک۔ پھرمان (فرمان)۔ سلام ٭

ترجمہ اور تصنیف کے تجربہ کار جانتے ہیں کہ اُن کی عبارت میں کسی زبان کا اصل لفظ جو اپنا مطلب بتا جاتا ہے۔ سطر سطر بھر عبارت میں ترجمہ کریں تو بھی وہ بات حاصل نہیں ہوتی جو مجموعہ خیالات کا اور اس کے صفات و لوازمات کا اس ایک لفظ سے سُننے والے کے سامنے آئینہ ہوجاتا ہے وہ ہماری سطر بھر سے پورا نہیں ہوتا۔ مثلاً چند کوی اپنی نظم میں سلطان کی جگہ اگر راجہ بلکہ مہاراجہ لکھ دیتا۔ تو بھی جو صفات اور اُس کے لوازمات نیک یا بد۔ رحم یا عدل۔ زور یا ظلم یہ لفظ اس کی نظم میں دکھا رہا ہے وہ بات راجہ مہاراجہ سے ممکن نہیں۔ اسی طرح لفظ سلام کہ اس کے مطلب کا حق خواہ ڈنڈوت خواہ پرنام کوئی لفظ ادا نہیں کر سکتا۔ نظیر اس کی آج انگریزی کے سیکڑوں لفظ ہیں۔ اگر ترجمہ کریں تو سطروں میں بھی مطلب پورا نہیں ہو سکتا۔ مثلاً ایک ہندوستانی شخص اپنے دوست سے کہتا ہے "لاٹ صاحب چھ بجے اسٹیشن پر پہنچیں گے۔ پروگرام کے بموجب شہر کی سیر کریں گے۔ ۵ بجے آنا۔ وہیں چل کر تماشا دیکھیں گے"! اب خواہ صحیح خواہ بگڑے۔ مگر جو اصلی لفظ آپ اپنے معنے سُننے والے کو سمجھا رہے ہیں۔ کئی کئی سطروں میں ترجمہ کیے جائیں تو بھی حقِ مطلب بجا نہ لا سکیں گے۔ آخر پندرہ صدی عیسوی میں کہ سکندر لودی کا زمانہ تھا اتنا ہوا کہ اول کائیتھ فارسی پڑھ کر شاہی دفتر میں داخل ہوئے اور اب ان لفظوں کو اُن کی زبانوں پر آنے کا زیادہ موقع ملا۔ رفتہ رفتہ اکبر کے عہد سے مسلمان شیر و شکر ہو گئے۔ یہ نوبت ہوئی کہ ادھر بادشاہ اور اس کے اعلیٰ درجہ کے اہل دربار نے جُبّہ و دستار کے ساتھ داڑھیوں کو خدا حافظ کہا۔ اور جامے پہن کر کھڑکی دار پگڑیاں باندھ بیٹھے۔ ادھر ہندو شرفا بلکہ راجہ مہاراجہ

کائیتھ اول نمبر ہیں

ایرانی لباس پہننے اور فارسی بول کر فخر کرنے لگے۔ بلکہ مرزا کے خطاب کو بڑے شوق سے لینے لگے +

امیر خسرو

اب جس قدر ممکن ہے عہد بعہد کی زبانوں کے نمونے دکھاتا ہوں۔ امیر خسرو جو کہ ۷۲۵ھ ۱۳۲۵ء میں فوت ہوئے۔ ان کی ایک غزل نظم اردو کی تاریخ میں دیکھو جس کا پہلا مصرع ہے ع زحالِ مسکیں مکن تغافل درائے نیناں بنائے بتیاں الخ۔ اس سے تمھیں کچھ کچھ حال اس وقت کی زبان کا بھی معلوم ہوگا۔ خالق باری بھی انہیں کے مخلوقات فکر سے ہے۔ باریک بین اشخاص اس سے بھی بہت سے الفاظ اور فقرے دیکھ کر یہ نکتے سمجھ سکتے ہیں ؎

بیا برادر آؤ رے بھائی   بنشیں مادر بیٹھ ری مائی

ایک مجرب نسخہ آنکھوں کا دوہروں کی بحر میں کہتے ہیں :۔

لود پھٹکری مُردہ سنگ   ہلدی زیرہ ایک ایک ٹنگ

افیون چنا بھر مرچیں چار   اُردد برابر تھوتھا ڈار

پوست کے پانی پوٹلی کرے   تُرت پیڑ نینوں کی ہرے

نظم اُردو کی تاریخ میں ان کی عمدہ پہیلیاں۔ مکرنیاں۔ دو سخنے انمل میں لکھ دئے ہیں۔ انھیں دیکھو اور خیال کرو کہ بحریں دوہروں کی ہیں مگر فارسیت کس قدر اپنا زور دکھا رہی ہے +

کبیر

ہندو شاعروں کے دوہرے برج بھاشا میں ہیں مگر عہد بعہد کی زبان کا پتا بتاتے ہیں۔ چنانچہ سکندر لودی کے زمانے میں کبیر شاعر بنارس کے رہنے والے علم میں ان پڑھ تھے۔ گرو رامانند کے چیلے ہوکر ایسے ہوئے کہ خود کبیر پنتھیوں کا مت نکالا تصنیفات اگر جمع ہوں تو کئی جلدیں ہوں۔ اُن کے دوہروں میں فارسی عربی کے لفظوں کو دیکھو:۔

دین گوایُو دُنی سے دُنی نہ آیُو ہاتھ   پیر کہاڑی ماریو گا پھل اپنے ہاتھ

کبیر سر پر سر لئے ہے کیوں سوئے سکھ چین   کوچ نگارا سانس کا باجت ہے دن رین

گرو نانک صاحب

گرو نانک صاحب کی تصنیفات بہت کچھ ہے۔ اگرچہ خاص قطعۂ پنجاب کی زبان ہے۔ مگر جس بہتات سے ان کے کلام میں عربی فارسی کے لفظ ہیں اُتنے کسی کے کلام میں نہیں اور چونکہ ۹۰۰ ہجری (۱۵۰۰ء) کے بعد فوت ہوئے تو اُس سے چار سو برس پہلے کی پنجابی کا نمونہ بھی معلوم ہو سکتا ہے۔ دوہرا:-

ساس ماس سب جیو تمھارا — تو ہے کھرا پیارا

نانک شاعر ایو کہت ہے — سچے پروردگارا

بلکہ اکثر چیزیں وظیفہ عبادت کے طور پر ہیں۔ ان میں بھی الفاظ مذکورہ اسی کثرت سے نظر آتے ہیں۔ جپ جی کے دو فقرے دیکھو:-

وارن جاؤں ان ایک بار۔ تو سدا سلامت جی نرنکار

ملک محمد جائسی کی پدماوت

مسلمان بھی اس زمانہ میں یہاں کی زبان سے محبت رکھتے تھے۔ چنانچہ سولھویں صدی عیسوی شیر شاہی عہد میں ملک محمد جائسی ایک شاعر ہوا اُس نے پدماوت کی داستان نظم کی۔ اس سے عہد مذکور کی زبان ہی نہیں معلوم ہوتی بلکہ ثابت ہوتا ہے کہ مسلمان اِس ملک میں رہ کر یہاں کی زبان کو کس پیار سے بولنے لگے تھے۔ اسکی بحر بھی ہندی رکھی ہے اور ورق کے ورق اُلٹتے چلے جاؤ۔ فارسی عربی کا لفظ نہیں ملتا۔ مطلب اس کا آج مسلمان بلکہ ہر ایک ہندو بھی نہیں سمجھتا۔ کتاب مذکور چھپ گئی ہے اور ہر جگہ ملتی ہے اس لئے نمونہ نہیں لکھتا۔

واہ رے طوطے

ہمایوں نے جب گجرات دکن پر فوج کشی کی تو سلطان بہادر وہاں کا بادشاہ تھا اور جاپانیر کا قلعہ بڑا مستحکم تھا کہ سلطان خود بھی اکثر وہاں رہتا تھا اور تمام خزائن و دفائن وہیں رکھتا تھا۔ محاصرے کے وقت رومی خاں میر آتش (باوجودیکہ کمال معتبر اور مصاحب منظور نظر سلطان کا تھا) ہمایوں سے مل گیا۔ اور قلعہ (تمام نفائس اموال اور خزائن بے حساب سمیت) ہمایوں کے قبضہ میں آیا۔ سلطان بہادر کے پاس ایک طوطا تھا۔ کہ آدمی کی طرح باتیں کرتا تھا اور سمجھ کر بات

کا جواب دیتا تھا۔ سلطان اُسے ایسا چاہتا تھا کہ سونے کے پنجرے میں رکھا تھا اور ایک دم جُدا نہ کرتا تھا۔ وہ بھی لوٹ میں آیا۔ جب دربار میں لائے تو رومی خاں بھی موجود تھا۔ طوطے نے دیکھ کر پہچانا اور کہا "پھٹ پاپی رومی خاں نمک حرام"۔ سب کو تعجب ہوا اور ہمایوں نے کہا۔ رومی خاں چکنم کہ جانوراست ورنہ زبانش می بُریدم۔ اُس نے شرما کر آنکھیں نیچی کرلیں۔ غرض اس نقل سے یہ ہے کہ اس وقت بھی لوگوں کی زبان پر عربی فارسی کے لفظ ضرور چڑھے ہوئے تھے۔ جب ہی طوطے کی زبان سے نمک حرام کا لفظ نکلا۔ جانور تھا جو سنتا ہوگا وہی بولتا ہوگا +

بابا تلسی داس کی رامائن

سترھویں صدی عیسوی میں بابا تلسی داس برہمن ضلع باندہ کے رہنے والے کہ پنڈت بھی تھے۔ شاعر بھی تھے۔ فقیر بھی تھے۔ انھوں نے رامائن کو بھاشا میں اس طرح ترجمہ کیا کہ وہ لاثانی کتاب مطبوع خاص و عام ہوئی۔ ان کے دُہروں میں بہت اور کتاب مذکور میں کہیں کہیں لفظ فارسی عربی کے موجود ہیں۔ دُہرا از رامائن :-

سنکارے سیوک سکل چلے سوامی رکھ پائے گھر ترو تر دبن و باگ (باغ) و بر ڈیرا دیو لگائے

گھر بسواس بچن ہٹ بولے کٹنی بھنگ کُلہ (ٹوپی) بھی کھولے

رام انیک گریب نوا جے لوک بید بر بر د براجے

گنی گریب گرام نر ناگر پنڈت موٹے ملیں اُو جاگر

مایا کو مایا سلے کر کر لمبے ہاتھ تلسی داس گریب کو کوئی نہ پوچھے بات

انہی دنوں میں سورداس جی نے سری کرشن جی کے ذکر سے اپنے کلام کو مقبولِ خاص و عام کیا۔ ان کی تصنیف میں شاید کوئی شعر ہوگا کہ فارسی عربی لفظ سے خالی ہوگا :-

مایا دھام دھن دھنتا باندھیوں ہوں اس ساج یعنی ساز

سنت سبھی جانت ہوں تو نہ آئیو باج یعنی باز

کھبت بہت کا ہے تم نانے سبن سُنی آواج یعنی آواز

دیو نہ جات پار اُتر آئے — چاہت چڑھیں جہاج یعنی جہاز
بیجے پار اُتار سور کوں — مہاراج برج راج
نئیں کرت کمت پر بھو تم سوں — سدگریب نواج غریب نواز

خیال کرو کہ جب یہ بزرگان مذہب اپنے دُہروں میں فارسی لفظ بول جاتے تھے تو گفتگو میں عام ہندو لوگ کیا اس سے زیادہ نہ بولتے ہوں گے +

بھاشا کا اوج اقبال دیکھ

اخیر میں حُسن و خوبی برج بھاشا کی راجہ جے سنگھ سوائی کی قدردانی سے ظاہر ہوئی۔ انھوں نے ایک ایک اشرفی دہرہ گوئی اور گنوان پنڈتوں کو انعام دے کر دہلی اور نواح دہلی میں شوق پھیلایا +

اس عہد میں مسلمانوں کی زبان کا کیا حال ہوگا؟ ظاہر ہے کہ کئی سو برس سے اسلام آیا ہوا تھا جن کے باپ دادا کئی پشت یہیں کی خاک سے اُٹھے اور یہیں پیوند زمین ہوئے۔ انھیں آپس کے رشتوں اور معاملات کے سررشتوں سے ضرور یہاں کی زبان یعنی برج بھاشا بولنی پڑتی ہوگی۔ تازہ ولایت۔ آدھی اپنی آدھی ان کی ملا کر ٹوٹی پھوٹی بولتے ہوں گے۔ ان زبانوں کی کوئی نثر تصنیف نہیں۔ وہی امیر خسرو کی ایک غزل اور پہیلیاں اور مکرنیاں اور گیت پتا بتاتے ہیں کہ سنہ ہ میں یہاں کے مسلمان خاصی بھاشا بولتے ہوں گے۔ بلکہ یہی کلام یہ بھی خبر دیتے ہیں کہ مسلمان بھی اب یہیں کی زبان کو اپنی زبان سمجھنے لگے تھے۔ اور اس زبان کو کس شوق اور محبت سے بولتے تھے۔ شاید بہ نسبت ہندوؤں کے فارسی عربی لفظ ان کی زبان پر زیادہ آجاتے ہوں گے اور جتنا یہاں رہنا سہنا اور استقلال زیادہ ہوتا گیا اُتنا ہی روز بروز فارسی ترکی نے ضعف اور یہاں کی زبان نے زور پکڑا ہوگا۔ رفتہ رفتہ شاہجہاں کے زمانے میں کہ اقبال تیموری کا آفتاب عین اوج پر تھا شہر اور شہر پناہ تعمیر ہو کر نئی دلی دار الخلافہ ہوئی۔ بادشاہ اور ارکان دولت زیادہ تر وہاں رہنے لگے۔ اہل سیف۔ اہل قلم۔ اہل حرفہ اور تجار وغیرہ ملک ملک اور شہر شہر کے آدمی ایک جگہ جمع ہوئے

ترکی میں اُردو بازارِ لشکر کو کہتے ہیں۔ اُردوئے شاہی اور دربار میں ملے جُلے الفاظ زیادہ بولتے تھے۔ وہاں کی بولی کا نام اُردو ہو گیا۔ اسے فقط شاہجہاں کا اقبال کہنا چاہیئے۔ کہ یہ زبان خاص و عام میں اس کے اُردو کی طرف مشہور ہو گئی۔ ورنہ جو نظم و نثر کی مثالیں بیان ہوئیں اُن سے خیال کو وسعت دے کر کہہ سکتے ہو کہ جس وقت سے مسلمانوں کا قدم ہندوستان میں آیا ہو گا اُسی وقت سے اُن کی زبان نے یہاں کی زبان پر اثر شروع کر دیا ہو گا۔ چند کوی کا کلام مل گیا۔ اُس میں الفاظ موجود ہیں۔ محمود کے وقت کی نظم یا نثر مل جائے تو اس میں بھی ضرور ہوں گے +

آگاہی ضروری

بیان ہائے مذکورہ سے یہ بھی ثابت ہوا کہ جو کچھ اس میں ہوا کسی تحریک یا ارادہ سے نہیں ہوا بلکہ زبان مذکور کی طبیعت ایسی ملنسار واقع ہوئی ہے کہ ہر زبان سے مل جل جاتی ہے، سنسکرت آئی اس سے مل گئی۔ عربی فارسی آئی اسے بسم اللہ خیر مقدم کہا۔ اب انگریزی الفاظ کو اس طرح جگہ دے رہی ہے گویا اس کے انتظار میں بیٹھی تھی +

اس کو ریختہ کیوں کہتے ہیں

اسی زبان کو ریختہ[1] بھی کہتے ہیں کیونکہ مختلف زبانوں نے اسے ریختہ کیا ہے جیسے دیوار کو اینٹ۔ مٹی۔ چونا۔ سفیدی وغیرہ سے پختہ کرتے ہیں۔ یا یہ کہ ریختہ کے معنے ہیں گری پڑی۔ پریشان چیز۔ چونکہ اس میں لفظ پریشان جمع ہیں۔ اس لئے اسے ریختہ کہتے ہیں۔ یہی سبب ہے کہ اس میں عربی۔ فارسی۔ ترکی وغیرہ کئی زبانوں کے الفاظ شامل ہیں۔ اور اب انگریزی بھی داخل ہوتی جاتی ہے اور ایک وقت ہو گا کہ عربی فارسی کی طرح انگریزی زبان قابض ہو جائے گی۔ چنانچہ میں ایک

ایک نواب زادے کی گفتگو

خاندانی نواب زادے کی گفتگو لکھتا ہوں جس کی پرورش اور تعلیم گھریلو ہے۔ یعنی نہ عربی فارسی کی لفاظی نے اس پر رنگ چڑھایا ہے نہ انگریزی نے روغن

---

[1] پہلے شعرا اُردو کو ریختہ کہتے تھے۔ میر غفر غینی کی تقریر میں دیکھو۔ صفحہ ۲۵ مرزا رفیع فرماتے ہیں۔ ع شعر بے معنی سے تو بہتر ہے کہنا ریختہ۔ اور دیکھو صفحہ ۱۰۸ +

پھیرا ہے۔ فقط دوستانہ بے تکلفانہ باتیں ہیں۔" بڑے آکا کی پنشن لینے کل کچہری گیا تھا۔ ڈپٹی صاحب کے کمرے کے آگے کچھ قرقی کا مال نیلام ہو رہا تھا۔ کمریاں۔ کوٹ اور واسکٹیں نئی تھیں۔ کنٹر اور گلاس بھی ولایتی تھے۔ کرسیاں۔ میزیں۔ چقیں۔ باریک خوش رنگ تھیں۔ میں نے کہا چلو کوئی ڈھب کی چیز ہو تو لے لیں۔ منجھلے آکا بولے۔ جانے بھی دو۔ جس مال نے مالک سے وفا نہ کی۔ ہم سے کیا وفا کرے گا۔ آتے ہوئے ریل اسٹیشن کے پاس دیکھتا ہوں۔ سامنے مرزا جان چلے آتے ہیں۔ تنکرم ٹھیرا کر بڑے تپاک سے ملے۔ بڑھاپے نے بچارے کا رنگ روپ سب کھو دیا۔ وہ شکل ہی نہیں۔ وہ صورت ہی نہیں۔ کیسے گورے چٹے سجیلے جوان تھے۔ لوگ تصویریں اترواتے تھے۔ میں نے کہا۔ میاں! ہم نے تو جانا تھا تم دکھن سے خوب چاق چوبند۔ سرخ و سفید ہو کر آؤ گے۔ تم تو سوکھ کر قاق ہو گئے۔ غضب کیا اگلا جوبن بھی گنوا آئے۔ ٹھنڈا سانس بھر کے بولے۔ ہائے جوانی"+

فارسی عربی کے الفاظ تو ظاہر ہیں۔ مگر خیال کیجئے کہ قرق۔ چق۔ چاق۔ قاق۔ آکا ترکی ہیں۔ میزنا معلوم۔ نیلام پرتگالی ہے۔ کمرا اطالی ہے۔ ڈپٹی۔ ریل۔ اسٹیشن۔ کوٹ۔ واسکٹ۔ کنٹر۔ گلاس انگریزی ہیں۔ چٹا۔ کھبا پنجابی ہے مگر اتنا ہے کہ ہم چٹا بغیر گورے کے اور اسی طرح چنگا بغیر بھلے کے نہیں بولتے۔ وہ اکیلا ہی بولتے ہیں۔ کھبا پنجابی میں عام ہے خاص صفت کے ساتھ بولتے ہیں۔ بھانڈا پھوڑنا۔ اُردو میں کسی بات یا راز کھول دینے کو کہتے ہیں۔ پنجابی میں باسن کو بھانڈا ہی کہتے ہیں۔ گلا گھونٹنا اُردو میں بولتے ہیں۔ پنجابی میں کھینچ کر باندھنے کو یا مضبوط پکڑنے کو کہتے ہیں۔ مثلاً گھٹ کر باندھو یا گھٹ کر پکڑو۔ تُھنّا بھنانا۔ توڑنا اور تڑوانا ہے اور اسی سبب سے پنجابی میں روپیہ کے لئے بھی بھنانا کہتے ہیں۔ اُردو میں پہلے معنی متروک ہو گئے۔ دوسرے معنی رہے وہ بھی تر کو قر کرکے کہ جاؤ

لہ میز دری زبان میں ترجمہ ٹیبل کا ہے۔ مگر اُردو کو یہ لفظ فارسی مروجہ سے نہیں ملا صاحب لوگوں سے پہنچا ہے+

روپے کے ٹکے بھنا لاؤ۔ اور اس اصلیت کا سُراغ یوں لگا۔ کہ فارسی میں روپے کے لئے خوردہ کردن بولتے ہیں اور اُردو میں بھی کہتے ہیں۔ صبح کو روپیہ خوردہ کیا تھا۔ دوپہر کو دیکھو تو برکت! یعنی سب پیسے اُٹھ گئے +

کسوٹی۔ گھسنا مرادف فرسودن اُردو میں بالکسر ہے۔ پنجابی میں اس طرح بولتے ہیں کہ کاف مفتوح معلوم ہوتا ہے اور ہ کا تلفظ عجیب ہے کہ انہی کے لہجہ کے لئے خاص ہے۔ بہرحال اس سے کس وٹی (گھسنے کی بٹیا) معیار کا نام ہوا۔ اُردو میں یہی لفظ کسوٹی ہو گیا +

روپ۔ سجیلا۔ جوبن۔ گنوایا۔ برج بھاشا ہے۔ ان کے علاوہ روزمرہ کی باتوں پر خیال کرو۔ یوسف۔ ہارون۔ موسےٰ۔ عیسےٰ وغیرہ وغیرہ عبرانی ہیں۔ کیمیا۔ فیلسوف۔ اصطرلاب یونانی ہیں۔ اُرد یعنی ماش تامل ہے۔ ننھا یعنی خورد گجراتی ہے۔ بڑا جو کڑھائی میں تلتے ہو تلنگو ہے۔ گدام ملایا کی زبان ہے۔ تماکو امریکہ کا لفظ ہے۔ یورپ کے رستہ ہو کر اکبر کے عہد میں یہاں پہنچا +

اُردو میں اس وقت نثر کی کوئی کتاب نہ لکھی گئی۔ جس سے سلسلہ ان تبدیلیوں کا معلوم ہو۔ میر جعفر زٹل کے کلام کو میں محمد شاہی بلکہ اس سے پہلے زمانہ کا نمونہ کہتا۔ مگر زٹل کا اعتبار کیا؟ البتہ محمد شاہ کے عہد میں ۱۱۴۵ھ میں فضلی تخلّص ایک بزرگ نے دہ مجلس لکھی۔ اس کے دیباچہ میں سبب تالیف لکھتے ہیں۔ اور غالباً یہی نثر اُردو کی پہلی تصنیف ہے"۔ پھر دل میں گزرا کہ ایسے کام کو عقل چاہئے کامل اور مدد کسو طرف کی ہوئے شامل۔ کیونکہ بے تائید صمدی اور بے مدد جناب احمدی۔ یہ مشکل صورت پذیر نہ ہووے اور گوہر مراد رشتہٴ امید میں نہ آوے۔ لہذا کوئی اس صنعت کا نہیں ہوا مخترع۔ اور اب تک ترجمہ فارسی بعبارت ہندی نثر نہیں ہوا۔ مستمع۔ پس اس اندیشہٴ عمیق میں غوطہ کھایا۔ اور بیابان تامل و تدبیر میں سرگشتہ ہوا۔ لیکن راہ مقصود کی نہ پائی۔ ناگاہ نسیم

فضلی مرحوم کی دہ مجلس کی عبارت

عنایتِ الٰہی دلِ فگار پر اہتزاز میں آ۔ یہ بات آئینہ خاطر میں منہ دکھائی +

شعلۂ عشق نثر میں بھی تھی

میر کی مثنوی شعلۂ عشق کے مضمون کو بھی مرزا رفیع نے نثر میں لکھا ہے۔ افسوس کہ اس وقت موجود نہیں۔ اس کا انداز بالکل یہی ہے۔ لیکن چند فقرے سودا کے ایک دیباچہ سے نقل کرتا ہوں جو کلیات میں موجود ہیں:۔

نثر مرزا رفیع۔ "ضمیر منیر پر آئینہ دارانِ معنی کے مبرہن ہو کہ محض عنایت حق تعالیٰ کی ہے جو طوطی ناطقہ شیریں سخن ہو۔ پس یہ چند مصرع کہ از قبیل ریختہ در ریختہ۔ خامۂ دو زبان اپنی سے صفحۂ کاغذ پر تحریر پائے۔ لازم ہے کہ تحویل سخن سامعہ سنجان روزگار کردں۔ تا زبانی ان اشخاص کی ہمیشہ مورد تحسین و آفریں رہیں ؎

قیمت و قدر شناسا ہی سے پہنچے ہے بہم ۔ ورنہ دنیا میں خذف بھی نہیں گوہر سے کم

مضمون سینہ میں بیش از مرغ اسیر نہیں۔ کہ ہو ہیچ قفس کے۔ جس وقت زبان پر آیا فریادِ بلبل ہے واسطے گوش دادرس کے۔ غرض جس اہل سخن کا دُرِ منصفی زینتِ لب ہے سر رشتۂ حسن و معانی کا اس کلام کے اس سے انصاف طلب ہے۔ اگر حق تعالیٰ نے صبح کاغذ سفید کی مانند شام سیاہ کرنے کو یہ خاکسار خلق کیا ہے۔ تو ہر انسان کے فانوس دماغ میں چراغ ہوش دیا ہے۔ چاہئے کہ دیکھ کر نکتہ چینی کرے ورنہ گزند زہر آلود سے بے اجل کاہے کو مرے"+

اس تصنیف سے تقریباً ۳۰ برس کے بعد جبکہ میر انشاء اللہ خاں اور مرزا جانجاناں مظہر کی دلّی میں ملاقات ہوئی ہے۔ اس گفتگو کے چند فقرے بھی قابل غور ہیں۔ سید انشا مرزا جان جاناں سے فرماتے ہیں:۔

سیّد انشا فرماتے ہیں:۔

سید انشا کی تقریر

ابتدائے سنِ صبا سے تا اوائلِ ریعان۔ اور اوائل ریعان سے الی الآن اشتیاق مالا یطاق تقبیل عتبۂ عالیہ نہ بحدسے تھا کہ سلک تحریر و تقریر میں منتظم

ہو سکے لہذا بے واسطہ و وسیلہ حاضر ہوا ہوں +

مرزا صاحب جواب میں فرماتے ہیں :-

مرزا جانجاں کا جواب

اپنے تئیں کوں بھی بدو طفلی سے تھیں ایسے اشخاص کے ساتھ موانست اور مجالست رہا کی ہے +

لیکن میر[1] عفر غلیغی کے نام سے ایک گفتگو سید انشانے دریائے لطافت میں لکھی ہے اسے پڑھ کر تعجب آتا ہے کہ اس صاحب کمال نے یہ زبان کس فصاحت کے قالب میں ڈھالی تھی۔ کہ ان عبارتوں میں اور اس میں زمین آسمان کا فرق ہے شاید مرزا جان جاناں اور سودا وغیرہ بزرگوں کی تحریر کچھ اور ہوگی۔ تقریر کا انداز اور ہوگا +

بہر حال اس وقت تک انشا پردازی اور ترقی اور وسعت زبانِ اُردو کی فقط شعراء کی زبان پر تھی جن کی تصنیفات غزلیں عاشقانہ اور قصیدے مدحیہ ہوتے تھے۔ اور غرض اُن سے فقط اتنی تھی کہ امراء و اہل دول سے انعام لے کر گزارہ کریں۔ یا تفریح طبع یا یہ کہ ہمچشموں میں تحسین و آفریں کا فخر حاصل کریں۔ وہ بھی فقط نظم میں نثر کے حال پر کسی کو اصلا توجہ نہ تھی۔ کیونکہ کارروائی مطالب ضروری کی سب فارسی میں ہوتی تھی۔ مگر خدا کی قدرت دیکھو تھوڑے عرصے میں کئی قدرتی سامان جمع ہو گئے۔ اور سب سے مقدم سبب اس کی عام فہمی تھی کہ ہر شخص سمجھتا تھا۔ اس لئے لکھنے والوں کو اسی میں واہ وا لینے کا شوق ہوا۔ میر محمد عطا حسین خاں تحسین نے چار درویش کا قصہ اُردو میں لکھ کر نو طرزِ مرصع نام رکھا۔ شجاع الدولہ کے عہد میں تصنیف شروع ہوئی۔ ۱۲۱۳ھ ۱۷۹۸ء نواب آصف الدولہ کے عہد میں ختم ہوئی +

ادھر تو یہ چونچال لڑکا شعراء کے جلسوں میں اور اُمرا کے درباروں میں اپنے بچپنے کی شوخیوں سے سب کے دل بہلا رہا تھا۔ اُدھر دانائے فرنگ جو کلکتہ میں فورٹ ولیم

[1] دیکھو صفحہ ۱۰۸ +

کے قلعہ پر دوربین لگائے بیٹھا تھا۔ اُس نے دیکھا۔ نظرباز تاڑ گیا کہ لڑکا ہونہار ہے۔ مگر تربیت چاہتا ہے۔ تجویز ہوئی کہ جس ملک پر حکمرانی کرتے ہیں۔ اس کی زبان سیکھنی واجب ہے۔ چنانچہ ۱۷۹۹ء ۱۲۱۴ھ میں میر شیر علی افسوس نے باغ اُردو اور ۱۸۰۵ء ۱۲۲۰ھ میں آرائش محفل لکھی۔ میر امن دہلوی نے ۱۸۰۲ء ۱۲۱۷ھ میں باغ و بہار آراستہ کیا اور انہی دنوں میں اخلاق محسنی کا ترجمہ لکھا۔ ساتھ ہی جان گلگرسٹ صاحب نے انگریزی میں قواعد اُردو لکھی ۱۸۰۳ء ۱۲۱۸ھ میں شری للوجی لال کوی نے پریم ساگر[1] لکھی اور بیتال پچیسی جو محمد شاہ کے زمانہ میں سنسکرت سے برج بھاشا میں آئی تھی اب عام فہم اردو ہو کر ناگری میں لکھی گئی۔ لیکن اس نقارۂ فخر کی آواز کو کوئی دبا نہیں سکتا۔ کہ میر انشاء اللہ خاں پہلے شخص ہیں جنھوں نے ۱۸۰۷ء ۱۲۲۲ھ میں قواعد اُردو لکھ کر ایجاد کی ٹہنی میں ظرافت کے پھول کھلائے +

مذہبی تصانیف اُردو میں

عجیب لطف یہ ہے کہ زبان اُردو کی عام فہمی دیکھ کر مذہب نے بھی اپنی برکت کا ہاتھ اس کے سر پر رکھا یعنی ۱۸۰۷ء ۱۲۲۲ھ میں مولوی شاہ عبدالقادر صاحب نے قرآن شریف کا ترجمہ اُردو میں کیا۔ بعد اس کے مولوی اسمٰعیل صاحب نے بعض رسالے عام اہل اسلام کی فہمائش کے لئے اُردو میں لکھے +

اردو اخبار

۱۸۳۵ء سے دفاتر سرکاری بھی اردو ہونے شروع ہوئے۔ چند سال کے بعد کُل دفتروں میں اُردو زبان ہو گئی۔ اسی سنہ میں اخباروں کو آزادی حاصل ہوئی۔ ۱۸۳۶ء میں اُردو کا اخبار دلّی میں جاری ہوا۔ اور یہ اس زبان میں پہلا اخبار تھا کہ میرے والد مرحوم کے قلم سے نکلا +

دفاتر سرکاری اردو ہوئے

غرض اپنی آسانی کے وصف سے اور اس لحاظ سے کہ ملکی زبان بھی ہے دفتری زبان بھی یہی ٹھہری۔ اُردو نے آہستہ آہستہ فارسی کو پیچھے ہٹانا اور اپنا قدم آگے بڑھانا شروع کیا۔ تب سرکار نے مناسب سمجھا کہ اس ملک کے لوگوں کو انہی کی زبان

---

[1] پریم ساگر سمت ۱۸۶۰ میں بھاشا ہوئی۔ بیتال پچیسی ۱۸۰۵ء میں مظہر علی وِلا نے اُردو میں لکھی۔

میں انگریزی علوم و فنون سکھائے جائیں۔ چنانچہ ۱۸۴۲ء سے دلی میں سوسائٹی قائم ہو کر ترجمے ہونے لگے۔ اور ضرورت علمی الفاظ بہم پہنچانے لگی۔ خیال کرو کہ جس زبان کی فقط اتنی بنیاد ہو وہ زبان کیا اور اُس کی وسعت کا میدان کیا۔ البتہ اب اُمید کر سکتے ہیں کہ شاید یہ بھی ایک دن علمی زبانوں کے سلسلہ میں کوئی درجہ پائے +

اُردو روز نیا رنگ بدلتی ہے

اُردو اس قدر جلد جلد رنگ بدل رہی ہے کہ ایک مصنّف اگر خود اپنی ایک سنہ کی تصنیف کو دوسرے سنہ کی تصنیف سے مقابلہ کرے تو زبان میں فرق پائے گا۔ باوجود اس کے اب تک بھی اس قابل نہیں کہ ہر قسم کے مضمون خاطر خواہ ادا کر سکے یا ہر علم کی کتاب کو بے تکلف ترجمہ کر دے۔ اس کا سبب یہ ہے کہ اکثر علوم اور ہزاروں مسائل علمی ممالکِ فرنگ میں ایسے نکلے ہیں کہ زمانۂ سلف میں بالکل نہ تھے۔ اس واسطے عربی۔ فارسی۔ سنسکرت بھاشا وغیرہ جو کہ اُردو کے بزرگ ہیں اُن کے خزانہ میں بھی اس کے ادائے مطلب کے لئے لفظ نہیں۔ اور اس میں ہم اُردو بچاری کے افلاس پر چنداں تعجب نہیں کر سکتے۔ خصوصاً جب کہ ہندو مسلمان اپنے بزرگوں کی میراث کو بھی ہاتھ سے کھوئے بیٹھے ہوں +

برج بھاشا پر عربی اور فارسی زبانوں نے کیا کیا اثر کئے

جب دو صاحبِ زبان قومیں باہم ملتی ہیں تو ایک کے رنگ و روپ کا دوسرے پر ضرور سایہ پڑتا ہے۔ اگرچہ اُس کے اثر۔ گفتگو۔ لباس۔ خوراک۔ نشست برخاست مختلف رسوم میں بھی ہوتے ہیں۔ لیکن چونکہ مجھے اس مقام پر زبان سے غرض ہے اس لئے اسی میں گفتگو کرتا ہوں۔ ظاہر ہے کہ جب ایک قوم دوسری قوم میں آتی ہے۔ تو اپنے ملک کی صدہا چیزیں ایسی لاتی ہے کہ جو یہاں نہیں تھیں۔ اشیائے مذکورہ کبھی ضروری اور کبھی ایسی باعث آرام ہوتی ہیں کہ انھیں استعمال میں لینا ضروریات زندگی

سے نظر آتا ہے، اس لئے یہ لوگ انھیں غنیمت سمجھ کر لیتے ہیں۔ اور بخوشی کام میں لاتے ہیں۔ ان اشیاء میں سے بہتیری چیزیں تو نام اپنے ساتھ لاتی ہیں۔ اور بہتیری نئی ترکیب سے یا اَدل بَدل کر یہاں نیا نام پاتی ہیں اور یہ پہلا اثر دوسری زبان کا ہے۔ اس کے علاوہ جب یہ دونوں ایک جگہ رہ سہہ کر شیر و شکر ہوتی ہیں تو ایک زبان میں دوسری زبان کے لفظ بھی گھل مل جاتے ہیں +

جب مہمان و میزبان ایک دوسرے کی زبان سمجھنے لگتے ہیں۔ تو ایک خوشنما اور مفید تبدیلی کے لئے رستہ پیدا ہوتا ہے۔ کیونکہ اگرچہ طبع انسانی کے اتحاد سے سب کے خیالات متفق یا قریب قریب ہوں۔ مگر انداز بیان سب کا جُدا جُدا ہے۔ اور طبیعت ہمیشہ نئے انداز کو پسند کرتی ہے۔ اس لئے ادائے مطلب میں ایک دوسرے کے انداز بیان سے بھی فائدہ اُٹھاتے ہیں۔ پھر نئی نئی تشبیہیں لطیف استعارے لے کر اپنی پرانی تشبیہوں اور مستعمل استعاروں کا رنگ بدلتے ہیں۔ اور جس قدر زبان میں طاقت ہے ایک دوسرے کے خیالات اور نئی طرز کو لے کر اپنی زبان میں نیا مزہ پیدا کرتے ہیں +

یہ انقلاب حقیقت میں وقت بوقت ہر ایک زبان پر گزرتا ہے۔ چنانچہ قوم عرب جو ایک زمانہ میں روم۔ یونان اور ہسپانیہ وغیرہ سے خلط ملط ہوئی تھی۔ ہزاروں لفظ علمی اور غیر علمی وہاں سے لئے۔ اسی طرح فارسی زبان عربی و ترکی وغیرہ الفاظ سے مالامال نظر آتی ہے۔ انگریزی کے باب میں مجھے کہنا زیبا نہیں کیونکہ اب روشن ضمیر انگریزی خواں بہت ہیں۔ اور وہ مجھ سے زیادہ جانتے ہیں۔ مگر اتنا کہنا کافی ہے کہ جس طرح ایک مہذّب سلطنت کو تمام ضروریات سلطنت کے کارخانے اور ملکی سامان موجود ہونے چاہئیں۔ اسی طرح سب قسم کے الفاظ اور تمام ادائے خیالات کے انداز انگریزی زبان میں موجود ہیں +

اب مجھے اپنی زبان میں گفتگو کرنی چاہئے۔ لیکن اتنا پھر یاد دلانا واجب ہے

کہ اُردو کہاں سے نکلی ہے اور کیونکر نکلی ہے۔ اُردو زبان اوّل۔ لین دین۔ نشست برخاست کی ضرورتوں کے لئے پیدا ہوگئی۔ ہندوؤں کے ساتھ ہندی مسلمان جو اکثر ایرانیوں یا ترکستانیوں کی اولاد تھے۔ ہندوستان کو وطن۔ اور اس زبان کو اپنی زبان سمجھنے لگے۔ یہ بھی ظاہر ہے کہ جس طرح زمین بے روئیدگی کے نہیں رہ سکتی۔ اسی طرح کوئی زبان بے شاعری کے نہیں رہ سکتی۔ محمد شاہی دور تھا اور عیش و عشرت کی بہار تھی۔ ان شرفا کو خیال آیا ہوگا کہ جس طرح ہمارے بزرگ اپنی فارسی کی انشاپردازی میں گلزار کھلاتے تھے۔ اب ہماری یہی زبان ہے۔ ہم بھی اس میں کچھ رنگ دکھائیں۔ چنانچہ وہی فارسی کے خاکے اُردو میں اتار کر غزل خوانیاں شروع کر دیں اور قصیدے کہنے لگے۔ اور اس میں کچھ شک نہیں کہ جو کچھ قوت بیان۔ یا لفظوں کی تراش۔ یا ترکیبوں کی خوبصورتی یا تشبیہ اور استعاروں کی رنگینی۔ غرض اوّل جو کچھ نصیب ہوا شعرائے اُردو کی بدولت ہوا۔ اور یہی سبب ہے کہ جو کچھ سامان ایک ملکی اور ٹکسالی زبان کے لئے درکار ہوتے ہیں اُس سے یہ زبان مفلس رہی۔ کیونکہ اس عہد میں علوم و فنون۔ تاریخ۔ فلسفہ۔ ریاضی وغیرہ کا چرچا عام ہوتا تو اس کے لئے بھی الفاظ ہو جاتے۔ جن جن باتوں کا چرچا تھا انہی سامانوں کے الفاظ اور خیالات پیدا ہوئے۔ ہاں یہ کہنا ضرور چاہئے کہ جو کچھ ہوا تھا اپنے رنگ پر خوب ہوا تھا +

اُردو کی ابتدائی تصنیفیں نظم سے شروع ہوئیں

اب ہمیں پھر مطلب پر آنا چاہئے کہ بھاشانے اُردو کے کپڑے پہننے کے لئے فارسی سے کیا کیا لیا +

بہت چیزیں ہند میں آئیں اور نام اپنے ساتھ لائیں

۱۔ اُن چیزوں کے نام لئے جو عرب اور فارس سے آئیں اور اپنے نام اپنے ساتھ لائیں۔ مثلاً لباس میں فرغل۔ لبادہ۔ کرتہ۔ قبا۔ چوغا۔ آستین۔ گریبان۔ پائجامہ۔ ازار۔ عمامہ۔ رومال۔ شال۔ دوشالہ۔ تکیہ۔ گاؤتکیہ۔ برقع۔ پوستین وغیرہ + کھانے کے ذیل میں دسترخوان۔ چپاتی۔ شیرمال۔ باقرخانی۔ پلاؤ۔ زردہ۔

مُزعفر۔ قورمہ۔ مُتنجن۔ فرنی۔ ماقوتی۔ حریرہ۔ حریسہ۔ لوز۔ مربّٰی۔ اچار۔ فالودہ۔ گلاب۔ بیدمشک۔ خوان۔ طبق۔ رکابی۔ تشتری۔ کفگیر۔ چمچہ۔ سینی۔ کشتی۔ چائے۔ جوشش وغیرہ +

متفرقات میں حمام۔ کیسہ۔ صابون۔ شیشہ۔ شمع۔ شمعدان۔ فانوس۔ گلگیر۔ تنور۔ رفیدہ۔ مشک۔ نماز۔ روزہ۔ عید۔ شب برات۔ قاضی۔ ساقی۔ حقہ۔ نیچہ۔ چلم۔ تفنگ۔ بندوق۔ تختہ نرد۔ گنجفہ۔ اور اُن کی اصطلاحیں۔ یہ سب چیزیں اپنے نام ساتھ لے کر آئیں۔ بہت سی چیزیں آئیں کہ بھاشا میں ان کے لئے نام نہیں۔ سنسکرت کی کتابوں میں ہوں گے۔ پستہ۔ بادام۔ منقّٰی۔ شہتوت۔ بیدانہ۔ خوبانی۔ انجیر۔ سیب۔ بہی۔ ناشپاتی۔ انار وغیرہ +

بہت چیزیں ہندی کی ہیں مگر اپنے ہندی نام کھو بیٹھی ہیں۔

۲۔ بہت سے عربی۔ فارسی کے لفظ کثرت استعمال سے اس طرح جگہ پکڑ بیٹھے ہیں۔ کہ اب ان کی جگہ کوئی سنسکرت یا قدیمی بھاشا کا لفظ ڈھونڈھ کر لانا پڑتا ہے مگر اس میں یا تو مطلب اصلی فوت ہو جاتا ہے۔ یا زبان ایسی مشکل ہو جاتی ہے کہ عوام تو کیا خواص ہنود کی سمجھ میں بھی نہیں آتی۔ مثلاً دلّال۔ فرّاش، مزدور۔ وکیل۔ جلّاد۔ صرّاف۔ مسخرا۔ نصیحت۔ لحاف۔ توشک۔ چادر۔ صورت۔ شکل۔ چہرہ۔ طبیعت۔ مزاج۔ برف۔ فاختہ۔ قمری۔ کبوتر۔ بلبل۔ طوطا۔ پر۔ دوات۔ قلم۔ سیاہی۔ جلاب۔ رقعہ۔ عینک۔ صندوق۔ کرسی۔ تخت۔ لگام۔ رکاب۔ زین۔ تنگ۔ پوزی۔ نعل۔ کوتل۔ عقیدہ۔ وفا۔ جہاز۔ مستول۔ بادبان۔ تہمت۔ ذرہ۔ پردہ۔ دالان۔ تہ خانہ۔ ملّاح۔ تازہ۔ غلط۔ صحیح۔ رسد۔ سرباری۔ کاریگر۔ ترازو۔ شطرنج کے باب میں تعجب ہے کہ خاص ہند کا ایجاد ہے۔ مگر عرب اور فارس سے جو پھر کر آئی تو سب اجزا کے نام اور اپنی اصطلاحیں بدل آئی +

سینکڑوں لفظ عربی فارسی کے یہاں آئے مگر ہوا موافق نہ آئی۔ اس لئے مزاج اور صورت بگڑ گئی مثلاً مُرغا وغیرہ۔ دیکھو صفحہ ۳۸ +

حرف میں فارسی سے کچھ نہیں لیا۔خود اتنا کیا کہ ؤ ں علامت جمع ہندی کو عربی فارسی لفظوں پر بھی لگا لیا۔ مثلاً آدمیوں۔ انسانوں۔ درختوں۔ میوؤں +

حرف میں فارسی نے ہندی پر کیا اثر کیا

اسم فاعل فارسی عربی کے بے شمار لئے۔اوران میں شطرنج باز کے قیاس پر چوپڑ باز اور وفادار کے قیاس پر ظرفاً سمجھدار۔ سمجھ ناک بھی بول دیتے تھے۔ باغبان کے قیاس پر گاڑی بان۔ ہاتھی بان۔ بہلبان۔ نگربان اور وان حقیقت میں ایک ہیں۔ کیونکہ اصل میں دونوں زبانیں ایک دادا کی اولاد ہیں۔ اس کی تحقیق جیسی کہ چاہیے۔ فارسی لکچروں میں لکھی ہے +

اسم ظرف۔ قلمدان وغیرہ کے قیاس پر خاصدان۔ پاندان۔ ناگردان۔ پیک دان۔ مودیخانہ۔ پیخانہ +

باب الحروف

باب حروف کا بھی یہی حال ہے۔ مثلاً حرف تشبیہ کوئی نہیں لیا۔ مگر چنانچہ اور چونکہ موجود ہیں اور اس طرح آتے ہیں کہ ترجمہ کے لئے ہندی حرف معلوم ہی نہیں ہوتا +

حرف شرط میں۔ اگر۔ اور اس سے اگرچہ بھی لیا +

واو عاطفہ سمیت۔ معطوف اور معطوف علیہ۔ اردو عبارت میں لے لئے۔ مثلاً آب وہوا۔ شب و روز۔ صبح و شام۔ زور و شور +

حرف استثنا میں سے مگر۔ اور عربی کے لفظ سوا۔ ماسوا۔ اِلّا۔ و اِلّا نہ۔ لیکن و لیکن لے لئے۔ اپنے حرفوں کو گم کر دیا +

حرف نفی۔ نا۔ اور بنا کی جگہ نہ اور نے۔ آگئے +

حرف ایجاب رہے مگر ادب کی جگہ میں ست بچن وغیرہ کی جگہ۔ بجا۔ درست۔ واقعی۔ حق۔ بے شک۔ برحق۔ بہ سرو چشم۔ آگئے۔ اصل زبان کے لفظ نہ رہے +

حروف تاکید کی جگہ ہرگز۔ زنہار۔ ضرور۔ البتہ۔ آگئے۔ اصلی لفظ گم ہو گئے +

حروف تردید کی جگہ یا۔ خواہ۔ ہیں۔ اصل گم +

حروف تمنا میں سے کوئی حرف نہیں۔ کاش فارسی کا حرف ہے +

حروف ترقی میں بل تو نہیں بولتے۔ مگر بلکہ اپنے موقع پر آتا ہے +

اسم کی بحث میں۔ اسماء اشارہ میں سے کچھ نہیں لیا مگر ازانجاکہ۔ باآنکہ۔ بااینکہ مرکب ہو کر بہت آتے ہیں +

موصولات میں سے کچھ نہیں لیا۔ مگر کاف بیانیہ اس طرح آنے لگا کہ بے اس کے کلام ہی بے مزہ ہو جاتا ہے۔ کیسا۔ ایسا۔ جیسا۔ کی جگہ۔ کس طرح وغیرہ۔ کس وضع وغیرہ۔ کتنا۔ اتنا۔ جتنا۔ کی جگہ۔ کس قدر وغیرہ بھی بولنے لگے +

یائے نسبت کی ترکیبوں میں فارسی عربی کے بموجب نسبتی الفاظ بولنے لگے چنانچہ دلّی وال کی جگہ دہلوی بولتے ہیں۔ اسی طرح اور الفاظ ہیں اور عورتوں میں شیخانی سیدانی۔ استانی وغیرہ وغیرہ +

باوجودیکہ ہندی کے مصدر موجود تھے مگر صدہا مصادر مرکبہ بنالئے۔ مثلاً مانا۔ اب کہتے ہیں۔ ہر چند سمجھایا اُس نے منظور نہ کیا۔ کسی عنوان قبول نہ کیا۔ یعنی نہ مانا +

مُکرنا۔ اب کہتے ہیں۔ پہلے تو قبول دیا تھا پھر انکار کر گیا۔ یعنی مُکر گیا +

سوچنا۔ اب کہتے ہیں۔ ہر چند فکر کرتا ہوں۔ عقل کام نہیں کرتی +

پچھتانا۔ اپنے کئے پر بہت پشیمان ہوا۔ مگر اب کیا ہو سکتا ہے۔ یعنی پچھتانا +

اسی طرح خوش ہونا۔ غصّے ہونا۔ خفا ہونا۔ تنگ ہونا۔ دق ہونا۔ غمگین ہونا۔ تماشا دیکھنا۔ سیر کرنی۔ انتظار کرنا۔ راہ دیکھنا۔ یہاں تک کہ بہتیرے مصادروں کی اصل ہندی گم ہو گئی۔ اس سے بڑھ کر یہ کہ عربی فارسی کے مصدر یا مشتقات لے کر ہندی کا اشتقاق کر لیا +

گزشتن سے گذرنا۔ اور اس کے افعال۔ محاورہ ہے کہ گئی گذری بات کا اب کیا کہنا

فرمودن سے فرمانا۔ اور اس کے بہت سے افعال +

قبول سے قبولنا۔ محاورہ ہے۔ بڑا بادی چور تھا۔ ہرگز نہ قبولا +

بدل سے بدلنا اور اس کے بہت سے افعال۔ محاورہ ہے کہ اُدلے کا بدلا ہے صاحب +

بخشیدن سے۔ بخشنا	لرزیدن سے لرزنا
نواختن یا نوازش سے نوازنا	شرم سے شرمانا

کاہلی سے کہلانا۔ میاں مجبور۔ ایک قدیمی شاعر تھے۔ اُستاد مرحوم ان کی باتیں کیا کرتے تھے۔ کہ بڈھے دیرینہ سال تھے۔ مکتب پڑھایا کرتے تھے۔ ایک دفعہ مشاعرہ میں غزل پڑھی۔ دیکھا کس خوبصورتی سے فعل مشتق کو بٹھایا ہے ؎

باتیں دیکھ زمانہ کی۔ جی بات سے بھی کہلاتا ہے　　خاطر سے سب یاروں کی۔ مجبور غزل کہہ لاتا ہے

نحو میں فارسی نے کیا اثر کیا۔

نحو میں ترکیب اضافی۔ ترکیب توصیفی۔ کہیں مبتدا کہیں خبر ہو کر تمام ہندی پر چھا گئی۔ اس میں پہلا فائدہ یہ ہوا کہ اختصار کے لحاظ سے لفظوں کا پھیلاؤ کم ہو گیا +
دوسرے جمع موصوف ہو تو اسم صفت موصوف کو بھی اس کے لئے جمع لاتے تھے اب واحد لاتے ہیں ؎

ملائم ہو گئیں دل پر برہ کی ساعتیں کڑیاں　　پہر کٹنے لگے اُن بن نہ کٹتیں جن بنا گھڑیاں

اب گھڑی ساعتیں بولتے ہیں +
تیسرے صیغہ مضارع بمعنی حال۔ سودا ؎

نالہ سینے سے کرے عزم سفر آخر شب　　راہ رو چلنے پہ باندھے ہے کمر آخر شب

چوتھے یہ کہ اقسام اضافتہ میں تشبیہ اور استعارہ کے رنگ سے سیدھی سادی زبان رنگین ہو گئی۔ چنانچہ بھاشا میں کہنا ہو تو کہیں گے۔ راج کنور کے دل کے کنول کی کُملاہٹ دربار کے لوگوں سے نہ دیکھی گئی۔ اُردو میں کہیں گے شہزادہ کے غنچۂ دل کی کُملاہٹ اہل دربار سے نہ دیکھی گئی +

ولی وغیرہ متقدمین کے کلاموں میں ایسی ترکیبیں بہت ہیں۔ بلکہ آدھے آدھے اور سارے سارے مصرع فارسی کے ہیں۔ مگر کچھ اور طرح سے۔ علیٰ ہذا القیاس بھاشا کے الفاظ اور اُس کی ترکیبیں بھی زیادہ ہیں۔ اور اس طرح ہیں کہ آج لوگوں کو فصیح

نہیں معلوم ہوتیں۔ اس کی مثال ایسی ہے گویا دودھ میں مٹھاس ملائی مگر وہ ابھی اچھی طرح گھلی نہیں۔ ایک گھونٹ خاصا میٹھا۔ ایک بالکل پھیکا ہے۔ پھر ایک میں مصری کی ڈلی دانت تلے آگئی۔ ہاں اب گھل مل کر وہ مرتبہ حاصل ہوا جسے شیر و شکر کہتے ہیں۔ بعض اشخاص یہ بھی کہتے ہیں کہ خالی بھاشا میں کچھ مزہ نہیں۔ اُردو خواہ مخواہ طبیعت کو بھلی معلوم ہوتی ہے۔ مگر میری عقل دونوں باتوں میں حیران ہے۔ کیونکہ جب کوئی کہے آج ایک شخص آیا تھا۔ یا یہ کہیں کہ ایک منش آیا تھا۔ تو دونوں یکساں ہیں۔ کیونکر کہوں کہ منش مخالفِ طبع ہے؟ یہ بھی تو ہو سکتا ہے کہ ہم بچپن سے شخص سنتے ہیں اس لئے ہمیں منش یا مانس۔ نامانوس معلوم ہوتا ہے اسی طرح اور الفاظ جن کی تعداد شمار سے باہر ہو گئی ہے۔

نکتۂ منصفانہ

اِس سے زیادہ تعجب یہ ہے کہ بہت سے لفظ خود متروک ہیں مگر دوسرے لفظ سے ترکیب پاکر ایسے ہو جاتے ہیں کہ فصحا کے محاورہ میں جان ڈالتے ہیں۔ مثلاً یہی مانس کہ اکیلا محاورہ میں نہیں مگر سب بولتے ہیں کہ احمد ظاہر میں تو بھلا مانس معلوم ہوتا ہے باطن کی خبر نہیں۔

بندھو۔ بھاشا میں بھائی یا دوست کو کہتے ہیں۔ اب محاورہ میں بھائی بند کہتے ہیں۔ نہ فقط بندھو۔ نہ بھائی بندھو۔ اور ان استعمالوں کی ترجیح کے لئے دلیل کسی کے پاس نہیں۔ جو کچھ جس زمانہ میں رواج ہو گیا وہی فصیح ہو گیا۔ ایک زمانہ آئے گا کہ ہمارے محاورہ کو لوگ بے محاورہ کہہ کر ہنسیں گے۔

اگرچہ یہ بات بغیر تمثیل دیکھنے کے بھی ہر شخص کے خیال میں نقش ہے کہ سنسکرت اور برج بھاشا کی مٹی سے اُردو کا پُتلا بنا ہے۔ باقی اور زبانوں کے الفاظ نے خط و خال کا کام کیا ہے۔ مگر میں چند لفظ مثالاً لکھتا ہوں۔ دیکھو سنسکرت الفاظ جب اُردو میں آئے تو اُن کی اصلیت نے انقلاب زمانہ کے ساتھ کیونکر صورت بدلی ہے۔

سنسکرت لفظوں پر اوّل بھاشا نے پھر اُردو نے کیا کیا تصرف کئے

(۱) چورن سنسکرت ہے یعنی آٹا۔ بھاشا میں۔ چون سے کہتے ہیں۔ اُردو میں چورن پسی ہوئی دوا کو کہتے ہیں۔ اور کُٹی ہوئی چیز کے نیچے جو باریک اجزاء رہ جائیں وہ چورا ہے +

(۲) پشٹ سنسکرت ہے برج بھاشا میں۔ پِسان اسی سے ہے۔ پسنہاری اُردو میں پیٹھی پیسی ہوئی دال کے لئے خاص ہوگئی اور پیسنا مصدر ہوگیا +

(۳) اَٹ جسے برج بھاشا اور اُردو دونوں میں آٹا کہتے ہیں +

(۴) وارتا یا وَرَتا۔ اُردو میں بات ہوگئی +

(۵) چترد ہر۔ اُردو میں چودھری ہو گیا +

(۶) چندر۔ چاندری۔ سنسکرت ہے۔ اُردو میں چاند اور چاندنی ہوگئی +

(۷) (گدّھ) گرّھ۔ گھر یعنی خانہ۔ اور کیا عجب ہے کہ فارسی میں کد۔ یا کدہ بھی یہی ہو +

(۸) ہست۔ ہاتھ ہے +

(۹) ہستی۔ کا ہاتھی ہوگیا +

(۱۰) بازد۔ سنسکرت ہے۔ بھاشا۔ بادر۔ اُردو بادل یعنی ابر ہو گیا +

(۱۱) دُل ایک ایک چیز کے دو دو ٹکڑے کرنے کو کہتے ہیں۔ بھاشا اور اُردو میں دال خاص غلّہ کے لئے اور دلنا مصدر نکل آیا +

(۱۲) کشیر۔ دُود۔ بھاشا۔ کھیر۔ یا چھیر۔ اُردو میں دود چاول سے تیار ہوتی ہے +

(۱۳) دُگدھ۔ سنسکرت ہے۔ بھاشا دُودھ۔ اب اُردو میں دَوَد کہتے ہیں +

(۱۴) ماشں یا ماکھ۔ ماس۔ اُردو میں مہینا ہوگیا +

عربی فارسی کے لفظ لے کر معنوں میں تصرف کر لیا اور کہیں بالعکس۔

(۱۵) گانڈا۔ اُردو میں گنّا ہوگیا مگر گنڈیری میں ڈال باقی رہی۔ بہت سے الفاظ ہیں کہ عربی فارسی نے اُردو کو دیئے۔ اُردو نے کہیں تو لفظوں میں کچھ تصرف کیا۔ معنے وہی رکھے۔ کہیں لفظوں کو سلامت رکھا معنے کچھ سے کچھ کر لئے۔ مثلاً:۔

فیلسوف ۔ یونانی لفظ ہے۔ بمعنی محب الحکمت۔ جسے عربی میں حکیم اور انگریزی میں ڈاکٹر یا فلوزفر کہتے ہیں ۔ مگر اُردو والے دغاباز اور مکار کو کہتے ہیں۔ اور فیلسوفی مکاری +

ابّا۔ امّا۔ اَب اور اُم سے نکلے ہیں +

خصم ۔ عربی میں بمعنی مقابل یا دشمن ہے مگر اُردو میں خاوند بمقابل جورو کے ہے جس سے زیادہ دنیا میں کوئی عزیز نہیں +

تماشا ۔ سَیر ۔ عربی میں فقط بمعنی رفتار ہے۔ اُردو میں کہتے ہیں ۔ چلو باغ کی سَیر دیکھ آئیں عجب تماشا ہے +

اخلاص ۔ عربی میں خالص کرنے کو کہتے ہیں۔ اُردو والے پیار۔ اخلاص ۔ محبت ایک معنوں میں بولتے ہیں +

خیرات ۔ عربی لفظ ہے یعنی نیکیاں ۔ اُردو میں خیرات دو۔ صدقہ اُتارو +

تکرار ۔ عربی میں دوبارہ کہنے یا کام کرنے کو کہتے ہیں۔ اُردو میں نزاع یا جھگڑے کو کہتے ہیں +

طوفان ۔ عربی لفظ ہے فارسی میں کسی شے کی حالتِ افراط کو کہتے ہیں ۔ اُردو میں بمعنی تہمت بھی آتا ہے +

خفیف ۔ عربی میں ہلکی شے کو کہتے ہیں ۔ ہندی میں کہتے ہیں ۔ وہ مجھ سے ذرا ملے تو سہی دیکھو کیسا خفیف کرتا ہوں ۔ یعنی شرمندہ +

مصالح ۔ جمع مصلحت یا ماصَلَح کا مخفف ہے ۔ اُردو میں گرم مصالح وغیرہ اور سامان عمارت کو بھی مصالح کہتے ہیں +

خاطر ۔ عربی فارسی میں دل یا خیال کے موقع پر بولتے ہیں۔ اُردو میں کہتے ہیں کہ بھلا ایک گھونٹ تو ہماری خاطر سے بھی پی لو۔ یا اُن کی بڑی خاطر کی +

دستوری ۔ جن معنوں میں یہاں بولتے ہیں ۔ یہ یہیں کا ایجاد ہے۔ پنجابی میں جھونگا کہتے ہیں +

روزگار۔ فارسی میں زمانہ کو کہتے ہیں۔ ہندی میں روزگار نوکری ہے +

رومال۔ جن معنوں میں یہاں بولتے ہیں یہ یہیں کا ایجاد ہے۔ فارسی میں روپاک یا دست پاک ہے +

خیر و صلاح۔ عوام النّاس خیر سلاّ کہتے ہیں یعنی صحت و سلامت +

رَسَدُ۔ اگرچہ فارسی لفظ علوم ہوتا ہے۔ مگر اہل فارس ان معنوں میں نہیں بولتے۔

عربی فارسی کے لفظ لیکر صورت اور معنی دونوں میں تصرف کیا

بہت الفاظ اس طرح لئے کہ معنوں کے ساتھ اُن کی صورت بھی بدل دی۔ اگرچہ اکثر اُن میں سے عوام النّاس بولتے ہیں۔ مگر بعض الفاظ خواص کی زبانوں تک بھی پہنچ گئے۔ مثلاً:۔

ارداوہ۔ کہ اصل اردابہ تھا +

شوروا۔ شوربا۔ یا شورابہ +

کھیسا۔ کیسہ +

کہگل۔ کاہ گل +

ہمام دستہ۔ ہاون دستہ +

بجاز۔ بزّاز +

قبور۔ قربوس +

دسپناہ۔ دست پناہ یہیں کی فارسی ہے +

مردار سنگ۔ مُردہ سنگ +

گدری۔ گذری۔ بازار وقت شام +

پجاوہ۔ پزادہ۔ پزیدن سے +

ٹاٹ بافی۔ تار بافی +

زری کونا۔ زری کہنہ +

تار تلاّ۔ تار طِلا یعنی زری کہنہ +

تانے تشنے۔ طعن و تشنیع +

تک تک جُھک جُھک۔ زق زق۔ بق بق

توبہ تنسو ہا۔ توبۃً نصوحا +

تاشہ۔ تاسہ اور تاسک فارسی لفظ ہے +

سہ بندی۔ سپہ بندی۔ نونگہداشت فوج

غُرفش۔ غرِّش +

افراتفری۔ یعنی افراط و تفریط اصل میں نہایت بہتات اور نہایت کمی کے معنی ہیں۔ اب کہتے ہیں۔ عجب افراتفری پڑ رہی ہے۔ یعنی ٹل چل پڑ رہی ہے +

قلانچ۔ قلاش یا قلاج۔ ترکی میں دونوں ہاتھوں کے درمیان کی وسعت کو کہتے ہیں۔ اس لئے کپڑا ناپنے کا پیمانہ ہے۔ یہاں خرگوش یا ہرن وغیرہ جانور دوڑتے ہوں تو کہیں گے کہ قلانچیں بھرتے پھرتے ہیں۔ ذوق ؎

وحشی کو دیکھا ہم نے اُس آہو نگاہ کے　　　جنگل میں بھر رہا تھا قلاچیں ہرن کے ساتھ

آکا ترکی میں بڑے بھائی کو کہتے ہیں۔ یہاں آکا ۔ یار دوست کو بولتے ہیں۔ اور اس میں کچھ بانکپن کو بھی دخل ہے +

قیورق ۔ ترکی میں شے محفوظ کو کہتے ہیں۔ یہاں جو شے حاکم کی ضبطی میں آئے اُسے قُرق کہتے ہیں +

مُشّاطہ ۔ مشط عربی میں کنگھی کو کہتے ہیں۔ فارسی میں مشّاطہ اُس عورت کو کہتے ہیں جو عورتوں کو بناؤ سنگار کروائے۔ جیسے ہندوستان میں نائن۔ اُردو میں مُشاطہ بضم اوّل۔ اور بتخفیف ثانی اُس عورت کو کہتے ہیں۔ جو زن و مرد کی نسبت تلاش کرے اور شادی کروا دے +

مُرغا۔ فارسی میں مرغ ۔ فقط پرندہ ہے۔ اُردو میں مرغا ۔ خروس ۔ مُرغی ۔ ماکیاں۔ کو کہتے ہیں اور ان کے ہاں ہر جمعہ کو مرغوں کی پالی بندھتی ہے +

چغ ۔ یا چق ۔ ترکی میں باریک پردہ کو کہتے ہیں۔ یہاں چلمن کو ۔ چک کہتے ہیں +

کَتّا ۔ ترکی میں بڑے کو کہتے ہیں۔ یہاں کٹا موٹے کو کہتے ہیں۔ ہٹا کٹا محاورہ ہے +

نَظَر۔ بالتحریک ہے مگر جمع اس کی بسکون اوسط ہی بولتے ہیں ۔ **وزیر**

ترچھی نظروں سے نہ دیکھو عاشقِ دلگیر کو　　　کیسے تیرانداز ہو سیدھا تو کرلو تیر کو

خطّ ۔ مشدد ہے۔ مگر اب کہتے ہیں۔ آجکل خطوں میں آداب و القاب کا دستور ہی نہیں رہا۔ کسی استاد کا شعر ہے ؎

صاف تھا جب تک کہ خط۔ تب تک جواب صاف تھا　　　اب تو خط آنے لگا شاید کہ خط آنے لگا

غمّ۔ بھی عربی میں مشدد ہے۔ فارسی اور اُردو میں بالتخفیف بولتے ہیں +

طرح ۔ عربی بالتسکین ہے۔ اُردو کے اہل محاورہ اور شاعر بھی بالتحریک باندھتے ہیں +

محلّ ۔ بالتشدید ہے۔ مگر کہتے ہیں ۔ کل بولی بھٹیاری کے محلوں پر بسنت ہے۔

بولی بھٹیاری ۔ کوئی بو علی بختیاری کا مخفف و مبدّل کہتا ہے۔ کوئی کہتا ہے

بھولی بھٹی کا +

بجے منڈل - بدیع منزل - کا مخفف و مبدّل ہے - دلّی کے باہر شاہان قدیم کی تعمیرات سے ایک مشہور عمارت ہے +

مرزا حسن کو پیار سے مرزا حسنو کہتے ہیں اور یہاں س کو ساکن ہی بولنا فصیح ہے +

کلِمہ - لام کی زیر سے ہے - محاورہ میں سکون لام بھی بولتے ہیں اور وہی بھلا معلوم ہوتا ہے - جرأت نے کیا خوب کہا ہے ؎

کلمہ بھرے تِرا جسے دیکھے تو بھر نظر — کافر اثر ہے یہ تری کافر نگاہ کا

نَشاَۂ - اہل محاورہ اسے بھی نشا کہتے ہیں - ذوق نے کیا خوب کہا ہے ؎

جتنے نشے ہیں یاں - روش نشۂ شراب — ہوجاتے بدمزہ ہیں جو بڑھ جاتے حد سے ہیں

کھُلا نشے میں جو پگڑی کا پیچ اسکی میر — سمند ناز کو اک اور تازیانہ ہوا

اس طرح سیکڑوں لفظ ہیں جن کی تفصیل بے فائدہ طویل ہے +

انگریزی زبان بھی اپنی عملداری بڑھاتی چلی آتی ہے

انگریزی زبان بھی اپنی عملداری بڑھاتی چلی آتی ہے - ہندو مسلمان بھائیوں کو اس دن کا انتظار چاہیے کہ وہ عربی فارسی کے لفظ جو اب تک ہمارے تمھارے باپ دادا بولتے رہے آئندہ اُن کی جگہ اس کثرت سے انگریزی لفظ نظر آئیں گے کہ عربی فارسی کے لفظ خود جگہ چھوڑ چھوڑ کر بھاگ جائیں گے - چند لفظ ایسے بھی دکھانے چاہئیں جو کہ مختلف ممالک یورپ کے ہیں اور اب ہماری زبان میں اس طرح پیوند پا گئے ہیں کہ جوڑ تک نہیں معلوم ہوتا - مثلاً :-

کمرا - اطالی ہے -
نیلام - پرتگالی ہے - وہ لیلام کہتے ہیں -
پادری - زبان لاطینی سے آیا ہے -
لالٹین - لین ٹرن انگریزی ہے -

اسٹام - سٹمپ انگریزی ہے -
بسکُٹ - بسکٹ انگریزی ہے -
پلٹن - انگریزی ہے -
بوتام - بوتان فرنچ ہے -

پستول ۔ پسٹل انگریزی ہے	بٹن ۔ بٹن انگریزی ہے ۔
فرانیل ۔ یا فلالین ۔ فلینل انگریزی ہے ۔	بگی ۔ انگریزی ہے ۔
بابنٹ ۔ بابی نٹ ۔ ایک جالی کی قسم کا کپڑا	گلاس ۔ انگریزی میں عام شیشہ ہے ۔
بوتل ۔ باٹل انگریزی ہے ۔	میم ۔ میڈم ۔ انگریزی ہے ۔
درجن ۔ ڈزن انگریزی ہے ۔	اردلی ۔ آرڈرلی ۔

اسی طرح اسٹیشن ۔ ٹکٹ ۔ ریل ۔ پولس وغیرہ صدہا لفظ ہیں کہ خاص و عام سے بڑھ کر عورتوں کی زبان تک پہنچ گئے ہیں ۔ اور جو الفاظ دفتروں اور کچہریوں میں صاحب لوگوں کے ملازم بولتے ہیں اگر سب لکھے جائیں تو ایک ڈکشنری بن جائے ۔

اُردو نے خود بھی ایجادی تصرف کئے

ہر زبان کے فصحا کا قاعدہ ہے کہ اپنی زبان میں تصرفات لطیف سے کچھ ایجاد کر کے نئے الفاظ اور اصطلاحیں پیدا کرتے ہیں ۔ ہماری اُردو بھی اس میدان میں کسی سے پیچھے نہیں رہی ۔ ان اصطلاحوں کی بنیاد اگرچہ اتفاقی پڑتی ہے مگر ان لوگوں کی طبیعت سے ہوتی ہے جو علم کے ساتھ فکرِ عالی ۔ طبیعت براق ۔ ذہن پر ایجاد ۔ اور ایجاد دل پذیر رکھتے ہیں ۔ انہی کے کلام کو خاص و عام کے دلوں میں بھی اثر ہوتا ہے کہ بات سب کے دلوں کو بھلی لگتی ہے ۔ اور اسے اختیار کرتے ہیں ۔ مثلاً :۔

گھوڑے کا رنگ جسے ہندوستان میں سُرنگ اور پنجابی میں چمپا ۔ یا کگا کہتے ہیں ۔ فارسی میں اُسے کُرنگ کہتے ہیں ۔ چونکہ بھاشا میں کُ ۔ علامتِ بدی اور سُ علامت خوبی ہے ۔ اس لئے **اکبر** نے اس کا نام سُرنگ رکھا ۔

گھوڑے کی اندھیری کا نام اُجیالی رکھا کہ نیک شگون ہے ۔

خاکروب کو حلال خور کا خطاب بھی اسی ذرہ نواز بادشاہ کا بخشا ہوا ہے ۔ جہانگیر کی رنگیلی طبیعت نے شراب کا نام رام رنگی رکھا اور اس کو فارسی کے اشعار میں بھی باندھا ۔ طالب آملی ۔

نہ ایم مُنکرِ صہبا و لیک میگوئیم　　　که رام رنگیِ ما نشۂ دگر دارد

سنگترہ کو اس کی خوبی و خوش رنگی کے سبب سے محمد شاہ نے رنگترہ کہا۔

بلبل ہندوستان کا گُلدم نام رکھا۔

ہار کے لفظ کو بدشگون سمجھ کر پھلمال کہلوایا۔

شاہ عالم نے سرخاب کو بھی گُلسرہ کہا۔ مگر اس نے رواج نہ پایا۔

نواب سعادت علی خاں مرحوم نے ملائی کا نام بالائی رکھا کہ لکھنؤ میں عام اور دلّی وغیرہ میں کم رائج ہے۔ مذاق سلیم دونوں کے لطف میں امتیاز کر سکتا ہے۔

بھاشا کی ساخت کو دیکھو کہ ہر ایک زبان کے ملاپ کے لئے کیسی ملنسار طبیعت رکھتی ہے۔ نظم و نثر پر غور سے نظر کرو اس نے اپنے مہمان کے لئے فقط لفظوں ہی میں جگہ خالی نہیں کی بلکہ بہت سے الفاظ و خیالات جو کہ ملکی خصوصیت عربی فارسی سے رکھتے تھے وہ بھی لے لئے۔ چنانچہ بہادری کا میدان رستم و سام کو دیا۔ حالانکہ یہاں وہ بھیم اور ارجن کا حق تھا۔ سودا کہتے ہیں ؎

رستم رہا زمین پہ نہ سام رہ گیا　　　مردوں کا آسماں کے تلے نام رہ گیا

رستم سے بھلا کہہ تو سر تیغ تلے دھر دے　　　پیارے یہ ہمیں سے ہو ہر کارے و ہر مردے

حُسن و جمال کے شبستان میں لیلی و شیریں آگئیں۔ اور جب وہ آئیں تو رانجھے کی جگہ مجنوں و فرہاد کیوں نہ آتے۔ مجنوں و فرہاد کی آنکھوں سے گنگا جمنا تو بہ نہیں سکیں مجبور۔ جیحوں۔ سیحوں۔ ہندوستان میں آگئے۔ ہماچل اور بندھیاچل کو چھوڑ کر کوہ بیستوں قصر شیریں کوہ الوند سے سر پھوڑتے ہیں۔ مگر جب کوئی خوش طبع چاہتا ہے تو یہیں کے پھولوں سے بھی یہاں کے مکان سجا دیتا ہے اور وہ عجیب بہار دیتے ہیں۔

محاورات اور اصطلاحات کے ترجمے ہوگئے

ایک زبان کے محاورہ کو دوسری زبان میں ترجمہ کرنا جائز نہیں مگر ان دونوں زبانوں میں ایسا اتحاد ہو گیا کہ یہ فرق بھی اُٹھ گیا اور اپنے کارآمد خیالوں کے

ادا کرنے کے لئے دل پذیر اور دل کش اور پسندیدہ محاورات جو فارسی میں دیکھے گئے انھیں کبھی بجنسہ اور کبھی ترجمہ کر کے لیا۔ مثلاً بر آمدن اور بسر آمدن ہندی میں اس کا ترجمہ لفظی ڈھونڈیں تو نہیں ہے۔ مگر اہل زبان نے نہایت خوبصورتی کے ساتھ تضمین کر لیا اور سودا نے کہا۔ سودا ؎

اس دل کی تفت آہ سے کب شعلہ بر آئے ۔۔۔ بجلی کو دمِ سرد سے جس کے حذر آئے

افعی کو یہ طاقت ہے کہ اس سے بسر آئے ۔۔۔ وہ زلفِ سیہ اپنی اگر لہر پہ آئے

در آمدن یعنی گھُس آنا۔ سودا ؎

یاں تک ؔ دل آزارِ خلائق ہو کہ کوئی ۔۔۔ ئل کر لہو مُنہ سے صفِ محشر میں در آئے

عرق عرق شدن اور آب شدن۔ ذوق ؎

آگ دوزخ کی بھی ہو جائے گی پانی پانی ۔۔۔ جب یہ عاصی عرقِ شرم میں تر جائیں گے

حرف آمدن اور دل خوں شدن ؎

حرف آئے مجھ پہ دیکھئے کس کس کے نام سے ۔۔۔ اس درد سے عقیق کا دل خوں یمن میں ہے

سید انشا۔ ع لب وہ کہ لعل کے بھی نگینہ پہ حرف ہے

چشمک زدن۔ ذوق ؎

لب پر ترے پسینہ کی بوند اے عقیق لب ۔۔۔ چشمک زنی کرے ہے سُہیلِ یمن کے ساتھ

پیمانہ پُر کردن۔ مار ڈالنا۔ سودا ؎

ساقی چمن میں چھوڑ کے مجھ کو کدھر چلا ۔۔۔ پیمانہ میری عمر کا ظالم تو بھر چلا

دامن افشاندہ برخاستن۔ بیزار ہو کر اٹھ کھڑے ہونا۔ سودا ؎

کیا اس چمن میں آن کے جائے گا کوئی ۔۔۔ دامن تو میرے سامنے گل جھاڑ کر چلا

از جامہ بیروں شدن۔ سودا ؎

نکلا پڑے ہے جامہ سے کچھ ان دنوں قبیب ۔۔۔ تھوڑے ہی دم دلاسے میں اتنا اُبھر چلا

کب صبا آئے ترے کوچہ سے اے یار کہ ہیں ۔۔۔ ذوق ۔۔۔ جوں حباب لبِ جو جامہ سے باہر نہ ہوا

فلکش خبر ندارد - یہ محاورہ بھی اہل ہند کا نہیں کیونکہ یہاں آکاس ہے فلک نہیں ہے۔ اہل ہند اس کا مضمون کیوں باندھتے مگر سودا کہتے ہیں ؎

تجھ رخ میں ہے جو لطف ملک کو خبر نہیں   خورشید کیا ہے اس کے فلک کو خبر نہیں

دل از دست رفتن - بے اختیار ہو جانا۔ سودا کا مصرع ہے ؎

ہاتھ سے جاتا رہا دل دیکھ محبوباں کی چال

دل دادن - عاشق ہونا۔ ظفر ؎

دل دے کے تم کو جان پہ اپنی بری بنی   شیریں کلامی آپ کی میٹھی چھری بنی

میر صاحب - ع ایسا نہ ہو دل دادہ کوئی جاں سے گزر جائے

از جاں گزشتن - جان پر کھیل جانا۔ ظفر کا شعر ہے ؎

وہاں جائے وہی جو جان سے جائے گزر پہلے

از سر چیزے گزشتن - دست بردار ہونا - سید انشا

خدا کے واسطے گزرا میں ایسے جینے سے

ذوق علیہ الرحمۃ ؎

پہنچیں گے رہگزر یار تلک کیونکر ہم   پہلے جب تک نہ دو عالم سے گزر جائیں گے

آصف الدولہ ؎

تو اپنے شیوۂ جور و جفا سے مت گذرے   تری بلا سے مرا دم رہے رہے نہ رہے

سودا ؎

چاہے تجھ چشم کے آگے جو ہو بادام سفید   کھینچ کر پوست کرے گردش ایام سفید

سفید شدن پوست کشیدن بھی فارسی کا محاورہ ہے جس کا ترجمہ انھوں نے کر لیا ہے اردو میں کھال اتارنا۔ ناسخ ؎

بھاگئی کون سی وہ چیز بتوں کی ہم کو   نہ کمر رکھتے ہیں ظالم نہ دہن رکھتے ہیں

یہ حقیقت میں لفظی ترجمہ فارسی محاورہ کا ہے کہ نہ کمر دارند - نہ دہن دارند۔

ہندی کا محاورہ بھی ہے کہ نہ کمر ہے نہ دہن ہے +

بعض جگہ اصل اصطلاح فارسی کی لے کر اس پر اپنے شعر کی بنیاد قائم کی ہے۔ مثلاً

خواجہ میر درد — تر دامن اصطلاح فارسی میں پُر گناہ ہے دیکھو اُسی کی بنیاد پر کیا مضمون پیدا کیا ہے ؎

تردامنی پہ شیخ ہمارے نہ جائیو — دامن نچوڑ دیں تو فرشتے وضو کریں

ذوق۔ ع کہ میری تردامنی کے آگے عرق عرق پاک دامنی ہے

چراغ سحری۔ بیمار جاں بلب ہے ؎

ٹک میر جگر سوختہ کی جلد خبر لے — کیا یار بھروسا ہے چراغِ سحری کا

اور دیکھو اُردو فارسی دو محاوروں کو کس خوبصورتی سے ترکیب دیا ہے ؎

آشیانے میں میر بُلبل کے — آتشِ گُل سے رات پھول پڑا[1]

پُنبہ دہن یعنی کم گو۔ زبان دراز۔ بے ادب پُر گو۔ اُستاد مرحوم نے ساقی نامہ میں کہا ؎

شیشۂ مے کی یہ دراز زباں — اُس پہ ہے یہ ستم کہ پنبہ دہاں

شیشہ کے منہ میں سے عرق یا شربت وغیرہ نکلتے وقت جو دھار بندھتی ہے اُسے اصطلاح فارسی میں زبان شیشہ کہتے ہیں +

آتش زیرہ پا بے قرار۔ موئے آتش دیدہ جیسے آگ کی سینک پہنچی ہو ؎

بسکہ ہوں غالبؔ اسیری میں بھی آتش زیر پا — موئے آتش دیدہ ہے حلقہ مری زنجیر کا

مردن چراغ۔ کشتن چراغ۔ چراغ کے بُجھنے اور بُجھانے کو کہتے ہیں۔ اُسی سے شمع مُردہ۔ چراغ۔ دیکھنا ذوق مرحوم نے کس لطف سے جان ڈالی ہے ؎

از قصیدہ — شمع مُردہ کے لئے ہے دمِ عیسیٰ آتش — سوزشِ عشق سے مُردہ ہوں محبت کے قتیل

از غزل — داغِ دل فسردہ یہ پھاہا نہیں۔ نہ ہو — کام اس چراغ مُردہ کو کیا ہے کفن کے ساتھ

کمرِ کوہ اور دامن کوہ سے بھی دیکھو کیا مضمون نکالا ہے۔ ذوق علیہ الرحمۃ

[1] دلّی والوں کا محاورہ ہے اگر رات کو کہیں آگ لگتی تھی تو اصلی لفظوں میں تعبیر کرنا بدشگونی سمجھتے تھے۔ کنایۃً ادا کرتے تھے اور کہتے تھے کہ دیکھنا کہیں پھول پڑا ہے +

حاضر ہیں جلو میں ترے وحشی کے ہزاروں   باندھے ہوئے کہسار بھی دامن کو کمر سے

گردنِ مینا۔ آتش نے کیا خوب مضمون نکالا ہے ؎

ہر شب شبِ برات ہے ہر روز روزِ عید   سوتا ہوں ہاتھ گردنِ مینا میں ڈال کے

دستِ سبو۔ خواجہ وزیر نے کس خوبصورتی سے اس کا ترجمہ کیا ہے ؎

ہوں وہ میکش گر نہ آیا میکدہ میں ایک دن   ہر سبو نے ہاتھ پھیلائے دعا کے واسطے

سوسن دہ زباں۔ فارسی والوں کا خیال ہے۔ میر وزیر علی صبا کہتے ہیں ؎

کھولا بہار نے جو کتب خانۂ چمن   سوسن نے دس ورق کا رسالہ اُٹھا لیا

سرو کو آزاد فارسی والوں نے کیا تھا۔ کہ بہار و خزاں اور ثمر اور بے ثمری کی قید سے آزاد ہے۔ ذوق مرحوم اس بنیاد پر فرماتے ہیں ؎

پا بہ زنجیر آب جو کی موج میں سب سرو ہیں   کیسی آزادی۔ کہ یاں یہ حال ہے آزاد کا

قافلہ نکہتِ گل۔ سید انشا نے کیا خوب ترجمہ کیا ؎

جو ٹھنڈی ٹھنڈی چلی ہے اے آہ   چھانو تاروں کی چل نکل تو

گلوں کی نکہت کا قافلہ بھی   چمن سے ہے لاد پھاند نکلا

آسمان زمین کے قلابے ملانے۔ بھی ایجاد اہل اُردو کا ہے ذوق ؎

قلابے آسمان و زمیں کے نہ تو ملا   اُس بُت سے کوئی ملنے کی ناصح بتا صلاح

طوفان باندھنا۔ بھی انہی کا ایجاد ہے۔ ہندی میں نہ تھا ؎

اشک آئے نہیں مژگاں پہ کہ یاروں نے ابھی   پانی سوئیزہ دیا باندھ کے طوفان چڑھا

بعض محاورے آئے مگر پھر متروک ہو گئے

بعض فارسی کے محاورے یا اُن کے ترجمے ایسے تھے کہ میرو مرزا وغیرہ استادوں نے لئے مگر متاخرین نے چھوڑ دیئے۔ چنانچہ فارسی کا محاورہ ہے۔

تر آمدن۔ یعنی شرمندہ شدن۔ میر صاحب کہتے ہیں ؎

کھلنے میں ترے منہ کی کلی پھاڑے گریباں   آگے ترے رخسار کے گل برگ تر آوے

تو گوئی۔ میر حسن اس کا ترجمہ فرماتے ہیں۔ ع کہے تو کہ خوشبوئیوں کے بھاڑ+

ایک اور موقع پر کہتے ہیں۔ ع

کہے تو کہ دریا تھا اک نور کا میرؔ ؎

اب کوفت سے ہجراں کی جہاں تن پہ رکھا ہاتھ جو درد و الم تھا سو کہے تو کہ یہیں تھا

نمود کردن بمعنے ظہور کردن بھی فارسی کا محاورہ تھا ؎

نمود کر کے وہیں بحر غم میں بیٹھ گیا کہے تو میر بھی اک بلبلہ تھا پانی کا

حیف آناں یا حیف کسانیکہ۔ میر صاحب ؎

حیف وے جن کے وہ اس وقت میں پہنچا جس وقت اُن سکنے حال اشاروں سے بتایا نہ گیا

اب اگر کہیں گے تو یہ کہیں گے کہ حیف ہے اُن لوگوں کے حال پر جن کے پاس تو گیا اور وہ بچارے اشارے سے بھی حال نہ کہہ سکے۔ کنے۔ ہندی ہے مگر اب متروک ہے۔

بے تہی۔ یعنی کم مایگی۔ میر صاحب کا شعر ہے ؎

اس زمانہ کی تری سے لہر بحر اگلی نہیں بے تہی کرنے لگے دریادلوں کے حوصلے

خوشم نمی آید۔ مجھے بھلا نہیں لگتا۔ میر صاحب فرماتے ہیں ؎

ناکامی صد حسرت خوش لگتی نہیں ورنہ اب جی سے گزر جانا کچھ کام نہیں رکھتا

خوشا بحال کسانیکہ۔ میر صاحب فرماتے ہیں ؎

احوال خوش انھوں کا ہم بزم ہیں جو تیرے افسوس ہے کہ ہم نے واں کا نہ بار پایا

داغ ایں حسرت ام۔ میر صاحب کہتے ہیں ؎

داغ ہوں رشک محبت سے کہ اتنا بیتاب کس کی تسکیں کے لئے گھر سے تو باہر نکلا

ایکہ یا اے آنکہ۔ میر صاحب نے کہا ہے ؎

اے تو کہ یاں سے عاقبت کار جائیگا غافل نہ رہ کہ قافلہ یکبار جائیگا

ایک قصیدۂ مدحیہ کے مطلع ثانی میں سوداؔ کہتے ہیں ؎

اے تو کہ کار جنّ و بشر تجھ سے ہے رواں تیری وہ ذات جس سے دو عالم ہے کامراں

فارسی میں۔ بیا امر کا صیغہ شعر کے اوّل میں لاتے ہیں اور وہ بہت مزا دیتا ہے ؎

بیا کہ گریۂ من آں قدر زمیں نگزاشت   کہ تو در فراق تو خاکے بسر تواں کردن

عرفی- بیا کہ بادلم آں می کند پریشانی   کہ غمزۂ تو نکردہ است با مسلمانی

میاں رنگین اس کا ترجمہ کرتے ہیں ؎

آ تجھ بغیر مملکتِ دل اُجاڑ ہے   چھاتی پہ رات ہجر کی کالا پہاڑ ہے

دستے دریں کار دارد یعنی وہ اس کام میں واقفیت یا مہارت رکھتا ہے۔ سودا ؎

کون ایسا ہے جسے دست ہو دل سازی میں   شیشہ ٹوٹے تو کریں لاکھ ہنر سے پیوند

او دہن ایں کار ندارد۔ سودا نے کہا ؎

نہیں ہے بحث کا طوطی ترا دہن مجھ سے   سخن تو دیکھ ہے رنگیں ترا چمن مجھ سے؟

گوش کردن۔ سُننا۔ سودا نے ترجمہ کیا ؎

کب اس کو گوش کرے تھا جہاں میں اہل کمال   یہ سنگ ریزہ ہوا ہے دُرِ عدن مجھ سے

بو کردن- سونگھنا۔ سودا نے ترجمہ کیا ؎

دیکھوں نہ کبھی گل کو ترے مُنہ کے میں ہوتے   سنبل کے سوا زلف تری بو نہ کروں میں

اور میر صاحب نے اس سے بڑھ کر کہا ؎

گل کو محبوب ہم قیاس کیا   فرق نکلا بہت جو باس کیا

خوابم بُرد یا خوابم در ربود یعنی مجھے نیند آگئی۔ جُرأت ؎

کل وہاں سے آتے ہی جو ہمیں خواب لیگیا   دیکھا تو پھر وہیں دلِ بیتاب لے گیا

ہند کا محاورہ نیند آتی ہے۔خواب کا لے جانا محاورہ نہیں -

زنجیر کردن ۔قید کرنا۔ سید انشا ؎

سودا زدہ دل ہے تو یہ تدبیر کریں گے   اس زلف گرہ گیر سے زنجیر کریں گے

خاک بر سر کردن۔ سودا نے ترجمہ کر دیا ؎

تو ہی کچھ اپنے سر پہ نہ یہاں خاک کر گئی   شبنم بھی اس چمن سے صبا چشم تر گئی

ہندی میں۔ سر پر خاک ڈالنی کہتے ہیں ؎

اس سے بڑھ کر یہ کہ بعض رسمیں اور ٹوٹکے جو ایران اور توران میں ہوتے تھے اُس کے اشارے اُردو میں کرنے لگے۔ سودا ؎

دِوانہ اِن لٹوں کا ہوں قسم ہے رُوحِ مجنوں کی　　نہ مارو مجھ کو چوبِ گل۔ بغیر از بید کی چھڑیاں

میر اور سودا کے حال میں ان مطالب کی توضیح کی ہے۔

داغِ جنوں۔ اُستاد مرحوم عالمِ طفولیت کی ایک غزل میں فرماتے ہیں ؎

دیوانہ ہوں تیرا مجھے کیا کام کہ لوں گل　　زیبائش سر کو ہے مرے داغ جنوں گل

اور میر صاحب مثنوی میں کہتے ہیں ؎

سر تا پا آشفتہ دماغی　　داغِ جنوں وے جس پہ چراغی

ولایت میں رسم ہے کہ قلعہ کے محاصرہ میں یا ایک لشکر سے دوسرے لشکر میں جب قاصد کا پہنچنا ممکن نہیں ہوتا تو خط کا پُرزہ تیر میں باندھ کر پھینکتے ہیں۔ چنانچہ میر و سودا نے اُسے اُردو میں باندھا ہے ؎

میر　نامہ جو وہاں سے آئے ہے سو تیر میں بندھا　　کیا دیجئے جواب اجل کے پیام کا

سودا　نہ تھا پیکاں پہ کیا جوہر جو نامہ تیر پر لکھا　　اشارہ قتل کا قاتل نے کس تقصیر پر لکھا

اگرچہ ان باتوں پر فصاحت کے اصول عامّہ کے بموجب بہت اعتراض ہوئے مگر احتراز نہ ہوئے کیونکہ بولنے والوں کی نسلیں اور اصلیں اور گھر اور گھرانے فارسی سے شیر و شکر ہو رہے تھے۔ جتنا اس کا دخل زیادہ ہوتا تھا اتنا ہی مزہ زیادہ ہوتا تھا۔ اور آج دیکھتے ہیں تو اور ہی رنگ ہے۔ ہمارے قادر الکلام انشا پرداز ترجمے کر کے انگریزی کے خیالوں کے چربے اُتارتے ہیں۔ اور ایسا ہی چاہئے۔ جہاں اچھا پھول دیکھا چُن لیا اور دستار نہیں تو کوٹ میں زیب گریباں کر لیا۔ ہمارے انشا پردازوں نے جب دیکھا کہ فارسی والوں نے اپنی قادر سخنی کے زور یا ظرافتِ طبع کے شور سے عربی ترکیبوں کا استعمال کیا ہے تو انھوں نے بھی اپنے پیارے ملک کی زبان کو اس نمک سے بے لطف نہ چھوڑا۔ سودا فرماتے ہیں ؎

عربی ترکیبیں ظرافت طرز کر

ع   جیسے کہتا ہے کوئی ہو ترا صَفاً صَفا

سید رضی خاں رضی مرحوم نے کیا خوب کہا ع

تری وہ مثل ہے کہ اے رضی نہ اِلیٰ الّذی نہ اُلیٰ الّذی

ہند کی تشبیہیں جاتی رہیں۔ فارس اور عرب کی تشبیہیں اور خیالات انکی جگہ قابض ہو گئے۔

دونوں زبان کے باب تشبیہات میں ایک نکتہ کہے بغیر مجھ سے آگے نہیں بڑھا جاتا یعنی مختلف افراد انسان کے طبائع پر غور کرو کہ ہزاروں کوس پر پڑے ہوں۔ اور مختلف طبیعت کے ملکوں میں ہوں لیکن چونکہ طبیعت انسانی متحد ہے اس لئے دیکھو ان کے خیالات کس قدر ملتے جُلتے ہوتے ہیں۔ چنانچہ یہاں بالوں کی تعریف میں ناگوں کے لہرانے اور بھونروں کے اُڑنے سے تشبیہ دیتے تھے۔ فارسی میں بھی زلف کی تشبیہ سانپ کے ساتھ آئی ہے۔ اس لئے اُردو میں سانپ رہے۔ مگر بھونرے اُڑ گئے۔ اور اس کی جگہ مشک۔ بنفشہ۔ سنبل۔ ریحاں آ گئے جو کبھی یہاں دیکھے بھی نہیں مگر عرب کا سادہ مزاج فصیح اپنی نیچر کا حق ادا کرتا ہے۔ اور زلف کو کوٹلے سے تشبیہ دیتا ہے۔ سانولی رنگت کی تعریف میں شام برن اور میگھ برن کہتے تھے۔ اس سے کھلتا رنگ ہوتا تو چنبک برنی کہتے تھے۔ اب سمن رنگ اور سیم رنگ کے الفاظ حُسن کو بہار دیتے ہیں مگر چندر مُکھ اور ماہ رُخ مشترک ہے۔

آنکھ کی تعریف میں یہاں مرگ کی آنکھ اور کنول کے پھول اور ممولا کی اچپلاہٹ سے تشبیہ دیتے تھے۔ اُردو میں آہو چشم رہے مگر ممولے ہوا ہو گئے اور کنول کی جگہ ساغر لبریز اور نرگس شہلا آ گئی جو کسی نے یہاں دیکھی بھی نہ تھی۔ بلکہ ترک چشم۔ شمشیر نگاہ سے قتل کرنے لگے +

رفتار کے لئے بھاشا میں ہتنی اور ہنس کی چال ضرب المثل ہے۔ اب ہنس کے ساتھ ہاتھی بھی اُڑ گیا۔ فقط کبک دری۔ شور محشر اور فتنۂ قیامت نے آفت برپا کر رکھی ہے +

بھاشا میں ناک کی تشبیہ طوطہ کی ناک سے تھی۔ اب زنبق کی کلی سے تشبیہ دیتے

ہیں۔ آتش کا شعر ہے ؎

توڑنے والے گل زنبق کے ہیں کاٹنے والے چمن کی ناک کے

فارسی والوں نے کمر کی نزاکت میں بڑی باریکیاں نکالی ہیں۔ مگر سنسکرت نے بھی اپنی جگہ مبالغہ میں کچھ کمی نہیں کی۔ چنانچہ آنکھوں کی تعریف میں ایک شاعر نے کہا۔ گوشے ان کے کانوں سے جا ملے تھے۔

پہلے یہاں ہُوا یا ابر یا ہنس کو قاصد کہتے تھے۔ انھوں نے نسیم اور صبا کو قاصد رکھا۔

بلکہ نالہ اور آہ اور اشک سے بھی پیغام رسانی کا کام لیا۔ اُستاد مرحوم کا شعر ہے ؎

نالہ ہے ان سے بیاں درد جدائی کرتا کام قاصد کا ہے یہ تیر ہوائی کرتا ہے

ظفر:۔ ظفر گر نہیں ہے کوئی نامہ بر تم آنسو ہی اپنا روانہ کرو

سودا:۔ قاصدِ اشک آ کے خبر کر گیا قتل کوئی دل کا نگر کر گیا

فارسی والے طفل اشک باندھتے تھے۔ انھوں نے بھی اسے لڑکا بنایا۔ اور دیکھو استاد مرحوم نے اس کے لئے دامن کیا خوب تیار کیا ہے۔ ع

طفل اشک ایسا گرا دامانِ مژگاں چھوڑ کر

اور ظفر نے کہا۔ ع کیا ہی شریر لڑکے یہ اوپر تلے کے ہیں

اور معروف نے کہا ہے ؎

ابھی سے نام خدا کر نے قاصدی نکلا یہ طفل اشک بڑا پاؤں کا بلی نکلا

بیاں کیا کروں اشک کی ابتری کا یہ لڑکا بداطوار پیدا ہوا ہے

فارسی عربی الفاظ ہندی میں داخل کر رہے تھے۔ اور ہندی لفظ فارسی میں

نہ سمجھنا کہ فارسی زبان ہندی میں تصرف حاکمانہ ہی کرتی رہی نہیں اُسے بھی یہاں کے الفاظ لئے بغیر چارہ نہیں ہوا۔ چنانچہ جو الفاظ فارسی اور سنسکرت کے اصلیت میں متفق ہیں اُن سے قطع نظر کر کے کہتا ہوں کہ سلاطین چغتائیہ کے دفتروں میں صدہا لفظ ہندی کے تھے جو کہ فارسی عبارتوں میں بے تکلف مستعمل

ہوتے تھے اور اب بھی عہد مذکور کی تواریخوں میں موجود ہیں +

مثلاً جھروکہ درشن اور پھول کٹارہ اور کھپوۂ مرصع۔ جہانگیر بادشاہ اپنی توزک میں لکھتا ہے کہ میرا بھائی شاہ مراد کوہستان فتح پور سیکری میں پیدا ہوا تھا۔ اسی واسطے میرے والد اُسے پہاڑی راجہ کہا کرتے تھے اور آرام بانو بیگم میری چھوٹی بہن کو بہت پیار کرتے تھے۔ اور اکثر مجھ سے کہتے تھے کہ "بابا بجہت خاطر من بایں خواہر خود کہ لاڈلہ من است بعد از من باید بروشے سلوک کنی کہ من بُود می کنم۔ ناز او برداشتہ۔ بے ادبی و شوخی ہائے اورا بگزرانی۔ اسی کتاب سے معلوم ہوتا ہے کہ شاہجہان بچپن میں اکبر کو شاہ بابا اور جہانگیر کو شاہ بھائی کہا کرتا تھا۔

اسی طرح شعرانے اپنے تصرفات رنگین کے ساتھ اشعار فارسی کو رونق دی ہے۔ امیر خسرو چھ سو برس پہلے کہتے ہیں۔ ع

بنشستہ چوں در پالکی نہ چرخ کہار آمدہ

قران السعدین میں کہتے ہیں ؎

خان کرہ چھوسے کشور کشا ‏ کز لب شاہاں گرہ دارد بپا

اور دہلی کی یاد میں ایک جگہ کہتے ہیں ؎

اے دہلی و اے بتانِ سادہ ‏ پگ بستہ و چیرہ کج نہادہ

مہر آں دو چشم گردم کہ چو ہندوانِ رہزن ‏ ہمہ را بنوک مژگاں زدہ بر جگر کٹارہ

عرفی درچاشت گہ از شبنمِ گل گرد فشانست ‏ آں باد کہ در ہند اگر آید جگر آید

سیر گشتم ز کچرے ایام ‏ ہوسِ سیم و زر نمی دارم

ظہوری سپہر از سر اندیش در حساب ‏ ز چو کھنڈیش سایہ بر آفتاب

اشرف چو کھنڈیٔ شکوہش اگر سایہ افگند ‏ فیلِ سپہر شانہ بدوزد بزیر پا

طغرا شوخ سوسن را بگو دل میر باید تشقہ آتش ‏ ذات رجپوت است ترسم دست بر جمدھر کند

پان خوردہ بمن دادہ اُگال آں بُتِ ہندی ایں بوسہ بہ پیغام چہ رنگیں مزہ دارد

شود چہرۂ زرد خورشید آل دہندشں اگر نازنیناں اُگال

اور نثر میں بادشاہ کے لئے کیا خوب کہا ہے "بارِ جگت گردئ عالم بر خود گرفتہ"

فارسی کے استعاروں اور تشبیہوں نے آکر کیسا زبان کا رنگ بدل دیا

بیان مذکورۂ بالا سے تمہیں اجمالاً معلوم ہوگیا کہ اُردو کا درخت اگرچہ سنسکرت اور بھاشا کی زمین میں اُگا مگر فارسی کی ہَوا میں سرسبز ہوا ہے۔ البتہ مشکل یہ ہوئی کہ بیدل اور ناصر علی کا زمانہ قریب گزر چکا تھا۔ اور اُن کے معتقد باقی تھے۔ وہ استعارہ اور تشبیہ کے لطف سے مست تھے۔ اس واسطے گویا اُردو بھاشا میں استعارہ و تشبیہ کا رنگ بھی آیا اور بہت تیزی سے آیا۔ یہ رنگ اگر اسی قدر آتا کہ جتنا چہرہ پر اُبٹنے کا رنگ یا آنکھوں میں سُرمہ۔ تو خوشنمائی اور بینائی دونوں کو مفید تھا۔ مگر افسوس کہ اُس کی شدت نے ہماری قوتِ بیان کی آنکھوں کو سخت نقصان پہنچایا۔ اور زبان کو خیالی باتوں سے فقط توہُمات کا سوانگ بنادیا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ بھاشا اور اُردو میں زمین آسمان کا فرق ہوگیا۔ چاہتا ہوں کہ دونوں کے نمونے آمنے سامنے رکھ کر اُن کے فرق دکھاؤں۔ مگر اس سے پہلے دو تین باتیں خیال میں رکھنی چاہئیں۔ اوّل تو شاعرانہ اُردو کا نوجوان جس نے فارسی کے دودھ سے پرورش پائی۔ اُس کی طبیعت میں بہت سے بلند خیالات اور مبالغہ مضامین کے ساتھ وہ حالات۔ اور مُلکی رسمیں اور تاریخی اشارے آگئے جو فارس اور ترکستان سے خاص تعلق رکھتے تھے اور بھاشا کے طبعی مخالف تھے۔ ساتھ اس کے فارسی کی نزاکت اور لطافت طبعی کے سبب سے اُردو کے خیالات اکثر پیچیدہ ہو گئے کہ بچپن سے ہمارے کانوں میں پڑتے اور ذہنوں میں جمتے چلے آتے ہیں۔ اس لئے ہمیں مشکل نہیں معلوم ہوتے۔ ان پڑھ انجان یا غیر زبان والا انسان سُنتا ہے تو منہ دیکھتا رہ جاتا ہے کہ یہ کیا کہا۔ اس لئے اُردو پڑھنے والے کو واجب ہے کہ فارسی کی انشا پردازی سے ضرور آگہی رکھتا ہو۔

نکتۂ دقیق

فارسی اور اُردو کی انشا پردازی میں جو دشواری ہے اور ہندی کی انشا میں آسانی ہے۔ اس میں ایک باریک نکتہ غور کے لائق ہے وہ یہ ہے کہ بھاشا زبان جس شے کا بیان کرتی ہے اُس کی کیفیت ہمیں اُن خط و خال سے سمجھاتی ہے جو خاص اسی شے کے دیکھنے۔ سُننے۔ سونگھنے۔ چکھنے یا چھونے سے حاصل ہوتی ہے۔ اس بیان میں اگرچہ مبالغہ کے زور یا جوش و خروش کی دھوم دھام نہیں ہوتی۔ مگر سُننے والے کو جو اصل شے کے دیکھنے سے مزہ آتا وہ سننے سے آجاتا ہے۔ برخلاف شعرائے فارس کے کہ یہ جس شے کا ذکر کرتے ہیں صاف اسی کی برائی بھلائی نہیں دکھادیتے بلکہ اس کے مشابہ ایک اور شے جسے ہم نے اپنی جگہ اچھا یا بُرا سمجھا ہوا ہے اُس کے لوازمات کو شے اوّل پر لگا کر ان کا بیان کرتے ہیں۔ مثلاً پھول کہ نزاکت رنگ اور خوشبو میں معشوق سے مشابہ ہے۔ جب گرمی کی شدّت میں معشوق کے حُسن کا انداز دکھانا ہو تو کہیں گے مارے گرمی کے پھول کے رخساروں سے شبنم کا پسینہ ٹپکنے لگا۔ اور اُسی رنگ میں شاعر کہتا ہے۔ خواجہ وزیر۔ وزیرؔ

ہوں وہ بلبل جو کرے ذبح خفا ہو کر ۔۔۔ روح میری گلِ عارض میں رہے بو ہو کر

تنبیہ فرو دلی

یہ تشبیہیں اور استعارے اگر پاس پاس کے ہوں اور آنکھوں کے سامنے ہوں تو کلام میں نہایت لطافت اور نزاکت پیدا ہوتی ہے لیکن جب دور جا پڑیں اور بہت باریک پڑ جائیں، تو دقّت ہو جاتی ہے۔ چنانچہ ہمارے نازک خیال کسی بادشاہ کے اقبال اور عقل کے لئے اس قدر تعریف پر قناعت نہیں کرتے کہ وہ اقبال میں سکندر یونانی اور عقل میں ارسطو کے ثانی ہے۔ بلکہ بجائے اس کے کہتے ہیں کہ اگر اس کا ہمائے عقل۔ اوج اقبال سے سایہ ڈالے۔ تو ہر شخص کشور دانش و دولت کا سکندر اور ارسطو ہو جائے۔ بلکہ اگر اس کے سینہ میں دلائل عقلی کا دریا جوش مارے تو طبقۂ یونان کو غرق کردے۔

اوّل تو ہما کی یہ صفت خود ایک بے بنیاد فرض ہے اور وہ بھی اسی ملک کے ساتھ خاص ہے۔ اس پر اقبال کا ایک فلک الافلاک تیار کرنا اور اس پر نقطۂ اوج کا دریافت کرنا دیکھئے۔ وہاں اُن کے فرضی ہما کا جانا دیکھئے۔ پھر زمین پر اُس خیالی آسمان کے نیچے ایک تدبیر کا یونان بسانا دیکھئے۔ پھر اس فرضی ہُما کی برکت کا اس قدر عام کرنا دیکھئے جس سے دنیا کے جاہل اس خیالی یونان میں جاکر ارسطو ہو جائیں +

دوسرے فقرے میں اوّل تو علمائے ہند نے تنور سے طوفان کا نکلنا مانا ہی نہیں ہے اس پر طبقۂ یونان کا اپنے فلسفہ کی تہمت میں تباہ ہونا وغیرہ وغیرہ۔ ایسی باتیں اور روایاتیں ہیں کہ اگرچہ ہمارے معمولی خیالات ہوں۔ مگر غیر قوم بلکہ ہمارے بھی عام لوگ اس سے بے خبر ہیں۔ اس لئے بے سمجھائے نہ سمجھیں گے اور جب بات کو زبان سے کہہ کر سمجھانے کی نوبت آئی تو لطف زبان کُجا اور یہ نہیں تو تاثیر کُجا مزا وہی ہے کہ آدھی بات کہی آدھی مُنہ میں ہے۔ اور سننے والا پھڑک اُٹھا۔ تار باجا اور راگ بوجھا۔ ان خیالی رنگینیوں اور فرضی لطافتوں کا نتیجہ یہ ہوا کہ جو باتیں بدیہی ہیں اور محسوسات میں عیاں ہیں۔ ہماری تشبیہوں اور استعاروں کے ہیچ در ہیچ خیالوں میں آکر وہ بھی عالم تصور میں جا پڑتی ہیں۔ کیونکہ خیالات کے ادا کرنے میں ہم اوّل اشیائے بے جان کو جاندار بلکہ اکثر انسان فرض کرتے ہیں۔ بعد اس کے جانداروں اور عاقلوں کے لئے جو باتیں مناسب حال ہیں۔ ان بیجانوں پر لگا کر ایسے ایسے خیالات پیدا کرتے ہیں۔ جو اکثر ملک عرب یا فارس یا ترکستان کے ساتھ قومی یا مذہبی خصوصیت رکھتے ہیں +

فارسی کے خیالات جو غیر زبان کے لوگوں کی سمجھ سے بہت دور ہیں

مثلاً رات کو اہل صحبت کے جلسہ میں اوّل تو ساقی[1] کا آنا واجب ہے۔

محفل شبستان کے خیالات

[1] ساقی عربی لفظ ہے اور ایسا ہے جس کے لئے ہندی لفظ ہے ہی نہیں۔ اس کا سبب یہ ہے کہ اُس ملک میں ساقی اور دور جام کی رسم نہیں تھی۔ اس لئے ان کے خیالات بھی نہیں تھے +

پھر معشوق بجائے ایک نازنین عورت کے پریزاد لڑکا ہو۔ اس کی پیشانی اور رخسارہ سے نور صبح روشن ہے۔ مگر زلف کی شام بھی برابر مشک افشاں ہے۔ صراحی کبھی سرکشی کرتی ہے۔ اسی لئے جگر خون ہو کر ٹپکتا ہے۔ کبھی جھکتی ہے اور خندۂ قلقل سے ہنستی ہے۔ کبھی وہی قلقل۔ حق حق ہو کر یاد الٰہی میں صرف ہوتی ہے۔ مگر پیالہ اپنے کھلے منہ سے ہنستا ہے اور اس کے آگے دامن بھی پھیلاتا ہے۔ فلک تیر حوادث کا ترکش اور کمان کہکشاں لگائے کھڑا ہے۔ مگر عاشق کا تیر آہ اس کے سینہ کے پار جاتا ہے۔ پھر بھی زُحل منحوس کی آنکھ نہیں پھوٹتی۔ کہ عاشق کی صبح مُراد روشن ہو۔ یہاں کی محفل میں شمع[1] برقعِ فانوس میں تاج زر سر پر رکھے کھڑی ہے۔ اس لئے پروانہ کا آنا بھی واجب ہے۔ وہ عاشقِ زار آتے ہی جل کر خاک ہو جاتا ہے۔ چراغ کو ہنساتے ہیں اور شمع[1] کو عاشق کے غم میں رُلاتے ہیں۔ وہ باوفا عشق کے تپ میں سراپا جلتی ہے۔ اُس کی چربی گُھل گُھل کر بہتی ہے۔ مگر پائے استقامت اس کا نہیں ٹلتا۔ یہاں تک کہ سفیدۂ سحری کبھی آکر کافور دیتا ہے اور کبھی تباشیر۔ شمع[1] کا دل اس لئے بھی گداز ہے کہ شبِ زندگی کا دامن بہت چھوٹا ہے۔ لیکن صبح دونوں کے ماتم میں گریبان چاک کرتی ہے۔ عاشق بادہ خوار کے لئے مرغ سحر بڑا موذی ہے۔ اس کے ذبح کو ہمیشہ تیغ زبان تیز رہتی ہے۔ بادِ سحر قاصد خجستہ گام ہے کہ پیغام یار کا بہت جلد لاتا اور لے جاتا ہے۔ اسی عالم میں آفتاب کبھی تو پنجۂ شعاع سے آنکھ ملتا سر برہنہ۔ حجرۂ مشرق سے نکلتا ہے۔ کبھی فلک کے سبزہ گھوڑے پر سوار کرن کا تاج زرنگار سر پر چمکاتا شفق کا پھریرا اُڑاتا آتا ہے۔ کیونکہ اپنے حریف شاہ انجم کی فوج کو پریشان کر کے فتحیاب آیا ہے +

---

[1] شمع عربی میں بمعنی موم ہے۔ پھر موم بتی کو کہنے لگے۔ فارس میں آکر چربی کی بھی بننے لگی۔ مگر نام شمع ہی رہا۔ ہند میں چربی ناپاک ہے۔ اس لئے شمع تھی نہ اسکا نام۔ مرغ سحر کے ذبح کا مضمون بھی وہیں کا ہے +

گل و گلزار کے خیالات

ان ہی بنیادوں پر جب گلزار کی شگفتگی - یا باغ کی بہار دکھائی ہو تو ایسے خیالات میں دکھائیں گے کہ شاہدِ گل کے کان میں قاصد صبا کچھ ایسا افسوں پھونک گیا کہ وہ مارے ہنسی کے فرش سبزہ پر لوٹ گیا۔ طفل غنچہ مسکرا کر اپنے عاشق بلبل شیدا کا دل لبھاتا ہے۔ کبھی خزاں کا غارت گر آتا ہے تو گل اپنا جام اور غنچہ اپنی صراحی لے کر روانہ ہو جاتے ہیں - اسی طرح ہمارے باغ میں بہار خود ایک معشوق ہے۔ اس کا چہرہ چمن ہے۔ گل رخسار ہیں۔ سنبل بال ہیں۔ بنفشہ زلف ہے۔ نرگس آنکھیں ہیں۔ وغیرہ وغیرہ +

پھر بہار موسم جوانی ہے - درخت جوانان چمن ہیں کہ عروسانِ گلشن سے گلے مل مل کر خوش ہوتے ہیں - شاخیں انگڑائیاں لیتی ہیں - تاک کا سیہ مست پڑا اینڈتا ہے - اطفال نبات دایہ بہار کی گود میں پرورش پاتے ہیں - خضر سبزہ کی برکت سے نسیم سحری مردۂ ہزار سالہ میں دمِ عیسوی کا کام دیتی ہے مگر بلبل زار عشق شاہدِ گل میں اُداس ہے۔ آبِ رواں عمرِ گزراں ہے۔ اُس کی موج کی تلوار سے دل کٹتے جاتے ہیں۔ سرو کے عکس کا اژدہا نگلے جاتا ہے۔ شبنم کے آنسو جاری ہیں۔ بلبل کبھی خوش ہے کہ گل اس کا پیارا پاس ہنس رہا ہے کبھی افسردہ ہے کہ خزاں کا خونریز ان سب کو قتل کرے گا۔ یا اس کے دشمن یعنی گلچین و صیّاد اُسے یہاں سے نکالیں گے۔ سرو یا شمشاد کے عشق میں قمری کا گیروا لباس ہے۔ اس کے نالہ کا آرہ دلوں کو چیرتا ہے۔ کبھی عاشقِ زار بھی وہیں آ نکلتا ہے - وہ بجائے اپنے معشوق کے حسرت و غم سے ہمکنار ہے۔ روتا ہے اور قاصد صبا کو پیغام دیتا ہے کہ میرے تغافل شعار کو ذرا میرے حال کی خبر کر دینا +

ملکی قصوں اور داستان کے اشارے بھی فارس ہی کے آ گئے

بیان مذکورۂ بالا سے معلوم ہوا ہوگا کہ ان میں بہت سی باتیں ایسی ہیں جو خاص فارس اور ترکستان کے ملکوں سے طبعی اور ذاتی تعلق رکھتی ہیں۔ اس کے علاوہ بعض

خیالات میں اکثر ان داستانوں یا قصوں کے اشارے بھی آگئے ہیں جو خاص ملک فارس سے علاقہ رکھتے تھے۔ مثلاً بجائے عورت کے لڑکوں کا عشق۔ ان کے خط کی تعریف شمشاد۔ نرگس۔ سنبل۔ بنفشہ۔ موے کمر۔ قد سرو وغیرہ کی تشبیہیں لیلی۔ شیریں۔ شمع۔ گل۔ سرو وغیرہ کا حسن۔ مجنوں۔ فرہاد۔ بلبل۔ قمری پروانہ کا عشق فانوس کا برقع۔ غازہ اور گلگونہ۔ مانی و بہزاد کی مصوری۔ رستم و اسفندیار کی بہادری زحل کی نحوست۔ سہیل یمن کی رنگ افشانی۔ مشاہیر فارس و یونان اور عرب کے قصے۔ راہ ہفتخواں۔ کوہ الوند۔ کوہ بے ستون۔ جوئے شیر۔ قصر شیریں۔ جیحوں۔ سیحوں وغیرہ وغیرہ۔ ہر چند یہ سب معاملات عرب اور فارس سے متعلق ہیں۔ مگر اُردو میں بہت سے خیالات اُنہی کی بنیاد پر نظم و نثر میں پیدا ہوتے ہیں +

تعجب

تعجب یہ ہے کہ ان خیالوں نے اور وہاں کی تشبیہوں نے اس قدر زور پکڑا کہ ان کے مشابہ جو یہاں کی باتیں تھیں۔ اُنھیں بالکل مٹا دیا۔ البتہ سودا اور سید انشا کے کلام میں کہیں کہیں ہیں۔ اور وہ اپنے موقع پر نہایت لطف دیتی ہیں +

افسوس

غرضکہ اب ہماری انشاپردازی ایک پرانی یادداشت اُن تشبیہوں اور استعاروں کی ہے کہ صدہا سال سے ہمارے بزرگوں کی دستمال ہو کر ہم تک میراث پہنچی ہیں +

ہمارے متاخرین کو نئی آفریں لینے کی آرزو ہوئی تو بڑا کمال یہ ہے کہ کبھی صفت بعد صفت۔ کبھی استعارہ در استعارہ سے۔ اُسے اور تنگ و تاریک کیا جس سے ہوا تو یہ ہوا کہ بہت غور کے بعد فقط ایک وہمی نزاکت اور فرضی لطافت پیدا ہو گئی۔ کہ جسے محالات کا مجموعہ کہنا چاہئے۔ لیکن افسوس یہ ہے کہ بجائے اسکے کہ کلام ان کا خاص و عام کے دلوں پر تاثیر کرے۔ وہ مستعد لوگوں کی طبع آزمائی کے لئے ایک دقیق معمہ اور عوام کے لئے عجیب گورکھ دھندا تیار ہو گیا۔ اور جواب ان کا یہ ہے کہ کوئی سمجھے تو سمجھے۔ جو نہ سمجھیں وہ اپنی جہالت کے حوالے +

بھاشا کے باغ کی بہار دیکھو

اب اس کے مقابلے میں دیکھو۔ بھاشا کا انشاپرداز برسات میں اپنا باغ کو نکر

لگا تا ہے۔ درختوں کے جھنڈ چھائے ہیں۔ گھن کے پتے ہیں۔ انکی گہری گہری چھاؤں ہے۔ جامن کی ٹہنیاں آم کے پتوں میں کھچڑی ہو رہی ہیں۔ کھرنی کی ٹہنیاں فالسے کے درخت میں پھیلی ہوئی ہیں۔ چاندنی کی بیل کمرک کے درخت پر لپٹی جاتی ہے۔ عشق پیچہ گگرونده پر چڑھا جاتا ہے۔ اس کی ٹہنیاں لٹکتی ہیں جیسے سانپ لہرا رہے ہیں۔ پھولوں کے گچھے پڑے جھوم رہے ہیں۔ میوے دانے زمین کو چوم رہے ہیں۔ نیم کے پتوں کی سبزی اور پھولوں کی سفیدی بہار پر ہے۔ آم کے بور میں اس کے پھولوں کی مہک آتی ہے۔ بھینی بھینی تو جی کو بھاتی ہے۔ جب درختوں کی ٹہنیاں ہلتی ہیں۔ مولسری کے پھولوں کا مینھ برستا ہے۔ پھل پھلاری کی بوچھاڑ ہو جاتی ہے۔ دھیمی دھیمی ہوا اُن کی بو باس میں بسی ہوئی۔ روشوں پر چلتی ہے۔ ٹہنیاں ایسی ہلتی ہیں جیسے کوئی جوبن کی متوالی اٹھکیلیاں کرتی ہوئی چلی جاتی ہے۔ کسی ٹہنی میں بھونرے کی آواز۔ کسی میں مکھیوں کی بھنبھناہٹ الگ ہی سماں باندھ رہی ہے۔ پرند درختوں پر بول رہے ہیں۔ اور کلول کر رہے ہیں۔ حوض میں چادر اس زور سے گرتی ہے کہ کان پڑی آواز نہیں سنائی دیتی۔ اس سے چھوٹی چھوٹی نالیوں میں پانی لہراتا جاتا ہے تو عجیب بہار دیتا ہے۔ درختوں سے جانور اُترتے ہیں۔ نہاتے جاتے ہیں۔ آپس میں لڑتے جاتے ہیں۔ پروں کو پھڑاتے ہیں اور اُڑ جاتے ہیں۔ چرند زمین پر چوکڑیاں بھرتے پھرتے ہیں۔ ایک طرف سے کوئل کی کوک۔ ایک طرف سے کوکلے کی آواز اسی جمگھٹ میں عاشق مصیبت زدہ بھی کہیں اکیلا بیٹھا جی بہلا رہا ہے اور اپنی جدائی کے دُکھ کو مزے لے لے کر اُٹھاتا ہے +

برکھارت کی بہار دیکھو

برسات کا سماں باندھتے ہیں تو کہتے ہیں۔ سامنے سے کالی گھٹا جھوم کر اُٹھی۔ ابر دھواں دھار ہے۔ بجلی کوندتی چلی آتی ہے۔ سیاہی میں سارس اور بگلوں کی سفید سفید قطاریں بہاریں دکھا رہی ہیں۔ جب بادل کڑکتا ہے اور بجلی چمکتی ہے تو پرندے کبھی دبک کر ٹہنیوں میں چھپ جاتے ہیں۔ کبھی دیواروں سے لگ

جاتے ہیں۔ مور جُدا جھنگارتے ہیں۔ پپیہے الگ پکارتے ہیں۔ محبت کا متوالا چنبیلی کے جُھرمٹ میں آتا ہے تو ٹھنڈی ٹھنڈی ہوا لہک کر پھوار بھی پڑنے لگی ہے۔ مست ہو کر وہیں بیٹھ جاتا ہے۔ اور شعر پڑھنے لگتا ہے۔

شام کا سما دیکھو

جب ایک شہر کی خوبی بیان کرتے ہیں تو کہتے ہیں۔ شام ہوتے ایک مقام پر پہنچا۔ دیکھتا ہے کہ پہاڑیاں ہری بھری ہیں۔ اردگرد سبز سبز میدانوں میں بسے ہوئے گاؤں آباد ہیں۔ پہاڑ کے نیچے ایک دریا میں نرمل جل بہہ رہا ہے جیسے موتی کی آب۔ بیچوں بیچ میں شہر آباد۔ جب اس کے اونچے اونچے مکانوں اور برجیوں کا عکس پڑتا ہے تو پانی میں کلسیاں جگمگ جگمگ کرتی ہیں اور دوسرا شہر آباد نظر آتا ہے۔ لبِ دریا کے پیڑ بوٹوں اور زمین کی سبزی کو برسات نے ہرا کیا ہے کہ دودھیلیں گایوں اور بکریوں کا چارہ ہو جائے +

رات کی اداسی کا سما دیکھو

جب اُداسی اور پریشانی کا عالم دکھلاتے ہیں تو کہتے ہیں کہ آدھی رات اِدھر آدھی رات اُدھر۔ جنگل سنسان۔ اندھیر بیابان۔ مرگھٹ میں دور دور تک راکھ کے ڈھیر۔ جلے ہوئے لکڑ پڑے ہیں۔ کہیں کہیں چتا میں آگ چمکتی ہے۔ بھوتوں پریتوں کی ڈراؤنی صورتیں اور بھیانک مورتیں ہیں۔ کوئی تاڑ سا قد۔ لال لال دیدے پھاڑے۔ لمبے لمبے دانت نکالے گلے میں کھوپریوں کی مالا ڈالے کھڑا ہنس رہا ہے۔ کوئی ایک ہاتھی کو بغل میں مارے بھاگا جاتا ہے۔ کوئی ایک کالا ناگ ککڑی کی طرح کھڑا چبا رہا ہے۔ پیچھے غل ہوتا چلا آتا ہے کہ لیجیو لیجیو۔ ماریو ماریو۔ جانے نہ پائے۔ دم بھر میں یہ بھوت پریت غائب ہوتے ہیں۔ غل شور تھمتا ہے۔ پھر مرگھٹ کا میدان سنسان ہے۔ پتّے ہوا سے کھڑکتے ہیں۔ ہوا کا سناٹا۔ پانی کا شور۔ اُلّو کی ہوک۔ گیدڑوں کا بولنا اور کتّوں کا رونا یہ ایسی وحشت ہے کہ پہلے ڈر بھی بھول جاتے ہیں +

دونوں زبانوں کی انشاپردازی کا مقابلہ

دیکھو یہ دونوں باغ آمنے سامنے لگے ہیں۔ تم نے مقابلہ کیا؟ دونوں کے

رنگ ڈھنگ میں کیا فرق ہے؟ بھاشا کا فصیح استعارہ کی طرف بھول کر بھی قدم نہیں رکھتا۔ جو جو لطف آنکھوں سے دیکھتا ہے اور جن خوش آوازیوں کو سنتا ہے۔ یا جن خوشبوؤں کو سونگھتا ہے اُنہی کو اپنی میٹھی زبان سے بے تکلف بے مبالغہ صاف صاف کہہ دیتا ہے +

ہندی کی انشا پردازی بھی مبالغہ میں اپاہج نہیں

لیکن یہ سمجھنا کہ ہندوستان میں مبالغہ کا زور تھا ہی نہیں۔ سنسکرت کا انشا پرداز ذرا بگڑ جائے تو زمین کے ماتھے پر پہاڑ تیوری کے بل ہو جائیں۔ اور وہاں غار پتھروں سے دانت پیسنے لگیں۔ ان مضامین کو دیکھ کر اوّل ہمیں وہ عام قاعدہ یاد آتا ہے کہ ہر ملک کی انشا پردازی۔ اپنے جغرافیئے اور سرزمین کی صورتِ حال کی تصویر بلکہ رسم و رواج اور لوگوں کی طبیعتوں کا آئینہ ہے۔ سبب اس کا یہ ہے کہ جو کچھ شاعر یا انشا پرداز کے پیش نظر ہوتا ہے۔ وہی اس کی تشبیہوں اور استعاروں کا سامان ہوتا ہے (۲) معلوم ہوتا ہے کہ جس طرح ایران۔ خراسان اور توران زمین میں بہار کا موسم دلوں کو شگفتہ کرتا ہے۔ یہاں برسات کا موسم دلوں میں ذوق و شوق پیدا کرتا ہے۔ وہاں بہار میں بلبلِ ہزار داستان ہے۔ یہاں کوئل اور پپیہا ہے۔ برج بھاشا کے انشا پرداز برسات کے لطف اور اسکی کیفیتیں بہت خوب دکھاتے ہیں۔ جہانگیر نے اپنی توزک میں سچ کہا ہے کہ ہندوستان کی برسات ہماری فصل بہار ہے۔ اور کوئل یہاں کی بلبل ہے۔ اس موسم میں عجیب لطف سے بولتی ہے۔ اور مستیاں کرتی ہے۔ بہار کے موسم کا کچھ لطف یہاں ہے تو بسنت رُت کا سماں ہے۔ جس میں ہولی کے رنگ اُڑتے ہیں۔ پچکاریاں چھٹتی ہیں۔ گلال کے قمقمے چلتے ہیں۔ وہ باتیں نہیں جو فارسی والے بہار کے سینے پر کرتے ہیں +

فارسی کی انشا پردازی کا شکریہ

بہر حال ہمیں اپنے بزرگوں کی اس صنعت کا شکریہ ہی کرنا چاہئے۔ کہ ہندی بھاشا میں جو اضافت کی طوالت۔ کا۔ کے۔ کی سے ادا ہوئی۔ وہ فارسی کی

اضافت میں آکر مختصر ہو گئی۔ اس کے علاوہ استعارہ و تشبیہ جو بھاشا میں شاید اس سبب سے کم لاتے تھے۔ کہ وہ کتاب یا انشاپردازی کی زبان نہ تھی۔ یا اس سبب سے کہ برابر کا اور کے کے آنے سے کلام بدمزہ ہوجاتا تھا۔ اسی طرح بہت تشبیہ میں بھی لفظوں کے بڑھانے سے کلام مرتبۂ فصاحت سے گرجاتا تھا۔ اب انھوں نے فارسی کو اس میں داخل کرکے استعارہ و تشبیہ سے مرصع کردیا۔ جس سے وہ خیالوں کی نزاکت۔ اور ترکیب کی پختگی۔ اور زور کلام۔ اور تیزی وطراری میں بھاشا سے آگے بڑھ گئی۔ اور بہت سے نئے الفاظ اور نئی ترکیبوں نے زبان میں وسعت بھی پیدا کی +

استعاروں اور تشبیہوں کی شدت نے ادائے مطلب اور اظہار اصلیت کی طاقت کھودی۔

اس فخر کے ساتھ یہ افسوس پھر بھی دل سے نہیں بھولتا کہ انھوں نے ایک قدرتی پھول کو جو اپنی خوشبو سے مہکتا اور رنگ سے لہکتا تھا۔ مفت ہاتھ سے پھینک دیا۔ وہ کیا ہے؟ کلام کا اثر۔ اور اظہار اصلیت ہمارے نازک خیال اور باریک بین لوگ استعاروں اور تشبیہوں کی رنگینی اور مناسبتِ لفظی کے ذوق شوق میں خیال سے خیال پیدا کرنے لگے۔ اور اصلی مطالب کے ادا کرنے میں بے پروا ہوگئے۔ انجام اس کا یہ ہوا کہ زبان کا ڈھنگ بدل گیا۔ اور نوبت یہ ہوئی کہ اگر کوشش کریں تو فارسی کی طرح پنج رقعہ اور مینا بازار یا فسانۂ عجائب لکھ سکتے ہیں۔ لیکن ایک ملکی معاملہ یا تاریخی انقلاب اس طرح نہیں بیان کرسکتے جس سے معلوم ہوتا جائے کہ واقعہ مذکور کیونکر ہوا اور کیوں کر اختتام کو پہنچا۔ اور اُس سے پڑھنے والے کو ثابت ہو جائے کہ روئداد وقت کی اور صورت حال معاملہ کی ایسی ہو رہی تھی۔ کہ جو کچھ ہوا اسی طرح ہو سکتا تھا۔ دوسری صورت ممکن نہ تھی۔ اور یہ تو ناممکن ہے کہ ایک فلسفہ یا حکمت اخلاق کا خیال لکھیں۔ جسکی صفائی کلام لوگوں کے دلوں کو اپنی طرف لگائے۔ اور اس کے دلائل جو حُسن بیان کے پردہ میں برابر جلوہ دیتے جاتے ہیں۔ وہ دلوں سے تصدیق کے اقرار

لیتے جائیں۔ اور جس بات سے روکنا یا جس کام پر جھوکنا منظور ہو اس میں پوری پوری اطاعت سُننے والوں سے لے سکیں۔ یہ قباحت فقط نازک خیالی نے پیدا کی کہ استعارہ و تشبیہ کے انداز۔ اور مترادف فقرے۔ تکیہ کلام کی طرح ہماری زبان قلم پر چڑھ گئے۔ بے شک ہمارے متقدمین اس کی رنگینی اور نزاکت کو دیکھ کر بھولے مگر نہ سمجھے کہ یہ خیالی رنگ ہمارے اصلی جوہر کو خاک میں ملانے والا ہے۔ یہی سبب ہے کہ آج انگریزی ڈھنگ پر لکھنے میں یا ان کے مضامین کے پورا پورا ترجمہ کرنے میں ہم بہت قاصر ہیں۔ نہیں! ہماری اصلی انشا پردازی اس رستہ میں قاصر ہے۔

انشائے انگریزی کے عام اُصول

انگریزی تحریر کے عام اُصول یہ ہیں کہ جس شے کا حال یا دل کا خیال لکھئے تو اسے اس طرح ادا کیجئے۔ کہ خود وہ حالت گزرنے سے یا اس کے مشاہدہ کرنے سے جو خوشی یا غم یا غصہ یا رحم یا خوف یا جوش دل پر طاری ہوتا۔ یہ بیان وہی عالم اور وہی سماں دل پر چھا دیوے۔

بیشک ہماری طرز بیان۔ اپنی چُست بندش اور قافیوں کے مسلسل کھٹکوں سے کانوں کو اچھی طرح خبر کرتی ہے۔ اپنے رنگین الفاظ اور نازک مضمونوں سے خیال میں شوخی کا لطف پیدا کرتی ہے۔ ساتھ اس کے مبالغۂ کلام اور عبارت کی دھوم دھام سے زمین آسمان کو تہ و بالا کر دیتی ہے۔ مگر اصل مقصود یعنی دلی اثر یا اظہار واقعیت ڈھونڈو تو ذرا نہیں۔ چند مضمون ہیں کہ ہماری زبانوں پر بہت رواں ہیں۔ مگر حقیقت میں ہم اُن میں بھی ناکام ہیں۔ مثلاً ہم اگر کسی کے حسن کی تعریف کرتے ہیں تو رشک حور اور غیرت پری پر قناعت نہ کر کے اُسے ایک پُتلا ناممکنات و محالات کا بنا دیتے ہیں۔ مگر کسی حسین کا حُسن خداداد خود ایک عالم ہے کہ جو کچھ آنکھوں سے دیکھ کر دلوں پر گزر جاتی ہے۔ دل ہی جانتے ہیں۔ بس اسی کو اس طرح کیوں نہیں ادا کر دیتے کہ سُننے والے بھی کلیجہ پکڑ کے رہ جائیں +

سجیلے جوان کا انداز

ایک بلونت جوان کی تعریف کریں گے تو رستم۔ تہمتن۔ اسفندیار۔ روئیں تن۔ شیر بیشۂ وغا۔ نہنگ قلزم ہیجا۔ وغیرہ وغیرہ لکھ کر صفحے سیاہ کر دیں گے۔ لیکن اسکی بلند گردن۔ بھرے ہوئے ڈنڑ۔ چوڑا سینہ۔ بازوؤں کی گلاوٹ۔ پتلی کمر۔ غرض خوشنما بدن اور موزوں ڈیل ڈول بھی ایک انداز رکھتا ہے۔ اس کی اپنی دلاوری اور ذاتی بہادری بھی آخر کچھ نہ کچھ ہے۔ جس کے کارناموں نے اسے اپنے عہد میں ممتاز کر رکھا ہے۔ اسی کو ایک وضع سے کیوں نہیں ادا کر دیتے جسے سُن کر مُردار خیالوں میں اکڑ تکڑ اور کملائے ہوئے دلوں میں اُمنگ پیدا ہو جائے +

گلزار کی بہار

ایک چمن کی تعریف سے کبھی فلک کے سبز باغ اور گلشن انجم کے دل پر داغ دینگے کبھی اُسے فردوس بریں اور جنات روئے زمیں بنائیں گے۔ بلکہ ایک ایک پھول اور ایک ایک پتے کی تعریف میں رنگ رنگ سے ورق سیاہ کر دیں گے۔ مگر اس کی ہریاول کا لہلہانا۔ پھولوں کا چہچہانا۔ میٹھی میٹھی خوشبوؤں کا آنا۔ آب رواں کا لہرانا۔ موزوں درختوں۔ گلزار کے تختوں کی بہار۔ ہوا کی مہک اور طوطی کی چہک پپیہے کی کوک۔ کوئل کی ہوک۔ جو کہ روحانی تفریح کے ساتھ انسان کے دل پر اثر کرتی ہے۔ اُس کا بیان اس طرح نہیں کرتے۔ جس کے پڑھنے سے آنکھوں میں سما چھا جائے۔ میدان جنگ ہو تو زمین کے طبقوں کو اُڑا کر آسمان میں تلپٹ کر دیتے ہیں۔ اور خون کے دریا ملکوں میں بہا دیتے ہیں۔ مگر اپنے موقع پر وہ تاثیر جس سے ایک بہادر کی بہادری دیکھ کر دلوں میں قوم کی ہمدردی اور رفیق پر جان نثار کرنے کا ولولہ پیدا ہو۔ وہ نہیں +

صاحب علم اور علم کی خوبیاں

دوسرے کوچہ میں آکر علم کی تعریف پر اُترتے ہیں۔ تو اس کی برکت سے پیر۔ پیغمبر ملائک۔ فرشتہ بنا دیتے ہیں۔ کاش اس کے عوض میں چند ظاہر کھُلے کھُلے فائدے بیان کر دیں۔ جس سے ہر شخص کے دل میں اس کا شوق پیدا ہو۔ اور عالم۔ جاہل سمجھ جائے کہ اگر بے علم رہوں گا تو خواری و ذلت کی زندگی سے دین و دنیا دونوں

خراب ہوں گے۔ ہماری تصنیفات میں اس کا کچھ ذکر ہی نہیں۔ اور افسوس کہ اب تک بھی ہم نے اس پر توجہ نہیں کی۔ انگریزی میں بہت خیالات اور مضامین ایسے ہیں کہ ہماری زبان نہیں ادا کر سکتی۔ یعنی جو لطف ان کا انگریزی زبان میں ہے وہ اُردو میں پورا ادا نہیں ہو سکتا۔ جو کہ حقیقت میں زبان کی نا طاقتی کا نتیجہ ہے اور یہ اہل زبان کے لئے نہایت شرم کا مقام ہے +

ہماری انشا پردازی کیوں ایسی بدحالی میں رہ گئی

اگر شائستہ قوموں کی انشا پردازی سوال کرے کہ اردو کی انشا کیوں اس حالت میں مبتلا رہی ؟ تو حاضر جوابی فوراً بول اُٹھے گی۔ کہ قوم کی انشا پردازی بموجب اس کے حالات کے ہوتی ہے اور خیالات اس کے بموجب حالات ملک اور تربیت ملکی کے ہوتے ہیں۔ جیسی ہندوستان کی تعلیم و شائستگی تھی۔ اور بادشاہوں اور امیروں کی قدر دانی تھی ویسی ہی انشا پردازی رہی۔ اور خاتمۂ کلام اس فقرہ پر ہوگا۔ کہ کوئی پرندا اپنے بازوؤں سے بڑھ کر پر نہیں مار سکتا۔ اس کے بازو فارسی سنسکرت۔ بھاشا وغیرہ تھے۔ پھر اُردو بیچاری انگلینڈ یا روم یا یونان کے محلوں پر کیونکر جا بیٹھتی۔ مگر حقیقت میں عقدہ اس سوال کا ایک اور گرہ میں بندھا ہے۔ وہ یہ ہے کہ ہر ایک شے کی ترقی کسی ملک میں اُسی قدر زیادہ ہوتی ہے جس قدر شے مذکور کو سلطنت سے تعلق ہوتا ہے۔ یورپ کے ملکوں میں قدیم سے دستور ہے کہ سلطنت کے اندرونی اور بیرونی زور قوم کے ذاتی اور علمی لیاقتوں پر منحصر ہوتے تھے۔ اور سلطنت کے کل انتظام اور اس کے سب قسم کے کاروبار۔ انہی کے شمول اور انہی کی عرق ریز تدبیروں سے قرار پاتے تھے۔ یہ بھی ظاہر ہے کہ ان کی تجویزوں کی بنیاد۔ علمی۔ اور عقلی اور تاریخی تجربہ کے ذوروں پر قائم ہوتی تھی۔ پھر لیاقت مذکورہ بھی سیکڑوں ہی میں منحصر نہیں۔ بلکہ ہزاروں میں پھیلی ہوئی تھی۔ اس میں جہان اور جہات سلطنت ہیں۔ وہاں ایک یہ بھی تھا کہ ہر امر تنقیح طلب جلسۂ عام کے اتفاق راے سے تحریروں اور تقریروں میں فیصل ہوتا

تھا۔ موقع پر جب ایک شخص جلسہ عام میں استادہ ہو کر کوئی مطلب ادا کرتا تھا تو اِدھر کی دنیا اُدھر ہو جاتی تھی۔ پھر جب طرفِ ثانی اس کے مقابل میں جواب ترکی بہ ترکی دیتا تھا۔ تو مشرق کے آفتاب کو مغرب سے طلوع کر دیتا تھا اور اب تک بھی فقط تقریروں اور تحریروں کے زور سے ہزاروں لاکھوں آدمیوں کو متفق کر کے ایک رائے سے دوسری رائے پر پھیر لیتے ہیں۔ خیال کرنا چاہئے کہ ان کے بیان میں کیسی طاقت اور بیان میں کیا کیا زور ہوں گے۔ برخلاف ہندوستان کے یہاں کی زبان میں اگر ہوئے تو ایک بادشاہ کی خوش اقبالی میں چند شعراء کے دیوان ہوئے۔ جو فقط تفریح طبع اور دل لگی کا سامان ہے۔ کہاں زمین کہاں آسمان۔ نہ وہ جوہر پیدا ہوا نہ کسی نے اس کے پیدا کرنے کا ارادہ کیا۔ باوجود اس کے اُردو کی خوش اقبالی۔ اور خوش رواجی قابل رشک ہے۔ کیونکہ اس کی اصل تو برج بھاشا۔ جو اپنی بہار جوانی میں بھی فقط ایک ضلع میں یعنی دیس کی زبان تھی۔ خود اُردو دلّی سے نکلی۔ جس کا چراغ دلّی کی بادشاہت کے ساتھ گل ہونا چاہئے تھا۔ پھر بھی اگر یوں بیچ ہندوستان میں کھڑے ہو کر آواز دیں کہ اس ملک کی زبان کیا ہے تو جواب یہی سُنیں گے کہ **اُردو**۔ اس کے ایک کنارے مثلاً پشاور سے چلو تو اوّل افغانی ہے۔ اٹک اُترے تو پوٹھواری کچھ اور ہی کہتے ہیں۔ جہلم تک داہنے پر کشمیر پکار رہا ہے کہ یوروؔ لا۔ یوروؔ لا۔ یعنی ادھر آؤ۔ بائیں پر ملتان کہتا ہے کتھے گھنیا یعنی کہاں چلے۔ آگے بڑھے تو وہ بولی ہے کہ پنجابی خاص اسی کو کہتے ہیں۔ اس کے بائیں پر پہاڑی ایسی زبان ہے کہ تحریر تقریر سب سے الگ ہے۔ ستلج اُتریں تو پنجابیت کی کمی سے لوگوں کی وضع و لباس میں بھی فرق شروع ہوتا ہے۔ دلّی پہنچے تو اور ہی سماں بندھا ہوا ہے۔ میرٹھ سے بڑھے تو علیگڈھ میں بھاشا سے ملا جلا پورب کا انداز شروع ہو گیا۔ کانپور۔ لکھنؤ سے الہ آباد تک یہی عالم ہے۔

اُردو کی خوش اقبالی

جنوب کو ہٹیں تو مارواڑی ہو کر گجراتی اور دکھنی ہو جاتی ہے۔ پھر ادھر آئے تو آگے بنگالہ ہے۔ اور کلکتہ پہنچ کر تو عالم گوناگوں خلق خدا۔ اور ملک خدا ہے۔ جس کا امتیاز حد اندازہ سے باہر ہے۔ میرے دوستو تم جانتے ہو ہر شے کی اصلیت اور حُسن و قبح کے واسطے ایک مقام پر ایسا ہوتا ہے جیسے سکّہ کے لئے ٹکسال۔ کیا سبب ہے کہ ابتدا میں زبان کے لئے دلّی ٹکسال تھی۔ وجہ اس کی یہ ہے کہ وہ دارالخلافہ تھی۔ دربار ہی میں خاندانی اُمرا اور امیرزادے خود صاحبِ علم ہوتے تھے۔ ان کی مجلسیں اہلِ علم اور اہلِ کمال کا مجمع ہوتی تھیں۔ جن کی برکت سے طبیعتیں گویا ہر شے کے سلیقے اور شائستگی اور لطافت و ظرافت کا قالب ہوتی تھیں۔ اسی واسطے گفتگو۔ لباس۔ ادب آداب۔ نشست برخاست۔ بلکہ بات بات ایسی سنجیدہ اور پسندیدہ ہوتی تھی۔ کہ خواہ مخواہ سب کے دل قبول کرتے تھے۔ ہر شے کے لئے ہمیشہ نئی نئی تراش اور نئی نئی اصلاحیں اور ایجاد و اختراع وہاں سے ہوتے تھے۔ اور چونکہ دارالخلافہ میں شہر شہر کا آدمی موجود تھا۔ اس لئے وہ دلپذیر ایجاد اور اصلاحیں ہر شہر میں جلد عام ہو جاتی تھیں۔ چنانچہ بہادر شاہ سے پہلے تک دلّی ہر بات کی سند رہی۔ اور انہی صفتوں سے لکھنؤ نے بھی سندِ افتخار حاصل کی۔ لکھنؤ کو دیکھ کر سمجھ لو۔ کہ دلپسند ایجادوں۔ اور رنگین باتوں کا ایجاد ہونا کسی شہر کے اینٹ پتھر کی تاثیر نہیں ہے۔ ہاں شائستہ اور رنگین مزاج لوگ جہاں جمع ہوں گے۔ اور دلپذیر باتوں کے سامان موجود ہوں گے۔ وہیں سے پھول کھلنے لگیں گے۔ چنانچہ وہی دلّی کے لوگ اور ان کی اولاد تھی۔ کہ جب تباہیِ سلطنت اور آبادیِ لکھنؤ کے سبب سے وہاں پہنچے تو چند روز میں ویسی ہی تراشیں وہاں سے نکلنے لگیں۔ لکھنؤ دارالسلطنت ہو گیا۔ اور اس کے ضمن میں زبان بھی دلّی کی اطاعت سے آزاد ہو گئی۔ اس آزادی کی تاریخ۔ آتش۔ ضمیر۔ خلیق وغیرہ اہلِ کمال نے بنیاد ڈالی۔ اور انیس۔ دبیر۔ رند

خواجہ۔ وزیر۔ اور سرور نے خاتمہ کر دیا۔ انھوں نے زبان کو بڑی ترقی دی۔ مگر اکثر ان میں ایسے ہوئے کہ جنگل کے صاف کرنے کو اُٹھے تھے۔ مگر اس میں دریا کا دہانہ لا ڈالا۔ یعنی صفائی زبان کی جگہ لغات کی بوچھاڑ کر دی۔ یہاں تک کہ لکھنؤ کا ورق بھی زمانہ نے اُلٹ دیا۔ اب آفتاب ہماری ملکۂ آفاق کا نشان ہے۔ جسے حکم نہیں کہ ان کی قلمرو کے خط سے باہر حرکت کر سکے۔ ڈاکوں اور ریل گاڑیوں نے پورب سے پچھم تک دوڑ کر بھانت بھانت کا جانور ایک پنجرے میں بند کر دیا۔ دلّی برباد۔ لکھنؤ ویران۔ دونوں کے سندی اشخاص کچھ پیوند زمین ہو گئے۔ کچھ دربدر خاک بسر۔ اب جیسے اور شہر ویسے ہی لکھنؤ۔ جیسے چھاؤنیوں کے بازار۔ ویسی ہی دلّی۔ بلکہ اس سے بھی بدتر۔ کوئی شہر ایسا نہیں رہا۔ جس کے لوگوں کی زبان عموماً سند کے قابل ہو۔ کیونکہ شہر میں ایسے چیدہ اور برگزیدہ اشخاص جن سے کہ وہ شہر قابل سند ہو۔ صرف گنتی کے لوگ ہوتے ہیں اور وہ زمانہ کی صدہا سالہ محنتوں کا نتیجہ ہوتے ہیں۔ اُن میں سے بہت مر گئے۔ کوئی بڈھا جیسے خزاں کا مارا پتا کسی درخت پر باقی ہے۔ اس بڈھے کی آواز کیٹوں کے غُل اور اخباروں کے نقار خانوں میں سنائی بھی نہیں دیتی۔ پس اگر دلّی کی زبان کو سندی سمجھیں تو وہاں کے ہر شخص کی زبان کیونکر سندی ہو سکتی ہے۔ ہوا کا رُخ اور دریا کا بہاؤ نہ کسی کے اختیار میں ہے نہ کسی کو معلوم ہے کہ کدھر پھرے گا۔ اس لئے نہیں کہہ سکتے کہ اب زبان کیا رنگ بدلے گی ہم بھی جہاز بے ناخدا ہیں۔ توکل بخدا کر بیٹھے ہیں۔ زمانہ کے انقلابوں کو رنگ چمن کی تبدیلی سمجھ کر دیکھتے ہیں اور کہتے ہیں۔ آزاد سے

ہماری زبان کا آئندہ کیا رنگ ہوگا

قسمت میں جو لکھا تھا سو دیکھا ہے اب تلک
اور آگے دیکھئے ابھی کیا کیا ہیں دیکھنے

نظمِ اُردو کی تاریخ

فلاسفہ یونان کہتے ہیں کہ شعر خیالی باتیں ہیں۔ جن کو واقعیت اور اصلیت سے کوئی تعلق نہیں۔ قدرتی موجودات۔ یا اس کے واقعات کو دیکھ کر جو خیالات شاعر کے دل میں پیدا ہوتے ہیں۔ وہ اپنے مطلب کے موقع پر موزوں کر دیتا ہے۔ اس خیال کو سچ کی پابندی نہیں ہوتی۔ جب صبح کا نور و ظہور دیکھتا ہے۔ تو کبھی کہتا ہے۔ دیگ مشرق سے دودھ اُبلنے لگا۔ کبھی کہتا ہے دریائے سیماب موج مارنے لگا۔ کوئی مشرق سے کافور اُڑاتا آتا ہے۔ صبح نباشیر بکھیرتی آتی ہے۔ یا مثلاً سورج نکلا۔ اور کرن ابھی اس میں نہیں پیدا ہوئے۔ وہ کہتا ہے۔ سنہری گیند ہوا میں اُچھالی ہے۔ صبح طلائی تھال سر پر دھرے آتی ہے۔ کبھی مرغانِ سحر کا غل۔ اور عالم نور کا جلوہ۔ آفتاب کی چمک دمک اور شعاعوں کا خیال کر کے صبح کی دھوم دکھاتا ہے۔ اور کہتا ہے بادشاہ مشرق سبز خنگِ فلک پر سوار۔ تاج مرصع سر پر رکھے۔ کرن کا نیزہ لئے مشرق سے نمودار ہوا۔ شام کو شفق کی بہار دیکھتا ہے تو کہتا ہے۔ مغرب کے چھپر کھٹ میں آفتاب نے آرام کیا اور شنگرفی چادر تان کر سو رہا۔ کبھی کہتا ہے جامِ فلک خون سے چھلک رہا ہے۔ نہیں مغرب کے ایوان میں آگ لگ گئی۔ تاروں بھری رات میں چاند کو دیکھتا ہے۔ تو کہتا ہے لاجوردی چادر میں ستارے ٹنکے ہوئے ہیں۔ دریائے نیل میں قمر کا جہاز چلا جاتا ہے۔ اور روپے کی مچھلیاں تیرتی پھرتی ہیں۔ غرض ایسی ایسی باتیں ہیں کہ نہایت لطف دیتی ہیں۔ مگر اصلیت سے اُنھیں کچھ بھی غرض نہیں ہے۔ باوجود اس کے صنعت گاہِ عالم میں نظم ایک عجیب صنعت صنائع الٰہی سے ہے۔ اسے دیکھ کر عقل حیران ہوتی ہے کہ اوّل ایک مضمون کو ایک سطر میں لکھیں۔ اور نثر میں

پڑھتے ہیں پھر اسی مضمون کو فقط لفظوں کے پس و پیش کے ساتھ لکھ کر دیکھتے ہیں - تو کچھ اور ہی عالم ہو جاتا ہے۔ بلکہ اس میں چند کیفیتیں پیدا ہو جاتی ہیں
(۱) وہ وصف خاص ہے کہ جسے سب موزونیت کہتے ہیں ۔
(۲) کلام میں زور زیادہ ہو جاتا ہے۔ اور مضمون میں ایسی تیزی آجاتی ہے کہ اثر کا نشتر دل پر کھٹکتا ہے ۔
(۳) سیدھی سادی بات میں ایسا لطف پیدا ہو جاتا ہے کہ سب پڑھتے ہیں اور مزے لیتے ہیں۔ تجربہ سے معلوم ہوتا ہے کہ جب خوشی یا غم و غصہ یا کسی قسم کے ذوق و شوق کا خیال دل میں جوش مارتا ہے اور وہ قوت بیان سے ٹکر کھاتا ہے تو زبان سے خود بخود موزوں کلام نکلتا ہے۔ جیسے پتھر اور لوہے کے ٹکرانے سے آگ نکلتی ہے ۔ اسی واسطے شاعر وہی ہے جس کی طبیعت میں یہ صفت خداداد ہو۔ قدرتی شاعر اگرچہ ارادہ کر کے شعر کہنے کو خاص وقت میں بیٹھتا ہے۔ مگر حقیقت میں اس کا دل اور خیالات ہر وقت اپنے کام میں لگے رہتے ہیں۔ قدرت کے کارخانے میں جو چیز اُس کے حواس میں محسوس ہوتی ہے اور اُس سے کچھ اثر اس کی طبیعت اٹھاتی ہے۔ وہ ہر شخص کو نصیب نہیں۔ خواہ لطف و شگفتگی ہو۔ خواہ آزردگی یا بیزاری۔ یہ ضرور ہے کہ جو کیفیت وہ آپ اُٹھاتا ہے اس کے لئے ڈھونڈتا رہتا ہے کہ کیسے لفظ ہوں۔ اور کس طرح انھیں ترکیب دوں تاکہ جو کیفیت اس کے دیکھنے سے میرے دل پر طاری ہے وہی کیفیت سننے والوں کے دل پر چھا جائے اور وہ بات کہوں کہ دل پر اثر کر جائے ۔

شاعر کبھی ایک حجرہ میں تنہا بیٹھتا ہے۔ کبھی سب سے الگ اکیلا پھرتا ہے۔ کبھی کسی درخت کے سایہ میں تنہا نظر آتا ہے۔ اور اسی میں خوش ہوتا ہے ۔ وہ کیسی ہی خستہ حالی میں ہو مگر مزاج کا بادشاہ اور دل کا حاتم ہوتا ہے۔ بادشاہ کے پاس فوج و سپاہ۔ دفتر و دربار۔ اور ملک داری کے سب کارخانے اور سامان موجود

ہیں۔ اس کے پاس کچھ نہیں۔ مگر الفاظ اور معانی سے وہی سامان بلکہ اُس سے ہزاروں درجے زیادہ تیار کر کے دکھا دیتا ہے۔ بادشاہ مالہا سال میں کن کن خطرناک معرکوں سے ملک فتح یا خزانہ جمع کرتا ہے۔ یہ جسے چاہتا ہے گھر بیٹھے دے دیتا ہے۔ اور خود پرواہ نہیں کرتا۔ بادشاہ کو ایک ولایت فتح کر کے وہ خوشی نہیں حاصل ہوتی جو اسے ایک لفظ کے ملنے سے ہوتی ہے کہ اپنی جگہ پر موزوں سجا ہوا ہو۔ اور حق یہ ہے کہ اُسے ملک کی پرواہ بھی نہیں۔

اس بات میں جو کچھ میں نے اپنی آنکھوں سے دیکھا وہ یہ ہے کہ شیخ ابراہیم ذوق جس مکان میں بیٹھتے تھے تنگ و تاریک تھا گرمی میں دل دق ہو جاتا تھا۔ بعض قدیمی احباب کبھی جاتے تو گھبراتے اور کہتے کہ یہ مکان بدلو۔ گھڑی بھر بھی بیٹھنے کے قابل نہیں۔ تم کیوں کر دن رات یہیں کاٹتے ہو؟ وہ ہوں۔ ہاں کرتے اور چپکے ہو رہتے۔ کبھی مسکرا دیتے۔ کبھی جو غزل کہتے ہوتے۔ اُسے دیکھنے لگتے۔ کبھی ان کا منہ دیکھتے۔ خدا نے مکانات۔ باغ۔ آرام و آسائش کے سب سامان دیئے تھے مگر وہ وہیں [illegible] اور ایسے بیٹھے مر کر اُٹھے۔ اچھا ان کے قصائد اور غزلیں دیکھ لو۔ کسی بادشاہ کی سلطنت میں اس شان و شکوہ اور دھوم دھام کے سامان موجود ہیں؟ گویا سلطنت کے سامان سب انھی کا مال تھے کہ جس طرح چاہتے تھے اپنے کام میں لاتے تھے۔ جب وہ اپنے کلام کو پڑھتے تھے تو بادشاہ کو جو مالک سلطنت ہوتا ہے کچھ اُن سے زیادہ خوشی نہ ہوتی ہوگی کیونکہ اسے ان کا فکر بھی رہتا ہے۔ انھیں پرواہ بھی نہیں تھی۔

جس طرح کوئی زمین اپنی قابلیت کے موافق بے کچھ روئیدگی کے نہیں رہ سکتی اس طرح کوئی زبان اپنے اہل زبان کی حیثیت بموجب نظم سے خالی نہیں رہ سکتی۔ ہر روئیدگی کی رنگینی اور شادابی اپنی سرزمین کی خاصیت ظاہر کرتی ہے۔ زبانوں کے سلسلہ میں ہر ایک نظم اپنی زبان اور اہل زبان کی شائستگی اور تہذیب

علمی کے ساتھ لطافت طبع کے درجے دکھاتی ہے +

نظم اُردو کی ولادت

زبانِ اُردو کے ظہور پر خیال کریں اور اس کی تصنیفات پر نگاہ کریں تو اس میں نثر سے پہلے نظم نظر آئے گی اور یہ عجیب بات ہے کہ ایک بچہ پہلے شعر کے پھر باتیں کرنی سیکھے۔ ہاں۔ نظم جوش طبع تھا اس لئے پہلے نکل پڑا۔ نثر شائستگی کے بوجھ سے گراں بار تھی۔ اپنی ضرورت کے وقت ظہور کیا۔ نثر اُردو کی تصنیف ۱۱۴۵ھ سے پہلے نظر نہیں آتی البتہ نظم کی حقیقت زبانی حکایتوں اور کتابی روایتوں کی خاک چھان کر یہ نکلتی ہے کہ جب برج بھاشا نے اپنی وسعت اخلاق سے عربی فارسی الفاظ کے مہمانوں کو جگہ دی تو طبیعتوں میں اس قدرتی روئیدگی نے بھی زور کیا۔ لیکن وہ صدہا سال تک دوہروں کے رنگ میں ظہور کرتی رہی یعنی فارسی کی بحریں اور فارسی کے خیالات نہ آتے تھے +

امیر خسرو کے ایجاد اختراع

امیر خسرو نے کہ جن کی طبیعت اختراع میں اعلیٰ درجہ صنعت و ایجاد کا رکھتی تھی ملک سخن میں برج بھاشا کی ترکیب سے ایک طلسم خانہ انشا پردازی کا کھولا۔ خالق باری جس کا اختصار آج تک بچوں کا وظیفہ ہے کئی بڑی بڑی جلدوں میں تھی۔ اس میں فارسی کی بحروں نے اوّل اثر کیا اور اسی سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ اس وقت کون کون سے الفاظ مستعمل تھے جو اب متروک ہیں۔ اس کے علاوہ بہت سی پہیلیاں عجیب و غریب لطافتوں سے ادا کی ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ فارسی کے نمک نے ہندی کے ذائقہ میں کیا لطف پیدا کیا ہے۔ مکرنی۔ انمل۔ دوسخنے وغیرہ خاص ان کے آئینہ کا جوہر ہے۔ ہر ایک کی مثال لکھتا ہوں۔ کیونکہ ان سے بھی اس وقت کی زبان کا کچھ نہ کچھ پتہ لگتا ہے:۔

پہیلیاں

نبولی کی پہیلی

تر ور سے اک تریا اُتری اُس نے بہت رجھایا ۔۔۔ باپ کا اس کے نام جو پوچھا آدھا نام بتایا

آدھا نام پتا پر پیارا بوجھ پہیلی موری ۔۔۔ امیر خسرو یوں کہیں اپنے نام نبولی

آئینہ کی پہیلی

فارسی بولی آئینہ — ترکی سوچی پائی نا
ہندی بولتے آرسی آئے — منہ دیکھو جو اُسے بتلائے

ناخن کی پہیلی

بیسوں کا سر کاٹ لیا — نا مارا ناخون کیا

لال کی پہیلی

اندھا گونگا بہرا بولے گونگا آپ کہائے — دیکھ سفیدی ہوت انگارا گونگے سے بھڑ جائے
بانس کا مندر واہ کا باشا ۔ ہانسے کلوہ کھاجا — سنگ ملے تو سر پر راکھیں واہ کو راد راجا
سی سی کر کے نام بتایا ۔ تا میں بیٹھا ایک — اُلٹا سیدھا ہر پھر دیکھو وہی ایک کا ایک
بھید پہیلی میں کہی تو سن لے میرے لال — عربی ہندی فارسی تینوں کرو خیال

دلّی بلکہ ہندوستان کے اکثر شہروں میں رسم ہے کہ عام عورتیں برسات کی بہار میں کھم گڑواتی ہیں ۔ درخت ہو تو اس میں جھولا ڈلواتی ہیں مل مل کر جھولتی ہیں اور گیت گا کر جی خوش کرتی ہیں ۔ اُن میں شاید کوئی عورت ہو جو یہ گیت نہ گاتی ہو :-

جو پیا آون کہہ گئے ۔ اجہوں نہ آئے سوامی ہو ۔ اے ہو جو پیا آون کہہ گئے ۔

آون آون کہہ گئے ۔ آئے نہ بارہ ماس ۔ اے ہو جو پیا آون کہہ گئے وغیرہ وغیرہ ۔

یہ گیت بھی انہی امیر خسرو کا ہے اور بردا راگ میں نے بھی انہی کی رکھی ہوئی ہے ۔ واہ کیا زبانیں تھیں کہ جو کچھ ان سے نکل گیا ۔ عالم کو بھایا ۔ گویا زمانے کے دل پر نقش ہو گیا ۔ بنانے والوں نے ہزاروں گیت بنائے اور گانے والوں نے گلے آج ہوئے کل بھول گئے ۔ ۶ سو برس گزرے ۔ یہ آج تک ہیں اور ہر برسات میں ویسا ہی رنگ دئے جاتے ہیں ۔ اس حسنِ قبول کو خداداد نہ کہئے تو کیا کہئے ۔

بڑی بڑی عورتوں کے گانے کے لئے تو ویسے گیت تھے ۔ چھوٹی چھوٹی لڑکیوں کو پیا اور سوامی کی یاد میں اس طرح گانا مناسب نہ تھا ۔ لیکن دل میں امنگ تو وہ

بھی رکھتی تھیں۔ اُنھیں بھی فصل کی بہار منانی تھی۔ اُن کے لئے اور گیت رکھے تھے۔ چنانچہ ایک لڑکی گویا سسرال میں ہے۔ برسات کی رُت آئی وہ جھولتی ہے۔ اور ماں کی یاد میں گاتی ہے:۔

اماں میرے باوا کو بھیجو جی ۔ کہ ساون آیا ۔ یعنی مجھے آکر لے جائے
بیٹی تیرا باوا تو بڈھا ری ۔ کہ ساون آیا ۔ یعنی وہ کیونکر آسکتا ہے
اماں میرے بھائی کو بھیجو جی ۔ کہ ساون آیا
بیٹی تیرا بھائی تو بالا ری ۔ کہ ساون آیا ۔ یعنی بچہ اکیلا اتنی دور کیونکر آئے
اماں میرے ماموں کو بھیجو جی ۔ کہ ساون آیا ۔ یعنی اس کے لئے تو وہ دونوں عذر نہیں
بیٹی تیرا ماموں تو بانکا ری ۔ کہ ساون آیا ۔ بھلا وہ میری کب سُنے گا

ذرا غور کرکے دیکھو۔ باوجود علم و فضل اور اعلیٰ درجہ خیالات شاعرانہ کے جب یہ لوگ پستی کی طرف جھکتے تھے تو ایسے تہ کو پہنچتے تھے کہ زمین کی ریت تک نکال لاتے تھے۔ ان الفاظ و خیالات پر غور کرو کیسے نیچر میں ڈوبے ہوئے ہیں۔ عورتوں اور لڑکیوں کے فطری خیالات اور دلوں کے ارمانوں کو کیا اصلی اصلی طور سے ظاہر کرتے ہیں۔ مکرنیوں کا انھیں موجد کہنا چاہئے:۔

مکرنیوں کے موجد تھے

مکرنی ۱۔ سگری رین موہے سنگ جاگا ۔ بھور بھئی تب بچھڑن لاگا
اس کے بچھڑے پھاٹت ہیا ۔ اے سکھی ساجن۔ نا سکھی دیا

مکرنی ۲۔ سرب سلونا سب گُن نیکا ۔ وا بن سب جگ لاگے پھیکا
وا کے سر پر ہووے کون ۔ اے سکھی ساجن نا سکھی لون

مکرنی ۳۔ وہ آوے تب شادی ہوئے ۔ اُس بن دوجا اور نہ کوئے
میٹھے لاگے وا کے بول ۔ اے سکھی ساجن نا سکھی ڈھول

انمل

ایک کنوئیں پر چار پنہاریاں پانی بھر رہی تھیں۔ امیر خسرو کو رستہ چلتے چلتے پیاس لگی۔ کوئیں پر جاکر ایک سے پانی مانگا۔ ان میں سے ایک انھیں پہچانتی

تھی۔ اُس نے اَوروں سے کہا کہ دیکھو خُسرو یہی ہے۔ اُنھوں نے پوچھا کیا تو خسرو ہے۔ جس کے سب گیت گاتے ہیں۔ اور پہیلیاں اور مُکرنیاں اَنمل سُنتے ہیں۔ اُنھوں نے کہا ہاں۔ اس پر ایک ان میں سے بولی کہ مجھے کھیر کی بات کہہ دے۔ دوسری نے چرخہ کا نام لیا۔ تیسری نے ڈھول۔ چوتھی نے کُتّے کا۔ اُنھوں نے کہا کہ مارے پیاس کے دم نکلا جاتا ہے۔ پہلے پانی پلا دو۔ وہ بولیں جب تک ہماری بات نہ کہہ دے گا۔ نہ پلائیں گے۔ اُنھوں نے جھٹ کہا:۔

اَنمل۔ کھیر پکائی جتن سے چرخہ دیا جلا۔ آیا کتا کھا گیا۔ تو بیٹھی ڈھول بجا۔ لا پانی پلا +

اِسی طرح کبھی کبھی ڈھکوسلا کہا کرتے تھے کہ وہ بھی انہی کی ایجاد ہے:۔

ڈھکوسلا۔ بھادوں پکی پیلی۔ چوچو پڑی کپاس۔ بی مہترانی دال پکاؤ گی یا ننگا ہی سو رہوں۔

دو سخنے۔ گوشت کیوں نہ کھایا۔ ڈوم کیوں نہ گایا — گلا نہ تھا

جوتا کیوں نہ پہنا۔ سنبوسہ کیوں نہ کھایا — تلا نہ تھا

انار کیوں نہ چکھا۔ وزیر کیوں نہ رکھا — دانا نہ تھا

دو سخنے فارسی اُردو۔ سوداگر راچہ می باید۔ بوچے کو کیا چاہئے — دوکان

تشنہ راچہ می باید۔ ملاپ کو کیا چاہئے — چاہ

شکار بچہ می باید کرد۔ قوت مغز کو کیا چاہئے — بادام

موسیقی میں ان کی طبیعت ایک بین تھی کہ بن بجائے بڑی بجتی تھی۔ اس لئے دھرپت کی جگہ قول و قلبانہ بنا کر بہت سے راگ ایجاد کئے کہ ان میں سے اکثر گیت اُن کے آج تک ہندوستان کے زن و مرد کی زبان پر ہیں۔ بہار راگ اور بسنت کے میلہ نے انہی کی طبیعت سے رنگ پکڑا ہے۔ بین کو مختصر کر کے ستار بھی انہی نے نکالا ہے +

لطیفہ۔ سلطان جی صاحب کے ہاں ایک سیاح نفر مہمان آئے۔ رات کو دسترخوان پر بیٹھے۔ کھانے کے بعد باتیں شروع ہوئیں۔ سیاح نے ایسے دفتر

کھوئے کہ بہت رات گئی ختم ہی نہ ہوں۔ سلطان جی صاحب نے کچھ انگڑائیاں
کچھ جمائیاں بھی لیں۔ وہ سادہ لوح کسی طرح نہ سمجھے۔ سلطان جی صاحب
مہمان کی دل شکنی سمجھ کر کچھ کہہ نہ سکے۔ مجبور بیٹھے رہے۔ امیر خسرو بھی موجود تھے۔
مگر بول نہ سکتے تھے۔ کہ آدھی رات کی نوبت بجی۔ اس وقت سلطان جی نے کہا کہ
خسرو یہ کیا بجا؟ عرض کی آدھی رات کی نوبت ہے۔ پوچھا اس میں کیا آواز
آتی ہے؟ انھوں نے کہا۔ مجھ میں تو ایسا آتا ہے:۔

نان کہ خوردی خانہ بروہ نان کہ خوردی خانہ برو۔ خانہ برو خانہ برو۔
نان کہ خوردی خانہ برو۔ نہ کہ بدست تو کردم خانہ گرد۔ خانہ برو۔ خانہ برو

حرف حرف کی حرکت و سکون پر خیال کرو۔ ایک ایک چوٹ کو کیا پورا پورا ادا
کر رہے ہیں اور نہ کہ بدست تو کردم خانہ گرد کو دیکھو۔ اس نے کیا کام کیا +

نقل۔ ایک دن کسی کوچہ میں سے گزر ہوا۔ دُھنیا ایک دُکان میں روئی دُھنک
رہا تھا۔ کسی نے کہا کہ جس دُھنے کو دیکھو ایک ہی انداز پر روئی دُھنکتا ہے۔ سب
ایک ہی اُستاد کے شاگرد ہیں[1] کوئی بولا کہ قدرتی استاد نے سب کو ایک ہی
انداز پر سکھایا ہے۔ آپ نے کہا سکھایا ہے اور ایک حرکت میں بھی تال کو ہاتھ سے
نہیں جانے دیا۔ کوئی بولا۔ لفظوں میں کیونکر لا سکیں؟ فرمایا:۔

در پئے جاناں جاں ہم رفت۔ جاں ہم رفت۔ جاں ہم رفت۔ رفت رفت۔ جاں ہم رفت +
ایں ہم رفت و آں ہم رفت۔ آنہم رفت آنہم رفت۔ اینہم۔ آنہم۔ اینہم۔ آنہم۔ آنہم رفت +
رفتن۔ رفتن۔ رفتن دہ۔ دہ دہ رفتن دہ۔ رف رف۔ رفتن دہ ۔ رفتن دہ +

نقل۔ محلّے کے سرے پر ایک بڑھیا ساقن کی دُکان تھی چھجّو اُس کا نام
تھا۔ شہر کے بیہودہ لوگ وہاں بھنگ چرس وغیرہ پیا کرتے تھے۔ جب یہ دربار سے
پھر کر آتے یا تفریحاً گھر سے نکلتے۔ تو وہ بھی سلام کرتی۔ کبھی کبھی حقّہ بھر کر سامنے

[1] بکسر اوّل۔ واؤ مجہول +

لے کھڑی ہوئی۔ یہ بھی اس کی دل شکنی کا خیال کر کے دو گھونٹ لے لیا کرتے۔
ایک دن اس نے کہا کہ بلاؤں۔ ہزاروں غزلیں۔ گیت۔ راگ۔ راگنی بناتے ہو۔
کتابیں لکھتے ہو۔ کوئی چیز لونڈی کے نام پر بھی بنا دو۔ انھوں نے کہا بی چھجو
بہت اچھا۔ کئی دن کے بعد اس نے پھر کہا کہ بھٹیاری کے لڑکے کے لئے
خالق باری لکھ دی۔ ذرا لونڈی کے نام پر بھی کچھ لکھ دو گے تو کیا ہوگا۔
آپ کے صدقے سے ہمارا نام بھی رہ جائے گا۔ اس کے بار بار کہنے سے
ایک دن خیال آگیا کہا لو بی چھجو سنو ؎

اوروں کی چوپہری باجے چھجو کی آٹھ پہری	یعنی یہ بادشاہوں سے بھی بڑی ہیں۔
باہر کا کوئی آئے ناہیں آئیں سارے شہری	جنگلی گنواروں کا کام نہیں سفید پوش آتے ہیں۔
صاف صوف کر آگے راکھے جس میں ناہیں تو سل	پیالہ رنگ صاف مصفّی حاضر کرتی ہے جسمیں تس تنکا تک نہ ہو
اور دلّی جہاں سینک سماوے چھجو کے وہاں موسل	بھنگڑ فخریہ کہا کرتے ہیں کہ وہ ایسی بھنگ پیتا ہے

کہ جس میں گاڑھے پن کے سبب سے سینک کھڑی رہے۔ آپ مبالغہ کرتے ہیں کہ
یہ ایسی بھنگ بناتی ہے کہ جس میں موسل کھڑا رہے۔ خیر اُن کی بدولت چھجو کا بھی نام
رہ گیا۔ حق پوچھو تو جس طرح ہر جاندار کی عمر ہے اسی طرح کتاب کی بھی عمر ہے۔ مثلاً
شاہنامہ کو نو برس ہوئے۔ سکندر نامہ کو ۷ سو برس کچھو۔ گلستاں بوستاں کو ۶ سو
برس کہو۔ زلیخا کی عمر قریب ۴ سو کے ہوئی۔ مگر اب تک سب جوان ہیں۔ اردو میں باغ و بہار
بدر منیر وغیرہ جوان ہیں۔ فسانۂ عجائب جاں بلب ہو گیا۔ بہت کتابیں اوّل شہرت پاتی
ہیں پھر گمنام ہو جاتی ہیں۔ یہ گویا بچے ہی تھے کہ مر گئے۔ بہتیری تصنیف ہوتی
ہیں اور چھپتی ہیں۔ مگر کوئی نہیں پوچھتا۔ یہ بچے مرے ہوئے پیدا ہوئے ہیں۔ بعض
کتابوں کی عمریں میعاد معلوم پر ٹھیری ہوئی ہیں۔ وہ مدارس سرکاری کی تصنیفیں
ہیں۔ کیونکہ جب تک تعلیم میں داخل ہیں تب تک چھپتی ہیں۔ اور خواہ مخواہ بکتی ہیں۔

[1] بادشاہ کے ہاں اس زمانہ میں یہ چوپہری نوبت بجا کرتی تھی۔

لوگ پڑھتے ہیں۔ جب تعلیم سے خارج ہوگئیں سرگئیں۔ کوئی آنکھ اُٹھا کر بھی نہیں دیکھتا۔ ع

قبولِ خاطر و لطفِ سخن خداداداست + خدایہ نعمت نصیب کرے +

غرض اسی جوشش طبع اور ہنگامۂ ایجاد میں ایک تازہ ایجاد اور ہوا جس میں ہمارے لئے تین باتیں قابل لحاظ ہیں:۔

(۱) مضامین عاشقانہ سے وہ سلسلہ اشعار کا ہمارے ہاتھ آیا جسے غزل کہتے ہیں۔ وہی قافیے۔ یا ردیف اور قافیے دونوں کی پابندی۔ اسی طرح اوّل مطلع یا کئی مطلعے۔ پھر چند شعر۔ اخیر میں مقطع اور اس میں تخلص۔

(۲) عروض فارسی نے پہلا قدم ہندوستان میں رکھا۔

(۳) فارسی اور بھاشا کو لون مرچ کی طرح اس انداز سے ملایا ہے کہ زبان پر چٹخارا دیتی ہے اس میں یہ بات سب سے زیادہ قابل لحاظ ہے کہ انھوں نے بنیادِ عشق کی عورت ہی کی طرف سے قائم کی تھی جو کہ خاصّہ نظم ہندی کا ہے۔ مگر یہ نہیں کہہ سکتے کہ اس تعشق کا انقلاب کس وقت ہوا۔ غزل مذکور یہ ہے:۔

زحالِ مسکیں مکن تغافل۔ دُرائے نیناں بنائے بتیاں ~~ زدراہ

کہ تابِ ہجراں ندارم اے جاں۔ نہ لیہو کاہے لگائے چھتیاں

شبانِ ہجراں دراز چوں زلف و روزِ وصلت چو عمر کوتاہ

سکھی پیا کو جو میں نہ دیکھوں۔ تو کیسے کاٹوں اندھیری رتیاں

یکا یک از دل دو چشم جادو بصد فریبم ببرد تسکیں

کسے پڑی ہے جو جا سُناوے پیارے پی کوں ہماری بتیاں

چو شمع سوزاں چو ذرّہ حیراں زمہرآں مہ بگشتم آخر

نہ نیند نیناں نہ انگ چینا۔ نہ آپ آویں نہ بھیجیں پتیاں

بحق روزِ وصال دلبر کہ داد مارا فریب خسروؔ ~~ سپیت منکے ورائے راکھوں جو جائے پاؤں پیا کے کھتیاں

ابتدائے ایجاد میں ایسا ہی ہوتا ہے۔ زمانہ بتدریج اس کا اصلاح دینے والا ہے۔ پھر تراشیں دے کر اعلیٰ درجہ خوبی و خوش اسلوبی پر پہنچا لیتا ہے۔ مگر اُس وقت اس طرف کسی اور نے ایسی توجہ نہ کی کہ جس سے اس طرز کا رواج جاری ہو جاتا۔ البتہ ملک محمد جائسی نے مثنوی پدماوت کے علاوہ دوہرے اور گیت بھی لکھے اور وہ ایسے اعلیٰ رتبہ کے ہیں کہ ڈاکٹر گلگرسٹ صاحب کی تصنیف میں نہایت مدد کرتے ہیں۔ تعجب یہ ہے کہ فارسی کی بحروں میں کوئی شعر اس کا نہیں۔

دکن میں ایک سعدی گذرے ہیں ان کا فقط اتنا حال معلوم ہے کہ اپنے تئیں ہندوستان کا سعدی شیرازی سمجھتے تھے۔ اور تعجب ہے کہ مرزا رفیع سوؔدا نے اپنے تذکرہ میں اُن کے اشعار مندرجہ ذیل کو شیخ سعدی شیرازی ہی کے نام پر لکھا ہے ؎

قسقہ جو دیدم بر رخت گفتم یہ کا دت ہے — گفتا کہ در ہو باورے۔ اس شہر کی یہ ریت ہے

ہمنا تُمھن کو دل دیا۔ تم دل لیا اور دُکھ دیا — ہم یہ کیا تم وہ کیا۔ ایسی بھلی یہ پیت ہے

سعدی کہ گفتہ ریختہ۔ در ریختہ دُر ریختہ — شیر و شکر ہم ریختہ۔ ہم ریختہ ہم گیت ہے

کبیر اور تلسی داس وغیرہ کے دُہرے عالم میں زبان زد ہیں۔ مگر وہ فقط اتنی سند کے لئے کارآمد ہیں کہ اس عہد میں فارسی الفاظ کا دخل ہندوؤں کی زبان پر بھی ہو گیا تھا۔ انہیں اس نظم سے علاقہ نہیں جو فارسی سے آکر اُردو کے لباس میں ظاہر ہوئی۔ اور ملکی مالک کو بیدخل کر کے گوشہ میں بٹھا دیا۔

حامد کوئی شخص ہوئے ہیں ان کا زمانہ معلوم نہیں کہتے ہیں کہ حامد باری انہیں کی تصنیف ہے۔ ان کی فقط سات شعر کی ایک غزل دیکھی جس سے معلوم ہوتا ہے کہ شاید کوئی پنجابی بزرگ ہیں۔ اس میں سے مطلع پر قناعت کرتا ہوں ؎

عزم سفر جو کردی ساجن نینوں نیند نہ آئی جی
قدر وصالت نادانستم تم بن برہ ستائی جی

اگر یہی شعر ہیں تو جب سے اب تک بیشمار شاعر پنجاب میں نکل آئیں گے۔

یہاں کی شاعری اب تک انہیں بیتوں میں جاری ہے لیکن یہ شاعر اور ان کی شاعری وہ نہیں ہے جس سے ہم بحث کرتے ہیں۔ **احمد گجراتی** ہم عہد وہم وطن دلی کے ہیں وہ فرماتے ہیں:۔

گر بیضۂ زاغ کسے در زیر سیمرغ نہد ۔۔۔ از اصل خود ناید بروں آخر گلیلا ہوئے پر

گر طفلکے بازی گرے خوانندہ وعالم شود ۔۔۔ اصلیکہ دارد کے رود آخر نورا ہوئے پر

گر بچۂ شیرے کسے با شیر روبہ پرورد ۔۔۔ ردی کہ دارد کے رود آخر بگیلا ہوئے پر

سیوا ایک مصنّف **دکن** میں گزرا ہے جس نے روضتہ الشہداء کا دکنی زبان میں ترجمہ کیا تھا۔ مرثیے اس کے اب تک وہاں کے امام باڑوں میں پڑھے جاتے ہیں۔ اور غالب ہے کہ اس طرح کے شاعران عہدوں میں بہت ہوں گے مگر ایسی شاعری کو علمی شاعری نہیں کہہ سکتے۔

نواز نام ایک مصنّف نے **فرخ سیر** کے عہد میں **شکنتلا** کا ترجمہ بھاشا میں لکھا۔ اس عہد میں نظم اُردو کے ضعف کا یہی سبب ہو گا کہ جو ذی استعداد اُردو کے اہل زبان ہوتے تھے وہ اُردو کی شاعری کو فخر نہ سمجھتے تھے۔ کچھ کہنا ہوتا تھا تو فارسی میں کہتے تھے۔ البتہ عوام النّاس موزوں طبع۔ دل کی ہوس پوری کرنے کو جو مُنہ میں آتا تھا کہے جاتے تھے۔ جو اہل ولایت شاعر ہوتے تھے۔ وہ فارسی شعر کہتے تھے۔ اُردو اُنھیں آتی نہ تھی۔ کہتے تھے تو ایسا معلوم ہوتا تھا گویا تمسخر کرتے ہیں۔ --- انجملہ مرزا مُعزّ موسوی خاں **فطرت** کہ زبدۂ شعرائے ایران اور عمدہ شعرائے عالمگیری سے تھے اور بعد میں قزلباش خاں **اُمّید** کے متفرق اشعار دیکھے۔ معلوم ہوتا ہے کہ جو کچھ اُس وقت ٹوٹی پھوٹی زبان تھی اُسے پورا ادا نہ کر سکتے تھے۔ چنانچہ **میر معزّ** فرماتے ہیں ؎

از زلفِ سیاہ تو بدل دوم پڑی ہے ۔۔۔ در خانۂ آئینہ گتا جوم پڑی ہے

قزلباش خانِ اُمید باوجودیکہ فارسی میں بڑے نامور ہیں اور اہل ہند کے ساتھ

ان کے جلسوں کی گرمجوشیاں بھی مشہور ہیں۔ مگر اُردو میں جو اظہار کمال کیا ہے وہ یہ ہے :۔

باامن کی بیتی آج مری آنکھوں پری　　غصہ کیا دگالی دیا اور دگرلری

اس بات میں سب کو اتفاق ہے کہ نظم موجودہ نے دکن سے ظہور کیا۔ چنانچہ میر تقی میر نے بھی ایک غزل میں شاعرانہ انداز سے اشارہ کیا ہے ؎

خوگر نہیں کچھ یوں ہی ہم ریختہ گوئی کے　　معشوق جو تھا اپنا باشندہ دکن کا تھا

اور قائمؔ ان کے ہمعصر نے صاف کہہ دیا ہے ؎

قایم میں غزل طور کیا ریختہ ورنہ　　اک بات لچر سی بزبانِ دکنی تھی

بہرحال عالمگیر کے عہد میں **ولی** نے اس نظم کا چراغ روشن کیا جو محمد شاہ کے عہد میں آسمان پر ستارہ ہو کر چمکا اور شاہ عالم کے عہد میں آفتاب[1] ہو کر اوج پر آیا۔

نظم اُردو کے آغاز میں یہ امر قابل اظہار ہے کہ سنسکرت میں ایک لفظ کے کئی کئی معنی ہیں۔ اسی واسطے اس میں اور برج بھاشا اس کی شاخ میں ذومعنیین الفاظ اور ایہام پر دوہروں کی بنیاد ہوتی تھی۔ فارسی میں یہ صنعت ہے مگر کم۔ اُردو میں پہلے پہلے شعر کی بنا اسی پر رکھی گئی اور دور اوّل کے شعراء میں برابر وہی قانون جاری رہا۔ اُس عہد کے چند اشعار بھی نمونہ کے طور پر لکھتا ہوں :۔

لام نستعلیق کا ہے اُس بُت خوشخط کی زلف　　ہم تو کافر ہوں اگر بندے نہ ہوں اسلام کے

کیوں نہ ہو ہم سے وہ سجن باغی　　قد ہو جس کا نہال کی مانند

تو جو دریا کے پار جاتا ہے　　دل مرا وار وار جاتا ہے

تم دیکھو یا نہ دیکھو ہم کو سلام کرنا　　یہ تو قدیم ہی سے سر پر ہمارے کر[2] ہے

---

[1] آفتاب شاہ عالم بادشاہ کا تخلص تھا۔ وہ خود بڑا مشاق شاعر تھا جس کے چار دیوان اُردو میں موجود ہیں۔

[2] کر ہندی میں محصول کو اور سنسکرت میں ہاتھ کو کہتے ہیں۔ سر کے بالوں کی جڑوں میں جو خشکی ہو جاتی ہے اُسے بھی کر کہتے ہیں +

نہیں محتاج زیور کا جسے خوبی خدا دیوے — کہ آخر بد نما لگتا ہے دیکھو چاند کو گہنا
سج دکھا بانکی نہیں چھوڑے گا میرا نقد دل — آج وہ افغاں پسر آتا ہی ہے دل میں ٹھان
نہ دیوے لے کے دل وہ جو دشکیں — اگر باور نہیں تو مانگ دیکھو

شاہ حاتم نے بڑی کوشش کرکے ان رنگ آمیزیوں سے اُردو کو پاک کیا۔ چنانچہ ان کے حال میں معلوم ہوگا۔

سودا کے عہد میں بھی اس مادۂ فاسد کا بقیہ چلا آتا تھا۔ چنانچہ انہوں نے بھی ایک قصیدہ میں ان بزرگوں کی شکایت کی ہے جس کے اشعار میں سے ایک شعر یہ ہے:۔

موہنو پرورشِ شانہ تو پھر ہے موسل — رام پور کی ہو کٹاری تو کہیں بیتا پھل

مگر لطف یہ ہے کہ خود بھی موقع پاتے تھے تو کہیں نہ کہیں کہہ جاتے تھے۔ چنانچہ فرمایا ہے

حکّاک کا پسر بھی مسیحا سے کم نہیں — فیروزہ ہو وے مُردہ تو دیتا ہے وہ جِلا

اگرچہ وہ انداز پہلے کی نسبت بالکل نہیں رہے پھر بھی جس قدر ہیں وہ ایسے زبان پر چڑھے ہوئے ہیں کہ جن مضامین کے ادا کرنے کی ہمیں آجکل ضرورت پڑتی ہے اُسکے لئے مخلل انداز ہوتے ہیں۔ یہ بات بھی بھولنی نہ چاہئے کہ جس طرح ایک نوجوان مُرغ اپنے پہلے پر جھاڑ کر نئے پر نکالتا ہے اسی طرح ہماری زبان بھی اپنے الفاظ کو بدلتی چلی آتی ہے۔ چنانچہ بہت سے لفظ ہیں جن کا دَور بدَور شعراء کے کلام میں اشارہ کیا گیا ہے۔

یہ اظہار قابل افسوس ہے کہ ہماری شاعری چند معمولی مطالب کے پھندوں میں پھنس گئی ہے۔ یعنی مضامین عاشقانہ۔ میخواری مستانہ۔ بے گل و گلزار وہمی رنگ و بو کا پیدا کرنا۔ ہجر کی مصیبت کا رونا۔ وصل موہوم پر خوش ہونا۔ دُنیا سے بیزاری اِسی میں فلک کی جفاکاری اور غضب یہ ہے کہ اگر کوئی اصلی ماجرا بیان کرنا چاہتے ہیں تو بھی خیال استعاروں میں ادا کرتے ہیں۔ نتیجہ جس کا یہ کہ کچھ نہیں کر سکتے ہیں۔ میرے دوستو! دیکھتا ہوں کہ علوم و فنون کا عجائب خانہ کھُلا ہے اور ہر قوم اپنے اپنے فن کی انشا کی دستکاریاں بھی سجائے ہوئے ہے۔ کیا نظر نہیں آتا ہماری زبان کس درجہ پر

کھڑی ہے؟ ہاں صاف نظر آتا ہے کہ پا انداز میں پڑی ہے۔

ہمارے بزرگوں میں سے دلّی میں اوّل مرزا رفیع سودا پھر شیخ ابراہیم ذوق نے زبان کی پاکیزگی۔ الفاظ کی شستگی۔ اور ترکیب کی چستی سے کلام میں خوب زور پیدا کیا۔ میر تقی میر اور خواجہ میر درد نے زار نالی۔ افسردہ دلی۔ دُنیا سے بیزاری کے مضامین کو خوب ادا کیا غالب نے بعض مواقع پر اُن کی عمدہ پیروی کی مگر معنے آفرینی کے عاشق تھے۔ اور زیادہ توجہ ان کی فارسی پر رہی اس لئے اُردو میں غالباً صاف اشعار کی تعداد سو دو سو شعر سے آگے نہ نکلی۔ جرأت نے عاشق معشوق کے معاملات اور دونوں کے دلی خیالات کو نہایت خوبی اور شوخی سے بیان کیا۔ مومن خاں نے باوجود مشکل پسندی کے پیروی کی۔ لکھنؤ میں شیخ امام بخش ناسخ اور خواجہ حیدر علی آتش۔ رند۔ صبا۔ وزیر وغیرہ نے شاعری کا حق ادا کیا۔ مگر پھر خیال کرو کہ فقط زبانی طوطا مینا بنانے سے حاصل کیا؟ جو شاعری ہمارا ہر قسم کا مطلب اور ہمارے دل کا ہر ایک ارمان پورا نہ نکال سکے۔ گویا ایک ٹوٹا قلم ہے جس سے پورا حرف نہ نکل سکے۔ دارالخلافہ دہلی جو کہ انشا اور شاعری اُردو کے لئے دارالضرب تھا وہاں ذوق اور غالب نے رسمی شاعری پر خاتمہ کیا۔ لکھنؤ میں ناسخ و آتش سے شروع ہو کر رند۔ وزیر۔ صبا تک سلسلہ جاری رہا۔ ایک زمانہ میں مثل مشہور تھی کہ بگڑا شاعر مرثیہ گو اور بگڑا گویّہ مرثیہ خواں۔ لیکن لکھنؤ میں ان دونوں شاخوں کے صاحب کمال بھی ایسے ہوئے کہ اصلوں کو رونق دیدی۔ اسی اعتبار سے کہہ سکتے ہیں کہ میر انیس اور مرزا دبیر خاتمہ شعرائے اُردو کا ہیں۔ اور چونکہ اس فن کے صاحب کمال کا پیدا ہونا نہایت درجہ کی آسودگی اور زمانہ کی قدردانی اور متعدد سامانوں پر منحصر ہے اور زمانہ کا رنگ اس کے

بالکل برخلاف ہے۔ اس لئے ہندوستان کو اس شاعری کی ترقی اور ایسے شعراء کے پیدا ہونے سے بالکل مایوس ہو جانا چاہئے۔ البتہ کوئی نیا فیشن نکلے پھر اس میں خدا جانے کیا کیا کمال ہوں اور کون کون اہل کمال ہوں +

خاتمۂ کلام میں عقل کے نجومی سے سوال ہوا کہ اس شاعری کا ستارہ جو نحوست زوال میں آگیا ہے۔ کبھی اوج اقبال پر بھی طلوع کرے گا۔ یا نہیں؟ جواب ملا کہ نہیں۔ پوچھا گیا کہ سبب؟ جواب ملا کہ حکام وقت کی یہ زبان نہیں۔ نہ ان کے کار آمد ہے۔ اسی لئے وہ اس کے قدردان نہیں۔ نہ وہ اسے جانتے ہیں نہ اس کے جاننے کو کچھ فخر جانتے ہیں۔ وہاں سے ہمارے شعراء کو۔ جھوٹے خوشامدی کا خطاب ملا ہوا ہے۔ اچھا یا قسمت! یا نصیب! جن لوگوں کے کلام ہماری زبان کے لئے سند سمجھے جاتے تھے اُن کی تو یہ عزت ہوئی۔ اب اس نیم جان مُردہ کے رونے والے چند بڈھے رہے جن کی دردناک آوازیں کبھی کبھی آہ سرد کے سُروں میں بلند ہو کر سینوں میں رہ جاتی ہیں۔ وہ کبھی دل آسردہ ہوتے ہیں تو ایک مشاعرہ کر کے مل بیٹھتے ہیں اور آپس ہی میں ایک دوسرے کی تعریفیں کر کے جی خوش کر لیتے ہیں۔ شاعر غریب اپنے بزرگوں کی قبریں قائم رکھنے کو اتنی ہی تعریف پر قناعت کریں۔ مگر پیٹ کو کیا کریں؟ یہ دوزخ تو بہت سی تعریف سے بھی نہیں بھرتا +

پھر سوال ہوا کہ کوئی ایسی تدبیر ہے؟ جس سے اس کے بھی دن پھریں۔ اور پھر ہماری نظم کا باغ لہلہاتا نظر آئے۔ جواب ملا کہ ہاں۔ ہمت و تدبیر کو خدا نے بڑی برکت دی ہے۔ صورت یہی ہے کہ ایشیا میں ایسے کمالوں کی رونق حکام کی توجہ سے ہوتی ہے۔ شاعروں کو چاہئے کہ اسے حاکموں کے کار آمد یا اُن کے پسند کے قابل بنائیں۔ ایسا کریں گے تو شعر کہنے والوں کو کچھ فائدہ ہوگا اور جس قدر فائدہ ہوگا۔ اُسی قدر چرچا زیادہ ہوگا۔ اُسی قدر ذہن

اور فکر جودت کریں گے۔ اور دلچسپ ایجاد اور خوشنما اختراع نکالیں گے۔ اسی کو ترقی کہتے ہیں +

یہ تو تم نے دیکھ لیا کہ اُردو میں جو سرمایہ انشا پردازی کا ہے۔ فارسی کی بدولت ہے۔ قدمائے فارس ہر قسم کے مضامین سے لطف اُٹھاتے تھے۔ متاخرین فقط غزل میں منحصر ہو گئے۔ ذی استعداد قصیدے بھی کہتے رہے۔ اُردو والوں نے بھی آسان کام سمجھ کر اور عوام پسندی کو غرض ٹھہرا کر حسن و عشق وغیرہ کے مضامین کو لیا اور اس میں کچھ شک نہیں کہ جو کچھ کیا بہت خوب کیا۔ لیکن وہ مضمون اس قدر مستعمل ہو گئے کہ سُنتے سُنتے کان تھک گئے ہیں۔ وہی مقرری باتیں ہیں۔ کہیں ہم لفظوں کو پس و پیش کرتے ہیں۔ کہیں اُدل بدل کرتے ہیں اور کہے جاتے ہیں۔ گویا کھائے ہوئے بلکہ اوروں کو چبائے ہوئے نوالے ہیں۔ انہیں کو چبلاتے ہیں اور خوش ہوتے ہیں۔ خیال کرو اس میں کیا مزا رہا۔ حسن و عشق سبحان اللہ! بہت خوب۔ لیکن تابکے؟ حور ہو یا پری۔ گلے کا ہار ہو جائے تو اجیرن ہو جاتی ہے۔ حُسن و عشق سے کہاں تک جی نہ گھبرائے! اور اب تو وہ بھی سو برس کی بڑھیا ہو گئی +

ایک دشواری یہ بھی ہے کہ ان خیالات کے ادا کرنے کے لئے ہمارے بزرگ الفاظ و معانی اور استعاروں اور تشبیہوں کے ذخیرے تیار کر گئے ہیں۔ اور وہ اتقدر زبانوں پر رواں ہو گئے ہیں کہ ہر شخص تھوڑے فکر سے کچھ نہ کچھ کر لیتا ہے اگر اور خیال نظم کرنا چاہے تو ویسا سامان نہیں پاتا۔ البتہ ذی استعداد مشاق چاہیں تو کر بھی سکتے ہیں۔ لیکن کم بخت حسن و عشق کے مضمون۔ اس کے خط و خال۔ لوہ بہاؤ گلر لبز کے الفاظ ان کی زبان و دہان میں رچے ہوئے ہیں۔ اگر کچھ کہنا چاہیں تو اوّل اسے بھلائیں۔ پھر اس کے مناسب مقام ویسے ہی نرالے استعارے نئی تشبیہیں۔ انوکھی ترکیبیں اور لفظوں کی عمدہ تراشیں پیدا کریں۔ اور یہ بڑی

عرق ریزی اور جاں کاہی کا کام ہے۔ بے ہمتی جو ہماری قوم پر حاکم با اختیار بنی ہوئی ہے اُسے اس سے زیادہ روکنے کا موقع کیا مل سکتا ہے +

اس اتفاقی معاملہ نے اور تو جو کیا سو کیا۔ بڑی قباحت یہ پیدا کی کہ ارباب زمانہ نے متفق اللفظ کہہ دیا کہ اُردو نظم مضامین عاشقانہ ہی کہہ سکتی ہے۔ اسے ہر ایک مضمون ادا کرنے کی طاقت اور لیاقت بالکل نہیں۔ اور یہ ایک بڑا داغ ہے جو ہماری قومی زبان کے دامن پر لگا ہے۔ سوچتا ہوں کہ اسے کون دھوئے؟ ہاں یہ کام ہمارے نوجوانوں کا ہے جو کشورِ علم میں مشرقی اور مغربی دونوں دریاؤں کے کناروں پر قابض ہو گئے ہیں۔ ان کی ہمت آبیاری کرے گی۔ دونوں کناروں سے پانی لائے گی۔ اور اس داغ کو نہ فقط دھوئے گی بلکہ قوم کے دامن کو موتیوں سے بھر دے گی +
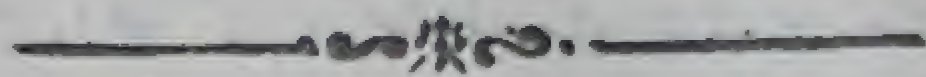
آبِ حیات کا پہلا دَور

تمہید

نظم اُردو کے عالم کا پہلا نوروز ہے۔ نفس ناطقہ کی روح یعنی شاعری عالم وجود میں آئی تھی۔ مگر بچوں کی نیند پڑی سوتی تھی۔ ولی نے آکر ایسی میٹھی میٹھی آواز سے غزل خوانی شروع کی ہے کہ اس بچے نے ایک انگڑائی لے کر کروٹ لی اور اٹھ اس کا دفعتہً حرارت برقی کی طرح دل دل میں دوڑ گیا۔ گھر گھر شاعری کا چرچا ہے۔ جس امیر اور جس شریف کو دیکھو شعر کی سوچ میں غرق بیٹھا ہے۔ ان بزرگوں کی باتیں تو ان کے شعروں سے سُن بھی سکتے ہو۔ مگر حیران ہوں کہ صورت کیونکر دکھادوں۔ اوّل تو حرفوں میں تصویر کھینچنی مشکل۔ اُس پر میں زبان کا اپاہج۔ اُس رنگ کے الفاظ کہاں سے لاؤں۔ جو ایسے لوگوں کی جیتی جاگتی بولتی چالتی تصویر کھینچ دکھاؤں کہ ادب کی آنکھ ان کی متانت پر نظر نہیں اُٹھا سکتی اور محبت کی آنکھ اُن کی پیاری حالت پر سے نگاہ نہیں ہٹا سکتی۔ دیکھو جلسہ مشاعرہ کا امرا و شرفا سے آراستہ ہے۔ معقول معقول بڈھے اور جوان برابر لمبے لمبے جامے۔ موٹی موٹی پگڑیاں باندھے بیٹھے ہیں۔ کوئی کٹاری باندھے ہے۔ کوئی سیف لگائے ہے۔ بعض وہ کہن سال ہیں کہ جن کے بڑھاپے کو سفید داڑھی نے نورانی کیا ہے۔ بعض ایسے ہیں کہ عالمِ جوانی میں اتفاقاً داڑھی کو رخصت کیا تھا۔ اب کیونکر رکھیں کہ وضع داری کا قانون ٹوٹتا ہے۔ اس پر خوش مزاجی کا یہ عالم ہے کہ ان کے بڑھاپے کی زندہ دلی سے آج نوجوانوں کی جوانی پانی پانی ہوتی ہے۔ ان شوخیوں سے اُنہیں کچھ اور مطلب نہیں ہے۔ مگر یہ کہ اپنے اوپر آپ ہنسیں اور اَوروں کو خوش کریں +

اِس دَور میں وَلی تو مجلس کی شمع ہیں اور اہلِ مجلس دلّی اور دکن کے شریف و نجیب

فصیح زبان ہیں کہ جو کچھ دیکھتے ہیں اُسی روشنی سے دیکھتے ہیں۔ ان کی زبان ایک ہی سمجھنی چاہیئے۔ مگر ولی نے اپنے کلام میں ایہام اور الفاظ ذو معنیین سے اتنا کام نہیں لیا۔ خدا جانے ان کے قریب العہد بزرگوں کو پھر اس قدر شوق اس کا کیونکر ہو گیا۔ شاید دُہروں کا انداز جو ہندوستان کی زبان کا سبزۂ خود رَو تھا اُس نے اپنا رنگ دیا۔ اگرچہ ولی کے بعد دلّی میں سیکڑوں صاحب طبع دیوان بنانے پر کمربستہ ہو گئے۔ مگر میں اِس مشاعرہ میں چند ایسے بزرگوں کو لاتا ہوں۔ جن کے ناموں پر اُس وقت کے معرکوں میں اُستادی کا چترشاہی سایہ کئے تھا اور غالباً اُس زبان کا نمونہ شعر کا انداز دکھانے کو اس قدر کافی ہو گا۔ ان بزرگوں کے کلام میں تکلف نہیں۔ جو کچھ سامنے آنکھوں کے دیکھتے ہیں اور اُس سے خیالات دل میں گزرتے ہیں وہی زبان سے کہہ دیتے ہیں۔ اینچ پیچ کے خیال۔ دُور دُور کی تشبیہیں۔ نازک استعارے نہیں بولتے۔ اسی واسطے اشعار بھی صاف اور بے تکلف ہیں۔ اور یہ دلیل ہے اِس بات کی کہ ہرایک زبان اور اس کی شاعری جب تک عالم طفولیت میں ہوتی ہے تب تک بے تکلف عام فہم اور اکثر حسب حال ہوتی ہے۔ اسی واسطے لُطف انگیز ہوتی ہے۔ اس میں شک نہیں کہ ان کے محاورات قدیم اور مضمون بھی اکثر سُبک اور مبتذل ہوں گے۔ مگر کلام کی سادگی اور بے تکلفی ایسی دل کو بھلی لگتی ہے جیسے ایک حُسن خداداد ہو کہ اس کی قدرتی خوبی ہزاروں بناؤ سنگار کا کام کر رہی ہے۔ میں خود نہیں کہتا۔ فلاسفہ سلف کا قول سُنتا ہوں کہ ہر شے اپنی مختلف کیفیتوں میں خوبصورتی اور بدصورتی کا ایک عالم رکھتی ہے۔ پس انسان وہی ہے کہ جس پیرایہ میں خوبصورتی جوبن دکھائے۔ یہ اُس سے کیفیت اُٹھا سکے۔ نہ کہ فقط حسینوں کے زلف و رخسار ہی پر پریشان رہے۔ خوش نظر اسے نہیں کہتے کہ فقط گل و گلزار ہی پر دیوانہ پھرے۔ نہیں! ایک گھاس کی پتّی بلکہ سڈول کانٹا خوشنما ہو تو اُس کی نوک جھونک پر بھی پھول ہی کی طرح لوٹ جائے ٭

—— . ——

شمسُ ولی اللہ

یہ نظمِ اُردو کی نسل کا آدم جب ملکِ عدم سے چلا تو اُس کے سر پر اولیت کا تاج رکھا گیا جس میں وقت کے محاورہ نے اپنے جواہرات خرچ کیے۔ اور مضامین کی رائج الوقت دستکاری سے میناکاری کی۔ جب کشورِ وجود میں پہنچا تو ایوان مشاعرہ کے صدر میں اُس کا تخت سجایا گیا۔ شہرتِ عام نے جو اس کے بقائے نام کا ایوان بنایا ہے۔ اُس بلندی اور مضبوطی کو ذرا دیکھو اور جو کتبے لکھے ہیں اُنہیں پڑھو۔ دُنیا تین سو برس دور نکل آئی ہے۔ مگر وہ آج تک سامنے نظر آتے ہیں۔ اور صاف پڑھے جاتے ہیں۔ اس زمانہ تک اُردو میں متفرق شعر ہوتے تھے۔ ولی اللہ کی برکت نے اُسے وہ زور بخشا کہ آج ہندکی شاعری نظمِ فارسی سے ایک قدم پیچھے نہیں۔ تمام بحریں فارسی کی اُردو میں لائے۔ شعر کو غزل اور غزل کو قافیہ ردیف سے سجایا۔ ردیف وار دیوان بنایا۔ ساتھ اس کے رباعی۔ قطعہ۔ مخمس۔ اور مثنوی کا رستہ بھی نکالا۔ اُنہیں ہندوستان کی نظم میں وہی رتبہ ہے جو انگریزی کی نظم میں چاسر[1] شاعر کو۔ اور فارسی میں رودکی[2] کو اور عربی میں مہلہل کو۔ وہ کسی کے شاگرد نہ تھے۔ اور یہ ثبوت ہے فصیحِ عرب کے قول کا کہ اَلشُّعَرَاءُ تَلَامِیْذُ الرَّحْمٰنِ اسی کو دانائے فرنگ کہتا ہے کہ شاعر اپنی شاعری ساتھ لے کر پیدا ہوتا ہے۔ ایسے وقت میں کہ ہماری زبان زد ربیان میں ایک طفل نو رفتار تھی۔ جو انگلی کے سہارے بغیر نہ چل سکے۔ بس جتنے قدم کہ آگے بڑھی انہی کی پرورش کے سہارے سے بڑھی۔ اُردو زبان اس وقت سوائے ہندی دُہروں اور بھاشا کے مضامین کے اور کسی

---

[1] چاسر ۱۳۲۸ء میں پیدا ہوا اور ۱۴۰۰ء میں مرگیا اُس وقت یہاں تغلقیہ خاندان کا دور ہوگا۔

[2] رودکی فارسی کا پہلا شاعر ہے۔ تیسری اور چوتھی صدی ہجری کے درمیان تھا۔ اور سلاطین سامانیہ کے دربار میں قدردانی کے بے انتہا انعام حاصل کرتا تھا۔

قابل نہ تھی۔ انہوں نے اس میں فارسی کی ترکیبیں اور فارسی کے مضامین کو بھی داخل کیا۔ ولی[1] احمد آباد گجرات کے رہنے والے تھے اور شاہ وجیہ الدین کے مشہور خاندان میں سے تھے۔ ان کی علمی تحصیل کا حال ہماری لاعلمی کے اندھیرے میں ہے۔ کیونکہ اس عہد کی خاندانی تعلیم اور بزرگوں کی صحبتوں میں ایک تاثیر تھی کہ تھوڑی نوشت و خواند کی لیاقت بھی استعداد کا پردہ کھُلنے نہ دیتی تھی چنانچہ ان کے اشعار سے معلوم ہوگا کہ وہ قواعد عروض کی طرح زبان عربی سے ناواقف تھے۔ پھر بھی کلام کہتا ہے کہ فارسیت کی استعداد درست تھی۔ اُن کی انشاپردازی اور شاعری کی دلیل اس سے زیادہ کیا ہوگی کہ ایک زبان کو دوسری زبان سے ایسا بے معلوم جوڑ لگایا ہے کہ آج تک زمانے نے کئی پلٹے کھائے ہیں مگر پیوند میں جُنبش نہیں آئی۔ علم میں درجۂ فضیلت نہ رکھتے تھے مگر کہتے ہیں ؎

ایک دل نہیں آرزو سے خالی ہر جا ہے محال اگر خلا ہے

یہ سیر کتاب کا شوق اور علما کی صحبت کی برکت ہے۔ ولی کی طبیعت میں بلند پروازی بھی معلوم ہوتی ہے کیونکہ اگرچہ **سودا** کی طرح کسی سے دست و گریباں نہیں ہوئے مگر اپنے ہمعصروں پر چوٹیں کی ہیں۔ چنانچہ ناصر علی سرہندی کے معاملہ سے ظاہر ہے۔

اگرچہ ایشیا کے شاعروں کا پہلا عنصر مضمون عاشقانہ ہے۔ مگر جس شوخی سے اخلاق کی شوخی ظاہر ہو اس کا ثبوت ان کے کلام سے نہیں ہوتا۔ بلکہ برخلاف اس کے صلاحیت اور متانت ان کا جوہر طبعی تھا۔ ان کے پاس سیاحی اور تجربہ کا توشہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ جس عہد میں تھوڑا سفر بھی بڑی سیاحی کی قیمت رکھتا تھا۔ اس میں یہ اپنے وطن سے ابو المعالی کے ساتھ دلّی میں آئے۔ یہاں شاہ سعد اللہ[2]

[1] دیکھو تذکرہ حکیم قدرت اللہ خاں قاسم۔ مگر تعجب ہے کہ میر تقی نے اپنے تذکرہ میں اورنگ آبادی لکھا ہے۔
[2] شیخ سعد اللہ گلشن اچھے شاعروں میں تھے اور مرزا بیدل کے معاصر تھے۔ دو شعر فارسی کے اُنسے بھی یادگار ہیں:

گشتم شہید تیغ تغافل کشید نت جانم زدست برد غزالانہ دیدنت
بدقت می توان فہمید معنی ہائے نازِ او کہ شرح حکمت انعیں است مژگانِ درازِ او

گلشن کے مُرید ہوئے۔ شاید ان سے شعر میں اصلاح لی ہو۔ مگر دیوان[1] کی ترتیب فارسی کے طور پر یقیناً ان کے اشارہ سے کی۔ اُن کا دیوان اُس عہد کے شاعروں کی بولتی تصویر ہے۔ کیونکہ اگر آج دریافت کرنا چاہیں کہ اُس وقت کے اُمرا و شرفا کی کیا زبان تھی؟ تو اس کی کیفیت سوا دیوانِ ولی کے اور کوئی نہیں بتا سکتا۔ انھی کے دیوان سے ہم اُس وقت اور آج کی زبان کے فرق بخوبی نکال سکتے ہیں +

سوں اور سیں۔ یعنی بجائے سے
کوں بہ واؤ معروف ،، کو
ہمن کو ،، ہم کو
جگ منے ،، دُنیا میں
بستے۔ بجائے بریں۔ فارسی کا ترجمہ ہے پیراہنے در بر
تجھ لب کی صفت بجائے تیرے لب کی صفت
نمن یعنی طرح یا مثل
جگ ،، جہاں۔ دُنیا
بچن ،، کلام
نت ،، ہمیشہ
مکھ ،، مُنہ
تسبی بجائے تسبیح
سہی ،، صحیح
بگانا ،، بیگانہ
مَرَض ،، مَرَض

بھیتر بجائے اندر
مجھ دل ،، میرا دل
موہن۔ سریجن۔ پی۔ پیتم ،، معشوق
انجھواں بجائے آنسو کی جمع
بھواں۔ پلکاں ،، بھویں۔ پلکیں
نین ،، آنکھ
دَہَن ،، دہن
مِرا ،، میرا
یوہ ،، یہہ

بعض قافیے مثلاً:۔
گھوڑا۔ مورا۔ گورا
دھر۔ سر
گھوڑی۔ گوری۔
اکثر غزلیں بے ردیف ہیں۔

چونکہ نظم فارسی کی روح اُسی وقت اُردو کے قالب میں آئی تھی۔ اسی واسطے

[1] دیکھو تذکرۂ فائق کہ خاص شعرائے دکن کے حال میں ہے۔ اور وہیں تصنیف ہوا ہے +

ہندی لفظوں کے ساتھ فارسی کی ترکیبیں اور بڑ اور دَرُ۔ بلکہ بعض جگہ افعال فارسی بھی مُنہ میں کھٹکتے ہیں۔ وہ خود دکنی تھے۔ اس لئے ان کے کلام میں بعض بعض الفاظ دکنی بھی ہوتے ہیں۔

آج اس وقت کی زبان کو سُن کر ہمارے اکثر ہمعصر ہنستے ہیں۔ لیکن یہ ہنسی کا موقع نہیں۔ حوادث گاہ عالم میں ایسا ہی ہوا ہے اور ایسا ہی ہوتا رہیگا۔ آج تم ان کی زبان پر ہنستے ہو کل ایسے لوگ آئیں گے کہ تمھاری زبان پر ہنسیں گے۔ اس انجمن غفلت کے ممبر اگر تھوڑی دیر کے لئے عقل دوربیں کو صدر انجمن کر لیں تو یہ اس تدبیر کے سوچنے کا موقع ہے کہ آج ہم کیونکر اپنے کلام کو ایسا کریں جس سے ہماری زبان کچھ مدت تک زیادہ مطبوع خلائق رہے۔ اگرچہ سامنے ہمارے اندھیرا ہے۔ لیکن پیچھے پھر کر دیکھنا چاہیئے اور خیال کرنا چاہیئے کہ زبان نے جو ترقی کی ہے تو کن اصول پر اور کس جانب میں قدم رکھتی گئی ہے۔ آؤ ہم بھی آج کے کاروبار اور اُس کے آئندہ حالات کو خیال کریں اور اسی انداز پر قدم ڈالیں۔ شاید ہمارے کلام کی عمر میں کچھ برس زیادہ ہو جائیں +

شاعرِ قدرت کے دیوان میں ایک سے ایک مضمون نیا ہے۔ مگر یہ لطیفہ بھی کچھ کم نہیں کہ شاعری کا چراغ تو دکن میں روشن ہو اور ستارے اس کے دِلّی کے اُفق سے طلوع ہوا کریں۔ اُس عہد کی حالت اور بھاشا زبان کو خیال کرتا ہوں تو سوچتا رہ جاتا ہوں کہ یہ صاحبِ کمال زبانِ اُردو۔ اور انشائے ہندی میں کیونکر ایک نئی صنعت کا نمونہ دے گیا اور پیچھے آنے والوں کے واسطے ایک نئی سڑک کی داغ بیل ڈالتا گیا۔ کیا اُسے معلوم تھا کہ اس طرح یہ سڑک ہموار ہو گی اُس پر دُکانیں تعمیر ہوں گی۔ لالٹینوں کی روشنی ہو گی۔ اہل سلیقہ دُکاندار جواہر فروشی کریں گے۔ اور اُردوئے معلّیٰ اس کا خطاب ہو گا۔ افسوس یہ ہے کہ ہماری زبان کے مورخ اور ہمارے شعراء کے تذکرہ نویسوں نے اس کے ولی اور خدا رسیدہ

ثابت کرنے میں بڑی عرق ریزی کی لیکن ایسے حال نہ لکھے جس سے اُس کے ذاتی خصائل و حالات مثلاً دنیاداری یا گوشہ گیری۔ اقامت یا سیاحی۔ راہ علم وعمل کی نشیب و فراز منزلیں یا اُس کی صحبتوں کی مزہ مزہ کی کیفیتیں معلوم ہوں بلکہ برخلاف اس کے سنہ ولادت اور سال فوت تک بھی نہ بتایا۔ اتنا ثابت ہے کہ ان کا ابتدائے عہد شاید عالمگیر کا آخری زمانہ ہوگا اور وہ مع اپنے دیوان کے ۳ سنہ محمد شاہی میں دلی پہنچے +

قاعدہ ہے کہ جب دولت کی بہتات اور عیش و نشاط میں کچھ نیکی پر خیالات آتے ہیں تو صوفیانہ لباس میں ظاہر ہوا کرتے ہیں۔ اُس وقت محمد شاہی دور نے در و دیوار کو دولت سے مست کر رکھا تھا جس سے کہ تصوّف کے خیالات عام ہو رہے تھے۔ دوسرے ولی خود فقر کے خاندان عالی سے تھے اور فقیر ہی کے دیکھنے والے بھی تھے۔ تیسرے زبان اُردو کے والدین یعنی بھاشا اور فارسی بھی صوفی ہیں۔ ان جذبوں نے انھیں تصوّف شاعرانہ میں ڈالا۔ اور دل کی اُمنگ نے پیش قدمی کا تمغہ حاصل کرنے کو اُس کام پر آمادہ کیا کہ جو سلف سے اس وقت تک کسی کو نہ سوجھا تھا۔ وہ یہی کہ فارسی کے قدم بہ قدم چلیں اور پورا دیوان مرتّب کریں۔ چنانچہ ان کے پیر کا اشارہ اس کی تائید کرتا ہے۔

غرض جب ان کا دیوان دلّی میں پہنچا تو اشتیاق نے ادب کے ہاتھوں پر لیا قدردانی نے غور کی آنکھوں سے دیکھا۔ لذّت نے زبان سے پڑھا۔ گیت موقوف ہو گئے۔ قوال معرفت کی محفلوں میں انہیں کی غزلیں گانے بجانے لگے۔ ارباب نشاط یاروں کو سُنانے لگے۔ جو طبیعت موزوں رکھتے تھے انہیں دیوان بنانے کا شوق ہوا +

اگرچہ اس اعتبار سے یہ نہایت خوشی کا موقع ہے کہ عمدہ جوہر انسانیت پسندیدہ لباس پہن کر ہماری زبان میں آیا۔ مگر اس کوتاہی کا افسوس ہے کہ

کوئی ملکی فائدہ اس سے نہ ہوا۔ اور اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ کسی علمی یا آئینی رستے سے نہیں آیا بلکہ فقیرانہ شوق یا تفریح کی ہوا سے اُڑ کر آگیا تھا کاش شاہنامہ کے ڈھنگ سے آتا کہ محمد شاہی عیاشی اور عیش پرستی کا خون بہاتا اور اہل ملک کو پھر تیموری اور بابری میدانوں میں لاڈالتا یا تہذیب و شائستگی سے اکبری عہد کو پھر زندہ کر دیتا+

باوجودیکہ اس کی زبان آج بالکل متروک ہے مگر دیوان اب تک ہر جگہ ملتا ہے اور بکتا ہے۔ یہاں تک کہ پیرس اور لندن میں چھپ گیا ہے۔ اس میں علاوہ ردیف وار غزلوں کے رباعیاں۔ قطعے۔ دو تین مخمّس۔ قصیدے۔ ایک مثنوی۔ مختصر معرکۂ کربلا کے حال میں۔ ایک شہر سورت کے ذکر میں ہے۔ واسوخت اُس وقت میں نہ تھا۔ اس ایجاد کا فخر میر صاحب کے لئے چھوڑ گئے۔ بادشاہ یا کسی امیر کی تعریف بھی نہیں۔ شاید خواجہ میر درد کی طرح تعریف کرنی عیب سمجھتے تھے۔ لیکن کبھی کبھی خواجہ حافظ کی طرح بادشاہ وقت کے نام سے اپنے شعر کو شان و شکوہ دیتے تھے۔ چنانچہ ولی کی تصنیفات میں سے ایک غزل میں کہتے ہیں ؎

دل ولی کا لے لیا دِلّی نے چھین　　　جا کہو کوئی محمد شاہ سوں

رسالہ نور المعرفت تصوّف میں بھی لکھا ہے۔ اُس میں کہتے ہیں کہ میں محمد نور الدّین صدّیقی سہروردی کے مُریدوں کا خاک پا ہوں اور شاہ سعداللہ گلشن کا شاگرد۔ مگر یہ نہیں لکھا کہ کس امر میں لطیفہ ولی نے اپنے جوشِ ریختہ گوئی میں ناصر علی سرہندی کو کہ علی تخلّص کرتے تھے۔ یہ شعر لکھا ؎

اُچھل کر جا پڑے جوں مصرعِ برق　　　اگر مطلع لکھوں ناصر علی کوں ٹو

ناصر علی نے جواب لکھا ؎

باعجازِ سخن گر اُڑ چلے وہ　　دکی ہرگز نہ پہنچے گا علی کوں[1]

اب ان کے کلام سے اس وقت کی زبان کا نمونہ دکھانا ضرور ہے لیکن ہمارے تذکرہ نویسوں کا دستور ہے کہ جب شاعر کا حال لکھتے ہیں تو اس کے اشعار انتخاب کر کے لکھتے ہیں۔ اور یہ ظاہر ہے کہ فیضانِ سخن رائگاں نہیں جاتا۔ نظیر کے بعض اشعار ایسے ہیں کہ میر سے پہلو مارتے ہیں۔ پس اگر نظیر کا ذکر لکھ کر اس کے چند شعر منتخب لکھ دیئے تو ناواقف سوائے اس کے کہ نظیر کو میر کا ہم پلّہ شاعر سمجھے اور کیا تصور کر سکتا ہے۔ بڑی قباحت اس میں یہ ہے کہ شاعر خود میں اور ہم میں سالہا سال کے عرصے حائل ہیں۔ پس ان شعروں سے اُن کی اصلی قابلیت اور طبیعت کی کیفیت کھُلنی مشکل ہو جاتی ہے۔ میں ان کے دیوان سے نیک نیتی کے ساتھ چند غزلیں پوری کی پوری لکھ دوں گا تاکہ اصلیتِ حال ظاہر ہو جائے۔ ہاں اگر کسی کی پوری غزلیں ہاتھ ہی نہ آئیں تو مجبوری ہے۔

تجھ لب کی صفت لعلِ بدخشاں سے کہوں گا　　جادو ہے ترے نین غزالاں سے کہوں گا

دی حق نے تجھے بادشہی حُسنِ نگر کی　　یہ کشورِ ایراں میں سلیماں سے کہوں گا

زخمی کیا ہے مجھ تری پلکوں کی انی نے　　یہ زخم ترا خنجرِ بھالاں سے کہوں گا

بے صبر نہ ہو اے ولی اس درد سے ہرگاہ
جلدی سے ترے درد کی درماں سے کہوں گا

دیکھنا ہر صبح تجھ رُخسار کا　　ہے مطالع مطلعِ انوار کا

یاد کرنا ہر گھڑی تجھ یار کا　　ہے وظیفہ مجھ دلِ بیمار کا

آرزوئے چشمۂ کوثر نہیں　　تشنہ لب ہوں شربتِ دیدار کا

[1] دیکھو تذکرۂ فائق۔ مگر شعر مذکور عزیز دکنی کے دیوان میں بھی درج ہے۔ شاید ناصر علی پر سے اُسے یہ چوٹ بُری لگی اس لئے جواب میں یہ شعر کہہ دیا۔ لوگوں میں ناصر علی کے نام سے مشہور ہو گیا۔

عاقبت ہو ویگا کیا معلوم نہیں — دل ہوا ہے مبتلا دیدار کا
بلبل و پروانہ کرنا دل کے تئیں — کام تھا تجھ چہرۂ گلنار کا
کیا کہے تعریف دل ہے بےنظیر — حرف حرف اُس مخزنِ اسرار کا
گر ہوا ہے طالبِ آزادگی — بند مت ہو سبحۂ زنّار کا
مسندِ گل منزلِ شبنم ہوئی — دیکھ رُتبہ دیدۂ بیدار کا

اے ولی ہونا سریجن پر نثار
مدّعا ہے چشم گوہر بار کا

بے وفائی نہ کر خدا سوں ڈر — جگ ہنسائی نہ کر خدا سوں ڈر
ہے جُدائی میں زندگی مشکل — آ جدائی نہ کر خدا سوں ڈر
اُس سوں جو آشنائی ڈر کرے — آشنائی نہ کر خدا سوں ڈر
آرسی دیکھ کر نہ ہو مغرور — خود نمائی نہ کر خدا سوں ڈر

اے ولی غیر آستانۂ یار
جبہہ سائی نہ کر خدا سوں ڈر

جب صنم کو خیالِ باغ ہوا — طالبِ نشۂ فراغ ہوا
فوج عشاق دیکھ ہر جانب — نازنیں صاحبِ دماغ ہوا
پان سیں تجھ لباں کے سُرخ ہوا — جگرِ لالہ داغ داغ ہوا
دلِ عشاق کیوں نہ ہو روشن — جب خیالِ صنم چراغ ہوا

اے ولی گلبدن کوں باغ میں دیکھ
دلِ صد برگ باغ باغ ہوا

جس وقت اے سریجن تو بے حجاب ہو گا — ہر ذرّہ تجھ جھلک سوں جوں آفتاب ہو گا
مت جا چمن موں لالہ بلبل پہ مت ستم کر — گرمی سوں تجھ نگہ کی گل گل گلاب ہو گا
مت آئینہ کو دکھلا اپنا جمال روشن — تجھ مکھ کی تاب دیکھے آئینہ آب ہو گا

نکلا ہے وہ ستمگر تیغِ ادا کوں لے کر — سینے پہ عاشقاں کے اب فتحیاب ہوگا

رکھتا ہے کیوں جفا کو مجھ پر روا اے ظالم — محشر میں تجھ سیں آخر میرا حساب ہوگا

مجھ کو ہوا ہے معلوم اے مست جامِ خوبیں — تجھ انکھڑیاں کے دیکھے عالم خراب ہوگا

ہاتف نے یوں دیا ہے مجھ کو ولی بشارت

اُس کی گلی میں جا تو مقصد شتاب ہوگا

تخت جس بے خانماں کا دشت ویرانی ہوا — سر اوپر اُس کے بگولا تاجِ سلطانی ہوا

تجھ حسنِ عالمتاب کا جو عاشق و شیدا ہوا — ہر خوبرو کے حسن کے جلوہ سوں بے پروا ہوا

سینہ میں اب محشر تلک کوئی نین کو بسرائے وہ — جو تجھ نین کے جام سوں مے پی کے متوالا ہوا

پایا ہے جگ میں اے ولی وہ لیلیٰ مقصود کوں — جو عشق کے بازار میں مجنوں نمن رسوا ہوا

لیا ہے جب سوں موہن نے طریقہ خود نمائی کا — بڑھا ہے آرسی پر تب سے رنگ حیرت فزائی کا

کیوں کرے آلودۂ زر جگ منے صیدِ مراد — ہے عَلم اوپر معطّل صورتِ شیرِ طلا

ملبوس رکھتے ہیں دائم فکرِ رنگِ عاشقاں — ہے مہوّس کی صدا سینہ میں تدبیرِ طلا

یو کنارے مکھ پہ تیرے اے زلیخا وش نہیں — سورۂ یوسف کو لکھا گردِ تحریرِ طلا

ہوا ہے سیر کا مشتاق بیتابی سوں من میرا — چمن موں آج آیا ہے مگر گل پیرہن میرا

خمارِ ہجر نے جس کے دیا ہے دردِ دل مجھ کوں — رکھوں نشہ نمن انکھیاں میں گر وہ مست ناز آوے

عجب نین گر گلاں دوڑیں پکڑ کر صورتِ قمری — اداسوں جیب چمن بھیتر وہ سروِ سرفراز آوے

تا حشر رہے بوئے گلاب اُس کے عرق سے — جس بر منے یکبار وہ گل پیرہن آوے

سایہ ہو مرا سبز برنگِ پرِ طوطی — گر خواب میں وہ نوخط شیریں بچن آوے

کھینچیں ایس انکھیاں منے جوں کحل جواہر — عشّاق کے گر ہاتھ وہ خاکِ چرن آوے

ہرگز سخنِ سخت کو لاوے نہ زباں پر — جس دہن میں یکبار وہ نازک بدن آوے

یہ تل تجھ مکھ کے کعبہ میں مجھے اسود حجر دِستا[1] — زنخداں میں ترے مجھ چاہِ زمزم کا اثر دِستا

[1] دِستا (دکھائی دیتا ہے یعنی نظر آتا ہے۔ یا معلوم ہوتا ہے۔ اور یہ ساری غزل اسی ردیف میں ہے۔

شاہ مبارک آبرو

آبرو تخلص ۔ مشہور شاہ مبارک ۔ اصلی نام نجم الدین تھا ۔ شاہ محمد غوث گوالیاری کی اولاد میں تھے ۔ باوجودیکہ بڈّھے شاعر اور پُرانے مشاق تھے ۔ مگر خان آرزو کو اپنا کلام دکھا لیتے تھے ۔ دیکھو اُس زمانہ کے لوگ کیسے منصف اور طالبِ کمال تھے ۔ یہ اپنے زمانہ میں مسلّم الثبوت شاعر زبان ریختہ کے اور صاحب ایجاد نظم اُردو کے شمار ہوتے تھے ۔ وہ ایسا زمانہ تھا کہ اخلاص کو ۔ وسواس ۔ اور دھڑ ۔ کو ۔ سر ۔ کا قافیہ باندھ دیتے تھے اور عیب نہ سمجھتے تھے ۔ ردیف کی کچھ ضرورت نہ تھی ۔ البتّہ کلام کی بنیاد ۔ ایہام اور ذو معنیین لفظوں پر ہوتی تھی ۔ اور محاورہ کو ہرگز ہاتھ سے نہ جانے دیتے تھے ۔ وہ ایک آنکھ سے معذور تھے ۔ اُن کی اور مرزا مظہر جان جاناں کی خوب خوب چشمکیں ہوتی تھیں ۔ بلکہ اُن میں آنکھ کا بھی اشارہ ہو جاتا تھا ۔ چنانچہ مرزا صاحب نے کہا ۔

آبرو کی آنکھ میں اک گانٹھ ہے　　　آبرو سب شاعروں کی الخ

شاہ آبرو نے کہا ؎

کیا کروں حق کے کئے کو ۔ کور میری چشم ہے　　　آبرو جگ میں رہے تو جان جاناں پشم ہے

شاہ کمال بخاری اُس زمانہ میں ایک بہت بزرگ شخص تھے ۔ اُن کے بیٹے میر مکھن تھے اور پاکباز تخلّص کرتے تھے ۔ شاہ مبارک کو ان سے بہت محبّت تھی ۔ چنانچہ اکثر شعروں میں اُن کا نام یا کچھ اشارہ ضرور کرتے تھے ۔ دیکھنا کیا مزے کا سجع کہا ہے ۔

ع ۔ عالم ہمہ دوغ است و محمد مکھن

ان کی علمی استعداد کا حال معلوم نہیں ۔ کلام سے ایسا تراوش ہوتا ہے کہ صرف و نحو عربی کی جانتے تھے اور مسائل علمی سے بے خبر نہ تھے ۔

ان کے شعر جب تک میر مکھن پاکباز کے کلام سے چپڑے نہ جائیں تب تک

مزانہ دیں گے۔ اس لئے پہلے ایک شعر اُن کا ہی لکھتا ہوں۔ اُس زمانہ کے خیالات پر خیال کرو۔

مجھے درد والم گھیرے ہے نت میرے میاں صاحب ۔۔۔ خبر لیتے نہیں کیسے ہو تم میرے میاں صاحب

آیا ہے صبح نیند سے اُٹھ رسمسا ہوا ۔۔۔ جامہ گلے میں رات کا پھولوں بسا ہوا

کم مت گنو یہ بخت سیاہوں کا رنگ زرد ۔۔۔ سونا وہ ہے کہ ہووے کسوٹی کسا ہوا

انداز میں زیادہ نپٹ ناز خوش نہیں ۔۔۔ جو خال اپنے حد سے بڑھا سو مسا ہوا

قامت کا سبھ جگت منیں بالا ہوا ہے نام ۔۔۔ قد اس قدر بلند تمہارا رسا ہوا

دل یوں ڈرے ہے زلف کا مارا بھونک سیں ۔۔۔ رسّی سے اژدہا کا ڈرے جوں ڈسا ہوا

اے آبرو اوّل توں سمجھ بیچ عشق کا ۔۔۔ پھر زلف سے نکل نہ سکے دل پھنسا ہوا

پلنگ کوں چھوڑ خالی گود سیں اُٹھ گئے سجن میتا ۔۔۔ چتر کاری لگے کھانے ہمن کو گھر ہوا چیتا

لگائی مینوا کی طرح سیں جب وہ چھڑی تم نے ۔۔۔ تج اوروں کو لیلے ہاتھ اپنے ایک تو بیتا

جُدائی کے زمانہ کی سجن کیا زیادتی کہئے ۔۔۔ کہ اس ظالم کی جو ہم پر گھڑی گزری سو جگ بیتا

لگا دل یار سیں تب اسکو کیا کام آبرو ہم سیں ۔۔۔ کہ زخمی عشق کا پھر مانگ کر پانی نہیں پیتا

نین سیں نین جب ملائے گیا ۔۔۔ دل کے اندر مرے سمائے گیا

نگہِ گرم سیں مرے دل میں ۔۔۔ خوش نین آگ سیں لگائے گیا

تیرے چلنے کی سُن خبر عاشق ۔۔۔ یہی کہتا ہوا کہ ہائے گیا

سہو کر بولتا تھا مجھ سیتی ۔۔۔ بوجھ کر بات چھپائے گیا

آبرو ہجر بیچ مرتا تھا ۔۔۔ مُکھ دکھا کر اُسے جلائے گیا

یہ رسم ظالمی کی دستور ہے کہاں کا ۔۔۔ دل چھین کر ہمارا دشمن ہوا ہے جاں کا

ہر یک نگہ میں ہم سے کرنے لگے ہو نوکیں ۔۔۔ کچھ یو تری آنکھوں نے پکڑا ہے طور بانکا

تجھ راہ میں ہوا ہے اب تو رقیب کتّا ۔۔۔ بو پائے کر ہماری آ باندھتا ہے ناں کا

خند دل کے طور گویا دیوارِ قہقہا ہے ۔۔۔ پھر کر پھرے نہ لڑکا جو اس طرف کو جھانکا

رستم دبلے کے دل میں ڈالے اچھو سو پانی ۔۔۔ دیکھے اگر بھواں کی تلوار کا جھماکا

فاسق کے دل پہ ڈالی جب نفس بدنے بَرکی　　رجوا‌ڑے کی گلی کا تب جا غبار پھانکا

سب عاشقوں میں ہم کوں مژدا ہے آبرو کا
ہے قصد گر تمھارے دل بیچ امتحاں کا

مت قہر سیتی ہاتھ میں لے دل ہمارے کوں　　جلتا ہے کیوں پکڑتا ہے ظالم انگارے کوں
ٹک باغ میں شتاب چلو لے بہارِ حُسن　　گل چشم ہو رہا ہے تمھارے نظارے کوں
مرتا ہوں ٹک رہی ہے رمق آ درس دکھا　　جا کر کہو ہماری طرف سیں پیارے کوں
میں آپڑا ہوں عشق کے ظالم بھنور کے بیچ　　تختہ اوپر چلاوتے ہیں جی کے آرے کوں

اپنا جمال آبرو کوں ٹک دکھاؤ آج
مدّت سے آرزو ہے درس کی بچارے کوں

رستم اس مرد کی کھاتے ہیں قسم زوروں کی　　تاب لاوے جو کوئی عشق کے جھک جھوروں کی
قدرداں حُسن کے کہتے ہیں اُسے دل مُردہ　　سانورے چھوڑ کے جو چارہ کرے گوروں کی
گانٹھ کاٹی ہے مِرے دل کی تری انکھیاں نے　　دو پلک نہیں یہ کترنی ہے مگر چوروں کی
لبِ شیریں پہ سریجن کے نہیں خطِ سیاہ　　ڈار چھوٹی ہے مٹھائی پہ شکر خوروں کی
جھلکیں سورج منیں جوں خطِ شعاع کے شعلے　　دیکھ انکھیوں منیں یہ لال جھمک ڈوروں کی
قادری جب کہ تجی بر میں سجن بوٹہ دار　　عقل چکّر میں گئی دیکھ کے چھب موروں کی

آبرو کوں نہیں کم ظرف کی صحبت کا دماغ
کس کو برداشت ہے ہر وقت کے بکتوروں کی

افسوس ہے کہ مجھ کوں وہ یار بھول جاوے　　وہ شوق وہ محبت وہ پیار بھول جاوے
رستم تیری آنکھوں کے ہووے اگر مقابل　　انکھیوں کو دیکھ تیری. تلوار بھول جاوے
عارض کے آئینہ پر تمنّا کے سبز خط ہے　　طوطی اگر جو دیکھے گلزار بھول جاوے
کیا شیخ دیکھا برہمن جب عاشقی میں آویں　　تسبی کرے فراموش زنّار بھول جاوے
یوں آبرو بناوے دل میں ہزار باتاں　　جب تیرے آگے آوے گفتار بھول جاوے

پانی پت[1] آج چھوڑ جو گنور تم چلے
تو راہ بیچ جائیو جاناں سنبھال کے

کنجی اس کی زبانِ شیریں ہے
دل مرا قفل ہے بتاسے[2] کا

کیوں چھپا ظلمت میں گراس لب سے شرمندہ نہ تھا
جان کچھ پانی مرے ہے چشمۂ حیواں کے بیچ

اب دین ہوا زمانہ سازی
آفاق تمام دہریا ہے

تم نے بجاڈنے کو جب ہاتھ بیچ نَے لی
مجنون ہو گئے سب یہ اس طرح کی لَے لی

سجا ہے نرگسی بوٹے کا جامہ
کرے کیونکر نہ مجھ سے چشم پوشی

آبرو کے قتل کو حاضر ہوئے کس کے کمر
خون کرنے کو چلے عاشق پہ تہمت باندھ کر

دو بھواں سے لگے ہیں جس کے نین
وہ کہاتا ہے حاجی الحرمین

عزت ہے جوہری کی ۔ جو قیمتی ہو جوہر
ہے آبرو ہمن کو جگ میں سخن ہمارا

جہاں اُس خو کی گرمی تھی ۔ نہ تھی واں آگ کو عزت
مقابل اسکے ہو جاتی ۔ تو آتش لکڑیاں کھاتی

اسی انداز میں حافظ عبدالرحمٰن خاں **احسان** نے ایک شعر کہا ہے اور کیا خوب کہا ہے۔

دُختِ رز سے کہا میخانے میں شب رندوں نے
آج تو خوب ہی کھٹکے تری سوکن کو لگے

یعنی بھنگیڑ خانے میں بھنگڑوں نے خوب سبزیاں گھونٹیں اور طرّے اُڑائے تم بھی وہاں یاروں پر نظرِ عنایت کرو۔

مبارک نام تیرے آبرو کا کیوں نہ ہو جگ میں
اثر ہے یو ترے دیدار کی فرخندہ فالی کا

نالہ ہمارے دل کا ۔ غم کا گواہ بس ہے
اپنے تئیں شہادت انگشت آہ بس ہے

تمھارے لوگ کہتے ہیں کمر ہے
کہاں ہے ۔ کس طرح کی ہے ؟ کدھر ہے ؟

تخلص آبرو برجا ہے میرا
ہمیشہ اشکِ غم سے چشم تر ہے

اس ناتواں کی حالت واں جا کہے ہے اُڑ کر
میرا یہ رنگ رو ہے گویا کمھی کبوتر

---

[1] پانی پت ۔ گنور ۔ سنبھالکہ قصبوں کے نام ہیں ۔ سنبھالکے کی پرانی سرا اب بھی قائم ہے ۔ اگلے وقتوں میں یہاں رستہ لٹتا تھا اور راہزنی اس کی مشہور تھی، اور سرا بھی استحکام اور وسعت میں ہمیشہ ضرب المثل ہے۔

[2] چھوٹا سا قفل مقدار میں بتاسے کے برابر یا اس سے کچھ بڑا ہوتا تھا ۔ بتاسے کا قفل کہلاتا تھا۔

مکھن میاں خفا ہیں فقیروں کے حال پر آتا ہے ان کو جوش جمالی کمالؒ پر
پھرتے تھے دشت دشت دیوانے کدھر گئے وے عاشقی کے ہائے زمانے کدھر گئے

خدمتگار خاں بادشاہی خواجہ سرا تھا اور سرکار شاہی میں بڑا صاحب اختیار تھا۔ اکثر بادشاہی نوکر اُس کی سخت گیری۔ اور بدمزاجی سے دق رہتے تھے۔ انہیں بھی اُس سے کام پڑتا تھا۔ کبھی آسانی سے مطلب نکل آتا تھا۔ کبھی دشواری سے۔ چنانچہ ایک موقع پر یہ شعر کہا ؎

یارو خدمتگار خاں خوجوں کے بیچ ہے تو مستثنٰے ولیکن منقطع

شیخ شرف الدین مضمونؔ

مضمون تخلص۔ شیخ شرف الدین نام۔ شیخ فریدالدین شکر گنج کی اولاد میں تھے جاجمو علاقۂ اکبرآباد وطن اصلی تھا دلّی میں آرہے تھے۔ اصل پیشہ سپاہ گری تھا۔ تباہیٔ سلطنت سے ہتھیار کھول کر مضمون باندھنے پر قناعت کی اور زینت المساجد میں ایسے بیٹھے کہ مرکر اُٹھے۔ اس عالم میں بھی ایک خوش مزاج۔ بااخلاق۔ یارباش آدمی تھے۔ دور اوّل کے اُستادوں میں شمار ہوتے تھے۔ اور انہی کا انداز تھا۔ کیوں کہ رواج یہی تھا اور خاص و عام اسی کو پسند کرتے تھے ٭

اس زمانہ کے لوگ کس قدر منصف اور بے تکلف تھے۔ باوجودیکہ مضمون سن رسیدہ تھے اور خان آرزو سے عمر میں بڑے تھے مگر انھیں غزل دکھاتے تھے اور اصلاح لیتے تھے۔ نزلہ سے دانت ٹوٹ گئے تھے اس لئے خان موصوف انھیں شاعر بیدانہ کہتے تھے۔

مرزا رفیع نے بھی ان کا عہد پایا تھا۔ چنانچہ جب انتقال ہوا تو مرزا نے غزل

ؔ جلالی اور جمالی دو قسم کے اسمائے الٰہی ہیں اور شیخ کمال بخاری ان کے دادا کا نام ہے ٭

کبھی جس کا مطلع و مقطع بھی لکھتا ہوں ؎

لئے مے اُٹھ گیا ساقی۔ مرا بھی پُر ہو پیمانہ		الٰہی کس طرح دیکھوں میں ان آنکھوں سے میخانہ
بنائیں اُٹھ گئیں یارو غزل کے خوب کہنے کی		گیا مضمون دنیا سے رہا سودا سو مستانہ

اور اس سے معلوم ہو سکتا ہے کہ اس صاحب کمال کے کمال نے زمانہ کے دل میں کیا اثر پیدا کیا تھا۔
ہائے دلّی خدا تجھے بہشت نصیب کرے۔ کیسے کیسے لوگ تیری خاک سے اُٹھے اور خاک میں مل گئے۔ استاد مرحوم نے ایک دن فرمایا کہ شیخ مضمون کے زمانہ میں کوئی امیر باہر سے محل میں آئے اور پلنگ پر لیٹ گئے۔ ایک بڑھیا ماما نئی نوکر ہوئی تھی۔ وہ حقہ بھر لائی اور سامنے رکھا۔ نواب صاحب کی زبان پر اس وقت یہ شعر کا مضمون تھا +

ہم نے کیا کیا نہ ترے عشق میں محبوب کیا		صبر ایوب کیا گریۂ یعقوب کیا

ماما سُن کر بولی۔ الٰہی تیری امان۔ اس گھر میں تو آپ ہی پیغمبری وقت پڑ رہا ہے۔ بیچارے نوکروں پر کیا گزرے گی؟ چلو بابا یہاں سے[۱] +

تعجب یہ ہے کہ اسی مضمون کو مخلص کاشی نے بھی باندھا ہے ؎

در فراق تو چہا اے بتِ محبوب کنم		صبر ایوب کنم گریۂ یعقوب کنم
کرے ہے دار کو کامل بھی سرتاج		ہوا منصور سے نکتہ یہ حل آج[۲]
خط آگیا ہے اُس کے۔ مری ہے سفید ریش		کرتا حساب تک بھی وہ ملنے میں شام صبح

[۱] دلّی میں غریب مفلس فقیر کسی سے سوال کیا کرتے تھے تو کہا کرتے تھے۔ عیالدار ہیں مفلس ہیں۔ ہم پر پیغمبری وقت پڑا ہے۔ للہ کچھ دو۔ اور اصل اس کی یہ تھی کہ جس پر سخت مصیبت پڑتی ہے وہ زیادہ خدا کا پیارا ہوتا ہے۔ اور چونکہ پیغمبر سب سے زیادہ خدا کے پیارے ہیں اس لئے اُن پر زیادہ مصیبتیں پڑتی ہیں۔ جو مصیبتیں پیغمبروں پر پڑی ہیں وہ دوسرے پر نہیں پڑیں۔ رفتہ رفتہ پیغمبری وقت اور پیغمبری مصیبت کے معنے سخت مصیبت کے ہو گئے۔ دیکھو ایسی ایسی باتیں اُس زمانہ میں کس قدر عام تھیں کہ بڑھیاں عورتیں اور مامائیں اُن سے نکتے اور لطیفے پیدا کرتی تھیں۔ اب اللہ ہی اللہ ہے +

[۲] حل آج اور حلاج میں حضرت نے تجنیس مرکب رکھی ہے +

کریں کیوں نہ شکر لبوں کو مُرید — کہ دادا ہمارا ہے بابا فرید[1]

ہنسی تیری پیارے پھلجھڑی ہے — یہی غنچہ کے دل میں گلجھڑی ہے

میکدہ میں گر سراپا فعل نامعقول ہے — مدرسہ دیکھا تو واں بھی فاعل و مفعول ہے

تیر مژگاں برستے ہیں مجھ پر — آب پیکاں کا اس طرف ہے ڈھال

محمّد شاکر ناجی

ناجی تخلص سیّد محمّد شاکر نام۔ شرافت اور سیادت کے ساتھ۔ کمال شاعری سے اپنے زمانہ میں نامور تھے۔ اہل سخن نے اُنھیں طبقۂ اوّل کے ارکان میں تسلیم کیا ہے۔ عمدۃ الملک امیر خاں جو محمد شاہی دربار کے رکن اعظم تھے۔ یہ اُن کے نوبت خانہ کے داروغہ تھے۔ شاہ مبارک آبرو نے جہاں ان کے کلام کی تعریف کی ہے وہاں اس امر کا بھی اشارہ کیا ہے ؎

سخن سنجاں میں ہیگا آبرو آج — نہیں شیریں زباں کا شاکر سریکا

مگر تیز مزاج اور شوخ طبع بہت تھے۔ راہ چلتے سے اُلجھتے تھے اور جس کے گرد ہوتے تھے اُسے پیچھا چھڑانا مشکل ہو جاتا تھا۔

زلف کے حلقہ میں دیکھا جب سے دانہ خال کا — مرغ دل عاشق کا تب سے صید ہے اس جال کا

گندمی چہرہ کو اپنے زلف میں پنہاں کر — ہندواں سُن کر مبادا شور ڈالیں کال کا

بنواؤں سے نہ مل اے مو کرمت پیچ کھا — مونڈ سر لڑکوں کو کرتے ہیں وہ اپنا بال کا

مہر کی بیجا ہے چرخِ بے مروّت سے اُمید — پیرزالوں سے نہیں احسان کر اک بال کا

ایک دم ناجی کے تئیں آ کر جلالے پیار سے
جاں بلب ہوں اے سجن یہ وقت نہیں اہمال کا

---

[1] شادی کی ریت رسموں میں بادا فرید کا بٹڑا عورتوں کی شرع کا ایک واجب مسئلہ ہے۔ مزا یہ ہے کہ اس میں شکر ہی ہو اور مٹھائی جائز نہیں۔

نہ تھا آزردہ دل کنعاں سے یوسف ڈرا تھا خواب میں اخواں سے یوسف
نہ ہوتا راہ میں گلبانگ شہرت جو روتا راہ میں خاراں سے یوسف
کوئیں میں جا پڑا یعقوب کا دل چلا جب نالہ و افغاں سے یوسف
زلیخا نے بہائے شیر کے نیل جو رد بادرد کے انجواں سے یوسف

جو ناجیؔ ڈر نہ ہوتا معصیت کا
نہ گردن پھیرتا فرماں سے یوسف

دیکھ مومن تری کمر کی طرف پھر گیا مانی اپنے گھر کی طرف
جن نے دیکھے ترے لب شیریں نظر اُن کی نہیں شکر کی طرف
ہے محال ان کا دام میں آنا دل ہے ان سب بتاں کا زر کی طرف
تیرے رخسار کی صفائی دیکھ چشم دانا نہیں ہنر کی طرف

حشر میں پاکباز ہے ناجیؔ
بدعمل جائیں گے سقر کی طرف

اے صبا کہہ بہار کی باتیں اُس بُتِ گلعذار کی باتیں
کس پہ چھوڑے نگاہ کا شہباز کیا کرے ہے شکار کی باتیں
چھوڑتے کب ہیں نقدِ دل کو صنم جب یہ کرتے ہیں پیار کی باتیں
معشوق مل کر آپ سے گر دلبری کرے گر دیو ہو تو چاہئے آدم گری کرے
شیشہ اُسی کے آگے بجا ہے کہ رُخ ستی پیالے کو جب لے ہاتھ میں رشکِ پری کرے
اس قد سے جب چمن میں خراماں ہو تو اے جاں شمشاد و سرو آکے تری چاکری کرے
دشمن ہے دیں کا خال سیہ مکھ اوپر ترے ہندو سے کیا عجب ہے اگر کافری کرے

جو کوئی کہ ناجیؔ صاف کرے دل کا آئینہ
وہ عاشقی کے ملک میں اسکندری کرے

کفن ہے سبز ترے گیسوؤں کے ماروں کا مکان غم ہے ترے در کے بیقراروں کا

رکھے اس لالچی لڑکے کو کوئی کب تک بہلا چلی جاتی ہے فرمائش کبھی یہ لا کبھی وہ لا

موزوں قد اُس کا چشم کی میزاں میں جب تلا طوبیٰ تب اُس سے ایک قدم اَوکسا ہوا

اگر ہو وہ بُتِ ہندو کبھو اشنان کو ننگا بھنور میں دیکھ کر جمنا اُسے غوطہ میں جا گنگا

دیکھ ہم صحبت کی دولت سے نہ رکھ چشم اُمید لب صدف کے تر نہیں ہر چند گوہر میں ہے آب

بھا سستا ہو یا مہنگا نہیں موقوف غلے پر یہ سب خرمن اُسی کے ہیں خدا ہے جسکے پلّے پر

انگوٹھی لعل کی کرتی قیامت آج گر ہوتی جنھوں کی آن پہنچی۔ رلطوے وہ ایک چھلّے پر

اُس رُخ روشن کی جو کوئی یاد میں مشغول ہے مہر اُس کے روبرو سورج مکھی کا پھول ہے

نہ ٹوکو یار کو کہ خط رکھاتا یا منڈاتا ہے مرے نشّہ کی خاطر لطف سے سبزی بناتا ہے

جہاں دلبند ہو ناصح وہاں آوے خلل کرنے رقیب ناولد ناجی گویا لڑکوں کا بابا ہے

نادری چڑھائی اور محمد شاہی لشکر کی تباہی میں خود شامل تھے۔ اس وقت دربار دہلی۔ رنگ۔ شرفا کی خواری۔ پاجیوں کی گرم بازاری اور اس ہندوستانیوں کی آرام طلبی اور ناز پروری کو ایک طولانی مخمّس میں دکھایا ہے۔ افسوس کہ اس وقت دو بند اس کے ہاتھ آئے ؎

لڑے ہوئے تو برس بیس ان کو بیتے تھے دعا کے زور سے دائی دوا کے جیتے تھے

شرابیں گھر کی نکالی مزے سے پیتے تھے نگار و نقش میں ظاہر گویا کہ چیتے تھے

گلے میں ہنسلیاں بازو اوپر طلا کے نال

قضا سے بچ گیا مرنا نہیں تو ٹھانا تھا کہ مَیں نشان کے ہاتھی اُپر نشانا تھا

نہ پانی پینے کو پایا وہاں نہ کھانا تھا ملے تھے دھان جو لشکر تمام چھانا تھا

نہ ظرف و مطبخ و دُکان نہ غلّہ و بقّال

محمد احسن ۔ احسن

احسن تخلص۔ محمد احسن نام۔ یہ بھی انہی لوگوں کے ہم عصر و ہم زبان ہیں۔ چنانچہ ایک غزل اور دو شعر ان کے ہاتھ آئے وہی لکھے جاتے ہیں:-

صبا کہیو اگر جاوے ہے تو اُس شوخ دلبر سوں | کہ کر کر قول پرسوں کا گیا برسوں ہوئے پرسوں[1]
عجب نہیں ابر گر جلتوں کو تو جل سوں جلا دیگا | گیا ہے یار میرے برسوں کہتا ہے کہ ہیں برسوں
یو قاصد وعدہ کرتا ہے جو پرسوں کا کہ پھر آوے | کبھو تو پھر نہیں آتا گلی اس کی سیتی پرسوں
ترس تجھ کو نہیں اے شوخ اتنی کیا ہے ترسائی | ترے دیدار کو ہیں دیدۂ تر سوں کھڑا ترسوں
ترے تِل سوں مجھے نت بھنہ کا سودا ہے اے ظالم | عجب نہیں ہے اگر تو تیل نکساوے مرے سر سوں
زلف تیری معلّق ہے عطر فتنے سیتی ظالم | الٰہی آبرو رکھیو پڑا ہے کام اَبتر سوں
غرض اس طرح سے کبھی بھی احسن تجھ سوں آبن آوے | جواب اب آبرو کب کہہ سکے مضمون بہتر سوں

نام نستعلیق کا ہے اُس بُتِ خوشخط کی زُلف | ہم تو کافر ہوں اگر بندہ نہ ہوں اسلام کے

یہی مضمون خط ہے احسن اللہ | کہ حُسنِ خوبرویاں عارضی ہے

نازک بدن پہ اپنے کرتے ہو تم جو غرہ | ہوسی کمر نے تجھ کو فرعون سا بنایا

غلام مصطفیٰ خاں یکرنگ

یکرنگ تخلص۔ غلام مصطفیٰ خاں نام۔ قدیمی تذکروں میں اُنھیں طبقۂ اوّل کے شاعروں میں لکھا ہے۔ مگر یہ لوگ با انصاف ہوتے تھے۔ اور ہر کلام کے حسن و قبح کو خوب سمجھتے تھے اس لئے باوجود کہن سالی اور کہنہ مشاقی کے آخر عمر میں کلام اپنا مرزا جان جاناں مظہر کو بھی دکھاتے تھے۔ لیکن جو کلام ان کا موجود ہے۔ بزرگوں سے سُنا اور تذکروں میں بھی دیکھا بڑے مشاق تھے اور اپنے وقت میں سب انھیں خوش فکر

[1] یعنی بغل سے گیا برسوں گذر گئے۔

اور باکمال مانتے تھے۔ اور لطف یہ ہے کہ تخلص کی طرح عالم آشنائی میں بھی یکرنگ دیکھتا تھے:۔

یکرنگ پاس اور سخن کچھ نہیں بساط | رکھتا ہوں دو نین ۔ جو کہو تو نذر کروں
زبانِ شکوہ ہے مہدی کا ہر بات | کر طوباں نے لگائے ہیں مجھے ہاتھ
اُس زلف کا یہ دل ہے گرفتار بال بال | یکرنگ کے سخن میں خلاف ایک مو نہیں
جو کوئی توڑتا ہے غنچۂ گل | دل بلبل شکستہ کرتا ہے
یکرنگ نے تلاش کیا ہے بہت ولے | مظہر سا اس جہاں میں کوئی میرزا نہیں
پارسائی اور جوانی کیونکہ ہو | ایک جاگہ آگ پانی کیونکہ ہو
نہ کہو یہ کہ یار جاتا ہے | دل سے صبر و قرار جاتا ہے
مگر خبر لینی ہے تو لے صیاد | ہاتھ سے یہ شکار جاتا ہے

مرزا جان جاناں کی استادی اور اپنی شاگردی کا اشارہ ہے :۔

جس کے درد دل میں کچھ تاثیر ہے | گر جواں بھی ہے تو میرا پیر ہے
لگے ہیں خوب کانوں میں بتوں کے | سخن یکرنگ کے گویا گُہر ہیں
اس کو مت جانو میاں اوروں کی طرح | مصطفٰے خاں آشنا یکرنگ ہے
جُدائی سے تری اے صندلی رنگ | مجھے یہ زندگانی دردِ سر ہے

خدا جانے اِن باتوں کو سُن کر ہمارے شائستہ زمانہ کے لوگ کیا کہیں گے۔ کچھ تو پروا بھی نہ کریں گے۔ اور کچھ واہیات کہہ کر کتاب بند کر دیں گے۔ مگر تم اِن باتوں کو ہزل نہ سمجھو۔ ایک پل کی پل آنکھیں بند کر لو۔ اور تصوّر کی آنکھیں کھول دو۔ دیکھو وہی محمد شاہی عہد کے کہن سال درباری لباس پہنے بیٹھے ہیں۔ اور باوجود اُس متانت و معقولیت کے مسکرا مسکرا کر آپس میں اشعار پڑھتے ہیں اور مزے لیتے ہیں۔ کیا اُن نورانی صورتوں پر تمھیں پیار نہ آئے گا کلام کی تاثیر میٹھے دے گی! محبّت کا جوش ان کے ہاتھ نہ چوم لے گا؟

وہ صورتیں الٰہی کس ملک بستیاں ہیں | اب جن کے دیکھنے کو آنکھیں ترستیاں ہیں

میرے دوستو غور کے قابل تو یہ بات ہے کہ آج جو تمھارے سامنے ان کے کلام کا حال ہے

کل اوروں کے سامنے یہی تمھارے کلام کا حال ہوتا ہے۔ ایک وقت میں جو بات مطبوع خلائق ہو۔ یہ ضرور نہیں کہ دوسرے وقت میں بھی ہو۔ خیال کرو۔ انھی بزرگوں کے جلسہ میں آج ہم اپنی وضع اور لباس سے جائیں۔ اور اپنا کلام پڑھیں تو وہ سنجیدہ اور برگزیدہ لوگ کیا کہیں گے۔ ایک دوسرے کی طرف دیکھیں گے اور مسکرائیں گے۔ گویا سفلہ اور چھچھورا سمجھیں گے۔ ان بزرگوں کو کوئی بات ناپسند ہوتی تھی تو اتنا ہی اشارہ کافی ہوتا تھا۔ اس خیال کی تصدیق اور اس زمانہ کی وضع ولباس دکھانے کو دریائے لطافت کی ایک عبارت نقل کرتا ہوں۔ سید انشا جن کی کوئی بات ظرافت سے خالی نہیں۔ ایک اپنے عہد کے بڈھے میر صاحب کی تقریر ایک کسی کے ساتھ لکھتے ہیں۔ یہ دونوں دلی کے رہنے والے ہیں۔ اور لکھنؤ میں باتیں کر رہے ہیں:۔

بی نورن کہتی ہیں:۔

اجی آؤ میر صاحب! تم تو عید کا چاند ہو گئے۔ دلی میں آتے تھے۔ دو دو پہر رات رات تک بیٹھتے تھے اور ریختے پڑھتے تھے۔ لکھنؤ میں تمھیں کیا ہو گیا کہ کبھی صورت بھی نہیں دکھاتے۔ اب کے کربلا میں کتنا میں نے ڈھونڈا۔ کہیں تمھارا اثر آثار معلوم نہ ہوا۔ ایسا نہ کیجیو کہیں آٹھوں[1] میں بھی نہ چلو۔ تمھیں علی کی قسم آٹھوں میں مقرر چلیو۔

اب جس رنگ سے سید انشا میر صاحب کی تصویر کھینچتے ہیں اوّل اُسے ملاحظہ فرمایئے۔ اور اتنا خیال اور بھی رہے کہ یہ پراتم دیرینہ سال۔ اُس زمانہ کے ایک خوش طبع رنگیں مزاج شخص تھے۔ کوئی ثقہ۔ متقی۔ پرہیزگار نہ تھے۔ باوجود اس کے تازہ اوضاع واطوار۔ اور نئی رفتار و گفتار پر کیا خیالات رکھتے تھے۔

بیان صورت میر موصوف اینکہ۔ سیاہ رنگ۔ کوتاہ قد۔ فربہ گردن۔ دراز گوش۔ بندش دستار بطور بعض قند سازان کہنہ۔ رنگش سبز یا اگرئی۔ والا اکثر سفید۔ گاہے گلسرخ ہم در گوشۂ دستار می زنند۔ وجامۂ مصطلح ہندوستان (نہ جامۂ لغوی) در بر مبارک

[1] آٹھوں کا میلہ لکھنؤ میں بڑی دھوم دھام کا ہوتا تھا۔

بسیار پاکیزہ می باشد۔ چوں لباس باریک (ازیں جہت کہ برائے زناں مقرر است) نمی پوشند رخت پوشاکی ملازمانِ شریف ایشاں اکثر گندہ است۔ لیکن قیمت دو نیم روپیہ را یک تھان تمام در یک جامہ صرف می شود۔ چولی زیر پستان۔ بالائے آں دوپٹہ پستو یہ۔ دامن بر زمین جاروب می کشد۔ دسی ہم بر دندان مبارک می مالند و پاپوش از سقرلات زرد و در حاق وسط آں ستارہ از تارہائے طلائے غیر خالص۔ حالانکہ ہیئت معلوم شد طرز کلام باکسی باید شنید۔ میر صاحب فرماتے ہیں :-

اجی بی نورن۔ یہ کیا بات فرمائی ہو۔ تم اپنے جوڑے کی چین ہو۔ پر کیا کہیں جب سے دلی چھوڑی ہے کچھ جی افسردہ ہو گیا ہے اور شعر پڑھنے کو جو کہو تو کچھ لطف اس میں بھی نہیں رہا کہ مجھ سے سنئے۔ ریختے میں استاد میاں ولی ہوئے ان پر توجہ شاہ گلشن صاحب کی تھی۔ پھر میاں آبرو اور میاں ناجی اور میاں حاتم۔ پھر سب سے بہتر مرزا رفیع السودا اور میر تقی صاحب پھر حضرت خواجہ میر درد صاحب برّد اللہ مرقدہٗ جو میرے بھی استاد تھے۔ وہ لوگ تو سب مر گئے اور ان کی قدر دانی کرنے والے بھی جان بحق تسلیم ہوئے۔ اب لکھنؤ کے جیسے چھوکرے ہیں۔ ویسے ہی شاعر ہیں۔ اور دلی میں بھی ایسا ہی کچھ چرچا ہے۔ تخم تاثیر صحبت اثر۔ سبحان اللہ۔ یہ کون میاں جرأت بڑے شاعر۔ پوچھو تو تمھارا کام کس دن شعر کہنا تھا اور رضا بہادر کا کونسا کلام ہے۔ اور دوسرے میاں مصحفی کہ مطلق شعور نہیں رکھتے۔ اگر پوچھیے کہ خوب نہ ایک عمر دراز کی ترکیب تو ذرا بیان کرو تو اپنے شاگردوں کو ہمراہ لے کر لڑنے آتے ہیں۔ اور میاں حسرت کو دیکھو۔ اپنا عرق بادیان اور شربت انارین چھوڑ کے شاعری میں آکے قدم رکھا ہے۔ اور میر انشاء اللہ خاں بچارے میر ماشاء اللہ خاں کے بیٹے آگے پریزاد تھے۔ ہم بھی گھورنے کو جانتے تھے۔ اب چند روز سے شاعر بن گئے۔ مرزا مظہر جان جاناں صاحب کے روزمرہ کو نام رکھتے ہیں۔ اور سب سے زیادہ ایک اور سنئے کہ سعادت یار طہماسپ کا بیٹا۔ انوری ریختہ آپ کو جانتا ہے۔ رنگین تخلص ہے۔ ایک قصہ کہا ہے۔ اس مثنوی کا نام دلپذیر رکھا ہے۔ رنڈیوں کی بولی اس میں باندھی ہے۔ میر حسن بدر زہر کھایا ہے۔ ہرچند اس مرحوم کو بھی کچھ شعور نہ تھا۔

بدرِ منیر کی مثنوی نہیں کہی گویا سانڈے کا تیل بیچتے ہیں۔ بھلا اس کو شعر کیونکر کہئے۔ سارے لوگ دلّی کے لکھنؤ کے رنڈی سے لے کر مرد تک پڑھتے ہیں ؎

چلی واں سے دامن اٹھاتی ہوئی کڑے کو کڑے سے بجاتی ہوئی

سو اُس بچارے رنگین نے بھی اسی طور پر قصہ کہا ہے۔ کوئی پوچھے کہ بھائی تیرا باپ رسالدار مُسلّم۔ لیکن بچارا برچھی بھالے کا ہلانے والا۔ تیغے کا چلانے والا تھا تو ایسا قابل کہاں سے ہوا اور شہدپن جو بہت مزاج میں رنڈی بازی سے آگیا ہے۔ تو ریختہ کے تئیں چھوڑ کر ایک ریختی ایجاد کی ہے۔ اس واسطے کہ بھلے آدمیوں کی بہو بیٹیاں پڑھ کر مشتاق ہوں۔ اور ان کے ساتھ اپنا منہ کالا کرے۔ بھلا یہ کلام کیا ہے

ذرا گھر کو رنگیں کے تحقیق کر لو یہاں سے ہے کے پیسے ڈولی کہارو

مرد ہو کر کہتا ہے۔ ع کہیں ایسا نہ ہو کمبخت میں ماری جاؤں۔ اور ایک کتاب بنائی ہے اُس میں رنڈیوں کی بولی لکھی ہے جس میں اوپر والیاں۔ چلیں۔ اوپر والا چاند۔ اُجلی وغیرہ وغیرہ۔ ان بزرگوں کو خیال کرو کہ مصحفی اور سید انشا اور جرأت کو اپنی جگہ پر یہ کچھ کہتے تھے۔ پھر ہم اپنی بولی۔ اور اپنی تراش اور ایجادوں کو قبولیت دوام کا سارٹیفکیٹ دے کر کس طرح نازاں ہوں ؟ جو نئی اُمت ہمارے بعد آئے گی وہ کیا کچھ نہ میکھ نکالے گی خیر اپنے اپنے وقت پر یوں ہی ہوا ہے اور یوں ہی ہوتا رہے گا ؛

خاتمہ

پہلا دور برخاست ہوتا ہے۔ ان مبارک صدر نشینوں کو شکریہ کے ساتھ رخصت کرنا چاہئے کہ مبارک جانشینوں کے لئے جگہ خالی کر کے اُٹھے ہیں۔ ایجاد کے بانی اور اصلاح کے مالک تھے۔ ملک کی زبان میں جو کچھ کیا اچھا کیا۔ جو کام باقی ہے اچھے نکتہ پردازوں کے لئے چھوڑ چلے ہیں۔ ہر مکان جلسہ کے بعد درہم برہم معلوم ہوتا ہے مگر یہ اس طرح سجا کر چلے ہیں کہ جو ان کے بعد آئیں گے آرائش و زیبائش کے انداز سوچ سوچ کر پیدا کریں گے اب زیادہ گفتگو کا موقع نہیں کہ دورِ دوم کے زیب دینے والے آن پہنچے ؛

دُوسرا دَور

تمہید

دُوسرا دَور شروع ہوتا ہے. اس فصل میں زبان کے حُسنِ قدرتی کے لئے موسمِ بہار ہے. یہ وقت سبب ہے کہ مضامین کے پھول گلشن فصاحت میں اپنے قدرتی جوبن دکھا رہے ہیں۔ حُسنِ قدرتی کیا شے ہے؟ ایک لطف خداداد ہے جس میں بناؤ سنگار کا نام بھی آجائے تو تکلّف کا داغ سمجھ کر سات سات پانی سے دھوئیں ان کا گلزار نیچر کی گلکاری ہے۔ صنعت کی دستکاری یہاں آکر قلم لگائے تو ہاتھ کاٹے جائیں۔ اس میں تو کلام نہیں کہ یہ باکمال بھی ایک ہی شہد کی مکھی ہیں۔ اور معلوم ہوتا ہے کہ دریائے محبّت میں ڈوبے ہوئے ہیں۔ مگر اس خوبی کا وصف کسی زبان سے ادا نہیں ہوتا کہ جو کچھ دل میں ہوتا ہے جوں کا توں ادا کر دیتے ہیں۔ خیالی رنگوں سے طوطے مینا نہیں بناتے۔ ہاں طوطی و بلبل کی طرح صاف زبان اور قدرتی الحان لائے ہیں۔ انھوں نے اپنے نغموں میں گٹکری۔ اینچ پلٹی۔ تان کسی گویتے سے لے کر نہیں ڈالی۔ تم دیکھنا بے تکلّف بولی اور سیدھی سادی باتوں سے جو کچھ دل میں آئے گا ایسا بے ساختہ کہہ دیں گے کہ سامنے تصویر کھڑی کر دیں گے اور جب تک سُننے والے سُنیں گے کلیجے پکڑ کر رہ جائیں گے۔ اس کا سبب کیا؟ وہی بیساختہ پن جس کے سادہ پن پر ہزار بانکپن قربان ہوتے ہیں۔ ؏ ہے حُسن وہی جس میں بیساختہ پن نکلے۔ اُن کی اصلاح نے بہت سے لفظ ولی کے عہد کے نکال ڈالے مگر پھر بھی بھلا رے۔ اور گھیرے گھیرے۔ اور ہرے ہے۔ بجائے مرتا ہے اور دوانہ بجائے دیوانہ۔ اور میاں اور۔ فقط۔ جان۔ کا لفظ۔ بجائے معشوق موجود ہے۔ متاخرین اس کی جگہ جانِ جاں یا جاناں۔ یا۔ یار۔ یا۔ دوست۔ یا۔ دلبر۔ وغیرہ وغیرہ بولنے لگے۔ مگر موہن

دور دوم میں نہ رہا۔ سجن رہا۔ اور تل گیا۔ یعنی جل گیا۔ اور بل گیا یعنی صدقہ گیا۔ اور من بجائے دل بھی ہے۔

سید انشا ایک جگہ بعض الفاظ مذکورہ کا ذکر کر کے لکھتے ہیں کہ اس عہد کی گفتگو میں اس قسم کے الفاظ شرفا بولتے تھے۔ پروٹھا بجائے پراٹھا۔ اور دھیر بجائے آہستہ۔ یا متوقف۔ اور بمعنی طرف۔ اور بھیچک بمعنی حیران (یہ دو لفظ سودا نے بھی باندھے ہیں) اور۔ تکوں۔ بجائے۔ کو۔ (یا اپنے تئیں کو) اور جانے ہارا۔ بجائے۔ جانے والا۔ اور فرمائتا ہے۔ بجائے۔ فرماتا ہے۔ اور جائتا ہے بجائے۔ جاتا ہے۔

شاہ حاتم

دستور دُنیا کا یہ ہے کہ بیٹا باپ کے نام سے اور شاگرد اپنے نامی اُستاد کے نشان سے روشناس ہوتا ہے۔ مگر اس حاتم کو نصیبے کا بھی حاتم کہنا چاہیے جو اس نام سے نشان دیا جائے کہ وہ اُستاد سودا کا تھا۔ خوشا نصیب اُس باپ کے جس کی نسل کمال سے وہ فرزند پیدا ہو کہ خانوادۂ کمال کے لئے باعث فخر شمار کیا جائے۔ ان کا تخلص حاتم اور شیخ ظہور الدین نام تھا۔ والد کا نام فتح الدین تھا۔ خود کہا کرتے تھے کہ ۔ظہور۔ میرے تولّد کی تاریخ ہے۔ رہنے والے خاص شاہ جہاں آباد کے تھے۔ یہ معلوم نہیں کہ بزرگ ان کے کہاں سے آئے تھے کسی تذکرہ سے ان کی علمیت تحصیلی کا حال معلوم نہیں ہوتا ہے۔ نہ کچھ ان کے کلام سے ثابت ہوتا ہے مگر اس قدر استعداد ضرور رکھتے تھے کہ ان کی انشا پردازی میں خلل نہیں آنے دیتی۔ اور یہ جوہر اُس عہد کے شریف خاندانیوں کے لئے عام تھا۔ اصل حال یہ ہے کہ بعد عالمگیر کے جب اولاد میں کشاکشی ہوئی اور سلطنت تباہ ہو گئی تو جو شرفا منصب دار اور عہدہ دار تھے ۔ روز کے فسادوں سے دل شکستہ ہو گئے ۔ خصوصاً جبکہ

اُدھر مرہٹہ نے۔ ادھر سکھ نے زور پکڑا اور قیام سلطنت کی طرف سے لوگ بالکل مایوس ہوئے تو اکثروں نے نوکری چھوڑ کر بسبب بے علمی کے مختلف حرفے اور پیشے اختیار کر لئے۔ اور بعض لوگ باوجودیکہ صاحب علم تھے۔ مگر دنیا سے دل برداشتہ ہو کر چھوڑ ہی بیٹھے +

شاہ حاتم پہلے سپاہی پیشہ تھے۔ عمدۃ الملک امیر خاں کی مصاحبت میں عزت اور فارغ البالی بلکہ عیش و عشرت سے بسر کرتے تھے۔ اور چونکہ محمد شاہی دور تھا اس لئے آئین زمانہ کے بموجب جو جو اس وقت کے نوجوانوں کے شوق تھے سب پورے کرتے تھے۔ دلی میں قدم شریف کے پاس میر بادل علی شاہ کا تکیہ ایسے رند مشرب لوگوں کا ٹھکانا تھا۔ یہ بھی وہاں جایا کرتے تھے۔ چنانچہ فقیر کی صحبت نے ایسا اثر کیا کہ انھیں کے مُرید ہو گئے۔ رفتہ رفتہ سب گناہوں سے توبہ کی بلکہ زمانہ کی گردش نے دُنیا کے تعلقات سے بھی توبہ کروادی۔ توکل پر گزارہ کیا اور فقط ایک رومال اور ایک پتلی سی چھڑی جو کہ ہندوستان کے فقرائے آزاد منش کا تمغہ ہے وہ پاس رہ گئی۔

شاہ موصوف باوجودیکہ نہایت مہذب اور متین تھے اور عمر میں بھی سن رسیدہ ہو گئے تھے مگر بہت خوش مزاج اور نہایت خلیق اور ظریف تھے +

فقیری اختیار کر لی تھی مگر بانکوں[1] کی طرح دوپٹہ سر پر ٹیڑھا ہی باندھتے تھے۔

---

[1] لفظ بانکہ اگرچہ آج کل ہر ایک شخص بولتا ہے۔ مگر اس کی اصلیت سے بہت کم لوگ واقف ہیں۔ یہ دلی میں ایک خاص فرقہ تھا۔ چنانچہ سید انشاء اللہ خاں مرحوم ایک مقام پر ان کی تصویر کھینچتے ہیں "بانکہ ہا در ہر شہری باشند۔ خواہ در دہلی۔ خواہ در بلاد دکن۔ خواہ در بلاد بنگالہ۔ خواہ در شہرہائے پنجاب ہمہ را یک وضع و یک لباس می باشد۔ کج ادا کج راہ رفتن۔ و خود را بسیار دیدن۔ و حرف ش را مذکر ادا کردن شعار ایشان است۔ چنانچہ ہماری بکری را ہمارا بکرا گویند۔ مثل افغاناں در شہر۔ دستار و زلف۔ و طلیل۔ و اوچے۔ گفتن ایشاں مبدل نمی شود +

راج گھاٹ کے رستہ میں قلعہ کے نیچے شاہ تسلیم[1] کا تکیہ تھا وہاں کچھ چمن تھے۔ کچھ درختوں کا سایہ تھا۔ سامنے فضا کا میدان تھا۔ شام کو وہاں جا کر بیٹھا کرتے تھے اور چند احباب اور شاگردوں کے ساتھ شعر و سخن کا چرچا رکھتے تھے۔ چنانچہ ۵۰ برس تک اس معمول کو نباہ دیا۔ گرمی۔ جاڑا۔ برسات۔ آندھی جائے۔ مینہ جائے وہاں کی نشست قضا نہ ہوتی تھی۔ اہل دہلی کے قدیمی بزرگوں کا دستور تھا کہ جو ایک دفعہ اختیار کر لیتے تھے۔ پھر اسے مرتے دم تک نباہ دیتے تھے۔ اور اسے وضع داری یا پاس وضع کہتے تھے۔ ایک قانون تھا کہ آئین شریعت کے برابر پہلو مارتا ہوا جاتا تھا۔ ایسی پابندیاں بعض معاملات میں استقلال بن کر ملک اور اہل ملک کے لئے قابل فخر ہوتی ہیں۔ اور بعض جزئیات میں تکلیف بیجا ہو کر۔ خاندانوں اور گھرانوں کو بلکہ عام ہو کر ملک کو برباد کر دیتی ہیں +

شیخ غلام ہمدانی مصحفی اپنے تذکرہ میں ان کی شاعری کی ابتدا یہ لکھتے ہیں کہ ۲ سنہ محمد شاہی عہد میں ولی کا دیوان دکن سے دہلی میں آیا۔ اس زمانے کے حال بموجب وہی غنیمت تھا۔ اس واسطے خاص و عام میں اس کا بہت چرچا ہوا +

شاہ حاتم کی طبیعتِ موزوں نے بھی جوش مارا۔ شعر کہنا شروع کیا۔ اور ہمت و لیاقت سے اُسے انتہا کو پہنچایا۔ پہلے رمز تخلص کرتے تھے۔ پھر حاتم ہو گئے۔ یہ پہلے شعرائے طبقۂ اوّل کے منتخب شاعروں میں تھے۔ اس وقت بھی زبان انکی فصیح۔ اور کلام بے تکلف تھا۔ مگر پھر طبقۂ دوم میں داخل ہو گئے۔ کلیات ان کا بہت بڑا ہے۔ جو اکثر زبان قدیم کی غزل اور قصائد۔ اور رباعیات و مثنوی وغیرہ پر مشتمل ہے۔ کتب خانہائے قدیم لکھنؤ اور دہلی میں دیکھا گیا۔ وہ شاہ آبرو اور ناجی کی طرز میں ہے لیکن آخر عمر میں کلیات مذکور سے خود انتخاب کر کے ایک چھوٹا

[1] شاہ تسلیم ایک نیک مرد فقیر تھے اور خود شاعر تھے۔ چونکہ ان کا تکیہ بھی ایک دلکشا اور با فضا مقام تھا اس لئے اکثر شعر و سخن کے شائق بھی صبح و شام وہاں جا کر بیٹھا کرتے تھے۔ سعادت یار خاں رنگین۔ محمد امان نثار جن کا ذکر۔ میر کے حال میں ہے۔ اور اکثر شعرا حاتم کے شاگرد تھے +

دیوان مرتب کیا۔ اُس کا نام دیوان زادہ رکھا۔ کیونکہ پہلے دیوان سے پیدا ہوا تھا۔
وہ صاحب زادہ بھی پانچ ہزار سے زیادہ کا مال بغل میں دبائے بیٹھا ہے۔ بہر حال
یہ کارنامہ ان کا استحقاق پیدا کرتا ہے۔ کہ طبقۂ دوم سے نکال کر طبقۂ سوم کی اوّلیت
کا طرہ اُن کی زیب دستار کیا جائے۔ یا اس کا ایک رکن اعظم قرار دیا جائے۔
اُنھوں نے دیوان زادہ پر ایک دیباچہ بہت مفید لکھا ہے۔ خلاصہ اس کا یہ ہے:
"خوشہ چین خرمن سخنوران عالم۔ بصورت محتاج و بمعنی حاتم کہ از ۱۱۲۹ھ تا
۱۱۶۹ھ کہ چہل سال باشد۔ عمر دریں صرف کردہ۔ در شعر فارسی پیرو مرزا صائب و در
ریختہ ولی را استاد می داند۔ اوّل کسیکہ دریں فن دیوان ترتیب نمودہ او بود۔ فقیر دیوان
قدیم پیش از نادر شاہی در بلاد ہند مشہور دارد۔ بعد ترتیب آں تا امروز کہ ۳
عزیز الدین عالمگیر ثانی باشد۔ ہر رطب و یابس کہ از زبان ایں بے زبان برآمدہ۔ داخل
دیوان قدیم نمودہ کلیات مرتب ساختہ۔ از ہر ردیف دو سہ غزلے و از ہر غزل دو سہ بیتے
و رائے مناقب و مرثیہ۔ و چند مخمس و مثنوی از دیوان قدیم نیز داخل نمودہ۔ بہ دیوان زادہ
مخاطب ساختہ۔ و سرخیٔ غزلیات بسہ قسم منقسم ساختہ۔ یکے طرحی۔ دوم فرمائشی۔ سوم
جوابی۔ تا تفریق آں معلوم گردد۔ و معاصران فقیر۔ شاہ مبارک آبرو۔ و شرف الدین
مضمون۔ و مرزا جان جاناں مظہر۔ و شیخ احسن اللہ احسن۔ و میر شاکر ناجی ۔ و
غلام مصطفےٰ یکرنگ است۔ و لفظ در۔ و۔ بر۔ و۔ از۔ و۔ الفاظ و افعال دیگر کہ
در دیوان قدیم خود تقید دارد۔ درینولا از دہ دوازدہ سال اکثر الفاظ را از نظر انداختہ
و الفاظ عربی و فارسی کہ قریب الفہم و کثیر الاستعمال باشند۔ و روزمرّہ دہلی کہ
مرزایان ہند و فصیحان رند۔ در محاورہ آرند منظور دارند۔" پھر ایک جگہ کہتے ہیں ۔
"زبان ہندی بھاکا را موقوف کردہ محض روزمرّہ کہ عام فہم و خاص پسند باشد اختیار
نمود و شمۂ از آں الفاظ کہ تقید دارد۔ بہ بیان می آرد۔ چنانچہ عربی و فارسی مثلاً تسبیح را
تسبی۔ و صحیح را صحی۔ و بیگانہ را بگانہ۔ و دیوانہ را دِوانہ و مانند آں۔ یا متحرک را ساکن

وساکن را متحرک۔ مَرَض را مَرْض و نیز الفاظ ہندی مثل نین سُو جگ۔ و۔ نیت و غیرہ۔ و۔ لفظ میرا۔ و۔ میرا۔ و ازیں قبیل کہ بر آں قباحت لازم آید۔ یا بجائے۔سی۔ سی۔ یا اُدھر را اودھر۔ و۔ کدھر را۔ کیدھر۔ کہ زیادتیِ حرف باشد۔ یا۔ بجائے۔ پر۔ پہ۔ یا۔ یہاں۔ را۔ یاں۔ و۔ وہاں۔ را۔ واں۔ کہ در مخرج تنگ بود۔ یا قافیہ را۔ باڑا۔ ہندی۔ مثل گھوڑا۔ و۔ بورا۔ و۔ دھڑ۔ و سر۔ و۔ مانند آں۔ مگر ہائے ہوز را بدل کردن با الف کہ از عام تا خاص در محاورہ دارند۔ بندہ دریں امر بمتابعت جمہور مجبور است۔ چنانچہ۔ بندہ۔ را۔ بندا۔ و پردہ را پردا۔ و آنچہ ازیں قبیل باشد و ایں قاعدہ را تا کے شرح دہد۔ مختصر کہ لفظے کہ غیر فصیح انشاء اللہ نخواہد بود"۔

مضمون ان کے صاف عاشقانہ عارفانہ ہیں۔ شعر آپس کی باتیں اور زبان شُستہ و رُفتہ ہے۔ لیکن لفظ اَب۔ اور۔ یہاں۔ وغیرہ زائد اکثر ہوتے ہیں۔ غرض اسی دیوان کے دیباچہ میں اپنے شاگردوں کی ذیل میں ۴۵ آدمیوں کے نام درج کرتے ہیں۔ اُنہی میں مرزا رفیع بھی ہیں۔ میاں ہدایتؔ[1] کی زبانی روایت ہے۔ کہ شاہ حاتم جب سودا کی غزل کو اصلاح دیتے تھے تو اکثر یہ شعر پڑھا کرتے تھے ؎

از ادب صائمؔ خموشم ورنہ در ہر وادیے | رُتبۂ شاگردیٔ من نیست اُستاد مرا

اور احباب سے کہتے تھے کہ یہ شعر صائب نے میری اُستادی اور مرزا رفیع کی شاگردی کے حق میں کہا ہے۔ لکھنؤ سے مرزا صاحب کے قصیدے اور غزلیں آتیں تو آپ دوستوں کو پڑھ پڑھ کر سُناتے اور خوش ہوتے +

سعادت یار خاں رنگین ان کے شاگرد رشید۔ اپنی مجالس رنگین میں لکھتے ہیں۔ کہ تیسرے پہر کو میں بھی اکثر شاہ صاحب کے پاس شاہ تسلیم کے تکیہ میں حاضر ہوا

---

[1] اُردو کے ایک فصیح اور باکمال شاعر تھے۔ خواجہ میر درد کے ہمعصر تھے اور ان سے اصلاح بھی لیتے تھے۔ چنانچہ انہی کا شعر ہے ؎ ہدایت کہا ریختہ جب سے ہم نے + رواج اُٹھ گیا ہند سے فارسی کا
سودا کے ذکر میں ایک لطیفہ ان کے حال سے متعلق ہے۔ دیکھو صفحہ ۱۷۱ +

کرتا تھا۔ ایک دن میاں محمد امان نثار۔ لالہ مکندرائے فارغ۔ مرزا حسن اکبر علی اکبر وغیرہ چند شاگرد خدمت میں موجود تھے۔ اور میری نومشقی کے دن تھے کہ حسب معمول وہاں حاضر ہوا۔ شاہ صاحب نے فرمایا کہ آج رات کو مطلع کہا ہے ؎

سر کو پٹکا ہے کبھو سینہ کبھو کوٹا ہے	رات ہم ہجر کی دولت سے مزا لوٹا ہے

میاں رنگین لکھتے ہیں۔ ابتدا سے میرے مزاج میں چالاکی بہت تھی اور شعور کم تھا۔ اپنی نادانی سے گستاخانہ بول اُٹھا کہ مصرع ثانی میں اس طرح ارشاد ہو تو اچھا ہو ؎

سر کو پٹکا ہے کبھو سینہ کبھو کوٹا ہے	ہم نے شب ہجر کی دولت سے مزا لوٹا ہے

شاہ صاحب بہت خوش ہوئے۔ میرا ہاتھ پکڑ کر اپنی طرف کھینچا۔ اور فرمایا آفرین آفرین۔ ہونہار بروا کے چکنے چکنے پات۔ انشاء اللہ تمھاری طبیعت بہت ترقی کرے گی۔ مشق نہ چھوڑنا۔ ان کے دوستوں میں سے ایک شخص بولے کہ صاحبزادے! استاد کے سامنے یہ گستاخی زیبا نہ تھی۔ حضرت نے پھر فرمایا کہ مضائقہ کیا ہے! واللہ میں دیوان میں اسی طرح لکھوں گا۔ بعد اس کے یہ قطعہ پڑھا ؎

من و آں سادہ دل کہ عیب مرا	ہمچو آئینہ رو برو گوید
نہ چو شانہ بصد زبان و دو رو	پس سر رفتہ مو بمو گوید

اس میں شک نہیں کہ یہ نیک نیتی اور دریا دلی شاہ حاتم کی قابل رشک ہے۔ کیونکہ شعراء میں اپنے لئے خود پسندی۔ اور دوسرے کے لئے ناتواں بینی۔ ایک ایسی عادت ہے کہ اگر اسے قدرتی عیب کہیں تو کچھ مبالغہ نہیں۔ بلکہ شاگردوں کو استادوں سے دست و گریباں ہوتے دیکھا۔ یہ وصف یا اس فرشتہ سیرت میں پایا۔ یا مرزا محمد علی ماہر میں کہ مرزا محمد افضل سرخوش کے اُستاد تھے +

نقل ۔ مرزا محمد علی ماہر عہد عالمگیر میں ایک مشاق اور مسلّم الثبوت شاعر اپنے زمانہ کے تھے۔ اور مرزا سرخوش ان کے قدیمی شاگرد تھے مگر طبع مناسب اور کثرت مشق سے یہ بھی درجۂ کمال کو پہنچ گئے۔ مرزا ماہر اکثر فرمائش کر کے ان سے شعر کہوا لیا کرتے تھے۔

اور یہ سعادت سمجھ کر کہہ دیا کرتے تھے۔ سرخوش لکھتے ہیں کہ انھوں نے ایک مثنوی بہار یہ تحفۃ العراقین کے ڈھنگ میں لکھی تھی چنانچہ مطلع میں نے کہہ دیا کہ ؎

اے بر سر نامہ گل ز نامت باران بہار۔ شیخ جامت

اور میرے ساقی نامہ کے لئے اُنھوں نے مطلع کہہ دیا ؎

بود نامہ نشہ بخش ادا کہ بر سر کشد جام حمدِ خدا

پھر لکھتے ہیں کہ ایک شب قطب الدین مائل کے ہاں شعرا کا جلسہ تھا۔ چاندنی رات تھی۔ سب مہتابی پر بیٹھے تھے۔ مجھ سے شعر کی فرمائش کی۔ میں نے اُسی دن مطلع کہا تھا وہ پڑھا۔

کے تواند دید زاہد جام صہبا بشکند مے پرد رنگم حبابے گر بدریا بشکند

سب نے تعریف کی اور آدھی رات تک اس کے مصرع لوگوں کی زبان پر تھے۔ حکیم محمد کاظم صاحب تخلص کہ اپنے تئیں مسیح البیان بھی کہتے تھے۔ بار بار یہ شعر پڑھتے تھے۔ اور کہتے تھے کہ خدا کی قدرت ہے۔ ہندوستان میں ایک شخص پیدا ہوا! اور فارس کی زبان میں ایسے شعر کہے! دوسرے دن دانشمند خاں کے مکان پر جلسہ ہوا۔ وہاں میں نہ تھا مگر مرزا ماہر موجود تھے۔ سب نے پھر اس مطلع کا ذکر کیا۔ اور کہا کہ تمھارا شاگرد کتنا خوش فکر نکلا ہے۔ اس کے شعر کی کیفیت میں عجب لطف سے رات کٹی۔ آفریں ہے آپ کی محنت پر خوب تربیت کیا۔ اُنھوں نے کہا کہ وہ میرے شاگرد نہیں باہم اتحاد ہے۔ وہ مجھے شعر دکھاتے ہیں میں اُنھیں شعر دکھاتا ہوں۔ حکیم نے کہا کہ سرخوش سے بارہا گفتگو آئی وہ باصرار کہتے تھے کہ میں شاگرد ہوں۔ ماہر نے کہا کہ بزرگ زادہ ہے جو چاہا کہہ دیا۔ مجھے اس کی استادی کی لیاقت کب ہے! دوسرے دن میں خدمت میں حاضر ہوا۔ فرمایا کہ تم نے اپنے تئیں میرا شاگرد کیوں کہا؟ مجھے تو فخر ہے کہ تم جیسا شخص میرا شاگرد ہو۔ مگر دُنیا میں ایسے بلند فکر لوگ بھی ہیں کہ "وہ مجھ کو اور میرے شعر کو خاطر میں نہیں لاتے ان کی نظروں میں میرے شاگرد کی کیا قدر و منزلت ہو گی۔ شعراء خدا کے شاگرد ہیں ان کو کسی کی شاگردی کی پروا نہیں۔ شاہ حاتم کا ایک دیوان

فارسی میں بھی ہے۔ مگر بہت مختصر۔ میں نے دیکھا وہ ۱۱۶۹ھ کا خود ان کے قلم کا لکھا ہوا تھا۔ غزل ۹۰ صفحے رباعی و فرد وغیرہ ۶ صفحے۔ ولادت ان کی ۱۱۱۱ھ ہجری میں ہے۔ اور ۹۶ برس کی عمر میں ماہ رمضان ۱۲۰۷ھ میں دہلی میں فوت ہوئے۔ اور وہیں دلی دروازہ کے باہر دفن ہوئے۔ مگر مصحفی نے تذکرہ فارسی میں لکھا ہے کہ ۱۱۹۶ھ میں فوت ہوئے اور ۸۳ برس کی عمر پائی ☙

یار کا مجھ کو اس سبب ڈر ہے — شوخ ظالم ہے اور ستمگر ہے

دیکھ سرو چمن ترے قد کوں — خجل و پا بگل ہے بے بر ہے

حق میں عاشق کے تجھ لباں کا بچن — قند ہے نیشکر ہے شکر ہے

کیوں کے سب سے تجھے چھپا نہ رکھوں — جان ہے دل ہے دل کا اُتر ہے

مارنے کو رقیب کے حاتم
شیر ہے بَبَر ہے دھَنتَر ہے

یہاں طالعوں سے ملتا ہے پیارا — عبث دیکھے ہے زاہد استخارا

نئیں پایا ہوں ولے تجھ چشم کا بھید — نہ مانگوں گا کبھی ان کا اشارا

نہالِ دوستی کو کاٹ ڈالا — دکھا کر شوخ نے ابرو کا آرا

لیا اُس گلبدن کا ہم نے بوسہ — تو کیا چوما رقیبوں نے ہمارا

کئی عالم کئے ہیں قتل ان نے
کرے کیا ایکلا حاتم بچارا

چھپا نہیں جا بجا حاضر ہے پیارا — کہاں وہ چشم؟ جو ماریں نظارا

جدا نہیں سب ستی تحقیق کر دیکھ — ملا ہے سب سے اور سب سے ہے نیارا

مسافر اُٹھ تجھے چلنا ہے منزل — نبجے ہے کوچ کا ہر دم نقارا

مثالِ بحر موجیں مارتا ہے — کیا ہے جس نے اس جگ سوں کنارا

سیانے خلق سے یوں بھاگتے ہیں — کہ جوں آتش ستی بھاگے ہے پارا

سمجھ کر دیکھ سب جگ سیکھ ماہی کہاں ہیگا سکندر کہاں ہے دلرا
کہیں ہیں اہل عرفاں اُس کو جیتا جو مر کر عشق میں دنیا سوں ہارا
صفا کر دل کے آئینہ کو حاتم
دیکھا چاہے سجن گر آشکارا

جب سنا موتی نے تجھ دنداں کے موتی کا بہا آب میں شرمندگی سوں ڈوب جوں پانی بہا
مردماں کو دیکھ کر بسمل تیرے کوچہ کے بیچ ڈر گیا اور چشم سے آنسو کے چاہے خوں بہا
لب تمھارے سُرخ ہم نے تاڑ کر پوچھا تھا مول جوہری کہنے لگے یہ لعل ہیگا بے بہا
حاتم اس بے مہر نے مجھی نہ دی اس غم ستی
جا کنارے بیٹھ کر اس غم ستی دریا بہا

آب حیات جا کے کسو نے پیا تو کیا مانند خضر جگ میں اکیلا جیا تو کیا
شیریں لباں سوں سنگدلوں کو اثر نہیں فرہاد کام کوہ کنی کا کیا تو کیا
جلنا لگن میں شمع صفت سخت کام ہے پروانہ جوں شتاب عبث جی دیا تو کیا
ناسور کی صفت ہے نہ ہوگا کبھی وہ بند جرّاح زخم عشق کا آ کر سیا تو کیا
محتاجگی سوں مجھ کو نہیں ایک دم فراغ
حق نے جہاں میں نام کو حاتم کیا تو کیا

خال اس کے نے دل لیا میرا تل میں ان نے لہو پیا میرا
جان بیدرد کو ملا کیوں تھا آگے آیا مرے کیا میرا
اس کے کوچہ میں مجھ کو پھرتا دیکھ رشک کھاتی ہے آسیا میرا
نہیں شمع و چراغ کی حاجت دل ہے مجھ بزم کا دیا میرا
زندگی دردِ سر ہوئی حاتم
کب ملے گا مجھے پیا میرا

کاملوں کا یہ سخن مدت سوں مجھ کو یاد ہے جگ موں بے محبوب جینا زندگی برباد ہے

بندگی سوں سرو قد کی اک قدم باہر نہیں　سرو گلشن بیچ کہتے ہیں مگر آزاد ہے؟
بے مدد زلفوں کی اُسکے حسن نے قیدی کیا　صید دل بے دام کرنا صنعتِ اُستاد ہے
خلق کہتی ہے بڑا تھا عاشقی میں کوہکن　تجھ لبِ شیریں کی حسرت میں ہراک فرہاد ہے
دل نہاں پھرتا ہے حاتم کا نجف اشرف کے گرد
گو وطن ظاہر میں اس کا شاہجہاں آباد ہے
اے خردمند و مبارک ہو تمھیں فرزانگی　ہم ہوں اور صحرا ہو اور وحشت ہو اور دیوانگی
بے مروّت۔ بے وفا۔ بے دید اے ناآشنا　آشناؤں سے نہ کر بے رحمی و بیگانگی
ملک دل آباد کیوں کرتا ہے حاتم کا خراب
اے مرے بستی! خوش آتی ہے تجھے ویرانگی!

سراج الدّین علی خانِ آرزو

خانِ آرزو کو زبانِ اُردو پر وہی دعویٰ پہنچتا ہے جو کہ ارسطو کو فلسفۂ منطق پر ہے۔ جب تک کہ کل منطقی ارسطو کے عیال کہلائیں گے۔ تب تک اہلِ اُردو خانِ آرزو کے عیال کہلاتے رہیں گے۔ ان کا دلچسپ حال قابل تحریر تھا۔ لیکن چونکہ فارسی تصنیفات کی مہموں نے اُنھیں کوئی دیوان اُردو میں نہیں لکھنے دیا۔ اس لئے یہاں ان کے باب میں اس قدر لکھنا کافی ہے کہ خانِ آرزو وہی شخص ہیں جن کے دامنِ تربیت سے ایسے شائستہ فرزند پرورش پاکر اُٹھے جو زبانِ اُردو کے اصلاح دینے والے کہلائے اور جس شاعری کی بنیاد جگت اور ذو معنی لفظوں پر تھی اُسے کھینچ کر فارسی کی طرز اور ادائے مطالب پر لے آئے۔ یعنی مرزا جان جاناں۔ مرزا رفیع۔ میر تقی۔ خواجہ میر درد وغیرہ۔

خان آرزو اُردو کے شاعر نہ تھے۔ نہ اُس زمانہ میں اسے کچھ کمال سمجھتے تھے۔ البتہ بعض متفرق اشعار کہے تھے۔ وہ زمانہ کی گردشوں سے اس طرح گھس پس کر اُڑ گئے، کہ

آج کل کے لوگوں کو خبر بھی نہیں۔ میرے دیوانے دل نے جو استادوں کی زبان سے لیکر سینہ میں امانت رکھے۔ وہ کاغذ کے سپرد کرتا ہوں۔ یقین ہے کہ یہ امانت دار ضائع نہ کرے گا۔ خانِ موصوف نے ۱۱۶۹ھ میں رحلت کی۔ اصل وطن ان کے بزرگوں کا اکبرآباد ہے۔ مگر دلّی سے یہ خاص دل لگی رکھتے تھے۔ چنانچہ لکھنؤ میں انتقال کیا۔ لیکن ہڈیوں کی خاک دلّی میں آکر زمین کا پیوند ہوئی :-

کیا دن لگے ہیں دیکھو خورشید خاوری کو	آتا ہے ہر سحر اُٹھ تیری برابری کو
ہر کوئی مانتا ہے میری دلاوری کو	اُس تندخو صنم سے جب سے لگا ہوں ملنے
بیکار ہے اٹک نہ رہے دل تو کیا کرے!	تجھ زلف میں لٹک رہے دل تو کیا کرے!
چمن میں آج گویا پھول ہیں تیرے شہیدوں کے	رکھے سیپارۂ دل کھول آگے عندلیبوں کے
کیا حصار قلب دلبر نے کھلے بندوں کیا	کھول کر بندِ قبا کو غارت دل غارت کیا
آئینہ کے گلشن میں گھٹا جوم پڑی ہے	اُس زلفِ سیاہ فام کی کیا دھوم پڑی ہے
طوفان نوح بیٹھا گوشہ میں موج مارے	دریائے اشک اپنا جب سر بہ اوج مارے
بہارِ حُسن کو دی آب اُس نے جب چرس کھینچا	مرے شوخ خراباتی کی کیفیت نہ کچھ پوچھو
مے گلگوں کا شیشہ ہچکیاں لے لے کے رو دیگا	مغاں مجھ مست بن پھر خندۂ قلقل نہ ہو دیگا

باوجودیکہ عزت خاندان اور نفس کمالات کی حیثیت سے خانِ موصوف کو اُمرا و غربا سب معزز و محترم سمجھتے تھے۔ اور علم و فضل کے اعتبار سے قاضی القضاۃ کا عہدہ دربارِ شاہی سے حاصل کیا۔ مگر مزاج کی شگفتگی اور طبیعت کی ظرافت نے دماغ میں خودپسندی اور تمکنت کی بو نہیں آنے دی تھی۔ چنانچہ لطیفہ شاگردوں میں ایک نوجوان بچپن سے حاضر رہتا تھا۔ حُسن اتفاق یہ کہ چہرہ اُس کا نمک حُسن سے نمکین تھا۔ وہ کسی سبب سے

ل سودا نے اپنے تذکرہ میں اس شعر کو خان آرزو کے نام سے اس طرح لکھا ہے اور میر انشاء اللہ خاں نے اپنے دریائے لطافت میں قزلباش خان اُمید کے نام پر اسی شعر کو اس طرح لکھا ہے ؎

درخانۂ آئینہ گھٹا جوم پری ہے	از زلف سیاہِ تو بدل دوم پری ہے

اور بعض تذکروں میں اسی شعر کو میر معز فطرت کے نام سے لکھا ہے۔ واللہ اعلم +

چند روز نہ آیا۔ ایک دن یہ کہیں سرراہ بیٹھے تھے کہ وہ اُدھر سے گزرا۔ اُنھوں نے بلایا۔ شاید اُسے ضروری کام تھا کہ وہ عذر کر کے چلا۔ اُنھوں نے پھر روکا۔ اور بلا کر یہ شعر پڑھا کہ لطافت طبع سے اسی وقت شبنم کی طرح ٹپکا تھا ؎

یہ ناز یہ غرور لڑکپن ہیں تو د تھا کیا تم جوان ہو کے بڑے آدمی ہوئے

لطیفہ۔ ایک دن کہیں مشاعرہ تھا۔ ایک جانب میں چند فہمیدہ اور سخن شناس بیٹھے شعر و سخن سے دماغ تازہ کر رہے تھے۔ ایک شخص نے خان موصوف کی تعریف کی۔ اور اس میں بہت مبالغہ کیا۔ حکیم اُصلح الدین خاں مسکرائے اور کہا کہ ع

آرزو خوب است امّا اینقدر ہا خوب نیست

سب ہنسے اور خود خاں صاحب دیر تک اس مصرع لطیف کی داد دیتے رہے ؎

پیدا کہاں ہیں ایسے پراگندہ طبع لوگ افسوس تم کو میر سے صحبت نہیں رہی

اشرف علی خان فغاںؔ

فغاںؔ تخلص۔ اشرف علی خاں نام۔ احمد شاہ بادشاہ کے کوکہ تھے۔ بذلہ سنجی و لطیفہ گوئی کا یہ عالم تھا کہ زبان سے پھلجھڑی کی طرح پھول جھڑتے تھے۔ اسی لئے ظریف الملک کوکہ خاں خطاب تھا۔ اگرچہ شاعری پیشہ نہ تھے۔ مگر شعر کا مزہ ایسی بُری بلا ہے کہ اس کے چٹخارے کے سامنے سارے مزے بے مزہ ہو جاتے ہیں۔ چنانچہ وہ ایسے ہی صاحب کمالوں میں ہیں۔ ابتدائے عمر میں شعر گوئی کا شوق ہوا۔ طبیعت ایسی مناسب واقع ہوئی تھی کہ جبھی سے اس کام میں نام پیدا کیا۔ مصحفی نے اپنے تذکرہ میں قزلباش خاں امید کا شاگرد لکھا ہے۔ مگر ان کی اُردو ابھی

---

[1] گجرات احمد آباد کے سادات عظام کے خاندان سے تھے۔ سوداؔ کے دیوان پر جو دیباچہ ہے وہ انہیں کا لکھا ہوا ہے۔ خود شاعر تھے اور سید زین العابدین آشنا ان کا بیٹا بھی شاعر تھا۔ بعض لطائف خان موصوف کے سودا کے حال میں لکھے گئے +

سُن چکے۔ شاید فارسی میں اصلاح لی ہو۔ گلزار ابراہیمی میں لکھا ہے کہ ندیم کے شاگرد تھے اور خود بھی جابجا کہتے ہیں ؎

ہر چند اب ندیم کا شاگرد ہے فغاں ۔۔۔ دو دن کے بعد دیکھیو اُستاد ہو گیا

وحشتِ جنوں میں کیوں نہ پھروں میں برہنہ پا ۔۔۔ اب تو فغاںؔ ندیم مِرا رہنما ہوا

الغرض جب احمد شاہ دُرّانی کے حملوں نے ہندوستان کو تہ و بالا کر دیا۔ دِلّی میں دربار کا طور بے طور دیکھا تو مرشد آباد میں ایرج خاں کے چچا کا ستارہ اوج پر تھا ان سے ملنے گئے۔ اور وہاں سے علاقہ اودھ میں پہنچے۔ اس زمانہ میں دِلّی کا آدمی کہیں جاتا تھا تو لوگ ایسا سمجھتے تھے گویا پیرزادے آئے۔ بلکہ اس کی نشست برخاست کو سلیقہ اور امتیاز کا دستورالعمل سمجھتے تھے اِس وقت شاہ اودھ نواب وزیر ہی کہلاتے تھے۔ نواب شجاع الدولہ مرحوم حاکم اودھ ان کے ساتھ بہت تعظیم سے پیش آئے اور اعزاز و اکرام کے ساتھ رکھا۔ لیکن معلوم ہوتا ہے کہ یہ نازک مزاج بہت تھے اور زمانہ بھی ایسا تھا کہ ایسے مزاجوں کی نزاکتیں بیش جاتی تھیں چنانچہ ایک دن اختلاط میں ان کا کپڑا نواب کے ہاتھ سے جل گیا۔ یہ رنجیدہ ہو کر عظیم آباد چلے گئے۔ وہاں جا کر اس سے زیادہ عزّت پائی اور راجہ شتاب رائے کی سرکار میں اختیار اور اقتدار حاصل کیا۔ راجہ صاحب بھی علاوہ خاندانی بزرگی کے ان کے کمال ذاتی اور شیریں کلامی اور علم مجلسی کے سبب سے نہایت عزیز رکھتے تھے چنانچہ وہیں رہے اور باقی عمر خوشحالی میں بسر کر کے دُنیا سے انتقال کیا +

ان کے کمال کی سند اس سے زیادہ نہیں ہو سکتی کہ مرزا رفیع جیسے صاحب کمال اکثر ان کے اشعار مزے لے لے کر پڑھا کرتے تھے۔ اور بہت تعریف کیا کرتے تھے۔ حقیقت میں مرزا کا خود بھی یہی انداز تھا۔ کیونکہ ان کے کلام میں بھی ہندی کے محاورہ نے فارسیت کے ساتھ نئے لُطف سے پختگی پائی ہے۔ اور ہر خیال کو لطافت اور چوچلے کے ساتھ ادا کرتے ہیں۔ ان کے جس دیوان سے میری آنکھیں روشن ہوئیں

وہ میرے اُستاد ظاہرو باطن شیخ ابراہیم ذوق کے لڑکپن کا لکھا ہوا تھا۔ اگرچہ فغاں کی زبان اُسی زمانے کی زبان ہے مگر فن شاعری کے اعتبار سے نہایت بااصول اور برجستہ ہے اور الفاظ کی بندش ان کی مشق سخن پر گواہی دیتی ہے۔ مقدار میں دیوان درد سے کچھ بڑا تھا۔ مگر فقط غزلوں کا دیوان تھا۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کی طبیعت ایشیا کی شاعری کے لئے نہایت مناسب تھی۔ ان کے حالات سے معلوم ہوتا ہے کہ تیزی اور طرّاری کو ان کے مزاج سے وہ لگاؤ تھا جو بارود اور حرارت کو۔ لطیفہ گوئی اور حاضر جوابی زبان میں ایسی تھی جیسے تلوار میں جوہر۔

لطیفہ۔ ایک دن راجہ صاحب کے دربار میں غزل پڑھی جس کا قافیہ لالیاں اور جالیاں۔ سب سخن فہموں نے بہت تعریف کی۔ راجہ صاحب کی صحبت میں جگنو میاں ایک مسخرے تھے۔ ان کی زبان سے نکلا کہ نواب صاحب سب قافیے آپ نے باندھے مگر تالیاں رہ گئیں۔ انھوں نے ٹال دیا اور کچھ جواب نہ دیا۔ راجہ صاحب نے خود فرمایا کہ نواب صاحب! سنتے ہو؟ جگنو میاں کیا کہتے ہیں؟ انھوں نے کہا کہ مہاراج اس قافیے کو مبتذل سمجھ کر چھوڑ دیا تھا اور حضور فرمائیں تو اب بھی ہوسکتا ہے۔ مہاراج نے کہا کہ ہاں کچھ کہنا تو چاہئے۔ انھوں نے اسی وقت پڑھا ؎

جگنو میاں کی دُم جو چمکتی ہے رات کو　　　سب دیکھ دیکھ اُس کو بجاتے ہیں تالیاں

تمام دربار چمک اُٹھا اور میاں جگنو مدھم ہو کر رہ گئے۔

افسوس یہ ہے کہ اس قسم کے لطائف بڑھتے بڑھتے ان سے اور راجہ صاحب سے بھی شکر رنجی ہو گئی اس کی بنیاد یہ ہوئی کہ احمد شاہ دُرّانی نے جو سلطنت پر حملے کئے۔ ایک دن اُس کی دست درازی اور بے اعتدالیوں کا ذکر ہو رہا تھا۔ خدا جانے طنز سے یا سادہ مزاجی سے راجہ صاحب نے کہا کہ نواب صاحب! ملکہ زمانی کو احمد شاہ دُرّانی کیونکر لے گیا اُنھیں یہ بات ناگوار ہوئی۔ افسردہ ہو کر بولے کہ مہاراج جس طرح سیتا جی کو راون لے گیا تھا اُسی طرح وہ لے گیا۔ اس دن سے

دربار میں جانا چھوڑ دیا +

اُن کی لیاقت اور حُسن تدبیر کو اس بات سے قیاس کر سکتے ہیں کہ حکام فرنگ سے اُس عالم میں اس طرح رسائی پیدا کی کہ باقی عمر فارغ البالی اور خوش حالی میں گزاری۔ ۱۱۸۶ھ میں وفات پائی اور وہیں دفن ہوئے +

مبتلائے عشق کو اے ہمدماں شادی کہاں　　آ گئے اب تو گرفتاری میں آزادی کہاں

کوہ میں مسکن کبھی ہے اور کبھی صحرا کے بیچ　　خانۂ اُلفت ہو ویراں ہم کو آبادی کہاں

ایک میں تو کشتی سبیں خوش ہوں ولیکن مجھ سوا　　بیش جاوے گی مرے قاتل یہ جلادی کہاں

کاش آجاوے قیامت اور رکھے دیوان حشر

وہ فغاں جو ہے گریباں چاک فریادی کہاں

خط دیجیو چھپا کے ملے وہ اگر کہیں　　لینا نہ میرے نام کو لے نامہ بر کہیں

بادِ صبا توں عقدہ کشا اس کی ہوجیو　　مجھ سا گرفتہ دل اگر آوے نظر کہیں

اتنا وفور خوش نہیں آتا ہے اشک کا　　عالم کوں مت ڈبوئیو اے چشم تر کہیں

میری طرف سے خاطر صیاد جمع ہے　　کیا اُڑ سکے گا طائر بے بال و پر کہیں

تیری گلی میں خاک بھی چھانی کہ دل ملے　　ایسا ہی گم ہوا کہ نہ آیا نظر کہیں

رونا جہاں تلک تھا مری جان رو چکا　　مطلق نہیں ہے چشم میں نم کا اثر کہیں

باور اگر تجھے نہیں آتا تو دیکھ لے　　آنسو کہیں ڈھلک گئے لخت جگر کہیں

ایذا فغاں کے حق میں یہاں تک روا نہیں

ظالم یہ کیا ستم ہے خدا سے بھی ڈر کہیں

بے خانماں ہے آرزوئے سیم و زر فغاں　　کس زندگی کے واسطے یہ دردِ سر فغاں

جلتے ہیں اس گلی میں فرشتے کے پر فغاں　　کیونکر پھرے وہاں سے ترا نامہ بر فغاں

بوئے کباب سوختہ آتی ہے خاک سے　　دامن سے کیا گرا کوئی لخت جگر فغاں

یاں تک گرم ہے مرے خورشید رو کا حُسن　　دیکھے اگر کوئی تو نہ ٹھہرے نظر فغاں

کہتے ہیں فصلِ گل تو چمن سے گزر گئی
اے عندلیب تو قفس بیچ مر گئی

شکوہ تو کیوں کرے ہے مرے اشکِ سرخ کا
تیری کب آستیں مرے لوہو سے بھر گئی

اتنا کہاں رفیق بصارت ہے چشم کی
دل بھی اُدھر گیا مری جیدھر نظر گئی

تنہا اگر میں یار کو پاؤں تو یوں کہوں
انصاف کو نہ چھوڑ مروّت اگر گئی

آخر فغاں وہی ہے اُسے کیوں بھلا دیا
وہ کیا ہوئے تپاک وہ اُلفت کدھر گئی

مجھ سے جو پوچھتے ہو تو ہر حال شکر ہے
یوں بھی گزر گئی مری ڈوں بھی گزر گئی

مفت سودا ہے ارے یار کہاں جاتا ہے
آمرے دل کے خریدار کہاں جاتا ہے

کج کلہ تیغ بکف چیں بر ابرو بے باک
یا الٰہی یہ ستمگار کہاں جاتا ہے

لئے جاتی ہے اجل جان فغاں کو اے یار
لیجیو تیرا گرفتار کہاں جاتا ہے

صنم بتا تو خدائی کا مجھ کو کیا نہ ہوا
ہزار شکر کہ تو بُت ہوا خدا نہ ہوا

کباب ہو گیا آخر کو کچھ بُرا نہ ہوا
عجب یہ دل ہے جلا تو بھی بے مزہ نہ ہوا

شگفتگی سے ہے غنچہ تئیں پریشانی
بھلا ہوا کبھی کا فر تو مجھ سے وا نہ ہوا

مُوا نہ میں۔ جیا آخر کو نیم بسمل ہو
غضب ہوا مرے قاتل کا مدّعا نہ ہوا

نپٹ ہوا ہوں فضیحت بہت ہوا ہوں خراب
تری طفیل اے خانہ خراب کیا نہ ہوا

طرف سے اپنی تو نیکی میں ہے مرا صاحب
مری بلا سے فغاں کا اگر بھلا نہ ہوا

کھا پیچ و تاب مجکو ڈسیں اب وہ کالیاں
ظالم اسی لئے تیں نے زلفیں تھیں پالیاں

تنہا نہ دُر کو دیکھ کے گرتے ہیں اشکِ چشم
سوراخ دل میں کرتی ہیں کانوں کی بالیاں

دیکھا کہ یہ تو چھوڑنا ممکن نہیں مجھے
ق جلنے لگا وہ شوخ مرا تب یہ چالیاں

ہر بات بیچ روٹھنا ہر دم میں ناخوشی
ہر آن دو کھاتے مجھے ہر وقت گالیاں

ایذا ہر ایک طرح سیں دیا غرض مجھے کچھ بس نہ چل سکا تو یہ طرحیں نکالیاں
ہم نے شبِ فراق میں سُنتا ہے اے فغاں ق کیا خاک سب کے حسرتیں دل کی نکالیاں
یہ تھا خیال خواب میں ہیگا یہ روزِ وصل آنکھیں جو کھُل گئیں وہی راتیں ہیں کالیاں

خاتمہ

دوسرے دور کے شعرا رخصت ہوتے ہیں۔ سبحان اللہ اس بڑھاپے پر ایسے زندہ دل۔ اس کمال پر ایسے بے تکلف سادہ مزاج۔ ع

کیا خوب آدمی تھے خدا مغفرت کرے

نہ استعاروں کے پیچ نہ تشبیہوں کی رنگا رنگی۔ اپنے خیالات کو کیسی صاف صاف زبان اور سیدھے سیدھے محاورہ میں کہہ گئے کہ آج تک جو سُنتا ہے سر دُھنتا ہے ان کا کلام قال نہ تھا حال تھا۔ جو خیال شعر میں باندھتے تھے اس کا عالم اُن کے دل وجان پر چھا جاتا تھا۔ یہی سبب ہے کہ جس شعر کو دیکھو تاثیر میں ڈوبا ہوا ہے۔ اسی کو آج اہل فرنگ ڈھونڈتے ہیں اور کہتے ہیں کہ ہر شے کی اصلی حالت دکھانی چاہئے۔ مگر حالت کون دکھائے کہ اپنی حالت بگڑی ہوئی ہے ؎

صحبتِ گُل ہے فقط بلبل سے کیا بگڑی ہوئی آجکل سارے چمن کی ہے ہوا بگڑی ہوئی
آدمی کہتے ہیں جس کو ایک پُتلا کل کا ہے پھر کہاں کل اس کو جب کل مجھ ذرا بگڑی ہوئی

دل شکستوں کا سخن ہووے نہ کیونکر نادرست
ساز بگڑے ہے تو نکلے ہے صدا بگڑی ہوئی

تیسرا دَور

تمہید

اس مشاعرہ میں ان صاحب کمالوں کی آمد آمد ہے جن کے پا انداز میں فصاحت آنکھیں بچھاتی ہے اور بلاغت قدموں میں لوٹی جاتی ہے۔ زبان اُردو ابتدا میں کچا سونا تھی۔ ان بزرگوں نے اسے اکثر کدورتوں سے پاک صاف کیا اور ایسا بنا دیا ہے جس سے ہزاروں ضروری کام اور آرائشوں کے سامان۔ حسینوں کے زیور۔ بلکہ بادشاہوں کے تاج و افسر تیار ہوتے ہیں۔ اگرچہ بہت سے مرصع کار۔ مینا نگار پیچھے آئے۔ مگر اس فخر کا طوق ہا اُنھیں بزرگوں کے گلے میں رہا۔ جب یہ با کمال چمن کلام میں آئے تو اپنے بزرگوں کی چمن بندی کی سیر کی۔ فصاحت کے پھول کو دیکھا کہ قدرتی بہار میں حُسن خداداد کا جوبن دکھا رہا ہے۔ چونکہ انھیں بھی ناموری کا تمغہ لینا تھا اس لئے بڑوں سے بڑھ کر قدم مارنے چاہے۔ یہ گرد و پیش کے میدانوں میں بہت دوڑے سب پھول کام میں آئے ہوئے تھے جب سامنے کچھ نہ پایا تو ناچار اپنی عمارتوں کو اونچا اُٹھایا۔ تم دیکھنا وہ بلندی کے مضمون نہ لائیں گے۔ آسمان سے تارے اُتاریں گے۔ قدردانوں سے فقط داد نہ لیں گے۔ پرستش لیں گے۔ لیکن نہ وہ پرستش کہ سامری کی طرح عارضی ہو۔ ان کے کمال کا دامن قیامت کے دامن سے بندھا پاؤ گے۔ یہ اپنی صنعت میں کچھ کچھ تکلف بھی کریں گے مگر ایسا جیسے گلاب کے پھول پر شبنم۔ یا تصویر پر آئینہ۔ ان کا تکلف بھی اصلی لطافت پر کچھ لطف زیادہ کرے گا۔ اس کی خوبی پر پردہ نہ ہوگا۔ تم میر صاحب اور خواجہ میر درد کو دیکھو گے کہ اثر میں ڈوبے ہوں گے۔ سوداؔ کا کلام باوجود بلندیِ مضمون اور

چُستیِ بندش کے تاثیر کا طلسم ہو گا +

اتنی بات کا افسوس ہے کہ اس ترقّی میں طبیعت کی بلند پروازی سے اوپر کی طرف رُخ کیا۔ کاش آگے قدم بڑھاتے۔ تاکہ حُسن و عشق کے محدود صحن سے نکل جاتے اور ان میدانوں میں گھوڑے دوڑاتے کہ نہ ان کی وسعت کی انتہا ہے نہ عجائب و لطائف کا شمار ہے۔ اِس بات کو بھولنا نہ چاہئے کہ خان آرزو کے فیض صحبت نے ان جوانوں کے کمال کو اس طرح پرورش کیا۔ جس طرح دایہ اپنے دامن میں ہونہار بچّوں کو پالتی ہے۔ میں نے طبقۂ دوم اور سوم کے اکثر استادوں کے حال مجمل طور پر حواشی میں لکھ دئے ہیں اور اکثروں کے نام و کلام سے یہ جام خالی ہے حقیقۃً میں ان سب کو زبان اُردو کی اصلاح کا حق حاصل ہے۔ لیکن اپنے استادوں اور بزرگوں سے یہی سُنا کہ مرزا جان جاناں۔ سودا۔ میر۔ خواجہ میر درد۔ چار شخص تھے کہ جنھوں نے زبانِ اُردو کو خراط اُتارا ہے +

ہمارے زبان دانوں کا قول ہے کہ ۶۰ برس کے بعد ہر زبان میں ایک واضح فرق پیدا ہو جاتا ہے۔ طبقۂ سوم کے اشخاص جو حقیقت میں عمارت اُردو کے معمار ہیں انھوں نے بہت سے الفاظ پرانے سمجھ کر چھوڑ دئے۔ اور بہت سی فارسی کی ترکیبیں جو مصری کی ڈلیوں کی طرح دودھ کے ساتھ مُنہ میں آتی تھیں۔ اُنہیں گھُلایا۔ پھر بھی بہ نسبت حال کے بہت سی باتیں اُن کے کلام میں ایسی تھیں کہ اب متروک ہیں۔ چنانچہ فارسیت کی ترکیبوں کے اشعار دیباچہ میں لکھے گئے +

لیکن پُرانے الفاظ جو اب متروک ہیں اُن کے مثال کے چند اشعار میر اور مرزا اور خواجہ میر درد کے کلام سے لکھتا ہوں پھر بھی انصاف سے نہیں گزرا جاتا۔ ان میں اپنی اپنی جگہ ایک ایک لفظ ایسا جڑا ہوا ہے جسے اُٹھانا مشکل ہے۔

میر صاحب فرماتے ہیں :۔

لہ دیکھو ۱۲۱ +

ہوتا تھا مجلس آرا اگر غیر کا تو مجھ کو
مانند شمع مجلس کاہے کو تیں جلایا

نقاش دیکھ تو میں کیا نقش یار کھینچا
اس شوخ کم نما کا نت انتظار کھینچا

دیر و حرم میں کیونکہ قدم رکھ سکے گا میر
ایدھر تو اس سے بت پھرا اودھر خدا پھرا

تک بھی نہ مڑکے میری طرف تو نے کی نگاہ
ایک عمر تیرے پیچھے میں ظالم لگا پھرا

گل و آئینہ کیا؟ خورشید و مہ کیا!
جدھر دیکھا ایدھر تیرا ہی رو تھا

فقیرانہ آئے صدا کر چلے
میاں خوش رہو ہم دعا کر چلے

رسم قلمرو عشق مت پوچھ تو کہ ناحق
ایکوں کی کھال کھینچی ایکوں کو دار کھینچا

لوہو لگتا ہے ٹپکنے جو پلک مارو ہوں
اب تو یہ رنگ ہے اس دیدہ اشک افشاں کا

کیونکر تمہاری بات کرے کوئی اعتبار
ظاہر میں کیا کہو ہو سخن زیر لب ہے کیا

سیمیں تنوں کا ملنا چاہے ہے کچھ تمول
شاہد پرستیوں کو ہم پاس زر کہاں ہے

تا بمقدور انتظار کیا
دل نے اب زور بیقرار کیا

خون جگر ہو بہنے لاگا
پلکوں ہی پر رہنے لاگا

پی پی کے اپنا لوہو رہیں گو کہ ہم ضعیف
جوں رینگتی نہیں ہے انھوں کے تو کان پر

کیفیتیں ہزار ہیں اس کام جاں کے بیچ
دیتے ہیں لوگ جان تو ایک ایک آن پر

تازہ چمک تھی شب کو تاروں میں آسماں کی
اس آسیا کو شاید پھر ہے کنھو نے راہا

زمانہ نے مجھ جرعہ کش کو نداں
کیا خاک و خشت سر خم کیا

دل لے کے میری جان کا دشمن ہوا نداں
جس بیوفا سے اپنے تئیں پیار ہو گیا

گئے خون جگر گر اشک گا ہے لخت دل یارو
کسی نے بھی کبھی دیکھا ہے یہ بستار رونے کا

کہا تھا میں نہ دیکھو غیر کی اور
سو اس نے آنکھ مجھ سے ہی چھپائی

آنکھوں نے میر صاحب قبلہ ستم کیا
حضرت بکا کیا نہ کرو رات کے تئیں

باہر نہ آتا چاہ سے یوسف جو جانتا
لے کارواں مرے تئیں بازار جائے گا

ہر ذرہ خاک تیری گلی کی ہے بیقرار
یاں کون سا ستم زدہ ماٹی میں رل گیا

آتشِ تیرِ جُدائی سے یکایک اُس بن | یوں جلا دل کہ تنک جی بھی جلایا نہ گیا
رہے خیال تنک ہم بھی روسیاہوں کا | لگے ہو خون بہت کرنے بے گناہوں کا
ہو اس سے جہاں سیاہ تد بھی | نالہ میں مرے اثر نہ ہو گا
مت رنج کر کسی کو کہ اپنے تو اعتقاد | دل ڈھائے کر جو کعبہ بنایا تو کیا ہوا
بس طبیب اُٹھ جا مرے بالیں سے مت دے دردِ سر | کام جاں آخر ہوا اب فائدہ تدبیر کا؟
دل کی ویرانی کا کیا مذکور ہے | یہ نگر سو مرتبہ لوٹا گیا
حیف دے ہچکنے اُس وقت میں پہنچا جس وقت | اُن کنے حال اشاروں سے بتایا نہ گیا
لگوائے پتھرے اور بُرا بھی کہا کئے | تم نے حقوق دوستی کے سب ادا کئے
ایسے وحشی کہاں ہیں لے خوباں | میر کو تم عبث اُداس کیا

اِس عہد میں ماضی استمراری جمع مؤنث میں دونوں جمع لاتے تھے۔ مثلاً عورتیں آتیاں تھیں اور گاتیاں تھیں۔ اب پہلے فعل کو واحد لاتے ہیں۔ مثلاً عورتیں آتی تھیں اور گاتی بجاتی تھیں ؎

بارہا وعدوں کی راتیں آئیاں | طالعوں نے صبح کر دکھلائیاں
جنوں میرے کی باتیں دشت اور گلشن میں جب چلیاں | نہ چوبِ گل نے دم مارا نہ چھڑیاں بید کی ہلیاں

اس سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ اِس عہد میں ہلنا بالفتح بولتے تھے۔ چنانچہ سودا بھی ایک غزل میں کہتے ہیں جس کا قافیہ و ردیف ہے چلتے دیکھا۔ نکلتے دیکھا ؎

تیغ تیرے کا سدا شکر ادا کرتے ہیں | لبوں کو زخم کے دن رات ہیں ہلتے دیکھا

اسی طرح اکثر اشعار مرزا رفیع کے ہیں کہ باوجود محاورۂ قدیمانہ۔ آجکل کے ہزار محاورہ اُن پر قربان ہیں۔ چنانچہ فرماتے ہیں:۔

آخدا کے واسطے اس بانکپن سے در گذر | کل میں سودا یوں کہا دامن گھکر یار کا
بیوفائی کیا کہوں دل ساتھ تجھ محبوب کی | تیری نسبت تو میاں بلبل سے گل نے خوب کی
جس کے دل کو تری زلفوں سے میاں لاگ لگے | اُسکی آنکھوں میں جو رستی بھی ہو تو ناگ لگے
تجھ عشق میں پیارے وہ زیرِ چوبِ گل ہیں | نے بھول کی کسی نے جن کو چھڑی لگائی

خبر شتاب لے سودا کے حال کی پیارے	نہیں ہے وقت مری جان پہ تا آل کا
نہ جانے حال کس ساقی کو یاد آتا ہے شیشہ کا	کہ لے لے ہچکیاں جیوڑا نکل جاتا ہے شیشہ کا
نہ جانے یاد کر روتا ہے کس کے دل کے صدمہ کو	نہیں ٹکڑا جو سودا کو نظر آتا ہے شیشہ کا
بیہودہ اس قدر نہیں آتا ہے کام ناز	نکہ پر خط آچکا نہ کرو صبح و شام ناز
عالم کو مار رکھا ہے تیں با قدِ دوتا	زاہد یہ کاٹ ہے تری تیغ دو نیم کا
سودا کہے تھا یار سے اک مو نہیں غرض	اودھر کھلی جو زلف ادھر دل بکھر گیا
سودا نکل نہ گھر سے کہ اب تجھ کو ڈھونڈتے	لڑکے پھرے ہیں پتھروں سے دامن بھرے ہوئے
تسلی اس دوانے کی نہ ہو جھولی کے پتھروں سے	اگر سودا کو چھیڑا ہے تو لڑکو مول لو ٹھٹریاں
نگر آباد ہیں بسے ہیں گانوں	تجھ بن اُجڑے پڑے ہیں اپنے بھانوں
قیس و فرہاد کا نہیں کچھ ذکر	اب تو سودا کا باجتا ہے نانوں
جاتے ہیں لوگ قافلے کے پیش و پس چلے	ہے یہ عجب سرا کہ جہاں آئے بس چلے

اس غزل میں قفس چلے اور بس چلے قافیہ ہے اسی میں کہتے ہیں:۔

صیاد اب تو کردے قفس سے ہمیں رہا	ظالم پھڑک پھڑک کے پر و بال گھس[1] چلے
صبا سے ہر گھڑی مجھ کو لہو کی باس آتی ہے	چمن میں آہ گلچیں نے یہ کس بلبل کا دل توڑا
موجب مری رنجش کا جو پوچھے ہے تو اے جاں	موند و نگانہ میں کھول کے جوں غنچہ دہاں کو
داغ تجھ عشق کا جھمکے ہے مرے دل کے بیچ	مہر ذرہ میں درخشاں نہ ہوا تھا سو ہوا
وے صورتیں الٰہی کس ملک بستیاں ہیں	اب جن کے دیکھنے کو آنکھیں ترستیاں ہیں
بل بے ساقی تری سبے پروائیاں	جائیں مشتاقوں کی لب تک آئیاں

اسی طرح ہندی صفت بھی اب جمع نہیں لاتے:۔

ملائم ہو گئیں دل پر برہ کی ساعتیں کڑیاں	یہ انکھیاں کیوں مے جی کے گلے کی ہار ہو پڑیاں
یہ خبر کیا ہوں جو کریں قتل وہ انکھیاں مجھ کو	پھر گئے دیکھ کے منہ خنجرِ بُراں مجھ کو

[1] پنجاب میں اب تک گھستا۔ بالفتح بولتے ہیں +

خیالؔ ان انکھڑیوں کا چھوڑ مت مرنے کے بعد از بھی | دلا آیا جو تو اس میکدہ میں جام لیتا جا
ناتوانی بھی عجب شے ہے کہ گلشن میں نسیم | نت لئے پھرتی ہے دوش اوپر برنگ بُو مجھے

فارسی کی جمع کو اس وقت سب فصحا عموماً بولتے تھے۔ اب بغیر حالت صفت یا اضافت کے نہیں بولتے۔ سوداؔ کہتے ہیں ؎

سوداؔ غزل چمن میں تو ایسی ہی کہہ کے لا | گل پھاڑیں سن کے جیب کو دیں بلبلاں صدا
ہاتھ سے جاتا رہا دل دیکھ محبوباں کی چال | اور ایک جگہ کہتے ہیں
الٰہی میں کہوں کس سیتی اپنا احوال | زلف خوباں کی ہوئی ہے مرے جی کا جنجال

خوباں۔ اور محبوباں۔ مرزا کی زبان پر چڑھے ہوئے ہیں۔

اور خواجہ میر درد علیہ الرحمۃ فرماتے ہیں:۔

پرورش غم کی ترے یہاں تئیں تو کی دیکھا | کوئی بھی داغ تھا سینہ میں کہ ناسور نہ تھا!
تو کب تئیں مجھ سات مری جان سے ملے گا | ایسا بھی کبھی ہو گا کہ پھر آن ملے گا
گو نالہ نارسا ہو نہ ہو آہ میں اثر | میں نے تو در گذر نہ کی جو مجھ سے ہو سکا
ساقی مرے بھی دل کی طرف ٹک نگاہ کر | لب تشنہ تیری بزم میں یہ جام رہ گیا
اے آنسوؤ نہ آوے۔ کچھ دل کی بات مُنہ تک | لڑکے ہو تم کہیں مت افشائے راز کرنا
ہم جانتے نہیں ہیں۔ اے درد کیا ہے کعبہ | جیدھر ملے وہ ابرو اودھر نماز کرنا
کہا میں مرا حال تم تک بھی پہنچا | کہا تب اُچٹتا سا کچھ میں سُنا تھا
مرے دل کو جو ہردم تو بھلا اتنا ٹٹولے ہے | تصور کے سوا تیرے بتا تو اس میں کیا نکلا!
جا ئیے کس واسطے اے درد میخانے کے بیچ | اور ہی مستی ہے اپنے دل کے پیمانے کے بیچ
سو بار دیکھیاں ہیں تیری بیوفائیاں | تس پر بھی نت غرور ہے دل میں گناہ کا
جگ میں نہ کوئی ٹک ہنسا ہو گا | کہ نہ ہنستے ہی رو دیا ہو گا
درد کے ملنے سے اے یار بُرا کیوں مانے | اس کو کچھ اور سوا دید کے منظور نہ تھا
اے شانہ تو نہ ہو جو دشمن ہمارے جی کا | کوئی دیکھیو نہ ہو دے زلفوں کا بال بیکا

اگر تجھ کو چلنا ہے چل ساتھ میرے　　یہ کب لگ تو باتیں بناتا رہے گا
بعد مدت کے درد کل مجھ سے　　مل گیا راہ میں وہ غنچہ دہن
میری اُس کی جو لڑ گئیں نظریں　　ہو گئے آنکھوں میں ہی دو دو سخن

ان کے عہد میں زبان میں کچھ کچھ اصلاح ہو گئی مگر رسم الخط میں بہت کچھ بزرگوں کی میراث باقی تھی۔ ایک مجموعہ میرے ہاتھ آیا کہ ۱۱۷۰ھ کی تحریر ہے وہ کسی فہمیدہ شخص نے بڑے شوق سے لکھا ہے۔ اس میں میر سوز۔ تاباں۔ فغاں۔ سودا۔ خواجہ میر درد۔ انعام اللہ خاں۔ خواجہ آبرو میر محمد باقر حزیں۔ میر کمال الدین شاعر۔ خواجہ احسن اللہ خاں بیاں۔ قیام الدین قائم کے دیوانوں کی انتخاب غزلیں ہیں۔ اس سے ثابت ہوتا ہے کہ اس عہد میں کو علامت مفعول کوں لکھا جاتا تھا۔ چنانچہ شاہ آبرو اور میر کمال الدین شاعر وغیرہ نے جن غزلوں میں کو ردیف ہے انھیں ردیف ن ہی میں لکھا ہے۔ متاخرین نے ن کو دور کیا مگر معلوم ہوتا ہے کہ واو کو معروف ہی بولتے تھے۔ چنانچہ خواجہ میر اثر نے کہ خواجہ میر درد کے بھائی تھے ایک بے ردیف غزل میں تمو۔ ترو قافیہ رکھا ہے۔ اور کو استفہامیہ باندھا ہے۔ مرزا رفیع نے بھی ایک جگہ ایسا کہا ہے۔ ان کی ایک غزل ہے قفس کو۔ جرس کو۔ نفس کو۔ اس کا مقطع ہے :۔

ترغیب نہ کر سیر چمن کی ہمیں سودا　　ہر چند ہوا خوب ہے واں لیک ہوس کو؟

ایک غزل ہے۔ ابرو نہیں۔ گیسو نہیں۔ اس میں کہتے ہیں :۔

خط سبز اس کا سیہ۔ کچھ رو ہوا میرا سفید　　خواہش ترک نیاز و ناز دونوں کو نہیں
سُن کے ترکِ عشق میرا ہنس کے کہتا ہے وہ شوخ　　نیل بگڑا ہے کہیں یا رو یقیں مجھ کو نہیں

الفاظ مفصلہ ذیل کی رسم الخط اُس عہد میں اس طرح تھی :۔

تو ...... تیں	مجھے .... مجھ سیں	اس نے .... اُنے	تجھ کو .... تجھ کوں
سے .... سیں	تونے .... تونیں	جس نے .... جنے	کے .... کسو
اس سے .... اس سیں	جوں .... جیوں	جی .... جیو	....

اشعار مذکورۂ بالا جو کہ حقیقت میں ایک محاورۂ مرحوم کے نقش مزار ہیں میں نہیں جانتا کہ نئے ہونہار۔ یا جو کچھ اگلے وقتوں کی یادگار باقی ہیں اُنھیں پڑھ کر کہاں تک خیالات کو وسعت دیں گے۔ مجھے اس لکھنے سے فقط یہی مطلب نہیں کہ اُس عہد تک زبان پر اس قدر قدامت کا اثر باقی تھا بلکہ ایک بڑی بات کا افسوس ظاہر کرنا منظور ہے۔ وہ یہ ہے کہ سودا کی ۷۵ برس کی اپنی عمر۔ اور تخمیناً ۵۵۔۶۰ برس ان کی شاعری کی عمر۔ میر کی ۱۰۰ برس کی عمر۔ شاعری کی ۸۰۔۸۵ برس کی عمر۔ اور اس بات سے کسی کو انکار نہ ہوگا کہ جو زبان دلّی کی ان کے اوائل کلام میں تھی وہی اوسط میں نہ تھی پھر وہی اواخر میں نہ تھی۔ یقیناً تینوں زبانوں میں ظاہر اور واضح امتیاز ہوئے ہونگے مگر چونکہ رسم ملک نے دیوانوں کی ترتیب حروفِ تہجی پر رکھی ہے۔ اس لئے آج ہم معلوم نہیں کر سکتے کہ ان کے عہدوں میں وقت بوقت ملکی زبانوں میں کیا کیا انقلاب ہوئے یا مختلف وقتوں میں خود ان کی طبیعت کے میلان اور زور کلام کے آثار چڑھاؤ کس کس درجہ پر تھے۔ اس اندھیرے میں فقط دو شاعر ہمارے لئے چراغ رکھ گئے ہیں کہ حسب تفصیل ذیل چند قسموں میں اپنے کلام کو تقسیم کیا:۔

	اوائل عمر	عہد جوانی	سن کہولۃ	پیرانہ سالی
(۱) امیر خسرو۔	تحفۃ الصغر۔	غرۃ الکمال۔	وسط الحیوٰۃ۔	بقیۃ نقیۃ
(۲) جامی		فاتحۃ الشباب۔	واسطۃ العقد۔	خاتمۃ الحیوٰۃ

خیر یہ سمجھ لو کہ جن الفاظ پر ہم لوگوں کے بہت کان کھڑے ہوتے ہیں یہی ان کے اوائل عمر یا جوانی کے کلام ہیں۔ منشی احمد حسن خاں صاحب میر تقی مرحوم کے شاگرد رشید تھے۔ ان کی زبانی ڈپٹی کلب حسین خاں صاحب مرحوم فرماتے تھے کہ اکثر الفاظ جو میر صاحب پہلے دوسرے دیوان میں کہہ گئے ہیں وہ چوتھے پانچویں میں نہیں ہیں۔ جو دوسرے تیسرے میں ہیں۔ وہ پانچویں چھٹے میں نہیں۔ بہرحال اخیر عمر میں اُن کی زبان کا اندازہ وہ ہوگا جو کہ سید انشا۔ مصحفی۔ جرأت کی زبان ہے۔ واللہ اعلم بحقیقۃ الحال +

مرزا جان جاناں مظہر

اگرچہ نظم کے جوش و خروش اور کثرت کلام کے لحاظ سے میر اور سودا کے ساتھ ان کا نام لیتے ہوئے تامل ہوتا ہے لیکن چونکہ صانع قدرت نے طبیعت کی لطافت اور اصلی نفاست اور ہر بات میں انداز کی خوبی اور خوبصورتی اُن کے مزاج میں رکھی تھی۔ اور زمانہ بھی سب کا ایک تھا۔ اس کے علاوہ پُرانے پُرانے تذکرہ نویس لکھتے ہیں بلکہ بزرگوں کی زبان سے بھی یہی سُنا کہ زبان کی اصلاح اور انداز سخن اور طرز کے ایجاد میں انھیں ویسا ہی حق ہے جیساکہ سودا و میر کو۔ اسی واسطے ان کا حال بھی اسی سلسلہ میں لکھنا واجب ہے۔ ان کے والد عالمگیر کے دربار میں صاحب منصب تھے۔ نسب اُن کا باپ کی طرف سے محمد ابن حنفیہؓ سے ملتا ہے کہ حضرت علیؓ کے بیٹے تھے۔ ماں بیجاپور کے شریف گھرانہ سے تھیں۔ دادا بھی دربار شاہی میں صاحب منصب تھے۔ دادی اسد خاں وزیر عالمگیر کی خالہ زاد بہن تھیں۔ پردادا سے اکبر بادشاہ کی بیٹی منسوب ہوئی تھیں۔ ان رشتوں سے تیموری خاندان کے نواسے تھے۔ سنہ ۱۱۱۱ھ میں جب کہ عالمگیر دکن پر فوج لئے پڑا تھا ان کے والد نوکری چھوڑ کر دلی کو پھرے۔ یہ کالا باغ علاقہ مالوہ ۱۱ رمضان کو جمعہ کے دن پیدا ہوئے۔ عالمگیر کو خبر گزری۔ آئین سلطنت تھا کہ اُمرا کے ہاں اولاد ہو تو حضور میں عرض کریں۔ بادشاہ خود نام رکھیں یا پیش کئے ہوئے ناموں میں سے پسند کردیں۔ کسی کو خود بھی بیٹا یا بیٹی کر لیتے تھے کہ یہ امور طرفین کے دلوں میں اتحاد اور محبت پیدا کرتے تھے ان کے لئے ایک وقت پر سند ترقی ہوتے تھے اور بادشاہوں کو ان سے وفاداری اور جاں نثاری کی اُمیدیں ہوتی تھیں۔ شادی بھی اجازت سے ہوتی تھی۔ کبھی ماں باپ کی تجویز کو پسند کرتے تھے کبھی خود تجویز کردیتے تھے۔

غرض عالمگیر نے کہا کہ بیٹا باپ کی جان ہوتا ہے۔ باپ مرزا جان ہے۔ اس کا نام ہم نے جان جاناں رکھا۔ پھر اگرچہ باپ نے شمس الدین نام رکھا مگر عالمگیری نام کے سامنے نہ چمکا۔ مظہرؔ تخلص انھوں نے آپ کیا کہ جان جاناں کے ساتھ مشہور چلا آتا ہے۔ مرزا جان بھی شاعر تھے۔ اور جانی تخلص کرتے تھے +

۱۶ برس کی عمر تھی کہ باپ مر گئے۔ اسی وقت سے مشت خاک کو بزرگوں کے گوشۂ دامن میں باندھ دیا۔ ۳۰ برس کی عمر تک مدرسوں اور خانقاہوں میں جھاڑو دی اور جو دن بہار زندگی کے پھول ہوتے ہیں اُنھیں بزرگوں کے روضوں پر چڑھا دیا۔ اس عہد میں تصوف کے خیالات ابر کی طرح ہندوستان پر چھائے ہوئے تھے چنانچہ قطع نظر کمال شاعری کے ہزارہا مسلمان بلکہ ہندو بھی اُن کے مُرید تھے اور دل سے اعتقاد رکھتے تھے۔ ان کے باب میں بہت سے لطائف ایسے مشہور ہیں کہ اگر آج کسی میں پائے جائیں تو زمانہ کے لوگ اچھا نہ سمجھیں۔ لیکن وہ ایک زمانہ تھا کہ صفات مذکورہ داخل فضائل تھیں۔ کچھ تو اس اعتقاد سے کہ ع خطائے بزرگاں گرفتن خطاست۔ اور کچھ اس سبب سے کہ اگر ایک لطیف اور صاف شفاف سطح پر کوئی داغ ہو اور وہ ایک عمدہ نظر گاہ میں جلوہ گر ہو تو وہاں وہ دھبہ بدنما نہیں بلکہ گلکاری معلوم ہوتا ہے اور جسے بُرا معلوم ہو وہ خوش عقیدہ نہیں۔ میں روسیاہ، بزرگوں کی ہر بات کو چشم عقیدت کا سُرمہ سمجھتا ہوں مگر مقتضائے زمانہ پر نظر کر کے نمونہ پر اکتفا کرنا چاہیے +

وہ خود بیان کرتے تھے کہ حسن صورت اور لطف معنیٰ کا عشق ابتدا سے میرے دل میں تھا۔ چھوٹے سن میں بھی مصرع موزوں زبان سے نکلتے تھے۔ شیر خوارگی کے عالم میں حُسن کی طرف اس قدر میلان تھا کہ بدصورت کی گود میں نہ جاتا تھا۔ کوئی خوبصورت لیتا تھا تو ہُمک کر جا پڑتا تھا اور پھر اُس سے لیتے تو بمشکل آتا تھا +

لہ تذکرہ گلزار ابراہیمی میں ہے کہ ان کا وطن اکبرآباد تھا۔ دلّی میں آرہے تھے +

میر عبدالحی تاباںؔ

ان کے عہد میں میر عبدالحی تاباںؔ تخلص ایک نوجوان شریف زادہ حُسن و خوبی میں اس قدر شہرۂ آفاق تھا کہ خاص و عام اُس کو یوسف ثانی کہتے تھے۔ گوری رنگت پر کالے کپڑے بہت زیب دیتے تھے اس لئے ہمیشہ سیہ پوش رہتا تھا۔ اُس کے حُسن کی یہاں تک شہرت پھیلی کہ بادشاہ کو بھی دیکھنے کا اشتیاق ہوا۔ معلوم ہوا کہ مکان حبش خاں کے پھاٹک میں ہے۔ اور وہ بڑا دروازہ جو کوچۂ مذکور سے بازار لاہوری دروازہ میں نکلتا ہے اُس کے کوٹھے پر نشست ہے۔ زمانہ کی تاثیر اور وقت کے خیالات کو دیکھنا چاہئے کہ بادشاہ خود سوار ہو کر اس راہ سے نکلے۔ اُنھیں بھی خبر ہو گئی تھی بنے سنورے اور بازار کی طرف موڈھا بچھا کر آ بیٹھے۔ بادشاہ جب اس مقام پر پہنچے تو اس لئے کہ ٹھہرنے کا ایک بہانہ ہو۔ وہاں آبِ حیات[1] مانگا اور پانی پی کر دیکھتے ہوئے چلے گئے۔ الغرض تاباںؔ خود صاحب دیوان تھے۔ شاہ حاتمؔ اور میر محمد علی حشمتؔ کے شاگرد تھے اور مرزا صاحب کے مُرید تھے۔ مرزا صاحب بھی چشمِ محبت اور نگاہِ شفقت سے دیکھتے تھے۔ چنانچہ اکثر ایسا ہوتا تھا کہ مرزا صاحب بیٹھے ہیں۔ اور اُن کی صحبت میں کہ جہاں کبھی وعظ و ارشاد اور کبھی نظم و اشعار کا جلسہ رہتا تھا۔ تاباںؔ بھی حاضر ہیں اور باادب اپنے مُرشد کی خدمت میں بیٹھے ہیں۔ حضرت اگرچہ محفل ارشاد کے آداب سے گرمجوشی ظاہر نہ کرتے تھے مگر معلوم ہوتا تھا کہ اُنھیں دیکھتے ہیں۔ اور مارے خوشی کے باغ باغ ہوئے جاتے ہیں۔ تاباں بھی مزاج داں تھے۔ اشعار اور لطائف نمکین کہتے۔ حضرت سُن سُن کر خوش ہوتے۔ کوئی بات سب کے سامنے کہنی خلاف ادب ہوتی۔ جو اہلِ عقیدت میں ادب کا طریقہ ہے۔ اِسی طرح

[1] شاہانِ دہلی کے کاروبار کے لئے الفاظ خاص مستعمل تھے بتلاً پانی کو آبِ حیات۔ کھانے کو خاصہ۔ سونے کو سکھ فرمانا۔ شاہزادوں کے پانی کو آبِ خاصہ۔ اور اسی طرح ہزاروں اصطلاحی الفاظ تھے +

دست بستہ عرض کرتے کچھ اور بھی عرض کیا چاہتا ہوں حضرت مسکرا کر اجازت دیتے وہ کان کے پاس مُنہ لے جاتے اور چند کلمے چپکے چپکے ایسے گستاخانہ کہتے کہ سوا اس پیارے عزیز کے کوئی نہیں کہہ سکتا جیسے بزرگوں کی محبت نے گستاخ کیا ہو۔ پس حضرت مسکراتے اور فرماتے کہ درست ہے۔ پھر وہ اسی قسم کی کچھ اور باتیں کہتے۔ آپ پھر فرماتے کہ یہ بالکل درست ہے۔ جب **تاباں** اپنی جگہ پر آ بیٹھتے تو پھر حضرت خود کہتے کہ ایک بات کا تمھیں خیال نہیں رہا **تاباں** پھر کان کے پاس مُنہ لے جاتے۔ اس وقت اس سے بھی تیز تر کوئی لطیفہ آپ اپنے حق میں کہتے[1] اور اپنے پیارے عزیز کی ہم زبانی کا لطف حاصل کرتے۔ نہایت افسوس ہے کہ وہ پھول اپنی بہار میں لہلہاتا گر پڑا۔ (ہائے میری دلی تیری جو بات ہے جہان سے نرالی ہے) جب اس یوسف ثانی نے عین نوجوانی میں دلوں پر داغ دیا۔ تو تمام شہر نے اس کا سوگ رکھا۔ میر تقی میر نے بھی اپنی ایک غزل کے مقطع میں کہا ہے ؎

داغ ہے تاباں علیہ الرحمۃ کا چھاتی پہ میر — ہو نجات اس کو بچارا ہم سے بھی تھا آشنا

مرزا صاحب کی تحصیل علمی عالمانہ نہ تھی مگر علم حدیث کو با اصول پڑھا تھا۔ حنفی مذہب کے ساتھ نقشبندی طریقہ کے پابند تھے۔ اور احکام شریعت کو صدق دل سے ادا کرتے تھے۔ اوضاع و اطوار اور ادب آداب نہایت سنجیدہ اور برجستہ تھے۔ کہ جو شخص ان کی صحبت میں بیٹھتا تھا ہشیار ہو کر بیٹھتا تھا۔ لطافت مزاج اور سلامتی طبع کی نقلیں ایسی ہیں کہ آج سُن کر تعجب آتا ہے۔ خلاف وضع اور بے اسلوب حالت کو دیکھ نہ سکتے تھے۔

نقل۔ ایک دن درزی ٹوپی سی کر لایا۔ اس کی تراش ٹیڑھی تھی۔ اس وقت

---

[1] ان باتوں پر اور خصوصاً ان کے شعر مندرجہ صفحہ ۱۴۰ پر تہذیب آنکھ دکھاتی ہے۔ مگر کیا کیجیے۔ ایشیا کی شاعری کہتی ہے کہ یہ میری صفائی زبان اور طراری کا نمک ہے۔ پس مورخ اگر خصوصیت زبان کو نہ ظاہر کرے تو اپنے فرض میں قاصر ہے یا بے خبر ہے +

دوسری ٹوپی موجود نہ تھی اس لئے اسی کو پہننا پڑا۔ مگر سر میں درد ہونے لگا۔
نقل۔ جب چارپائی میں کان ہو اُس پر بیٹھا نہ جاتا تھا گھبرا کر اُٹھ کھڑے ہوتے تھے۔ چنانچہ دلی دروازہ کے پاس ایک دن ہوادار میں سوار چلے جاتے تھے۔ راہ میں ایک بنئے کی چارپائی کے کان پر نظر جا پڑی۔ وہیں ٹھیر گئے اور جب تک اُس کا کان نہ نکلوا لیا آگے نہ بڑھے۔
نقل۔ ایک دن ایک نوّاب صاحب کہ اُن کے خاندان کے مُرید تھے ملاقات کو آئے اور خود صراحی لے کر پانی پیا۔ اتفاقاً آبخورا جو رکھا تو ٹیڑھا رکھا۔ مرزا کا مزاج اس قدر برہم ہوا کہ ہرگز ضبط نہ ہو سکا اور بگڑ کر کہا کہ عجیب بیوقوف احمق تھا جس نے تمھیں نواب بنا دیا آبخورا بھی صراحی پر رکھنا نہیں آتا۔
نقل۔ مولوی غلام یحییٰ فاضل جلیل۔ جنھوں نے میرزاہد پر حاشیہ لکھا ہے بہ ہدایت غیبی مرزا کے مُرید ہونے کو دلی میں آئے ان کی داڑھی بہت بڑی اور گھن کی تھی۔ جمعہ کے دن جامع مسجد میں ملے اور ارادہ ظاہر کیا۔ مرزا نے ان کی صورت کو غور سے دیکھا اور کہا کہ اگر مجھ سے آپ بیعت کیا چاہتے ہیں تو پہلے داڑھی کو ترشوا کر صورت بھلے آدمیوں کی بنائیے پھر تشریف لائیے۔ اَللّٰہُ جَمِیْلٌ وَّ یُحِبُّ الْجَمَالَ۔ بھلا یہ ریچھ کی سی صورت مجھ کو اچھی نہیں معلوم ہوتی تو خدا کو کب پسند آئے گی۔ مُلا متشرع آدمی تھے گھر میں بیٹھ رہے۔ تین دن تک برابر خواب میں دیکھا کہ بغیر مرزا کے تمھارا عقدۂ دل نہ کُھلے گا۔ آخر بیچارے نے داڑھی حجّام کے سپرد کی اور جیسا خشخاشی خط مرزا صاحب کا تھا ویسا ہی رکھ کر مُریدوں میں داخل ہوئے۔
اسی لطافت مزاج اور نزاکت طبع کا نتیجہ ہے کہ زبان کی طرف توجہ کی اور اُسے ایسا تراشا کہ جو شعراء پہلے گذرے تھے اُنھیں پیچھے ہی چھوڑ کر اپنے عہد کا طبقہ الگ کر دیا۔ اور اہل زبان کو نیا نمونہ تراش کر دیا جس سے پُرانا رستہ ایہام گوئی کا زمین شعر سے مٹ گیا۔ ان کے کلام میں مضامین عاشقانہ عجب تڑپ دکھاتے

ہیں اور یہ مقام تعجب نہیں کیونکہ وہ قدرتی عاشق مزاج تھے۔ اوروں کے کلام میں یہ مضامین خیال ہیں۔ ان کے اصل حال[1]۔ زبان ان کی نہایت صاف وشستہ وشفاف ہے۔ اس وقت کے محاورہ کی کیفیت کچھ ان کے اشعار سے اور کچھ اس گفتگو سے معلوم ہوگی جو ایک دفعہ بروقت ملاقات ان سے اور سید انشا سے ہوئی چنانچہ اصل عبارت دریائے لطافت سے نقل کی جاتی ہے۔

سیّد انشاء اللہ خاں اور مرزا جان جاناں مظہر کی ملاقات

درزمانیکہ راقم مذنب ہمراہ والد مرحوم مغفور وارد دار الخلافہ بود۔ ازبسکہ آوازہ فصاحت وبلاغت جناب فیض مآب مرزا جان جاناں مظہر علیہ الرحمۃ گوش راقم را مقرر خود داشت دل بادیدہ مستعدِ ستیزہ شد کہ چرا از دیدار مرزا صاحب خودرا ایں ہمہ محروم می پسندی ومرا از لذتِ جاودانی وعیش روحانی کہ در کلام معجز نظام آنحضرت است باز میداری چاروناچار خط را تراش دادہ۔ وجامۂ ململ ڈھاکہ پوشیدہ۔ دستار سُرخ باندھنو برسر گذاشتم ودیگر لباس ہم ازیں قبیل واز سلاح آنچہ باخود گرفتم۔ کٹار بسیار خوبے بود کہ بکمرزدہ بودم۔ بایں ہیئت بسواری فیل روانہ خدمت سراپا افادتِ ایشاں شدم۔ چوں بالائے بام کہ کیول رام بانیہ متصل جامع مسجد ساختہ پیشکش مرزا صاحب کردہ بود برآمدم۔ دیدم کہ جناب موصی الیہ باپیراہن وکلاہ سفید۔ ددوپٹہ ناسپالی رنگ بصورت سموسہ بردوش گذاشتہ نشستہ اند بکمال ادب سلامے برایشاں کردم ازفرط عنایت وکثرت مکارمِ اخلاق کہ شیوۂ ستودۂ بزرگان خدا پرست است بجواب سلام ملتفت شد برخاستند ومرا ایں بے لیاقت را درکنار گرفتہ پہلوئے خود جا دادند[2]۔

[1] افسوس ہے اہل وطن کے خیالات پر جنھوں نے ایسی ایسی لطافت طبع کی باتیں دیکھ کر ازروئے اعتقاد آخر میں ایک طرہ اور بڑھایا یعنی قاتل ہم جوانے صبیح وملیح کہ بدستش جاں سپردند۔ یا شاید ایسا ہی ہو۔ عالم الغیب خدا ہے۔

[2] اس صحبت میں جو گفتگو ہوئی صفحہ ۴۲ میں لکھی گئی ہے۔

مرزا صاحب کا ایک دیوان فارسی ہے کہ خود ۶۰ برس کی عمر ۱۱۷۰ھ میں ۲۰ ہزار شعر میں سے ایک ہزار شعر انتخاب کیا تھا۔ اسی واسطے اکثر غزلیں ناتمام اور بے ترتیب ہیں اس کو انتہائے درجہ کی منصفی اور سلامتی طبع سمجھنا چاہئے۔ ورنہ اپنے اشعار گراولاد معنوی ہوتے ہیں۔ کس کا جگر ہے کہ اپنے ہاتھ سے کاٹے۔ فارسی بھی بہت شُستہ ہے اور مضامین عاشقانہ ایک انداز کے ساتھ بندھے ہیں +

مرا چہ جُرم کہ ہر نالہ ام زموزونی — غلط کنند عزیزاں زمصرعۂ اُستاد

اُردو میں بھی پورا دیوان نہیں۔ غزلیں اور اشعار ہیں جو **سودا** اور **میر** کی زبان ہے وہی ان کی زبان ہے۔ لیکن **سودا** بھلا کسے خاطر میں لاتے تھے۔ چنانچہ سب آداب اور رعایتوں کو بالائے طاق رکھ کر فرماتے ہیں ؎

مظہر کا شعر فارسی اور ریختہ کے بیچ — سودا یقین جان کہ روڑا ہے باٹ کا
آگاہ فارسی تو کہیں اس کو ریختہ — واقف جو ریختہ کے ذرا ہووے ٹھاٹھ کا
سُن کر وہ یہ کہے کہ نہیں ریختہ ہے یہ — اور ریختہ بھی ہے تو فیروزشاہ کی لاٹھ کا
القصہ اس کا حال یہی ہے جو سچ کہوں — کُتّا ہے دھوبی کا کہ نہ گھر کا نہ گھاٹ[1] کا

خریطہ جواہر۔ ایک مختصر انتخاب اساتذۂ فارس کے اشعار کا ہے کہ اپنی پسند کے بموجب لکھتے گئے تھے۔ وہ حقیقت میں خریطۂ جواہر ہے +

جب کہ صحرائے فنا میں ۷۹ منزلیں عمر کی طے کر کے ۸۰ میں قدم رکھا تو دل کو آگاہی ہونے لگی کہ اب روح کا مسافر بدن کا بوجھ پھینکا چاہتا ہے۔ چنانچہ خود اکثر تحریروں اور تقریروں میں صاف صاف اظہار کرتے تھے۔

نقل۔ ایک معتقد کا بیٹا حُسن اعتقاد سے غزل لے کر آیا کہ شاگرد ہو اور اصلاح لے۔ انھوں نے کہا کہ اصلاح کے ہوش و حواس کسے ہیں۔ اب عالم کچھ اور ہے۔ عرض کی کہ میں فقط بطور تبرّک سعادت حاصل کرنی چاہتا ہوں۔ فرمایا کہ اس وقت ایک شعر خیال میں

[1] نکتہ ایمش ہے کہ مرزا صاحب نے ایک دھوبن گھر میں ڈالی تھی۔ اکثر حالات اور سال تاریخ وغیرہ معمولات مظہری سے لئے گئے ہیں +

آیا ہے اسی کو تبرک اور اسی کو اصلاح سمجھ لو :۔

لوگ کہتے ہیں مر گیا مظہر　　فی الحقیقت میں گھر گیا مظہر

غرض ساتویں محرم کی تھی کہ رات کے وقت ایک شخص مٹھائی کی ٹوکری ہاتھ میں لئے آیا۔ دروازہ بند تھا۔ آواز دی اور ظاہر کیا کہ مُرید ہوں۔ نذر لے کر آیا ہوں۔ وہ باہر نکلے تو ایک قرابین[1] ماری کہ گولی سینہ کے پار ہو گئی۔ وہ تو بھاگ گیا۔ مگر اُنھیں زخم کاری آیا تین دن تک زندہ رہے اس عالم اضطراب میں لوٹتے تھے اور اپنا ہی شعر پڑھتے تھے۔

بنا کردند خوش رسمے بخون و خاک غلطیدن　　خدا رحمت کند ایں عاشقانِ پاک طینت را

یہ تین دن نہایت استقلال اور ثابت قدمی سے گزارے۔ بلکہ جب شاہ عالم بادشاہ کو خبر پہنچی تو بعد تحقیقات کے کہلا بھیجا کہ قاتل نہیں ملتا۔ نشان دو تو ہم اُسے سزا دیں جواب میں کہا کہ فقیر کشتۂ راہِ خدا ہیں۔ اور مُردہ کا مارنا قتل نہیں۔ قاتل ملے تو آپ سزا نہ دیں۔ یہاں بھیج دیں۔ آخر دسویں کو شام کے وقت دُنیا سے انتقال کیا۔ بہت لوگوں نے تاریخیں کہیں۔ مگر درجۂ اوّل پر میر قمر الدین منّت کی تاریخ ہے جس کا مادّہ خاص الفاظ حدیث ہیں۔ اور اتفاق یہ کہ موزوں ہیں:۔ عَاشَ حَمِیداً + مَاتَ شَہِیداً۔ اس قتل کا سبب دلّی کے خاص و عام میں مشہور تھا کہ بموجب رسم کے ساتویں کو عَلَم اُٹھے تھے۔ یہ سرِ راہ اپنے بالاخانہ پر خاص خاص مُریدوں کو لئے بیٹھے تھے جیسا کہ عوام جُہلا کی عادت ہے۔ شاید طرفین سے کچھ کچھ طعن و تعریض ہوئے ہوں! وہ کسی جاہل کو ناگوار ہوئے۔ ان میں کوئی سنگدل فولاد خاں نام۔ سخت جاہل تھا۔ اس نے یہ حرکت کی لیکن حکیم قدرت اللہ خاں قاسم اپنے تذکرہ میں فرماتے ہیں کہ مرزا صاحب اپنے کلام میں اکثر اشعار حضرت علیؑ کی مدح میں کہا کرتے تھے اس پر بگڑ کر کسی سُنّی نے یہ حرکت کی +

[1] اُستاد مرحوم فرمایا کرتے تھے کہ دُگاڑے کا نشان ہم نے بھی دیکھا ہوا ہے۔ کیول رام کے کوٹھے پر ڈیوڑھی کی دیوار میں ابتک موجود تھا + [2] عجب مشکل ہے حکیم بھی ایک خوش اعتقاد سنّت جماعت تھے۔ وہ کہتے ہیں کہ سُنّی نے مارا۔ لوگ کہتے ہیں شیعہ نے مارا۔ خیر سُنّی شیعہ آپس میں سمجھ لیں۔ میرا کام اتنا ہی تھا۔ جو کچھ پایا کاغذ کے حوالہ کیا +

نہ کرد مظہر ما طاعتے ورفت بخاک   نجاتِ خود بہ تولاّے بوتراب گذاشت

جدّ مرحوم ایک اُردو کا شعر اُن کے نام سے پڑھا کرتے تھے ؎

ہوں تو سُنّی پر علیؑ کا صدق دل سے ہوں غلام   خواہ ایرانی کہو تم خواہ تورانی مجھے

دلّی میں چتلی قبر کے پاس گھر ہی میں دفن کر دیا تھا کہ اب خانقاہ کہلاتی ہے۔ قبر پر انہی کا شعر لکھا ہے ؎

بلوحِ تربتِ من یافتند از غیب تحریرے   کہ ایں مقتول را جز بے گناہی نیست تقصیرے

تاریخ مرزا رفیع سودا نے بھی کہی ؎

مرزا کا ہوا جو قاتل ایک مرتدِ شوم   اور ان کی ہوئی خبر شہادت کی عموم

تاریخ از روے درد یہ سن کے کہی   سودا نے کہ ہائے جانجاناں مظلوم
۱۱۹۵ھ

اس لکھنے سے مجھے اظہار اس امر کا منظور ہے کہ ہجو ہماری نظم کی ایک خاردار شاخ ہے۔ جس کے پھل سے پھول تک بے لطفی بھری ہے۔ اور اپنی زمین اور دہقان دونوں کی کثافت طبع پر دلالت کرتی ہے۔ چنانچہ اس میں بھی مرزا رفیع مرحوم سب سے زیادہ بدنام ہیں۔ لیکن حق یہ ہے کہ ان کی زبان سے جو کچھ نکلتا تھا باعث اس کا یا فقط شوخی طبع یا کوئی عارضی جوش ناراضی کا ہوتا تھا۔[1] اور مادۂ کثافت فقط اتنا ہوتا تھا کہ جب الفاظ کاغذ پر آجاتے تھے تو دل صاف ہو جاتا تھا۔ چنانچہ تاریخ مذکور کے الفاظ دل کی صفائی کا حال ظاہر کرتے ہیں۔ ہمارا زمانہ ایسے مہذب اور شایستہ لوگوں سے آراستہ ہے کہ لفظ ہجو کو گالی سمجھتے ہیں۔ مگر دلوں کا مالک اللہ ہے +

ان شاگردوں میں میر محمد باقر حزیں۔ بساون لعل بیدار۔ خواجہ احسن اللہ خان بیان انعام اللہ خاں یقین۔ مشہور صاحب دیوان اور اچھے شاعر ہوئے۔ ان کی غزلیں تمام و کمال دیکھیں۔ جو کچھ سر دست حاضر تھا درج کیا:۔

[1] دیکھو سودا کے حال میں ان کا اور مرزا فاخر مکین کا جھگڑا صفحہ ۱۶۵۔ اور سید انشا کے حال میں مشاعرۂ دہلی کا معرکہ +

چلا اب گل کے ہاتھوں سے لٹا کر کارواں اپنا
نہ چھوڑا ہائے بلبل نے چمن میں کچھ نشاں اپنا

یہ حسرت رہ گئی کیا کیا مزے سے زندگی کرتے
اگر ہوتا چمن اپنا گل اپنا باغباں اپنا

الم سے یاں تلک روئیں کہ آخر ہو گئیں رسوا
ڈبایا ہائے آنکھوں نے مژہ کا خانداں اپنا

رقیباں کی نہ کچھ تقصیر ثابت ہے نہ خوباں کی
مجھے ناحق ستاتا ہے یہ عشقِ بدگماں اپنا

مرا جی جلتا ہے اس بلبلِ بیکس کی غربت پر
کہ جن نے آسرے پر گل کے چھوڑا آشیاں اپنا

جو تو نے کی سو دشمن بھی نہیں دشمن سے کرتا ہے
غلط تھا جانتے تھے تجھ کو ہم جو مہرباں اپنا

کوئی آزردہ کرتا ہے سجن اپنے کو ہے ظالم
کہ دولت خواہ اپنا مظہر اپنا جان جاں اپنا

گرچہ الطاف کے قابل یہ دلِ زار نہ تھا
لیکن اس جور و جفا کا بھی سزاوار نہ تھا

لوگ کہتے ہیں کہ موا مظہر بیکس افسوس
کیا ہوا اس کو وہ آنا بھی تو بیمار نہ تھا

جواں مارا گیا خوباں کے بدلے میرزا مظہر
بھلا تھا یا برا تھا۔ زور کچھ تھا خوب کام آیا

ہم نے کی ہے توبہ اور دھومیں مچاتی ہے بہار
ہائے بس چلتا نہیں کیا مفت جاتی ہے بہار

لالہ و گل نے ہماری خاک پر ڈالا ہے شور
کیا قیامت ہے موؤں کو بھی ستاتی ہے بہار

شاخ گل ہلتی نہیں یہ بلبلوں کو باغ میں
ہاتھ اپنے کے اشارے سے بلاتی ہے بہار

ہم گرفتاروں کو اب کیا کام ہے گلشن سے لیک
جی نکل جاتا ہے جب سنتے ہیں آتی ہے بہار

یہ دل کب عشق کے قابل رہا ہے
کہاں اس کو دماغ و دل رہا ہے

خدا کے واسطے اس کو نہ ٹوکو
یہی ایک شہر میں قاتل رہا ہے

نہیں آتا اسے تکیہ پہ آرام
یہ سر پاؤں سے تیرے ہل رہا ہے

اگر ملئے تو خفت ہے۔ وگر دوری قیامت ہے
غرض نازک دماغوں کو محبت سخت آفت ہے

کوئی لیوے دل اپنے کی خبر یا دلبر اپنے کی
کسی کا یار جب عاشق کہیں ہو کیا قیامت ہے

توفیق دے کہ شور سے اک دم تو چپ رہے
آخر مرا یہ دل ہے الٰہی جرس نہیں

غزل ہائے تاباںؔ

نہیں کوئی دوست اپنا یار اپنا مہرباں اپنا
سُناؤں کس کو غم اپنا الم اپنا بیاں اپنا

بہت چاہا کہ آوے یار یا اس دل کو صبر آوے
نہ یار آیا نہ صبر آیا دیا جی میں نداں اپنا

قفس میں تڑپھے ہیں یہ عندلیباں سخت بے بس ہیں
نہ گلشن دیکھ سکتے ہیں نہ یہ اب آشیاں اپنا

مجھے آتا ہے رونا ایسی تنہائی پہ اے تاباںؔ
نہ یار اپنا نہ دل اپنا نہ تن اپنا نہ جاں اپنا

رہتا ہوں خاک و خوں میں سدا لوٹتا ہوا
میرے غریب دل کو الٰہی یہ کیا ہوا

میں اپنے دل کو غنچۂ تصویر کی طرح
یارب کبھو خوشی سے نہ دیکھا کھِلا ہوا

ناصح عبث نصیحتِ بیہودہ تو نہ کر
ممکن نہیں کہ چھوٹ سکے دل لگا ہوا

ہم بیکسی پہ اپنی نہ روئیں تو کیا کریں
دل سا رفیق ہائے ہمارا جُدا ہوا

جفا سے اپنی پشیماں نہ ہو۔ ہوا سو ہوا
تری بلا سے مرے جی پہ جو ہوا سو ہوا

سبب جو میری شہادت کا یار سے پوچھا
کہا کہ اب تو اسے گاڑ دو ہوا سو ہوا

یہ دردِ عشق ہے میرا نہیں علاج طبیب
ہزار کوئی دوا ایرج کرد ہوا سو ہوا

بھلے بُرے کی ترے عشق میں اُڑا دی شرم
ہمارے حق میں کوئی کچھ کہو ہوا سو ہوا

نہ پائی خاک بھی تاباںؔ کی ہم نے پھر ظالم
وہ ایک دم ہی ترے روبرو ہوا سو ہوا

سُن فصلِ گُل خوشی ہو گلشن میں آئیاں ہیں
کیا بلبلوں نے دیکھو دھومیں مچائیاں ہیں

بیمار ہے۔ زمیں سے اُٹھتی نہیں عصا بن
نرگس کو تم نے شاید آنکھیں دکھائیاں ہیں

آئینہ روبرو رکھ اور اپنی چھب دکھانا
کیا خود پسندیاں ہیں کیا خود نمائیاں ہیں

دیکھے سے آئینہ بھی حیران ہے ترا رُو
چہرہ کے بیچ تیرے کیا کیا صفائیاں ہیں

خورشید گر کہوں میں تو جان ہے وہ بیلا
جو مہ کہوں ترا رُو اُس پر تو چھائیاں ہیں

جب پان کھا کے پیارا گلشن میں جا ہنسا ہے — بے اختیار کلیاں تب کھل کھلا ئیاں ہیں
کہتے تھے ہم کسی سے تم بن نہیں ملیں گے — اب کس کے ساتھ پیارے وے دلربائیاں ہیں
عاشق سے گرم ملنا پھر بات بھی نہ کہنا — کیا بے مروّتی ہے کیا بے وفائیاں ہیں
افسوس اے صنم تم ایسے ہوئے ہو ابتر — ملتے تو غیر سے جا ہم سے روکھائیاں ہیں
قسمت میں دیکھیں کیا ہے جیتے رہیں کہ مرجائیں — قاتل سے ہم نے یارو آنکھیں لڑائیاں ہیں

اب مہرباں ہوا ہے تاباں ترا ستمگر
آہیں تری کسی نے شاید سنائیاں ہیں

مرزا محمد رفیع سودا

سودا تخلص۔ مرزا محمد رفیع نام۔ شہر دہلی کو ان کے کلام سے فخر ہے۔ باپ مرزا محمد شفیع میرزایانِ کابل سے تھے۔ بزرگوں کا پیشہ سپہ گری تھا۔ مرزا شفیع بطریق تجارت وارد ہندوستان ہوئے۔ ہند کی خاک دامنگیر نے ایسے قدم پکڑے کہ یہیں رہے۔ بعض کا قول ہے کہ باپ کی سوداگری سودا کے لئے وجہ تخلص ہوئی۔ لیکن بات یہ ہے کہ ایشیا کے شاعر ہر ملک میں شاعری کا دم بھرتے ہیں اور سودا اور دیوانگی عشق کے ہمزاد ہیں اس لئے وہ بھی ان لوگوں کے لئے باعث فخر ہے۔ چنانچہ اسی لحاظ سے سودا تخلص کیا۔ اور سوداگری کی بدولت ایہام کی صنعت زد کن میں آئی۔

سودا ۱۱۲۵ھ میں پیدا ہوئے۔ دہلی میں پرورش اور تربیت پائی۔ کابلی دروازہ کے علاقہ میں ان کا گھر تھا۔ ایک بڑے پھاٹک میں نشست رہتی تھی۔ وہ دروازہ تباہی دہلی میں تباہ ہوا۔ شیخ ابراہیم ذوق علیہ الرحمۃ اکثر اُدھر ٹہلتے ہوئے جا نکلتے تھے۔ مَیں ہمرکاب ہوتا تھا۔ مرزا کے وقت کے حالات اور مقالات کو ذکر کر کے قدرت خدا کو یاد کیا کرتے تھے۔

سودا بموجب رسم زمانہ کے اوّل سلیمان قلی خاں وداؔد[1] کے پھر شاہ حاتم کے شاگرد ہوئے۔ شاہ موصوف نے بھی اپنے دیوان کے دیباچہ میں جو شاگردوں کی فہرست لکھی ہے اس میں مرزا کا نام اس طرح لکھا ہے جس سے فخر کی خوشبو آتی ہے۔ خوشا نصیب اس استاد کے جس کی گود میں ایسا شاگرد پل کر بڑا ہو۔ خان آرزو کے شاگرد نہ تھے مگر ان کی صحبت سے فائدے بہت حاصل کئے۔ چنانچہ پہلے فارسی شعر کہا کرتے تھے۔ خان آرزو نے کہا کہ مرزا فارسی اب تمہاری زبان مادری نہیں۔ اس میں ایسے نہیں ہو سکتے کہ تمہارا کلام اہل زبان کے مقابل میں قابل تعریف ہو۔ طبع موزوں ہے۔ شعر سے نہایت مناسبت رکھتی ہے۔ تم اُردو کہا کرو تو یکتائے زمانہ ہو گے۔ مرزا بھی سمجھ گئے اور دیرینہ سال استاد کی نصیحت پر عمل کیا۔ غرض طبیعت کی مناسبت اور مشق کی کثرت سے دلّی جیسے شہر میں اُن کی اُستادی نے خاص و عام سے اقرار لیا کہ اُن کے سامنے ہی ان کی غزلیں گھر گھر اور کوچہ و بازار میں خاص و عام کی زبان پر جاری تھیں +

جب کلام کا شہرہ عالمگیر ہوا تو شاہ عالم بادشاہ اپنا کلام اصلاح کے لئے دینے لگے اور فرمائشیں کرنے لگے۔ ایک دن کسی غزل کے لئے تقاضا کیا۔ انھوں نے عذر بیان کیا۔ حضور نے فرمایا کہ بھئی مرزا کے غزلیں روز کہہ لیتے ہو؟ مرزا نے کہا پیر و مرشد جب طبیعت لگ جاتی ہے۔ دو چار شعر کہہ لیتا ہوں۔ حضور نے فرمایا کہ ہم تو پائخانہ میں بیٹھے بیٹھے چار غزلیں کہہ لیتے ہیں۔ ہاتھ باندھ کر عرض کی حضور ویسی بو بھی آتی ہے۔ یہ کہہ کر چلے آئے۔ بادشاہ نے پھر کئی دفعہ بُلا بھیجا اور کہا کہ ہماری غزلیں بناؤ، ہم تمہیں ملک الشعراء کر دیں گے۔ یہ نہ گئے اور کہا کہ حضور کی

[1] مرزا محمد زمان عرف سلیمان قلیخاں کے دادا اصفہان سے آئے تھے۔ یہ دلی میں پیدا ہوئے۔ نواب موسوی خاں کے ساتھ اعزاز سے زندگی بسر کرتے تھے تین سو روپیہ مہینہ پاتے تھے اور شعر کہہ کر دل خوش کیا کرتے۔ دیکھو مصحفی کا شعرائے فارسی کا تذکرہ +

ملک الشعرائی سے کیا ہوتا ہے۔ کر لے گا تو میرا کلام ملک الشعرا کرے گا۔ پھر ایک بڑا مخمس شہر آشوب لکھا ع

کہا میں آج یہ سوداؔ سے کیوں ہے ڈانواں ڈول ؛

بے درد ظاہر بیں کہتے ہیں کہ بادشاہ اور دربار بادشاہ کی ہجو کی ہے۔ غور سے دیکھو تو ملک کی دلسوزی نے اپنے وطن کا مرثیہ کہا ہے +

مرزا دل شکستہ ہو کر گھر میں بیٹھ رہے۔ قدرداں موجود تھے۔ کچھ پروا نہ ہوئی ان میں اکثر رؤسا و اُمرا خصوصاً مہربان خاں اور بسنت خاں خواجہ سرا تھے۔ چنانچہ وہی بسنت خاں ہیں جن کی تعریف میں قصیدہ کہا ہے ؎

کل حرص نام شخصے سودا پہ مہرباں ہو　بولا نصیب تیرے سب دولتِ جہاں ہو

حرص کی زبانی دُنیا کی دولت اور نعمتوں کا ذکر کرکے خود کہتے ہیں کہ اے حرص!

جو کچھ کہا ہے تو نے یہ تجھ کو سب مبارک　میں اور میرے سر پر میرا بسنت خاں ہو

ان لوگوں کی بدولت ایسی فارغ البالی سے گزرتی تھی کہ ان کے کلام کا شہرہ جب نواب شجاع الدّولہ نے لکھنؤ میں سُنا تو کمال اشتیاق سے برادرِ من مشفق مہربانِ من لکھ کر خط مع خرچ سفر بھیجا اور طلب کیا۔ انھیں دلی کا چھوڑنا گوارا نہ ہوا جواب میں فقط اس رباعی پر حُسن معذرت کو ختم کیا ؎

سوداؔ پئے دُنیا تو بہر سُو کب تک ؟　آوارہ ازیں کوچہ باں کو کب تک ؟

حاصل یہی اس سے نہ کہ دنیا ہو وے ؟　بالفرض ہوا یوں بھی۔ تو پھر تو کب تک ؟

کئی برس کے بعد وہ قدردان مر گئے زمانے بدل گئے۔ سوداؔ بہت گھبرائے۔ اس عہد میں ایسے تباہی زدوں کے لئے دو ٹھکانے تھے۔ لکھنؤ یا حیدرآباد۔ لکھنؤ پاس تھا اور فیض وسخاوت کی گنگا بہہ رہی تھی۔ اس لئے جو دلّی سے نکلتا تھا اُدھر ہی رخ کرتا تھا اور اتنا کچھ پاتا تھا کہ پھر دوسری طرف خیال نہ جاتا تھا۔ اس وقت حاکم بلکہ وہاں کے محکوم بھی جویائے کمال تھے۔ نکتہ کو کتاب کے مولوں خریدتے تھے +

غرض ۶۰ یا ۶۶ برس کی عمر میں دتی سے نکل کر چند روز **فرخ آباد** میں نواب بنگش کے پاس رہے۔ اس کی تعریف میں بھی قصیدے موجود ہیں۔ وہاں سے ۱۱۸۵ھ میں لکھنؤ پہنچے۔ نواب شجاع الدولہ کی ملازمت حاصل کی۔ وہ بہت اعزاز سے ملے۔ اور ان کے آنے پر کمال خرسندی ظاہر کی۔ لیکن یا نو بے تکلفی سے یا طنز سے اتنا کہا کہ مرزا وہ رباعی تمھاری اب تک میرے دل پر نقش ہے اور اسی کو مکرر پڑھا۔ انھیں اپنے حال پر بڑا رنج ہوا اور بپاس وضعداری پھر دربار نہ گئے۔ یہاں تک کہ شجاع الدولہ مر گئے اور **آصف الدولہ** مسند نشین ہوئے لکھنؤ میں مرزا **فاخر مکیں** زبان فارسی کے مشہور شاعر تھے۔ ان سے اور مرزا رفیع سے بگڑی۔ اور جھگڑے نے ایسا طول کھینچا کہ نواب آصف الدولہ کے دربار تک نوبت پہنچی (عنقریب اس کا حال بہ تفصیل بیان کیا جائے گا) انجام یہ ہوا کہ علاوہ انعام واکرام کے چھ ہزار روپیہ سالانہ وظیفہ ہو گیا اور نواب نہایت شفقت کی نظر فرمانے لگے۔ اکثر حرم سرا میں خاصہ پر بیٹھے ہوتے اور مرزا کی اطلاع ہوتی فوراً باہر نکل آتے تھے۔ شعر سن کر خوش ہوتے اور انھیں انعام سے خوش کرتے تھے +

نواب آصف الدولہ کی ملازمت

جب تک مرزا زندہ رہے نواب مغفرت مآب اور اہل لکھنؤ کی قدردانی سے ہر طرح فارغ البال رہے۔ تقریباً ۷۰ برس کی عمر میں ۱۱۹۵ھ میں وہیں دنیا سے انتقال کیا۔ شاہ حاتم زندہ تھے۔ سن کر بہت روئے اور کہا کہ افسوس ہمارا پہلوانِ سخن مر گیا۔ حکیم قدرت اللہ خاں قاسم فرماتے ہیں کہ اواخر عمر میں مرزا نے دلی چھوڑی۔ تذکرۂ دلکشا میں ہے کہ ۶۶ برس کی عمر میں گئے۔ تعجب ہے کہ مجموعۂ سخن جو لکھنؤ میں لکھا گیا اس میں ہے کہ مرزا عالم شباب میں وارد لکھنؤ ہوئے۔ غرض جو نکہ شجاع الدولہ ۱۱۸۸ھ میں فوت ہوئے تو مرزا نے کم وبیش ستر برس کی عمر پائی +

[1] فخر الدین نے تاریخ کہی ع بولے سنعف دو رکر پلٹے عناد۔ شاعران ہند کا سردار گیا ۱۱۹۵ھ۔ مصحفی نے کہا ع سودا کجا وآں سخنِ دلفریب او ۱۱۹۵ھ + میر قمر الدین منت نے کہا ع بگفت گوہر معنی یتیم شد ہے ہے۔ ۱۱۹۵ھ

ان کے بعد کمال بھی خاندان سے نیست و نابود ہو گیا۔ راقم آثم ۱۸۵۸ء میں لکھنؤ گیا۔ بڑی تلاش کے بعد ایک شخص ملے کہ ان کے نواسے کہلاتے تھے۔ بیچارے پڑھے لکھے بھی نہ تھے اور نہایت آشفتہ حال تھے۔ سچ ہے۔ ع

میراثِ پدر خواہی علم پدر آموز

بندۂ عشق شدی ترک نسب کن جامی کاندریں راہ فلاں ابن فلاں چیزے نیست

کلیات اور اسکی تفصیل

ان کا کلیات ہر جگہ مل سکتا ہے اور قدر و منزلت کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے۔ حکیم سیّد اصلح الدین خاں نے ترتیب دیا تھا اور اس پر دیباچہ بھی لکھا تھا۔ تھوڑی دیر کے لئے پرانے محاوروں سے قطع نظر کر کے دیکھیں تو سرتاپا نظم اور انشاء اُردو کا دستور العمل ہے۔ اوّل قصائد اُردو بزرگان دین کی مدح میں اور اہل دول کی تعریف میں۔ اسی طرح چند قصائد فارسی۔ ۲۴ مثنویاں ہیں بہت سی حکایتیں اور لطائف منظوم ہیں۔ ایک مختصر دیوان فارسی کا تمام و کمال۔ دیوان ریختہ جس میں بہت سی لاجواب غزلیں۔ اور۔ مطلع۔ رباعیاں۔ مستزاد۔ قطعات۔ تاریخیں۔ پہیلیاں۔ واسوخت۔ ترجیع بند۔ مخمس سب کچھ کہا ہے۔ اور ہر قسم کی نظم میں ہجویں ہیں کہ جو ان کے مخالفوں کے دل و جگر کو کبھی خون اور کبھی کباب کرتی ہیں۔ ایک تذکرہ شعرائے اُردو کا ہے اور وہ نایاب ہے +

رائے قصائد پر

غزلیں اُردو میں پہلے سے بھی لوگ کہہ رہے تھے مگر دوسرے طبقہ تک اگر شعرا نے کچھ مدح میں کہا ہے تو ایسا ہے کہ اُسے قصیدہ نہیں کہہ سکتے۔ پس اوّل قصائد کا کہنا اور پھر اس دھوم دھام سے اعلیٰ درجۂ فصاحت و بلاغت پر پہنچانا ان کا پہلا فخر ہے۔ وہ اس میدان میں فارسی کے نامی شہسواروں کے ساتھ عنان درعنان ہی نہیں گئے۔ بلکہ اکثر میدانوں میں آگے نکل گئے ہیں۔ ان کے کلام کا زور شور انوری اور خاقانی کو دباتا ہے۔ اور نزاکت مضمون میں عرفی و ظہوری کو شرماتا ہے +

رائے مثنویوں

مثنویاں ۲۴ ہیں اور اکثر حکایتیں اور لطائف وغیرہ ہیں وہ سب نظم اور فصاحت کلام کے اعتبار سے ان کا جوہر طبعی ظاہر کرتی ہیں۔ مگر عاشقانہ مثنویاں اُن کے مرتبہ کے لائق نہیں۔ میر حسن تو کیا۔ میر صاحب کے شعلۂ عشق اور دریائے عشق کو بھی نہیں پہنچیں۔ فارسی کے مختصر دیوان میں سب ردیفیں پوری ہیں۔

دیوان فارسی

زورِ طبع اور اصول شاعرانہ سب قائم ہیں۔ صائب کا انداز ہے مگر تجربہ کار جانتے ہیں کہ ایک زبان کی مشق اور مزاولت دوسری زبان کے اعلیٰ درجہ کمال پر پہنچنے میں سنگ راہ ہوتی ہے۔ چنانچہ شیخ مصحفی نے اپنے تذکرہ میں لکھا ہے۔ "آخر آخر خیال شعر فارسی ہم پیدا کرد۔ مگر از فہم و عقلش ایں امر بعید بود کہ کرد۔ غرض غزلہائے فارسی خود نیز کہ در لکھنؤ گفتہ بقید ردیف ترتیب دادہ داخل دیوان ریختہ نمودہ۔ وایں ایجاد اوست"۔ دیوان ریختہ (وقت کی زبان سے قطع نظر کرکے) باعتبار جوہر کلام سرتاپا مرصع ہے۔ بہت سی غزلیں دلچسپ اور دلپسند بحروں میں ہیں کہ اس وقت تک اُردو میں نہیں آئی تھیں۔ زمینیں سنگلاخ ہیں اور ردیف قافیئے بہت مشکل۔ مگر جس پہلو سے اُنھیں جمادیا ہے۔ ایسے جمے ہیں کہ دوسرے پہلو سے کوئی بٹھائے تو معلوم ہو +

دیوان ریختہ

ہجووں کا حال

گرمیٔ کلام کے ساتھ ظرافت جو ان کی زبان سے ٹپکتی ہے۔ اس سے صاف ظاہر ہے کہ بڑھاپے تک شوخی طفلانہ اُن کے مزاج میں اُمنگ دکھاتی تھی۔ مگر ہجووں کا مجموعہ جو کلیات میں ہے اس کا ورق ورق ہنسنے والوں کے لئے زعفران زار کشمیر کی کیاریاں ہیں۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ طبیعت کی شگفتگی اور زندہ دلی کسی طرح کے فکر و تردد کو پاس نہ آنے دیتی تھی۔ گرمی اور مزاج کی تیزی بجلی کا حکم رکھتی تھی۔ اور اس شدت کے ساتھ کہ نہ کوئی انعام اسے بجھا سکتا تھا نہ کوئی خطرا سے دبا سکتا تھا۔ نتیجہ اس کا یہ تھا کہ ذرا سی ناراضی میں بے اختیار ہو جاتے تھے۔ کچھ اور بس نہ چلتا تھا۔ جھٹ ایک ہجو کا طومار

تیار کر دیتے تھے +

غنچہ نام ان کا غلام تھا۔ ہر وقت خدمت میں رہتا تھا اور ساتھ قلمدان لئے پھرتا تھا۔ جب کسی سے بگڑتے تو فوراً پکارتے۔ ارے غنچہ لا تو قلمدان۔ ذرا میں اس کی خبر تو لوں۔ یہ مجھے سمجھا کیا ہے۔ پھر شرم کی آنکھیں بند اور بیحیائی کا مُنہ کھول کر وہ بے نُقط سُناتے تھے کہ شیطان بھی امان مانگے +

عربی و فارسی دو ذخیرہ دار اُردو کے ہیں۔ اُن کے خزانوں میں ہجووں کے تھیلے بھرے ہیں۔ مگر اس وقت تک اُردو کے شاعر صرف ایک دو شعروں میں دل کا غبار نکال لیتے تھے۔ یہ طرز خاص کہ جس سے ہجو ایک موٹا ٹہنا اس باغ شاعری کا ہو گئی۔ انہی کی خوبیاں ہیں۔ عالم۔ جاہل۔ فقیر۔ امیر۔ نیک۔ بد۔ کسی کی ڈاڑھی ان کے ہاتھ سے نہیں بچی۔ اس طرح پیچھے پڑتے تھے کہ انسان جان سے بیزار ہو جاتا تھا۔ مگر میر ضاحک[1]۔ فدوی۔ مکین۔ بقا[2] وغیرہ اہل کمال نے بھی چھوڑا نہیں۔ ان کا کیا انھیں کے دامن میں ڈالا ہے۔ البتہ حسن قبول اور شہرت عام

[1] میر ضاحک کا حال دیکھو صفحہ ۱۸۱۔ فدوی ۱۵۵۔ مکین ۱۶۹۔ شاہ ہدایت سے جو لطیفہ ہوا دیکھو صفحہ ۱۷۱۔

[2] بقا تخلص۔ بقاء اللہ خاں نام۔ اکبر آباد وطن تھا۔ دلّی میں پیدا ہوئے تھے۔ لکھنؤ میں جا رہے۔ حافظ لطف اللہ خوشنویس کے بیٹے تھے۔ اور مرزا اور میر صاحب کے معاصر تھے۔ شاہ حاتم سے ریختہ کی اصلاح لی تھی۔ اور فارسی میں مرزا فاخر کے شاگرد تھے۔ طبیعت فن شعر کے لئے نہایت مناسب تھی اور زبان صاف۔ ایک مطلع ان کا اہل سخن کے جلسوں میں ضرب المثل چلا آتا ہے۔ لاجواب ہے۔ دیکھو صفحہ ۲۰۸۔ میر اور سودا دونوں کو خاطر میں نہ لاتے تھے۔ چنانچہ ایک جگہ فرماتے ہیں:

میر و مرزا کی شعر خوانی نے — بس کہ عالم میں دھوم ڈالی تھی
کھول دیوان دونوں صاحب کے — اے بقا ہم نے جب زیارت کی
کچھ نہ پایا سوائے اس کے سخن — ایک تُو تُو کہے ہے اک ہی ہی

بقا کا باقی حال دیکھو صفحہ ۲۲۲ و ۲۹۱۔

ایک نعمت ہے کہ وہ کسی کے اختیار میں نہیں۔ انھیں خدا نے دی۔ وہ محروم رہے۔ مرزا نے جو کچھ کہا بچے بچے کی زبان پر ہے انھوں نے جو کہا وہ ڈھونڈنے سے بھی نہیں ملتا۔ انھیں میں سے ایک شعر ہے کہ فدوی[1] کی طبع موزوں سے مرزا صاحب کی شان میں واقع ہوا ہے:۔

کچھ کٹ گئی ہے پٹی کچھ کٹ گیا ہے ڈورا　　دُم داب سامنے سے وہ اُڑ چلا لٹورا

ع　بھڑوا ہے مسخرا ہے سودا اسے ہوا ہے

ہاتھی کی ہجو

مرزا نے جو راجہ نرپت سنگھ کے ہاتھی کی ہجو میں مثنوی کہی ہے۔ اس کے جواب میں بھی کسی نے مثنوی لکھی ہے۔ اور خوب لکھی ہے۔ چنانچہ وہ خوب کہتے ہیں ؎

تم اپنے فیل معنیٰ کو نکالو　　مرے ہاتھی سے دو ٹکر لڑا لو

سید انشا نے لکھا ہے کہ دو ٹکریں چاہئیں۔ مگر یہ سید صاحب کی سینہ زوری ہے +

ہجوؤں میں ایک ساقی نامہ ہے جس میں فوقی شاعر کی ہجو ہے

---

[1] فدوی اصل میں ہندو تھے۔ مکند رام نام تھا۔ مسلمان ہو گئے تھے۔ پنجاب وطن تھا۔ علم کم مگر طبیعت مناسب تھی۔ شعر اُردو کہتے تھے۔ صابر علی شاہ کے شاگرد تھے۔ اور فقیرانہ وضع سے زندگی بسر کرتے تھے۔ مشاعرہ میں جاتے تو کبھی بیٹھے کبھی کھڑے ہی کھڑے غزل پڑھتے اور چلے جاتے تھے۔ جب انھوں نے احمد شاہ کی تعریف میں قصیدہ کہا تو بادشاہ نے ہزار روپیہ نقد اور گھوڑا اور تلوار انعام دی۔ ان کا بھی دماغ بلند ہوا اور دعویٰ ملک الشعرائی کا کرنے لگے۔ کچھ مرزا پر اعتراض کئے۔ اس پر مرزا نے اُلّو کی اور بنئے کی ہجو کہی۔ انجام کو طرفین کی ہجویں حد سے گزر گئیں۔ فدوی نواب ضابطہ خاں کے ہاں نوکر بھی ہو گئے تھے۔ اور آخر کو انھیں بھی لکھنؤ جانا پڑا۔ ان کا دیوان نہایت دلچسپ ہے۔ اور ہر غزل کا خاتمہ پیغمبر صاحب کی نعت یا کسی اور امام کی مدح پر کرتے ہیں۔ زلیخا کا ترجمہ بھی نواب صاحب موصوف کی فرمائش سے نظم کیا ہے۔ گلزار ابراہیمی میں لکھا ہے کہ یہ ایک برخود غلط آدمی تھا مرزا کے مقابلہ کے لئے فرخ آباد میں آیا اور ذلت اٹھا کر گیا +

اصل میں قیام الدین قائم[1] کی ہجو میں تھا وہ بزرگ باوجود شاگردی کے مرزا سے منحرف ہو گئے تھے۔ جب یہ ساقی نامہ لکھا گیا تو گھبرائے اور آ کر خطا معاف کروائی۔ مرزا نے ان کا نام نکال ڈالا اور فوقی ایک فرضی شخص کا نام ڈال دیا +

مرثیہ اور سلام

مرثیے اور سلام بھی بہت کہے ہیں۔ اس زمانے میں مسدس کی رسم کم تھی۔ اکثر مرثیے چو مصرع ہیں مگر مرثیہ گوئی کی آج کی ترقی دیکھ کر ان کا ذکر کرتے ہوئے شرم آتی ہے۔ شاید انھی مرثیوں کو دیکھ کر اگلے وقتوں میں مثل مشہور ہوئی تھی۔ کہ بگڑا شاعر مرثیہ گو اور بگڑا گویا مرثیہ خواں۔ حق یہ ہے کہ مرثیہ کا شاعر گویا ایک مصیبت زدہ ہوتا ہے کہ اپنا دُکھڑا روتا ہے۔ جب کسی کا کوئی مر جاتا ہے تو غم و اندوہ کے عالم میں جو بیچارہ کی زبان سے نکلتا ہے سو کہتا ہے۔ اس پر کون بے درد ہے جو اعتراض کرے۔ وہاں صحت و غلطی اور صنائع و بدائع کو کیا ڈھونڈھنا۔ یہ لوگ فقط اعتقاد مذہبی کو مدنظر رکھ کر مرثیے سلام کہتے تھے۔ اس لئے قواعد شعری کی احتیاط کم کرتے تھے۔ اور کوئی اس پر گرفت بھی نہ کرتا تھا۔ پھر بھی مرزا کی تیغ زبان جب اپنی اصالت دکھاتی ہے تو دلوں میں چھریاں ہی مار جاتی ہے۔ ایک مطلع ہے ؎

نہیں ہلال فلک پر مہِ محرم کا	چڑھا ہے چرخ پہ تیغا مصیبت و غم کا

ایک اور مرثیہ کا مطلع ہے ؎

[1] یہ صاحب کمال چاندپور کے رہنے والے تھے۔ مگر فن شعر میں کامل تھے ان کا دیوان ہرگز میر و مرزا کے دیوان سے نیچے نہیں رکھ سکتے مگر کیا کیجئے کہ قبول عام اور کچھ شے ہے۔ شہرت نہ پائی۔ یہ اول شاہ ہدایت کے شاگرد ہوئے۔ ان سے ایسی بگڑی کہ ہجو کہی۔ تعجب یہ ہے کہ شاہ موصوف باوجودیکہ حد سے زیادہ خاکساری طبیعت میں رکھتے تھے۔ مگر انھوں نے بھی ایک قطعہ ان کے حق میں کہا۔ پھر خواجہ میر درد کے شاگرد ہوئے۔ ان کے حق میں بھی کچھ سن کر الگ ہوئے۔ پھر مرزا کی خدمت میں آئے اور ان سے پھرے۔ مرزا تو مرزا تھے انھوں نے سیدھا کیا +

یا رسُنو تو خالق اکبر کے واسطے   انصاف سے جواب دو حیدر کے واسطے
وہ بوسہ گہ نبی تھی پیمبر کے واسطے   یا ظالموں کی بُرّشِ خنجر کے واسطے

باوجود عیوب مذکورہ بالا کے جہاں کوئی حالت اور روئداد دکھاتے ہیں۔ پتھر کا دل ہو تو پانی ہوتا ہے۔ اور وہ ضرور آجکل کے مرثیہ گویوں کو دیکھنی چاہئے۔ کیونکہ یہ لوگ اپنے زور کمال میں آکر اس کوچہ سے نکل گئے ہیں[1] +

متفرقات رائے تاریخ پر

داسوخت۔ مخمس۔ ترجیع بند۔ مستزاد۔ قطعہ۔ رباعیاں۔ پہیلیاں وغیرہ اپنی اپنی طرز میں لاجواب ہیں۔ خصوصاً تاریخیں بے کم وکاست ایسی برمحل اور برجستہ واقع ہوئی ہیں کہ ان کے عدم شہرت کا تعجب ہے۔ غرض جو کچھ کہا ہے اُسے اعلیٰ درجہ کمال پر پہنچایا ہے۔ مرزا کی زبان کا حال نظم میں تو سب کو علوم ہے کہ کبھی دودھ ہے۔ کبھی شربت۔ مگر نثر میں بڑی مشکل ہوتی ہے۔ فقط مصری کی ڈلیاں چبانی پڑتی ہیں۔ اور صاف معلوم ہوتا ہے کہ نثر اُردو ابھی بچہ ہے۔ زبان نہیں کھُلی۔ چنانچہ شعلۂ عشق کی عبارت سے واضح ہے کہ اُردو ہے مگر مرزا بیدل کی نثر فارسی معلوم ہوتی ہے۔ کتاب مذکور اس وقت موجود نہیں۔ لیکن ایک دیباچہ میں اُنھوں نے تھوڑی سی نثر بھی لکھی ہے۔ اُس سے افسانہ مذکور کا انداز معلوم ہوسکتا ہے۔ دیکھو صفحہ ۲۲ +

رائے نثر اُردو پر

عمومی رائے انکے کلام پر

کُل اہلِ سخن کا اتفاق ہے کہ مرزا اس فن میں اُستاد مسلم الثبوت تھے۔ وہ ایسی طبیعت لے کر آئے تھے جو شعر اور فن انشا ہی کے واسطے پیدا ہوئی تھی۔ میر صاحب نے بھی اُنھیں پورا شاعر مانا ہے[2]۔ ان کا کلام کہتا ہے کہ دل کا کنول ہر وقت کھِلا رہتا تھا۔ اِس پر سب رنگوں میں ہم رنگ اور ہر رنگ میں اپنی ترنگ۔ جب دیکھو طبیعت شورش سے بھری اور جوش و خروش سے لبریز۔ نظم کی ہر فرع میں

---

[1] لطف یہ ہے کہ اس زمانہ کے لوگ سودا کے مرثیوں کو کہتے تھے کہ ان میں مرثیت نہیں۔ شاعری ہے۔ اور سودا خود بھی اُن کی بے انصافی سے نالاں ہیں +

[2] دیکھو صفحہ ۲۱۸ +

طبع آزمائی کی ہے اور کہیں رُکے نہیں - چند صفتیں خاص ہیں۔ جن سے کلام ان کا جملہ شعرائے سے ممتاز معلوم ہوتا ہے۔ اول یہ کہ زبان پر حاکمانہ قدرت رکھتے ہیں۔ کلام کا زور مضمون کی نزاکت سے ایسا دست و گریبان ہے جیسے آگ کے شعلہ میں گرمی اور روشنی۔ بندش کی چُستی اور ترکیب کی درستی سے لفظوں کو اس دروبست کے ساتھ پہلو بہ پہلو جڑتے ہیں گویا ولایتی طپنچہ کی چانپیں چڑھی ہوئی ہیں اور یہ خاص ان کا حصّہ ہے۔ چنانچہ جب اُن کے شعر میں سے کچھ بھول جائیں تو جب تک وہی لفظ وہاں نہ رکھے جائیں۔ یہ شعر مزا ہی نہیں دیتا۔ خیالات نازک اور مضامین تازہ باندھتے ہیں مگر اس باریک نقاشی پر ان کی فصاحت آئینہ کا کام دیتی ہے۔ تشبیہ اور استعارے ان کے ہاں ہیں۔ مگر اسی قدر کہ جتنا کھانے میں نمک یا گلاب کے پھول پر رنگ۔ رنگینی کے پردہ میں مطلب اصلی کو گم نہیں ہونے دیتے +

اُن کی طبیعت ایک ڈھنگ کی پابند نہ تھی۔ نئے نئے خیال اور چُٹیلتے قافئے جس پہلو سے جمتے دیکھتے تھے جما دیتے تھے۔ اور وہی ان کا پہلو ہوتا تھا کہ خواہ مخواہ سننے والوں کو بھلے معلوم ہوتے تھے۔ یا زبان کی خوبی تھی کہ جو بات اس سے نکلتی تھی اس کا انداز نیا اور اچھا معلوم ہوتا تھا۔ ان کے ہمعصر اُستاد خود اقرار کرتے تھے کہ جو باتیں ہم کاوش اور تلاش سے پیدا کرتے ہیں وہ اس شخص کو پیش پا افتادہ ہیں +

جن اشخاص نے زبان اُردو کو پاک صاف کیا ہے مرزا کا ان میں پہلا نمبر ہے۔ اُنھوں نے فارسی محاوروں کو بھاشا میں کھپا کر ایسا ایک کیا ہے جیسے علم کیمیا کا ماہر ایک مادّہ کو دوسرے مادّہ میں جذب کر دیتا ہے۔ اور تیسرا مادّہ پیدا کر دیتا ہے کہ کسی تیزاب سے اس کا جوڑ کھُل نہیں سکتا۔ انھوں نے ہندی زبان کو فارسی محاوروں اور استعاروں سے نہایت زور بخشا۔ اکثر ان میں

سے رواج پاگئے اکثر آگے نہ چلے[۱]

انہی کا زور طبع تھا جس کی نزاکت سے دو زبانیں ترکیب پاکر تیسری زبان پیدا ہوگئی اور اسے ایسی قبولیت عام حاصل ہوئی کہ آئندہ کے لئے وہی ہندوستان کی زبان ٹھیری جس نے حکام کے درباروں اور علوم کے خزانوں پر قبضہ کیا۔ اسی کی بدولت ہماری زبان فصاحت اور انشا پردازی کا تمغا لے کر شائستہ زبانوں کے دربار میں عزت کی کرسی پائے گی۔ اہل ہند کو ہمیشہ اُن کی عظمت کے سامنے ادب اور ممنونی کا سر جھکانا چاہئے۔ ایسی طبیعتیں کہاں پیدا ہوتی ہیں کہ پسند عام کی نبض شناس ہوں اور وہی باتیں نکالیں جن پر قبول عام رجوع کرکے سالہاسال کے لئے رواج کا قبالہ لکھ دے +

تصرفات قادر الکلامی

ہر زبان کے اہل کمال کی عادت ہے کہ غیر زبان کے بعض الفاظ میں اپنے محاورہ کا کچھ نہ کچھ تصرف کر لیتے ہیں۔ اس میں کسی موقع پر قادر الکلامی کا زور دکھانا ہوتا ہے کسی موقع پر محاورہ عام کی پابندی مطلوب ہوتی ہے۔ بے خبر کہہ دیتا ہے کہ غلطی کی۔ مرزا نے بھی کہیں کہیں ایسے تصرف کئے ہیں۔ چنانچہ ایک جگہ کہتے ہیں

ع جیسے کہتا ہے کوئی ہو ترا صفاً صفا ایک غزل میں کہتے ہیں۔

لب و لہجہ ترا سا ہیگا کب خوبان عالم میں | یہ غلط الزام ہے جگ میں کہ سب مصری کی ہیں ڈلیاں

کل تو مست اس کیفیت سے تھا کہ آنے دَیر سے | بھر نظر جو مدرسہ دیکھا سو وہ میخانہ تھا

ساق سیمیں کو ترے دیکھ کے گوری گوری | شمع مجلس میں ہوئی جاتی ہے تھوڑی تھوڑی

اپنے کعبہ کی بزرگی شیخ جو چاہے سو کر | از روئے تاریخ تو بیش از صنم خانہ نہیں

فارسی محاورہ کو بھی دیکھنا چاہئے کہ کس خوبصورتی سے بول گئے ہیں:۔

ہے مجھے فیض سخن اسکی ہی مداحی کا | ذات پر جس کی مُنبر ہن کُنہ عزوجل

بہت ہر ایک سے ٹکراکے چلے تھا کالا | ہوگیا دیکھ کے وہ زلفِ سیاہ فام سفید[۲]

---

[۱] دیکھو صفحہ ۴۶-۴۷ [۲] اس غزل کا مطلع دیکھو صفحہ ۴۳ +

خیال ان انکھڑیوں کا چھوڑمت مرنیکے بعد از بھی　　دلا آیا جو تو اِس میکدہ میں جام لیتا جا

سودا تجھے کہتا ہوں نہ خوباں سے مل انشا　　تو اپنا غریب عاجز دل بیچنے والا

عاشق بھی نامراد ہیں پر اس قدر کہ ہم　　دل کو گنوا کے بیٹھ رہے صبر کرکے ہم

یہاں ردیف میں تصرف کیا ہے کہ سے حذف ہو گئی ہے۔ اسی طرح عاجز میں ع
حکیم کی ہجو میں کہتے ہیں ؎

لکھ دیا مجنوں کو شیر شتر　　کہہ دیا مستسقی سے جا فصد کر

ایک کہانی میں لکھتے ہیں ؎

قضا کار وہ والیٔ نامدار　　ہوا درد قولنج سے بیقرار

ہندی مضامین

مرزا اکثر ہندی کے مضمون اور الفاظ نہایت لطیف طور پر تضمین کرکے زبانِ ہند کی اصلیت کا حق ادا کرتے تھے۔ اس لطف میں یہ اور سید انشا شامل ہیں چنانچہ فرماتے ہیں:۔

ترکش الینڈ سینہ عالم کا چھان مارا　　مژگاں نے تیرے پیارے ارجن کا بان مارا

محبت کے کروں بھج بل کی میں تعریف کیا یارو　　ستم پربت ہو تو اُس کو اُٹھا لیتا ہے جوں رائی

نہیں ہے گھر کوئی ایسا جہاں اسکو نہ دیکھا ہو　　کنھیا سے نہیں کچھ کم صنم میرا وہ ہرجائی

ساون کے بادلوں کی طرح سے بھرے ہوئے　　یہ وہ نین ہیں جن سے کہ جنگل ہرے ہوئے

بوندی کے جمدھروں سے وہ بھڑتے ہیں ہر گھڑی　　لڑکے مجھ آنسوؤں کے غضب منکرے ہوئے

اے دل یہ کس سے بگڑی کہ آتی ہے فوج اشک[1]　　لختِ جگر کی لاش کو آگے دھرے ہوئے

تراش الفاظ

مرزا خود الفاظ تراشتے تھے اور اس خوبصورتی سے تراشتے تھے کہ مقبول خاص و عام ہوتے تھے۔ آصف الدولہ مرحوم کی تعریف میں ایک قصیدہ کہا ہے چند شعر اس کے لکھتا ہوں مضامین ہندی کے ساتھ الفاظ کی خوبصورت تراش کا لطف دیکھو:۔

[1] ہندوستان کا قدیم دستور ہے کہ جب سپہ سالار لڑائی میں مارا جاتا تھا تو اُس کی لاش کو آگے لے کر تمام فوج کے ساتھ دھاوا کر دیتے تھے۔ سرہند پر جب درانی سے فوج شاہی کی لڑائی ہوئی اور نواب قمر الدین خاں مارے گئے تو میر منو اُن کے بیٹے نے یہی کیا اور فتحیاب ہوئے۔

تیرے سایہ تلے ہے تو وہ مہنت پشہ کرجائے دیو و دد سے لڑنت
نام سُن ۔ پیل کوہ پیکر کے بہہ چلیں جوئے شیر ہو کر دنت
سحر صولت کے سامنے تیرے سامری بھول جائے اپنی پڑھنت
تیری ہیبت سے نہ فلک کے تلے کانپتی ہے زمیں کے بیچ گرنٹ
تکلے کی طرح بل نکل جاوے تیرے آگے جو دُو کرے اکڑنت
دیکھ میداں میں تجھ کو روزِ نبرد مُنہ پہ راون کے پھول جائے بسنت
منگتکِ پا اگر سُنے تیرے داب کر دم کھسک چلے مہونت
آوے بالفرض سامنے تیرے اوز ہیجا کے سوریا ساونت
تن کا اُن کے زرہ میں ہوویں حال مُرغ کی دام میں ہو جوں پھڑکنت

اسی طرح باقی اشعار ہیں۔ مُرغ کی پھڑکنت۔ جل کر بھسمنت۔ تیر کی کمان سے سرکنت زمین میں کُھدنت۔ گھوڑے کی کڑکنت اور ڈپٹنٹ۔ چودَنت (مقابل) دَبکنت (ڈر کر دبکنا) روباہ شیر کو سمجھتی ہے کیا بِشمنت۔ نچنت (بے فکر) رو پیوں کی بِکھرنت تاروں کی چھٹکنت۔ لپٹنت (لپٹنا) پڑھنت (پڑھنا) گھٹنت (گھٹنا) عام شعرائے ہند و ایران کی طرح سب تصنیفات ایک کلیات میں ہیں۔ اس لئے نہیں کہہ سکتے کہ کہ کونسا کلام کس وقت کا ہے اور طبیعت نے وقت بوقت کس طرف میل کیا ہے خصوصاً یہ کہ زبان میں کب کب کیا کیا اصلاح کی ہے۔ یہ اتفاقی موقع میرؔ صاحب[1] کو ہاتھ آیا۔ کہ چھ دیوان الگ الگ لکھ گئے۔ متقدمین اور متاخرین کے کلاموں کے مقابلہ کرنے والے کہتے ہیں کہ ان کے دفتر تصنیفات میں ردی بھی ہے۔ اور وہ بہت ہے۔ چنانچہ جس طرح میر صاحب کے کلام میں بہتر نشتر بتاتے ہیں۔ ان کے زبردست کلام میں سے بہتر خنجر تیا کرتے ہیں۔ اس رائے میں مجھے بھی شامل ہونا پڑتا ہے کہ بیشک جو کلام آج کی طرز کے موافق ہے وہ ایسے مرتبہ عالی

ساری کلیات میں بہتر خنجر ہیں۔

[1] مصحفی کے آٹھ دیوانوں میں سے بھی یہ فائدہ حاصل کر سکتے ہیں +

پر ہے جہاں ہماری تعریف کی پرواز نہیں پہونچ سکتی۔ اور دل کی پوچھو تو جن اشعار کو پرانے محاوروں کے جُرم میں ردّی کرتے ہیں آج کے ہزار محاورے ان پر قربان ہیں۔ سُن لیجیے[1]

گر کیجیے انصاف تو کی زور وفائیں | خط آتے ہی سب ٹل گئے اب آپ ہیں نا مَیں
تم جن کی ثنا کرتے ہو کیا بات ہے اُن کی! | لیکن ٹک ادھر دیکھیو اے یار بھلا مَیں!
کیفیتِ چشم اس کی مجھے یاد ہے سوداؔ | ساغر کو مرے ہاتھ سے لیجو کہ چلا مَیں

اُستاد مرحوم کہا کرتے تھے کہ جب سوداؔ کے سامنے کوئی یہ شعر پڑھ دیتا تھا یا اپنی ہی زبان پر آجاتا تھا تو وجد کیا کرتے تھے۔ اور مزے لیتے تھے۔ اسی انداز کا ایک شعر نظیری کا یاد آگیا اگرچہ فارسی ہے۔ مگر جی نہیں چاہتا کہ دوستوں کو لطف سے محروم رکھوں

بوئے یار من ازیں سُست وفا می آید | گلم از دست بگیرید کہ از کار شدم

حسن معذرت

بہارِ سخن کے گلچینو! وہ ایک زمانہ تھا کہ ہندی بھاشا کی زمین جہاں دوہروں کا سبزہ خودرو اُگا ہوا تھا وہاں نظم فارسی کی تخم ریزی ہوئی تھی۔ اس وقت فارسی کی بحروں میں شعر کہنا اور اُدھر کے محاورات کو ادھر لینا۔ اور فارسی مضامین کو ہندی لباس پہنانا ہی بڑا کمال تھا۔ اس صاحب ایجاد نے اپنے زورِ طبع اور قوت زبان سے صنعتوں اور فارسی ترکیبوں اور اچھوتے مضمونوں کو اس میں ترتیب دیا اور وہ خوبی پیدا کی کہ ایہام اور تجنیس وغیرہ صنائع لفظی جو ہندی دوہروں کی بنیاد تھی اُسے لوگ بھول گئے۔ ایسے زمانہ کے کلام میں رطب و یابس ہو تو تعجب کیا۔ ہم اس الزام کا بُرا نہیں مانتے +

اس وقت زمین سخن میں ایک ہی آفت تو نہ تھی۔ ادھر تو مشکلات مذکورہ۔ اُدھر پرانے لفظوں کا ایک جنگل۔ جس کا کاٹنا کٹھن۔ پس کچھ اشخاص آئے کہ چند کیاریاں تراش کر تخم ریزی کر گئے۔ ان کے بعد والوں نے جنگل کو کاٹا۔ درختوں کو چھانٹا۔ چمن بندی کو پھیلایا جو ان کے پیچھے آئے انھوں نے روش۔ خیاباں۔ داربست۔ گلکاری

[1] دیکھو صفحہ ۱۳۲۔ ۱۳۳ +

نہال۔ گلبن سے باغ سجایا۔ غرض عہد بعہد اصلاحیں ہوتی رہیں اور آیندہ ہوتی رہینگی
جس زبان کو آج ہم تکمیل جاودانی کا ہار پہنائے خوش بیٹھے ہیں کیا یہ ہمیشہ ایسی ہی
رہے گی ؟ کبھی نہیں ہم کس مُنہ سے اپنی زبان کا فخر کر سکتے ہیں۔ کیا دور گذشتہ کا سماں
بھول گئے۔ ذرا پھر کر دیکھو تو اِن بزرگان متقدمین کا مجمع نظر آئے گا کہ محمد شاہی
دربار کی کھڑکی دار پگڑیاں باندھے ہیں۔ پچاس پچاس گز گھیر کے جامے پہنے بیٹھے
ہیں۔ وہاں اپنے کلام لے کر آؤ۔ جس زبان کو تم نئی تراش اور ایجاد اور اختراع کا
خلعت پہناتے ہو کیا وہ اسے تسلیم کریں گے ؟ نہیں ہرگز نہیں۔ ہماری وضع کو سفلہ
اور گفتگو کو چھچھورا سمجھ کر مُنہ پھیر لیں گے پھر ذرا سامنے دوربین لگاؤ۔ دیکھو اُن
تعلیم یافتہ لوگوں کا لین ڈوری آچکا ہے جو آئے گا اور ہم پر ہنستا چلا جائے گا +
یہ چمن یوں ہی رہے گا اور ہزاروں جانور اپنی اپنی بولیاں سب بول کر اُڑ جائیں گے

مرزا قتیل کی رائے

مرزا قتیل چار شربت میں فرماتے ہیں۔ "مرزا محمد رفیع سودا در ریختہ پایۂ ملا ظہوری دارد
وغیر از یکہ زبان ہردو۔ باہم تخالف دارد فرقے نتواں کرد"۔ مرزا قتیل مرحوم صاحبِ کمال
شخص تھے۔ مجھ بے کمال نے اُن کی تصنیفات سے بہت فائدے حاصل کئے ہیں۔
مگر ظہوری کی کیا غزلیں کیا قصائد دونوں استعاروں اور تشبیہوں کے پھندوں سے
اُلجھا ہوا ریشم ہیں۔ سودا کی مشابہت ہے تو انوری سے ہے کہ محاورہ اور زبان کا
حاکم اور قصیدہ اور ہجو کا بادشاہ ہے +

تصوف

یہ بات بھی لکھنے کے قابل ہے کہ تصوف جو ایشیا کی شاعری کی مرغوب نعمت ہے
اس میں مرزا پھیکے ہیں۔ وہ حصہ خواجہ میر درد کا ہے +

قصیدہ و غزل

کہتے ہیں کہ مرزا قصیدہ کے بادشاہ ہیں۔ مگر غزل میں میر تقی کے برابر سوز و گداز
نہیں۔ یہ بات کچھ اصلیت رکھتی ہے۔ مگر معلوم ہوتا ہے کہ ان کے سامنے بھی اس
بات کے چرچے تھے۔ چنانچہ خود کہتے ہیں ؎

لوگ کہتے ہیں کہ سودا کا قصیدہ ہے خوب ان کی خدمت میں لئے مَیں یہ غزل جاؤں گا

یعنی دیکھو تو سہی غزل کچھ کم ہے *

حکیم قدرت اللہ خاں کا محاکمہ میر و مرزا کے باب میں

حکیم قدرت اللہ خاں قاسم بھی اپنے تذکرہ میں فرماتے ہیں۔" زعم بعضے آنکہ سرآمد شعرائے فصاحت آما مرزا محمد رفیع سودا درغزل گوئی بوے نہ رسیدہ اما حق آنست کہ
ع ہر گُلے را رنگ و بوے دیگراست * مرزا دریائیست بیکراں و میر نہریست عظیم الشان۔ در معلومات قواعد میرزا بر مرزا برتری ست و در قوت شاعری مرزارا برمیر سروری"۔ اصل حقیقت یہ ہے کہ قصیدہ غزل مثنوی وغیرہ اقسام شعر میں ہر کوچہ کی راہ جُدا جُدا ہے جس طرح قصیدہ کے لئے شکوہ الفاظ۔ اور بلندی مضامین۔ چُستی۔ ترکیب وغیرہ لوازمات ہیں۔ اسی طرح غزل کے لئے عاشق معشوق کے خیالات عشقیہ ذکر وصل۔ شکایت فراق۔ درد انگیز اور الم ناک حالت۔ گفتگو ایسی بے تکلف صاف صاف نرم نرم۔ گویا وہی دونوں بیٹھے باتیں کر رہے ہیں۔ اس کے ادائے مضامین کے لئے الفاظ بھی اور ہیں۔ اور اس کی بحریں بھی خاص ہیں۔ میر صاحب کی طبیعت قدرتی درد خیز اور دل حسرت انگیز تھا کہ غزل کی جان ہے۔ اس لئے ان کی غزلیں ہی ہیں اور خاص خاص بحور و قوافی ہی ہیں۔ مرزا کہ طبیعت ہمہ رنگ اور ہمہ گیر۔ ذہن برّاق اور زبان مشاق رکھتے تھے۔ توسن فکر ان کا منہ زور گھوڑے کی طرح جس طرف جاتا تھا رُک نہ سکتا تھا۔ کوئی بحر اور کوئی قافیہ ان کے ہاتھ آئے۔ تغزل کی خصوصیت نہیں رہتی تھی۔ جس برجستہ مضمون میں بندھ جائے باندھ لیتے تھے۔ بیشک ان کی غزلوں کے بھی اکثر شعر چُستی اور درستی میں قصیدہ کا رنگ دکھاتے ہیں *

میر و مرزا کے بارے میں محاکمہ خواجہ باسط کے سامنے

ایک دن میر اور مرزا کے کلام پر دو شخصوں میں تکرار نے طول کھینچا۔ دونوں خواجہ باسط کے مرید تھے۔ اُنہیں کے پاس گئے اور عرض کی کہ آپ فرمائیں۔ انھوں نے کہا کہ دونوں صاحب کمال ہیں مگر فرق اتنا ہے کہ میر صاحب کا کلام آہ ہے اور مرزا صاحب کا کلام واہ ہے۔ مثال میں میر صاحب کا شعر پڑھا ؎

سرہانے میر کے آہستہ بولو ابھی ٹُک روتے روتے سو گیا ہے

پھر مرزا کا شعر پڑھا ؎

سودا کی جو بالیں پہ ہوا شورِ قیامت   خدّام ادب بولے ابھی آنکھ لگی ہے

لطیفہ در لطیفہ۔ ان میں سے ایک شخص جو مرزا کے طرفدار تھے وہ مرزا کے پاس بھی آئے اور سارا ماجرا بیان کیا۔ مرزا بھی میر صاحب کے شعر کو سُن کر مُسکرائے اور کہا کہ شعر تو میر صاحب کا ہے مگر درد خواہی ان کی دَوا کی معلوم ہوتی ہے +

رسالہ عبرۃ الغافلین کیونکر لکھا گیا

رسالہ عبرۃ الغافلین طبع شاعر کے لئے سیڑھی کا کام دیتا ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ مرزا فقط طبعی شاعر نہ تھے بلکہ اس فن کے اصول و فرع میں ماہر تھے۔ اس کی فارسی عبارت بھی زبان دانی کے ساتھ ان کی شگفتگی اور شوخی طبع کا نمونہ ہے۔ اُس کی تالیف کا ایک افسانہ ہے۔ اور قابل سُننے کے ہے۔ اس زمانہ میں اشرف علی خاں نام ایک شریف خاندانی شخص تھے۔ انھوں نے فارسی کے تذکروں اور استادوں کے دیوانوں میں سے ۱۵ برس کی محنت میں ایک انتخاب مُرتّب کیا اور تصحیح کے لئے مرزا فاخر مکین کے پاس لے گئے کہ ان دنوں فارسی کے شاعروں میں نامور وہی تھے اُنھوں نے کچھ انکار کچھ اقرار بہت سے تکرار کے بعد انتخاب مذکور کو رکھا اور دیکھنا شروع کیا۔ مگر جا بجا اُستادوں کے اشعار کو کہیں بے معنے سمجھ کر کاٹ ڈالا۔ کہیں تیغ اصلاح سے زخمی کر دیا۔ اشرف علی خاں صاحب کو جب یہ حال معلوم ہوا تو گئے اور بہت سی قیل و قال کے بعد انتخاب مذکور لے آئے۔ کتاب اصلاحوں سے چھلنی ہو گئی تھی اس لئے بہت رنج ہوا۔ اسی عالم میں مرزا کے پاس لاکر سارا حال بیان کیا اور انصاف طلب ہوئے۔ ساتھ اس کے یہ بھی کہا کہ آپ اسے درست کر دیجئے + اُنھوں نے کہا کہ مجھے فارسی زبان کی مشق نہیں۔ اُردو میں جو چند لفظ جوڑ لیتا ہوں خدا جانے دلوں میں کیونکر قبولیت کا خلعت پا لیا ہے۔ مرزا فاخر مکیں فارسی داں اور فارسی کے صاحب کمال ہیں۔ انھوں نے جو کچھ کیا سمجھ کر کیا ہو گا۔ آپ کو اصلاح منظور ہے تو شیخ علی حزیں مرحوم کے شاگرد شیخ آیت اللہ ثنا۔

میر شمس الدین فقیر کے شاگرد مرزا بچو ذرہ تخلص موجود ہیں۔ حکیم بو علی خاں ہاتف بنگالہ ہیں۔ نظام الدین صانع بلگرامی فرخ آباد ہیں۔ شاہ نور العین واقف شاہجہان آباد میں ہیں۔ یہ ان لوگوں کے کام ہیں +

جب مرزا نے ان نامور فارسی دانوں کے نام لئے تو اشرف علی خاں نے کہا کہ ان لوگوں کو تو مرزا فاخر خاطر میں بھی نہیں لاتے۔ غرضکہ ان کے اصرار سے مرزا نے انتخاب مذکور رکھ لیا۔ دیکھا تو معلوم ہوا کہ جو جو با کمال سلف سے آج تک مسلّم الثبوت چلے آتے ہیں۔ اُن کے اشعار تمام زخمی تڑپتے ہیں۔ یہ حال دیکھ کر مرزا کو بھی رنج ہوا۔ بموجب صورت حال کے رسالہ عبرۃ الغافلین لکھا۔ اور مرزا فاخر کی غلط فہمیوں کو اصول انشاپردازی کے بموجب کما حقہٗ ظاہر کیا۔ ساتھ ان کے اُن کے دیوان پر نظر ڈال کر اس کی غلطیاں بھی بیان کیں اور جہاں ہو سکا اصلاح مناسب دی +

مرزا فاخر کو بھی خبر ہوئی۔ بہت گھبرائے اور چاہا کہ زبانی پیاموں سے ان داغوں کو دھوئیں۔ چنانچہ بقاء اللہ خاں بقا کو گفتگو کے لئے بھیجا وہ مرزا فاخر کے شاگرد تھے اور بڑے مشاق اور باخبر شاعر تھے۔ مرزا سے اور ان سے خوب خوب گفتگوئیں رہیں اور مرزا فاخر کے بعض اشعار جن کے اعتراضوں کی خبر اُڑتے اُڑتے اُن تک بھی پہنچ گئی تھی۔ ان پر ردّ و قدح بھی ہوئی۔ چنانچہ ایک شعر اُن کا تھا ؎

گرفتہ بود دریں بزم چوں قدح دلِ من   شگفتہ روئے صہبا شگفتہ کرد مرا

مرزا کا اعتراض تھا کہ قدح کو گرفتہ کہنا بیجا ہے۔ اہل انشا نے ہمیشہ قدح کو کھلے پھول سے تشبیہ دی ہے۔ یا ہنسی سے کہ اسے بھی شگفتگی لازم ہے۔ بقا نے جواب میں شاگردی کا پسینہ بہت بہایا۔ اور اخیر کو باذل کا ایک شعر بھی سند میں لائے ؎

چہ نشاط بادہ بخشد بمن خراب بے تو   بہ دل گرفتہ ماند قدح شراب بے تو

مرزا رفیع سُن کر بہت ہنسے اور کہا اپنے استاد سے کہنا کہ اُستادوں کے شعروں کو دیکھا کرو تو سمجھا بھی کرو۔ یہ شعر تو میرے اعتراض کی تائید کرتا ہے۔ یعنی باوجودیکہ

پیالہ ہنسی اور شگفتگی میں ضرب المثل ہے اور پیالۂ شراب سامان نشاط ہے مگر وہ بھی دل افسردہ کا حکم رکھتا ہے +

غرض جب یہ تدبیر پیش نہ گئی تو مرزا فاخر نے اور راہ لی۔ شاگرد لکھنؤ میں بہت تھے خصوصاً شیخ زادے کہ ایک زمانہ میں وہی ملک اودھ کے حاکم بنے ہوئے تھے اور سینہ زوری اور سرشوری کے بخار ابھی تک دماغوں سے گئے نہ تھے۔ ایک دن سودا تو بےخبر گھر میں بیٹھے تھے وہ بلوہ کرکے چڑھ آئے۔ مرزا کے پیٹ پر چھری رکھ دی اور کہا کہ جو کچھ تم نے کہا ہے وہ سب لو اور ہمارے اُستاد کے سامنے چل کر فیصلہ کرو۔ مرزا کو مضامین کے گل پھول اور باتوں کے طوطا مینا تو بہت بنانے آتے تھے۔ مگر یہ مضمون ہی نیا تھا۔ سب باتیں بھول گئے۔ بچارے نے جزدان غلام کو دیا۔ خود میانے میں بیٹھے۔ اور اُن کے ساتھ ہوئے۔ گرد وہ لشکر شیطان تھا۔ یہ بیچ میں تھے۔ چوک میں پہنچے تو انھوں نے چاہا کہ یہاں اُنھیں بے عزت کیجئے۔ کچھ تکرار کرکے پھر جھگڑنے لگے۔ مگر جسے خدا عزت دے اُسے کون بے عزت کر سکتا ہے۔ اتفاقاً سعادت علی خاں کی سواری آ نکلی۔ مجمع دیکھ کر ٹھہر گئے۔ اور حال دریافت کرکے سودا کو اپنے ساتھ ہاتھی پر بٹھا کر لے گئے۔ آصف الدولہ حرم سرا میں دسترخوان پر تھے۔ سعادت علی خاں اندر گئے اور کہا کہ بھائی صاحب بڑا غضب ہے۔ آپ کی حکومت اور شہر میں یہ قیامت! آصف الدولہ نے کہا۔ کیوں بھئی خیر باشد۔ انھوں نے کہا کہ مرزا رفیع جس کو باوا جان نے برادر من اور مشفق مہربان کہہ کر خط لکھا۔ آرزوئیں کرکے بُلایا۔ اور وہ نہ آیا۔ آج وہ یہاں موجود ہے اور اس حالت میں ہے کہ اگر اس وقت میں نہ پہونچتا تو شہر کے بدمعاشوں نے اس بیچارے کو بےحرمت کر ڈالا تھا۔ پھر سارا ماجرا بیان کیا +

آصف الدولہ فرشتہ خصال گھبرا کر بولے کہ بھئی مرزا فاخر نے ایسا کیا تو

مرزا کو کیا گویا ہم کو بے عزّت کیا ۔ بادا جان نے اُن کو بھائی لکھا تو وہ ہمارے چچا ہوئے ۔ سعادت علی خاں نے کہا کہ اس میں کیا شبہہ ہے! اسی وقت باہر نکل آئے ۔ سارا حال سُنا ۔ بہت غصّے ہوئے اور حکم دیا کہ شیخ زادوں کا محلّہ کا محلّہ اُکھڑوا کر پھینک دو ۔ اور شہر سے نکلوا دو ۔ مرزا فاخر کو جس حال میں ہو اُسی حال سے حاضر کرو ۔ سودا کی نیک نیتی دیکھنی چاہیئے ۔ ہاتھ باندھ کر عرض کی کہ جناب عالی ہم لوگوں کی لڑائی کاغذ قلم کے میدان میں آپ ہی فیصل ہو جاتی ہے ۔ حضور اس میں مداخلت نہ فرمائیں ۔ غلام کی بدنامی ہے ۔ جتنی مدد حضور کے اقبال سے پہنچی وہی کافی ہے ۔ غرض مرزا رفیع باعزاز و اکرام وہاں سے رخصت ہوئے ۔ نواب نے احتیاطاً سپاہی ساتھ کر دئے ✣

حریفوں پر جب یہ راز کھُلا تو اُمرائے دربار کے پاس دوڑے ۔ صلاح ٹھیری کہ معاملہ روپیہ یا جاگیر کا نہیں ۔ تم سب مرزا فاخر کو ساتھ لے کر مرزا رفیع کے پاس چلے جاؤ اور خطا معاف کروالو ۔ دوسرے دن آصف الدولہ نے سرِ دربار مرزا فاخر کو بھی بُلایا اور کہا کہ تمھاری طرف سے بہت نازیبا حرکت ہوئی ۔ اگر شعر کے مرد میدان ہو تو اب روبرو سودا کے ہجو کہو ۔ مرزا فاخر نے کہا ۔ ایں از مانمی آید ۔ آصف الدولہ نے بگڑ کر کہا درست ۔ ایں از شما نمی آید ۔ ایں می آید کہ شیاطین خود را بر سر میرزائے بیچارہ فرستادید ۔ از خانہ ببازارش کشیدند و می خواستند آبرویش بخاک ریزند ۔ پھر سودا کی طرف اشارہ کیا ۔ یہاں کیا دیر تھی ۔ فی البدیہہ رباعی پڑھی ؎

تو فخر خراسانی و فا ساقط ازو	گو ہر بدہاں داری درا ساقط ازو
روزان و شبان ز حق تعالیٰ خواہم	مرکب دہد ت خدا د با ساقط ازو

یہ جھگڑا تو رفع دفع ہوا مگر دُور دُور سے ہجوؤں میں چوٹیں چلتی رہیں ۔ لطف یہ ہے کہ مرزا فاخر کی کہی ہوئی ہجویں کوئی جانتا بھی نہیں ۔ سودا نے جو کچھ ان کے حق میں کہا وہ ہزاروں کی زبان پر ہے ✣

مرزا فاخر مکیں ۔ اصل میں کشمیری تھے ۔ اوّل فتوت حسین خاں کشمیری سے اصلاح لیتے تھے ۔ پھر عظیمائے کشمیری کے شاگرد ہوئے ۔ ان کے کمال میں کلام کی جگہ نہیں صحت الفاظ اور تحقیق لغت میں بڑی کوشش کی تھی ۔ دیوان نے رواج نہیں پایا مگر ان کے اشعار متفرق بیاضوں میں ہیں یا وہ مشہور ہیں کہ انھوں نے سودا کے حق میں کہے ۔ سودا نے تضمین کر کے انہی پر اُلٹ دئیے ۔ کچھ اشعار سودا نے عبرۃ الغافلین میں اعتراضوں کی ذیل میں لکھے ۔ بہرحال معلوم ہوتا ہے کہ کیفیت سے خالی نہ تھے ۔ زمانہ نے بھی پورا حق ان کی قدردانی کا ادا کیا ۔ سیکڑوں شاگرد غریب اور تونگر لکھنؤ اور اطراف میں ہوگئے پیشہ توکل تھا اور بے دماغی سے اُسے رونق دیتے تھے +

نقل ۔ مولوی غلام ضامن صاحب رتبے کے فاضل تھے ۔ ایک دن غزل لے کر گئے کہ مجھے شاگرد کیجئے ۔ اور اسے اصلاح فرمائیے ۔ مرزا فاخر نے ٹال دیا ۔ مولوی صاحب نے پھر کہا ۔ انھوں نے پھر انکار کیا ۔ اور کج خلقی کرنے لگے ۔ جو عجز و انکسار کے حق تھے سب مولوی صاحب نے ادا کئے ایک نہ قبول ہوا ۔ ناچار یہ شعر پڑھ کر اُٹھ کھڑے ہوئے ؎

مرزا مکین ما نشود جوں بکین ما　　　کین است جزو اعظم مرزا مکینِ ما

یہ بھی معلوم ہوا کہ ابتدا سودا کی طرف سے کم ہوتی تھی ۔ ہاں کوئی چھیڑ دیتا تھا تو پھر یہ بھی حد سے پرے پہنچا دیتے تھے ۔ چنانچہ میر ضاحک کے حال سے معلوم ہوگا[۱] +

آصف الدّولہ ایک دفعہ شکار کو گئے ۔ خبر آئی کہ نواب نے بھیلوں کے جنگل میں شیر مارا ۔ باوجودیکہ ہمیشہ انعام و اکرام کے انباروں سے زیر بار تھے مگر فوراً کہا :۔

یارو یہ ابنِ ملجم پیدا ہو ادوبارہ　　　شیر خدا کو جس نے بھیلوں کے بن میں مارا

نواب کو بھی خبر ہوئی جب پھر کر آئے تو خود شکایت دوستانہ کے طور پر کہا کہ مرزا تم نے ہم کو شیر خدا کا قاتل بنایا؟ ہنس کر کہا کہ جناب عالی شیر تو اللہ ہی کا تھا نہ حضور کا نہ فدوی کا +

[۱] دیکھو صفحہ ۱۸۱ ۔

لڑکی کی ہجو

لطیفہ۔ آصف الدولہ مرحوم کی اَنّا کی لڑکی خورد سال تھی۔ نواب فرشتہ سیرت کی طبیعت میں ایک تو عموماً تحمّل اور بے پروائی تھی۔ دوسرے اُس کی ماں کا دودھ پیا تھا۔ ناز برداری نے اُس کی شوخی کو شرارت کر دیا۔ ایک دن دوپہر کا وقت تھا نواب سوتے تھے۔ ایسا غل مچایا کہ یہ بدخواب ہو کر جاگ اُٹھے۔ بہت جھنجھلائے اور خفا ہوتے ہوئے باہر نکل آئے۔ سب ڈر گئے کہ آج نواب کو غصّہ آیا ہے خدا خیر کرے۔ باہر آ کر حکم دیا کہ مرزا کو بُلاؤ۔ مرزا اُسی وقت حاضر ہوئے فرمایا کہ بھئی مرزا! اس لڑکی نے مجھے بڑا حیران کیا ہے تم اس کی ہجو کہہ دو۔ یہاں تو ہر وقت مصالح تیار تھا۔ اسی وقت قلمدان لے کر بیٹھ گئے۔ اور مثنوی تیار کر دی کہ ایک شعر اس کا لکھتا ہوں ؎

لڑکی وہ لڑکیوں میں جو کھیلے ۔۔۔ نہ کہ لونڈوں میں جا کے ڈنڑ پیلے

بعض بزرگوں سے یہ بھی سُنا ہے کہ دلّی میں نالہ پر ایک دوکان پر بھٹیاری رہتی تھی۔ وہ آپ بھی لڑاکا تھی مگر لڑکی اس سے بھی سوا چنچل ہوئی۔ آتے جاتے جب دیکھتے لڑتے ہی دیکھتے۔ ایک دن کچھ خیال آ گیا۔ اس پر یہ ہجو کہی تھی+

شیخ قائم علی کے ساتھ ایک لطیفہ

لطیفہ۔ شیخ قائم علی ساکن اٹاوہ ایک طبّاع شاعر تھے۔ کمال اشتیاق سے مقبول نبی خاں انعام اللہ خاں یقین کے بیٹے کے ساتھ بارادہ شاگردی ان کے پاس آئے۔ اور اپنے اشعار سُنائے۔ آپ نے پوچھا تخلص کیا ہے۔ کہا اُمیدوار مسکرائے اور فرمایا ؎

ہے فیض سے کسی کے شجر انکا باردار ۔۔۔ اس واسطے کیا ہے تخلص اُمیدوار[۱]

بیچارے شرمندہ ہو کر چلے گئے۔ قائم تخلص اختیار کیا اور کسی اور کے شاگرد ہوئے۔ ان کی طبیعت میں جو شوخیاں تھیں وہ حقیقت میں اتنی نہ تھیں جتنا انھیں لوگوں نے خطرناک بنا رکھا تھا۔ بیشک جو ان سے لڑتا تھا اُسے خوب خراب کرتے تھے۔ مگر اخلاق و انصاف سے خالی نہ تھے+

راسخ عظیم آبادی کی ملاقات

نقل۔ راسخ عظیم آبادی کا دیوان میں نے دیکھا ہے۔ بہت سنجیدہ کلام ہے۔ پُرانے

[۱] جب عورت حاملہ ہوتی ہے تو ان کے محاورہ میں کہتے ہیں کہ اُمیدواری ہے یا اللہ کی درگاہ سے اُمید ہے+

مشاق تھے اور سب ادھر کے لوگ انھیں اُستاد مانتے تھے۔ مرزا کے پاس شاگرد ہونے کو آئے۔ مرزا نے کہا کوئی شعر سنائیے! انھوں نے پڑھا ؎

ہوئے ہیں ہم ضعیف اب دیدنی رونا ہمارا ہے
پلک پر اپنی آنسو صبح پیری کا ستارا ہے

مرزا نے اُٹھ کر گلے لگا لیا۔ ایسا ہی معاملہ جرأت سے ہوا تھا[۱]+

میاں ہدایت کے ساتھ لطیفہ

لطیفہ۔ ایک دن میاں ہدایت[۲] ملاقات کو آئے بعد رسوم معمولی کے آپ نے پوچھا کہ فرمائیے میاں صاحب آجکل کیا شغل رہتا ہے۔ انھوں نے کہا افکار دنیا فرصت نہیں دیتے۔ طبیعت کو ایک مرض یاوہ گوئی کا لگا ہوا ہے۔ گاہے ماہے غزل کا اتفاق ہو جاتا ہے۔ مرزا ہنس کر بولے کہ غزل کا کہنا کیا! کوئی ہجو کہا کیجیے۔ بیچارے نے حیران ہو کر کہا کہ ہجو کس کی کہوں؟ آپ نے کہا کہ ہجو کو کیا چاہیے۔ تم میری ہجو کہو۔ میں تمھاری ہجو کہوں +

لطیفہ باتفاق عجیب

لطیفہ۔ ایک ولایتی نے کہ زمرۂ اہل سیف میں معزز ملازم تھا عجب تماشا کیا۔ یعنی سودا نے اس کی ہجو کہی اور ایک محفل میں اُس کے سامنے ہی پڑھنا شروع کر دی۔ ولایتی بیٹھا سُنا کیا۔ جب ہجو ختم ہوئی اُٹھ کر سامنے آ بیٹھا۔ اور ان کی کمر پکڑ کر مسلسل و متواتر گالیوں کا جھاڑ باندھ دیا۔ اُنھیں بھی ایسا اتفاق آج تک نہ ہوا تھا۔ حیران ہو کر کہا کہ خیر باشد! خیر باشد! جناب آغا اقسام ایں مقالات شایانِ شان شما نیست۔ ولایتی نے پیش قبض کمر سے کھینچ کر اُن کے پیٹ پر رکھ دی اور کہا۔ نظم خودت گفتی۔ حالا ایں نثر را گوش کن۔ ہرچہ تو گفتی نظم بود نظم از ما نمی آید ما بہ نثر ادا کردیم +

سید انشا کی نوجوانی

لطیفہ۔ سید انشا کا عالم نوجوانی تھا۔ مشاعرہ میں غزل پڑھی کہ ؎

جھڑکی سہی ادا سہی چینِ جبیں سہی
سب کچھ سہی پر ایک نہیں کی نہیں سہی

جب یہ شعر پڑھا کہ ؎

گر نازنیں کہے سے بُرا مانتے ہو تم
میری طرف تو دیکھیے میں نازنیں سہی

---

[۱] دیکھو صفحہ ۱۹۷۔ [۲] ایک مرد مسن دیرینہ سال اس زمانہ کے شعرائے معتبر میں تھے خواجہ میر درد کے شاگرد تھے +

سودا کا عالم پیری تھا مشاعرہ میں موجود تھے مُسکرا کر بولے " دریں چہ شک!"

ہائے افسوس

نقل۔ ایک دن سودا مشاعرہ میں بیٹھے تھے۔ لوگ اپنی اپنی غزلیں پڑھ رہے تھے۔ ایک شریف زادے کی ۱۲۔۱۳ برس کی عمر۔ اُس نے غزل پڑھی۔ مطلع تھا ؎

دل کے پھپھولے جل اُٹھے سینہ کے داغ سے ۔۔۔ اس گھر کو آگ لگ گئی گھر کے چراغ سے

گرمیٔ کلام پر سودا بھی چونک پڑے۔ پوچھا۔ یہ مطلع کس نے پڑھا؟ لوگوں نے کہا حضرت یہ صاحبزادہ ہے۔ سودا نے بھی بہت تعریف کی۔ کئی مرتبہ پڑھوایا اور کہا کہ میاں لڑکے جوان تو ہوتے نظر نہیں آتے۔ خدا کی قدرت انھی دنوں میں لڑکا جل کر مر گیا۔ جب کہ

شیخ علی حزیں کے ساتھ ملاقات

فخر شعرائے ایران زمیں شیخ علی حزیں وارد ہندوستان ہوئے۔ پوچھا کہ شعرائے ہند میں آج کل کوئی صاحب کمال ہے؟ لوگوں نے سودا کا نام لیا۔ اور سودا خود ملاقات کو گئے۔ شیخ کی عالی دماغی اور نازک مزاجی شہرۂ آفاق ہے۔ نام ونشان پوچھ کر کہا کہ کچھ اپنا کلام سُناؤ۔ سودا نے کہا ؎

ناوک نے تیرے صید نہ چھوڑا زمانہ میں ۔۔۔ تڑپے ہے مرغ قبلہ نما آشیانہ میں

شیخ نے کہا کہ تڑپے چہ معنی دارد۔ سودا نے کہا کہ اہل ہند طپیدن را تڑپنا۔ میگویند۔ شیخ نے پھر شعر پڑھوایا۔ اور زانو پر ہاتھ مار کر کہا کہ مرزا رفیع قیامت کردی یک مُرغ قبلہ نما باقی بود آنرا ہم نگذاشتی۔ یہ کہہ کر اُٹھ کھڑے ہوئے اور بغلگیر ہو کر پاس بٹھایا۔ مگر بعض اشخاص کی روایت ہے کہ شیخ نے کہا " در پوچ گویان ہند بد نیستی "۔

خان آرزو کا لطیفہ سودا کے توارد پر

لطیفہ۔ خان آرزو کے مکان پر مشاعرہ ہوتا تھا۔ سودا ان دنوں نوجوان تھے مطلع پڑھا ؎

آلودۂ قطرات عرق دیکھ جبیں کو ۔۔۔ اختر پڑے جھانکیں ہیں فلک پر سے زمیں کو

یا تو لاعلمی سے یا ان کی آتش زبانی کے ڈر سے کوئی نہ بولا۔ مگر خان آرزو جن کی دایۂ قابلیت کے دودھ سے مظہر۔ سودا۔ میر، درد۔ وغیرہ نوجوانوں نے پرورش پائی ہے انھوں نے فوراً یہ شعر پڑھا کہ قدسی کے مطلع پر اشارہ ہے:-

شعر سودا حدیثِ قدسی ہے ۔۔۔ چاہئے لکھ رکھیں فلک پہ ملک

آلودۂ قطراتِ عَرَق دیدہ جبیں را   اختر ز فلک می نگرد روئے زمیں را

سودا بے اختیار اُٹھ کھڑے ہوئے۔ خاں صاحب کے گلے سے لپٹ گئے۔ اور اس شکریہ کے ساتھ خوشی ظاہر کی گویا حقیقۃً خاں صاحب نے اُن کے کلام کو مثل حدیث قدسی تسلیم کیا ہے۔ ان کا ایک اور شعر ایسا ہی ہے ؎

بہار بے سپر جام و یار گذرے ہے   نسیم تیر سی۔ سینہ کے پار گذرے ہے

فارسی میں کوئی اُستاد کہتا ہے ؎

بہار بے سپر جام و یار می گذرد   نسیم ہمچو خدنگ از کنار می گذرد

مگر اہل تحقیق کا قول ہے کہ ایسی صورت خاص کو سرقہ نہیں۔ ترجمہ سمجھنا چاہئے۔ کیونکہ شعر کو شعر ہی میں ترجمہ کرنا ایک دشوار صنعت ہے۔ قطع نظر اس کے اسی مطلع کے بعد اور اشعار کو دیکھو کہ کیا موتی پروئے ہے اور کلیات ایک دریا ہے کہ اقسام جواہر سے بھرا ہوا ہے۔ کون کہہ سکتا ہے کہ اس رتبہ کا شاعر ایک مطلع کا محتاج تھا اس لئے چُرا لیا۔ ابو الفضل نے ایک مراسلہ میں لکھا ہے ؎

ولدُالزّناست حاسدم آنکہ طالعِ من   وَلدُالزّنا کُش آمد چو ستارۂ یمانی

یہ شعر قصائد نظامی میں موجود ہے۔ اور اسی مضمون کو عربی میں متنبی کہتا ہے:

وَ تُنکِرُ مَوْتَھُمْ وَ اَنَا سُہَیْلٌ   طَلَعْتُ لِمَوْتِ اَوْلَادِ الزِّنَاءِ

خود سودا سے زبان بزبان روایت پہنچی ہے کہ جو غزل فارسی ان کی ہجو میں مولوی ندرت کشمیری نے کہی اور مرزا نے اُسے مخمس کر کے اسی پر اُلٹ دیا اس کے مطلع پر خان آرزو نے مصرع لگا دئے تھے۔ باقی تمام مخمس مرزا کا ہے۔

ایک مخمس کی وجہ تصنیف

شعر ناموزوں سے تو بہتر ہے کہنا ریختہ   کب کہا میں قتل کر مضموں کسی کا ریختہ
بے حیائی ہے یہ کہنا سُن کے میرا ریختہ   خون معنی تا رفیع بادہ پیما ریختہ
آبروئے ریختہ از جوشش سودا ریختہ

بلبل کی تذکیر و تانیث

نقل۔ معتبر لوگوں سے سُنا ہے کہ کسی شخص نے سودا سے پوچھا بلبل مذکر ہے یا

مؤنث۔ مسکرا کر بولے کہ نوع انسان میں ایک ہو تو مرد سے عورت ہو جاتی ہے۔ لفظ کو دیکھو دو الف[1] موجود ہیں۔ لیکن تعجب ہے کہ انھوں نے ایک جگہ مذکر بھی باندھا ہے۔ چنانچہ غزل ہے۔ اثر لگا کہنے۔ چشم تر لگا کہنے۔ تارِ نظر لگا کہنے۔ اس میں کہتے ہیں کہ:۔

سنتے ہے مرغ چمن کا تو نالہ اے صیاد؟ بہار آنے کی بلبل خبر لگا کہنے

اکثر اہل لکھنؤ اب بھی مذکر باندھتے ہیں۔ چنانچہ سرور کا شعر ہے:۔

کرے گا تو مرے نالوں کی ہمسری بلبل شعور اتنا تو کم جا کے جانور پیدا

تذکیر و تانیث

آتش۔ ع۔ سیرِ چمن کو چلئے بلبل پکارتے ہیں + رند ع جانور کا جو ہوا شوق تو پالے بلبل

مگر حق یہ ہے کہ اس وقت تک تذکیر و تانیث لفظوں کی مقرر نہیں ہوئی تھی۔ بہت سے الفاظ ہیں کہ مرزا اور میر صاحب نے انھیں مذکر باندھا ہے۔ بعد ان کے سید انشا جرأت۔ مصحفی سے لے کر آج تک سب مؤنث باندھتے چلے آتے ہیں۔ چنانچہ میر صاحب کی طرح مرزائے موصوف بھی فرماتے ہیں:۔

جان — کہا طبیب نے احوال دیکھ کر میرا کہ سخت جان ہے سودا کا آہ کیا کیجئے

دید — بتاں کا دید میں کرتا ہوں شیخ جس دن سے حلال تب سے ہے مے مو بمو مرے دل پر

سیر — کریں شمار ہم دل کے یار داغوں کا تو آ کہ سیر کریں آج دل کے باغوں کا

〃 — ہر سنگ میں شرار ہے تیرے ظہور کا موسیٰ نہیں جو سیر کروں کوہِ طور کا

〃 — بسکہ پونچھوں ہوں میں اپنی چشم خوں آلود کو جامہ کا ہر ایک تختہ سیر ہے گلزار کا

جب مرزا رفیع لڑکے تھے اُس وقت میر جعفر زٹل کا بڑھاپا تھا۔ اگلے وقتوں کے لوگ رنگین جریبیں جن پر نقاشی کا کام ہوتا تھا اکثر ہاتھ میں رکھا کرتے تھے۔ ایک دن شام کے قریب میر موصوف ایک سبز رنگ جریب ٹیکتے ٹہلنے کو باہر نکلے۔ مرزا بغل میں کتابوں کا جزدان لئے۔ سامنے سے آتے تھے۔ اس زمانہ میں ادب کی بڑی پابندی تھی۔ بزرگوں کو سلام کرنا اور ان کی زبان سے دعا لینے کو بڑی

[1] اب تو ڈبل تانیث ہو گئی۔ اب بھی نہ مونث ہو گی +

نعمت سمجھتے تھے۔ مرزا نے جھک کر سلام کیا انھوں نے خوش ہو کر دعا دی۔ چونکہ بچپن ہی میں مرزا کی موزونی طبع کا چرچا تھا۔ میر صاحب کچھ باتیں کرنے لگے۔ مرزا ساتھ ہوئے۔ انھوں نے نوخیز طبیعت بڑھانے کے لئے کہا کہ مرزا بھلا ایک مصرع پر مصرع تو لگاؤ۔ ع لالہ در باغ داغ چوں دارد ؟
مرزا نے سوچ کر کہا ع عمر کوتاست غم فزوں دارد۔

میر صاحب نے فرمایا۔ مرزا دن بھر کے بھوکے تھے ۃ کھا گئے +

مرزا نے پھر کہا ع دریں عشق سینہ خوں دارد +

میر صاحب نے فرمایا۔ واہ بھئی دل خون ہوتا ہے۔ جگر خون ہوتا ہے۔ بھلا سینہ کیا خون ہوگا؟ سینۂ پر زخوں ہوتا ہے +

مرزا نے پھر ذرا فکر کیا اور کہا ع چہ کند سوزشِ دروں دارد +

میر صاحب نے کہا کہ ہاں مصرع تو ٹھیک ہے لیکن طبیعت پر زرا زور دیکر کہو + مرزا دق ہو گئے تھے۔ جھٹ کہہ دیا ع یک عصا سبز زیر.... دارد +

میر جعفر مرحوم ہنس پڑے اور جریب اُٹھا کر کہا۔ کیوں! یہ ہم سے کہی۔ دیکھو کہوں گا تیرے باپ سے۔ بازی بازی بریش بابا ہم بازی۔ مرزا لڑکے تو تھے ہی۔ بھاگ گئے +

چند اشعار جن سے میر اور مرزا کے کلام میں امتیاز ہوتا ہے لکھے جاتے ہیں۔ ان شعروں میں دونوں اُستادوں کی طبیعت برابر لڑی ہے مگر دونوں کے انداز پر خیال کرو + (دونوں اُستادوں کے انداز دیکھو)

ہمارے آگے ترا جب کسی نے نام لیا	دلِ ستم زدہ کو ہم نے تھام تھام لیا	میر
قسم جو کھائیے تو طالع زلیخا کی	عزیز مصر کا بھی صاحب اک غلام لیا	ایضاً
چمن میں صبح جو اس جنگجو کا نام لیا	صبا نے تیغ کا موجِ رواں سے کام لیا	سودا
کمال بندگیٔ عشق ہے خداوندی	کہ ایک زن نے سہ مصر سا غلام لیا	ایضاً
گلا ہیں جس سے کروں تیری بیوفائی کا	جہاں میں نام نہ لے پھر وہ آشنائی کا	میر

سودا	گلا لکھوں میں اگر تیری بیوفائی کا	لہو میں غرق سفینہ ہو آشنائی کا
ایضاً	دکھاؤں گا تجھے زاہد اس آفتِ دیں کو	خلل دماغ میں تیرے ہے پارسائی کا
میر	چمن میں گل نے جو کل دعوئے جمال کیا	جمال یار نے منہ اس کا خوب لال کیا
سودا	برابری کا تری گل نے جب خیال کیا	صبا نے مار تماچہ منہ اس کا لال کیا
میر	دل پہنچا ہلاکت کو بہت کھینچ کسالا	لے یار میرے سلمہ اللہ تعالیٰ
سودا	ہیں دشمنِ جاں ڈھونڈ کے اپنا جو نکالا	سو حضرتِ دل سلمہ اللہ تعالیٰ
میر	ایک محروم چلے میر ہمیں دنیا سے	ورنہ عالم کو زمانہ نے دیا کیا کیا کچھ
سودا	سودا جہاں میں آکے کوئی کچھ نہ لے گیا	جاتا ہوں ایک میں دلِ پر آرزو لئے
میر	رات ساری تو کٹی سنتے پریشاں گوئی	میر جی کوئی گھڑی تم بھی تو آرام کرو
سودا	سودا تری فریاد سے آنکھوں میں کٹی رات	اب آئی سحر ہونے کو ٹک تو کہیں مر بھی
سودا	ہوتی نہیں ہے صبح نہ آتی ہے مجھکو نیند	جس کو پکارتا ہوں وہ کہتا ہے مر کہیں
میر	کفر کچھ چاہئے اسلام کی رونق کے لئے	حُسن زنار ہے تسبیح سلیمانی کا
سودا	ہوا جب کفر ثابت ہے وہ تمغائے مسلمانی	نہ ٹوٹے شیخ سے زنار تسبیحِ سلیمانی
میر	مت رنج کر کسی کو کہ اپنے تو اعتقاد	دل ڈھائے کر جو کعبہ بنایا تو کیا ہوا
سودا	کعبہ اگرچہ ٹوٹا تو کیا جائے غم ہے شیخ	قصرِ دل نہیں کہ بنایا نہ جائے گا
میر	نہ بھول اے آرسی گر یار کو تجھ سے محبت ہے	نہیں ہے اعتبار اس کا یہ منہ دیکھے کی الفت ہے
سودا	بگولے سے جسے آسیب اور صرصر سے زحمت ہے	ہماری خاک یوں برباد ہو اے ابرِ رحمت ہے

چند مقابلہ اسی طرح کے جراَت کے حال میں بھی ہیں۔ (دیکھو صفحہ ۲۳۰ ۔ ۲۳۱)

غیر کے پاس یہ اپنا ہی گماں ہے کہ نہیں	جلوہ گر یار مرا ورنہ کہاں ہے کہ نہیں
دل کے پرزوں کو بغل بیچ لئے پھرتا ہوں	کچھ علاج ان کا بھی اے شیشہ گراں ہے کہ نہیں؟
مہر ہر ذرہ میں مجھ کو ہی نظر آتا ہے؟	تم بھی ٹک دیکھو تو صاحب نظراں ہے کہ نہیں؟
جرم ہے اس کی جفا کا کہ وفا کی تقصیر	کوئی تو بولو میاں منہ میں زباں ہے کہ نہیں؟

پاسِ ناموس مجھے عشق کا ہے اے بُلبُل — ورنہ یاں کونسا اندازِ فغاں ہے کہ نہیں
آگے شمشیر تمھاری کے بھلا یہ گردن — مو سے باریک تراے خوش کراں ہے کہ نہیں؟
پوچھا سودا سے میں اک روز کہ اے آوارہ — تیرے رہنے کا معین بھی مکاں ہے کہ نہیں؟
یک بیک ہو کے برآشفتہ لگا وہ کہنے — کچھ تجھے عقل سے بہرہ بھی میاں ہے کہ نہیں؟

دیکھا میں قصرِ فریدوں کے دراو پر اک شخص
حلقہ زن ہو کے پکارا کوئی یاں ہے کہ نہیں

سینہ میں ہوا نالہ دہلو میں دل آتش — دھڑکے ہے پڑا دل کہ نہ ہو مشتعل آتش
اشک آتش و خوں آتش و ہر لختِ دل آتش — آتش پہ برستی ہے پڑی متصل آتش
یک لحظہ طرف ہو کے مرے دیدۂ دل سے — نادم تو سمندر رہے سدا منفعل آتش
یاقوت نہیں ہے وہ ترے لعل سے اے شوخ — جا ڈوب موئی آگ میں ہو کر خجل آتش
داغ آج سے رکھتا نہیں ان سنگدلوں کا — مدت سے ہوئی ہے مری چھاتی پہ سل آتش
دل عشق کے شعلہ سے جو بھڑکا تو رہا کیا — اے جان نکل جا کہ لگی متصل آتش

یک قطرۂ مے لے اُڑی سودا کو جہاں سے
باروت کے تودے کو ہے بس یک نل آتش

دیں شیخ و برہمن نے کیا یار فراموش — یہ سبحہ فراموش وہ زُنّار فراموش
دیکھا جو حرم کو تو نہیں دیر کی وسعت — اس گھر کی فضا کر گیا معمار فراموش
بھولے نہ کبھی دل سے مرا مصرعِ جانکاہ — نالہ نہ کرے مُرغِ گرفتار فراموش
دل سے نہ گئی آہ ہوس سیرِ چمن کی — اور ہم نے کیا رخنۂ دیوار فراموش
یا نالہ ہی کر منع تو - یا گریہ کو ناصح — دو چیز نہ عاشق سے ہو یکبار فراموش
بھولا پھرو ہوں آپ کو اک عمر سے لیکن — تجکو نہ کیا دل سے میں زنہار فراموش

دل درد سے کس طرح مرا خالی ہو سودا
وہ ناشنوا حرف میں گفتار فراموش

جو گذری مجھ پہ مت اسے کہو جو ہوا سو ہوا
بلا کشانِ محبت پہ جو ہوا سو ہوا

مبادا ہو کوئی ظالم ترا گریباں گیر
مرے لہو کو تو دامن سے دھو ہوا سو ہوا

پہنچ چکا ہے سرِ زخم دل تلک یارو
کوئی سیو کوئی مرہم کرو ہوا سو ہوا

کہے ہے سُن کے مری سرگذشت وہ بیرحم
یہ کون ذکر ہے جانے بھی دو ہوا سو ہوا

خدا کے واسطے آ درگذر گنہ سے مرے
نہ ہوگا پھر کبھو اے تندخو ہوا سو ہوا

یہ کون حال ہے احوالِ دل پہ اے آنکھو
نہ پھوٹ پھوٹ کے اتنا بہو ہوا سو ہوا

دیا اسے دل و دیں اب یہ جان ہے سودا
پھر آگے دیکھئے جو ہو سو ہو۔ ہوا سو ہوا

ناوک نے تیرے صید نہ چھوڑا زمانے میں
تڑپے ہے مرغ قبلہ نما آشیانے میں

کیونکر نہ چاک چاک گریبانِ دل کروں
دیکھوں جو تیری زلف کو میں دستِ شانہ میں

زینت دلیل مفلسی ہی ٹک کماں کو دیکھ
نقش و نگار جھوٹ نہیں کچھ اسکے خانے میں

اے مُرغ دل سمجھ کے تو چشمِ طمع کو کھول
تو نے سُنا ہے دام جسے ہے وہ دانہ میں

چلّے میں کھینچ کھینچ کیا قد کو جوں کماں
تیرِ مراد پر نہ بٹھایا نشانے میں

پایا ہر ایک بات میں اپنے میں یوں تجھے
معنی کو جس طرح سخنِ عاشقانے میں

دستِ گرہ کشا کو نہ تزئیں کرے فلک
مہندی سبندھی نہ دیکھی ہیں انگشت شانے میں

ہمسا تجھے تو ایک ہمیں تجھ سے ہیں کئی
جا دیکھ لے تو آپ کو آئینہ خانے میں

سودا خدا کے واسطے کر قصہ مختصر
اپنی تو نیند اُڑ گئی تیرے فسانے میں

ابھی کدیہ طاقت ہے کہ اس سے بسر آوے
وہ زُلف سیہ اپنی اگر لہر پہ آوے

صورت ہمیں اس مہر کی پہچان اگر آوے
ہر ذرہ میں کچھ اور ہی جھمکا نظر آوے

مجھ چشم سے اب اشک نہیں آنے کا ناصح
آوے بھی غمِ دل سے تو لختِ جگر آوے

پھرتا ہوں ترے واسطے میں دربدر اے یار
تجھ سے نہ ہوا یہ کہ کبھو میرے گھر آوے

گویا دلِ عاشق بھی ہے اک فیل سیہ مست
رُکتا نہیں روکے سے کسو کے جدھر آوے

کہہ کہہ کے دُکھ اپنا میں کیا مغز کو خالی
اتنا نہ ہوا اُس کے تری چشم بھر آوے

شیشہ نہ کہے راز مرے دل کا تو لے جام
سرگوشی سے اس کی نہ تری چشم بھر آوے

کیا ہو جو قفس تک مرے اب صحنِ چمن سے
دو برگ لئے گل کے نسیم سحر آوے

سب کام نکلتے ہیں فلک تجھ سے ولیکن
میرے دلِ ناشاد کی اُمّید بر آوے

جب پھونکئے ناقوسِ صنم خانۂ دل شیخ
کعبہ کا ترے وجد میں دیوار و در آوے

نامے کا جواب آنا تو معلوم ہے اب کاش
قاصد کے بہ دو نیک کی مجھ تک خبر آوے

میں بھی ہوں ضعیف اسقدر اے مور کہ وہ آب
گذرے مرے سر سے جو ترے تا کمر آوے

سب کو کہے دیتا ہوں کہ یہ کہدیں کہ پھر آنا
بالیں پہ مرے شورِ قیامت اگر آوے

دیتا ہے کوئی مرغِ دل اُس شوخ کو سودا
کیا قہر کیا تو نے غضب تیرے پر آوے

اب لے تو گیا ہے پر اسے دیکھیو ناداں
پل میں نہ اُڑا تا وہ اگر بال و پر آوے

خوبوں میں دلدہی کی روش کم بہت ہے یاں
خواہانِ جاں جو چاہو تو عالم بہت ہے یاں

غافل نہ رہ تو اہلِ تواضع کے حال سے
تیغ و کماں کی طرح خم و چم بہت ہے یاں

بچشمِ ہوس اُٹھا لے تماشے سے جوں حباب
نادیدنی کا دید بس اک دم بہت ہے یاں

خونِ جگر بادم و لوزینہ ہے لگاؤ
صورت معاش خلق کی برہم بہت ہے یاں

آنکھوں میں دوں اس آئینہ رو کو جگہ ولے
ٹپکا کرے ہے بسکہ یہ گھر نم بہت ہے یاں

کہتا ہے حال ماضی و مستقبل ایک ایک
جامِ جہاں نما تو نہیں جم بہت ہے یاں

دیکھا جو باغ دہر تو مانند صبح و گل
کم فرصتی ملاپ کی باہم بہت ہے یاں

آیا ہوں تازہ دیں بحرم شیخنا مجھے
بوجا نماز سے بھی مقدم بہت ہے یاں

سودا کہ اُس سے دل کی تسلّی کے واسطے
گوشہ سے چشم کے نگہ کم بہت ہے یاں

ابراہیم علی خاں تذکرہ گلزارِ ابراہیمی میں لکھتے ہیں کہ مرزا غلام حیدر مجذوب مرزا رفیع

کے بیٹے ہیں اور اب کہ ۱۱۹۶ھ میں لکھنؤ میں رہتے ہیں۔ درستیٔ فہم اور آشنا پرستی کے اوصاف سے موصوف ہیں۔ حکیم قدرت اللہ خاں قاسم فرماتے ہیں کہ ایک مغل بچہ خوش اخلاق جوان ہے۔ مرزا سودا کا متبنّٰے ہے۔ سپاہ گری کے عالم میں زندگی بسر کرتا ہے اور اپنے مربی کی شاگردی کا دم بھرتا ہے۔

عداوت سے تمھاری کچھ اگر ہووے تو میں جانوں — بھلا تم زہر دے دیکھو اثر ہووے تو میں جانوں
نہ اندیشے کرو پیارے کہ شب ہے وصل کی تھوڑی — تم اپنی زلف کو کھولو سحر ہووے تو میں جانوں
ہمارے تم سے جو عہد وفا ہوں۔ ان کو تم جانو — مرے پیاں میں کچھ نوعِ دگر ہووے تو میں جانوں
ذرا تم مار کاکل کو مرے لب سے لگا دیکھو — ہزاروں سانپ کاٹیں پھر اثر ہووے تو میں جانوں

خوباں سے جو دل ملا کرے گا — ڈرتا ہوں یہی کہ کیا کرے گا

آوے بھی مسیحا مرے بالیں پہ تو کیا ہو — بیمار یہ ایسا تو نہیں جس کو شفا ہو

جور و جفا پہ یار کی دل مت نگاہ کر — اپنی طرف سے ہووے جہاں تک نباہ کر

خاک و خوں میں صورتیں کیا کیا نہ رلیاں دیکھیاں — اے فلک باتیں تری کوئی نہ بھلیاں دیکھیاں
آہ میں اپنی اثر ڈھونڈے ہے اے مجذوب تُو — بید مجنوں کی نہ شاخیں ہم نے پھلیاں دیکھیاں

بس اب تیری تاثیر اے آہ دیکھی — نہ آیا وہ کافر بہت راہ دیکھی

خاموش جو اتنا ہوں مجھے گنگ نہ سمجھو — اک عرض تمنا ہے کہ آ لب پہ اڑی ہے

چاہوں مدد کسی سے نہ اغیار کے لئے — میں تو ریار کم نہیں دو چار کے لئے
طوبیٰ تلے میں بیٹھ کے روؤں گا زار زار — جنت میں تیرے سایۂ دیوار کے لئے
ہے درد سر ہی بلبل آزاد کی صفیر — موزوں ہے نالہ مرغ گرفتار کے لئے

میر تقی مرحوم کی زبان سے ان کے باب میں کچھ الفاظ نکلے تھے اس پر فرماتے ہیں:۔

اے میر سمجھیو مت مجذوب کو اوروں سا — ہے وہ خلف سودا اور اہل ہنر بھی ہے
اشک آنکھ میں ہو عشق سے تا دل میں غم رہے — یہ گھر ہے وہ خراب کہ آتش میں نم رہے
نکلے اگر قفس سے تو خاموش ہم صفیر — صیاد نے سنا یہ ترانہ تو ہم رہے

میر ضاحک

میر مرحوم کو سودا کے دیوان میں بہت مداخلت ہے اور ان کے سلسلہ اولاد میں بھی ایسے عالی رتبہ باکمال پیدا ہوئے کہ خود صاحب طرز کہلائے۔ اس لئے ابتدا سے دل چاہتا تھا کہ اس خانوادۂ سیادت کا سلسلہ مسلسل لکھوں مگر پھول نہ ہاتھ آئے جو لڑی پروتا۔ اسی وجہ سے طبع اول میں مقصر رہا۔ بے درد۔ بے انصاف کہ اصول فن سے بے خبر ہیں۔ کیا جانیں انھیں اپنے مضامین اخباروں میں چمکانے کے لئے روشنائی ہاتھ آئی۔ اور جہاں اور شکایتیں چھاپیں ان میں ایک نمبر شماریہ بھی بڑھایا۔ راقم آثم نے اطراف مشرقی اور خاص لکھنؤ میں بھی احباب کو لکھا کہیں سے آواز نہ آئی۔ البتہ مولوی غلام محمد خاں تپش نے اس شفقت کے ساتھ جواب پاس دیا کہ دل مشقتِ تلاش سے رہا ہو گیا۔ اب کہ طبع ثانی کا موقع ہے۔ آرزوے قدیم پھر دل میں لہرائی۔ ناچار برسوں کے سوکھے مرجھائے پھول جو دل افسردہ کے طاق میں پڑے تھے۔ انہی کا سہرہ بنا کر سادات عظام کے روضوں پر چڑھاتا ہوں۔ اور جس ابتدا تک دست آگاہی نے رسائی کی وہاں سے شروع کرتا ہوں +

میر ضاحک مرحوم کا نام سید غلام حسین تھا۔ ان کے بزرگ ہرات سے آکر پرانی دلی میں آباد ہوئے[1]۔ خاندان سیادت ان کا سندی تھا۔ امامی ہروی کی اولاد میں تھے۔ اور شاعری بھی گھرانے میں میراث چلی آتی تھی۔ میر موصوف نہایت خوش طبع خوش مزاج خندہ جبیں ہنسنے اور ہنسانے والے تھے۔ اسی واسطے یہ تخلص اختیار کیا تھا۔ وضع اور لباس قدمائے دہلی کا پورا نمونہ تھا۔ سر پر سبز عمامہ بوضع عرب۔ بڑے گھیر کا جامہ

وضع اور لباس

[1] صاحب تذکرہ گلزار ابراہیمی میر حسن مرحوم کے حال میں لکھتے ہیں کہ دلی میں پھل مسجد کے پاس رہتے تھے۔ اور حکیم قدرت اللہ خاں قاسم فرماتے ہیں کہ میر مرحوم کی ولادت محلہ سید واڑہ میں ہوئی۔ کہ پرانی دلی میں ایک محلہ تھا +

یا جُبّہ کہ وہ بھی اکثر سبز ہوتا تھا۔ گلے میں خاک پاک کا کنٹھا۔ داہنے ہاتھ میں ایک چوڑی۔ اس پر کچھ کچھ دعائیں کندہ۔ چھنگلی بلکہ انگلیوں میں بھی کئی انگوٹھیاں ڈاڑھی کو بھی مہندی لگاتے تھے۔ بہت بڑی نہ تھی۔ مگر ریش بچہ مُنڈاتے تھے۔ کبھی کبھی ہاتھوں کو بھی مہندی ملتے تھے۔ میانہ قد۔ رنگ گورا +

دیوان دیوان اب تک نظر سے نہیں گزرا جس پر کچھ رائے ظاہر کی جائے۔ خواص میں جو کچھ شہرت ہے اُن کی ہجوؤں کی بدولت ہے جو سودا نے ان کے حق میں کہیں۔ سلطنت کی تباہی نے اُن سے بھی دلّی چھڑوائی اور فیض آباد کو آباد کیا +

سودا نے جوان کے حق میں گستاخی کی ہے اُس کا سبب یہ ہوا کہ اوّل کسی موقع پر انھوں نے سودا کے حق میں کچھ فرمایا۔ سودا خود اُن کے پاس گئے اور کہا کہ آپ بزرگ میں خورد۔ آپ سیّد۔ میں آپ کے جدّ کا غلام۔ عاصی اس قابل نہیں کہ آپ اس کے حق میں کچھ ارشاد فرمائیں۔ ایسا نہ کیجیے کہ مجھ گنہگار کے مُنہ سے کچھ نکل جائے اور قیامت کے دن آپ کے جد کے سامنے روسیاہ ہوں۔ تلامیذِ الٰہی کے دماغ عالی ہوتے ہیں۔ ان کی زبان سے نکلا کہ نہیں بھئی یہ شاعری ہے اس میں خوردی و بزرگی کیا۔ سودا آئیں تو کہاں جائیں پھر جو کچھ انھوں نے کہا خدا نہ سنوائے۔ یہ بھی بزرگوں سے سُنا کہ مرزا نے جو کچھ ان کی جناب میں یاوہ گوئی کی ہے۔ میر موصوف نے اس سے خراب و خوار کیا تھا لیکن وہ کلام عجیب طرح سے فنا ہوا +

میر حسن مرحوم ان کے صاحبزادے سودا کے شاگرد تھے۔ میر ضاحک کا انتقال ہوا تو سودا فاتحہ کے لئے گئے۔ اور دیوان اپنا ساتھ لیتے گئے۔ بعد رسم عزا پرسی کے اپنی یاوہ گوئی پر جو کہ اس مرحوم کے حق میں کی تھی بہت سے عذر کیے اور کہا کہ سیّد مرحوم نے دنیا سے انتقال فرمایا تم فرزند ہو جو کچھ اس روسیاہ سے گستاخی ہوئی معاف کرو۔ بعد اس کے نوکر سے دیوان منگا کر جو ہجویں ان کی کہی تھیں سب چاک کر ڈالیں۔ میر حسن نے بمقتضائے علو حوصلہ و سعادت مندی اُسی وقت دیوان

باپ کا گھر سے منگایا اور جو ہجویں ان کی تھیں وہ پھاڑ ڈالیں۔ لیکن چونکہ سودا کی تصنیف قلم سے نکلتے ہی بچہ بچہ کی زبان پر پھیل جاتی تھی۔ اس لئے سب قائم رہیں۔ ان کا کلام کہ اُسی مجلد کے اندر تھا۔ مفقود ہوگیا۔ سودا کے دیوان میں میر ضاحک مرحوم کی یہ ہجو جب میں دیکھتا تھا ع

یارب یہ دعا مانگتا ہے تجھ سے سکندر

تو حیران ہوتا تھا کہ سکندر کا یہاں کیا کام؟ میر مہدی حسن فراغ کو خدا[1] مغفرت کرے اُنھوں نے بیان کیا کہ ایک دن حسب معمول مرزا سلیمان شکوہ کے ہاں پائیں باغ میں تخت بچھے تھے۔ صاحب عالم خود مسند پر بیٹھے تھے۔ شرفاء و شعراء کا مجمع تھا۔ مرزا رفیع اور میاں سکندر مرثیہ گو بھی موجود تھے کہ میر ضاحک تشریف لائے۔ اُن کی پرانی وضع اور لباس پر کہ ان دنوں میں انگشت نما تھی۔ صاحب عالم مسکرائے۔ میر صاحب آکر بیٹھے۔ مزاج پرسی ہوئی۔ حقہ سامنے آیا۔ اتفاقاً صاحب عالم نے مرزا رفیع سے کہا کہ کچھ ارشاد فرمایئے (دونوں صاحبوں کے معاملات تو انھیں معلوم ہی تھے خدا جانے چھیڑ منظور تھی یا اتفاقاً زبان سے نکلا) سودا نے کہا کہ میں نے تو ان دنوں میں کچھ کہا نہیں۔ میاں سکندر کی طرف اشارہ کیا کہ انھوں نے ایک مخمس کہا ہے۔ صاحب عالم نے فرمایا۔ کیا؟ سودا نے پہلا ہی بند پڑھا تھا کہ میر ضاحک مرحوم اُٹھ کر میاں سکندر سے دست و گریبان ہو گئے۔ سکندر بچارے حیران کہ نہ واسطہ نہ سبب یہ کیا آفت آگئی۔ سب اُٹھ کھڑے ہوئے۔ دونوں صاحبوں کو الگ کیا۔ اور سودا کو دیکھئے تو

---

[1] میر مہدی حسن فراغ۔ ایک کہن سال شخص۔ سید انشا کے خاندان سے تھے۔ میاں بیتاب کے شاگرد تھے۔ فارسی کی استعداد اچھی تھی۔ اُردو شعر بھی خوب کہتے تھے اور رموز سخن سے ماہر تھے۔ ناسخ و آتش کے مشاعرے بھی اچھی طرح دیکھے تھے اور علمائے لکھنؤ کی صحبتوں میں بیٹھے تھے۔ ان کے بزرگ اور وہ ہمیشہ سرکاروں میں داروغہ رہے تھے۔ اس لئے قدیمی حالات اور خاندانی معاملات سے واقف تھے۔ بادشاہ بیگم یعنی نصیر الدین حیدر کی والدہ اور ثریا جاہ چند گدھ میں تھے۔ جب بھی یہ اور ان کے بھائی ان کے ہاں داروغہ تھے اور مرزا سکندر شکوہ کی سرکار میں بھی داروغہ رہے تھے۔ میاں بحر کے قدیمی دوست اور ہم مشق تھے +

کنارے کھڑے مسکرارہے ہیں۔ (یہ شان نزول ہے اس مخمس کی)۔

ہر چند چاہا کہ ان کے جلسے اور باہمی گفتگوؤں کے لطایف وظرایف معلوم ہوں۔ کچھ نہ ہو تو چند غزلیں ہی پوری مل جائیں۔ کوئی کوشش کارگر نہ ہوئی۔ جب اُن کے چراغ خاندان سید خورشید علی نفیس بھی شعاع توجہ دریغ فرمائیں تو غیر سے کیا اُمید ہو۔ اُنھوں نے آزاد خاکسار کو آب حیات کی رسید سے بھی شاداب نہ کیا ؎

تشنہ بودم زدم تیغ تو آبم دادند وز جوابِ لب لعل تو جوابم دادند

تاریخ وفات بھی نہ معلوم ہوئی۔ ممکن نہیں کہ باکمال صاحبزادہ نے تاریخ نہ کہی ہو مگر آزاد کو کون بتائے۔ صاحب تذکرہ گلزار ابراہیمی ۱۱۹۶ھ میں کہتے ہیں کہ فیض آباد میں ہیں اور وارستگی سے گزران کرتے ہیں۔

جس تذکرہ میں دیکھا ایک ہی شعران کا درج پایا ؎

کیا دیجئے اصلاح خدائی کو وگرنہ کافی تھا ترا حسن اگر ماہ نہ ہوتا

خواجہ میر درد

درد تخلص۔ خواجہ میر نام۔ زبان اُردو کے چار رکنوں میں سے ایک رکن[1] یہ ہیں۔ سلسلہ مادری ان کا خواجہ بہاء الدین نقشبندی سے ملتا ہے۔ خواجہ محمد ناصر عندلیب تخلص ان کے باپ تھے۔ اور شاہ گلشن صاحب سے نسبت ارادت رکھتے تھے۔ خاندان ان کا دلّی میں بباعث پیری و مریدی کے نہایت معزز اور معظم تھا۔ علوم رسمی سے آگاہ تھے کئی مہینے مفتی دولت صاحب سے مثنوی کا درس حاصل کیا تھا۔ ملک کی بربادی۔ سلطنت کی تباہی آئے دن کی غارت و تاراج کے سبب سے اکثر اُمرا و شرفا کے گھرانے گھر اور شہر چھوڑ چھوڑ کر

[1] دیکھو صفحہ ۱۲۱۔

نکل گئے۔ ان کے پائے استقلال کو جنبش نہ آئی۔ اپنے اللہ پر توکل رکھا اور جو سجادہ بزرگوں نے بچھایا تھا اُسی پر بیٹھے رہے۔ "جیسی نیت ویسی برکت"۔ خدا نے بھی نباہ دیا۔ دیوان اُردو مختصر ہے۔ سوا غزلیات اور ترجیع بند اور رباعیوں کے اور کچھ نہیں۔ قصائد و مثنوی وغیرہ کہ عادت شعرا کی ہے انھوں نے نہیں لکھے۔ باوجود اس کے سودا۔ میر تقی کی غزلوں پر جو غزلیں لکھی ہیں ہرگز اُن سے کم نہیں۔ ایک مختصر دیوان غزلیات فارسی کا بھی ہے۔ تصنیف کا شوق ان کی طبیعت میں خداداد تھا۔ چنانچہ اول پندرہ برس کی عمر میں بہ حالت اعتکاف رسالہ اسرار الصلوٰۃ لکھا۔ انتیس برس کی عمر میں وارداتِ درد نام ایک اور رسالہ لکھا اور اس کی شرح میں علم الکتاب ایک بڑا نسخہ تحریر کیا کہ اس میں ایک سو گیارہ رسالے ہیں۔ نالہ درد۔ آہ سرد۔ درد دل۔ سوز دل۔ شمع محفل وغیرہ جنھیں شائقِ تصوف نظر عظمت سے دیکھتے ہیں۔ اور واقعاتِ درد اور ایک رسالہ حرمتِ غنا میں ان سے یادگار ہے۔ چونکہ اس زمانہ کے خاندانی۔ خصوص اہل تصوف کو شاعری واجب تھی۔ اس واسطے ان کے والد کا بھی ایک دیوان مختصر مع اسکی شرح کے۔ اور ایک رسالہ نالہ عندلیب موجود ہے۔ ان کے بھائی میاں سید محمد میر اثر تخلص کرتے تھے۔ وہ بھی صاحب دیوان تھے۔ بلکہ ایک مثنوی خواب و خیال ان کی مشہور ہے اور بہت اچھی لکھی ہے۔ خواجہ میر درد صاحب کی غزل سات شعر ۹ شعر کی ہوتی ہے۔ مگر انتخاب ہوتی ہے۔ خصوصاً چھوٹی چھوٹی بحروں میں جو اکثر غزلیں کہتے تھے۔ گویا تلواروں کی آبداری نشتر میں بھر دیتے تھے۔ خیالات ان کے سنجیدہ اور متین تھے۔ کسی کی ہجو سے زبان آلودہ نہیں ہوئی۔ تصوف جیسا اُنھوں نے کہا اُردو میں آج تک کسی سے نہیں ہوا۔ میر صاحب نے اُنھیں آدھا شاعر شمار کیا ہے۔ ان کے عہد کی زبان سُننی چاہو تو دیوان کو دیکھ لو۔ جو میر۔ مرزا کی زبان ہے وہی ان کی زبان ہے۔

(حاشیہ: تصنیفات کی تفصیل — سید محمد میر اثر — خواجہ میر درد کی غزل کا انداز — میر حسن نے آدھا شاعر مانا ہے)

۵ دیکھو صفحہ ۲۱۸۔

زمانہ کے بموجب ان کے کلام میں بھی نت یعنی ہمیشہ۔ اور ٹک یعنی ذرا۔ تئیں یعنی کو۔ اور یہاں تئیں یعنی یہاں تک۔ اور مجھ ساتھ۔ یعنی میرے ساتھ۔ اور ایدھر۔ کیدھر۔ جیدھر۔ نہیں بہ حذف ہ وغیرہ الفاظ موجود ہیں۔ چنانچہ اس دور کی تمہید میں میر اور سودا کے اشعار کے ساتھ کچھ اشعار ان کے بھی لکھے گئے ہیں۔ دو تین شعر نمونہ کے طور پر یہاں بھی لکھتا ہوں ؎

چلئے کہیں اس جاگہ کہ ہم تم ہوں اکیلے ۔۔۔ گوشہ نہ ملے گا کوئی میدان ملے گا

جاگہ کے علاوہ جگہ کی۔ کے اور ہے وغیرہ دب دب کر نکلتے ہیں ؎

دید کو مذکر باندھا

ایک لحظہ اور بھی وہ اُڑاتا چمن کا دید ۔۔۔ فرصت نہ دی زمانہ نے آتنی شرار کو

اس سے اعتراض مقصود نہیں۔ وقت کی زبان یہی تھی۔ سید انشا نے بھی لکھا ہے کہ خواجہ میر اثر مرحوم ایک جگہ دِسا بھی کہہ گئے ہیں۔ اور بڑے بھائی صاحب تلوار کو تروار کہا کرتے تھے۔ لیکن اس سے قطع نظر کر کے دیکھا جاتا ہے تو بعض الفاظ پر تعجب آتا ہے چنانچہ خواجہ میر درد کی ایک پُرزور غزل کا مطلع ہے ؎

قافیہ کا اختلاف

مدرسہ یا دیر تھا یا کعبہ یا بُت خانہ تھا ۔۔۔ ہم سبھی مہمان تھے تو آپ ہی صاحب خانہ تھا

گویا بت خانہ کو کثرت استعمال کے سبب سے ایک لفظ تصور کیا۔ کہ دیر کے حکم میں ہو گیا۔ ورنہ ظاہر ہے کہ قافیہ صحیح نہیں۔ اگلے وقتوں کے لوگ خوش اعتقاد بہت ہوتے تھے۔

کسی کی نوکری نہ کی

اسی واسطے جو لوگ اللہ کے نام پر توکل کر کے بیٹھ رہتے تھے ان کی سب سے اچھی گذر جاتی تھی۔ یہی سبب ہے کہ خواجہ صاحب کو نوکری کی یا دلی سے باہر جانے کی ضرورت نہ ہوئی۔ دربار شاہی سے بزرگوں کی جاگیریں چلی آتی تھیں۔ امیر غریب خدمت کو سعادت سمجھتے تھے۔

دل کی بے نیازی

یہ بے فکر بیٹھے اللہ اللہ کرتے تھے۔ شاہ عالم بادشاہ نے خود ان کے ہاں آنا چاہا اور انھوں نے قبول نہ کیا۔ مگر ماہ بماہ ایک معمولی جلسہ اہل تصوف کا ہوتا تھا۔ اس میں بادشاہ بے اطلاع چلے آئے اتفاقاً اس دن بادشاہ کے پاؤں میں درد تھا۔ اس لئے ذرا پاؤں پھیلا دیا۔ انھوں

نے کہا۔ یہ امر فقیر کے آداب محفل کے خلاف ہے۔ بادشاہ نے عذر کیا کہ معاف کیجئے عارضہ سے معذور ہوں۔ انھوں نے کہا عارضہ تھا تو تکلیف کرنی کیا ضرور تھی +

موسیقی میں اچھی مہارت تھی۔ بڑے بڑے باکمال گوئیے اپنی چیزیں بنظر اصلاح لاکر سنایا کرتے تھے۔ راگ ایک پُر تاثیر چیز ہے۔ فلاسفۂ یونان اور حکمائے سلف نے اسے ایک شاخِ ریاضی قرار دیا ہے۔ دل کو فرحت اور روح کو عروج دیتا ہے۔ اس واسطے اہل تصوف کے اکثر فرقوں نے اسے عبادت میں شامل کیا ہے۔ چنانچہ معمول تھا کہ ہر مہینے کی دوسری اور ۲۴ کو شہر کے بڑے بڑے کلاونت۔ ڈوم۔ گوئیے اور صاحب کمال۔ اہل ذوق جمع ہوتے تھے۔ اور معرفت کی چیزیں گاتے تھے۔ یہ دن ان کے کسی بزرگ کی وفات کے ہیں۔ محرم غم کا مہینہ ہے اس میں دو کو بجائے گانے کے مرثیہ خوانی ہوتی تھی۔ مولوی شاہ عبدالعزیز صاحب کا گھرانا اور یہ خاندان ایک محلہ میں رہتے تھے۔ ان کے والد مرحوم کے زمانہ میں شاہ صاحب عالم طفولیت میں تھے۔ ایک دن اُس جلسہ میں چلے گئے اور خواجہ صاحب کے پاس جا بیٹھے۔ ان کی مُرید بہت سی کنچنیاں بھی تھیں۔ اور چونکہ اس وقت رخصت ہوا چاہتی تھیں۔ اس لئے سب سامنے حاضر تھیں باوجودیکہ مولوی صاحب اس وقت بچے تھے مگر ان کا تبسم اور طرزِ نظر دیکھ کر خواجہ صاحب اعتراض کو پا گئے۔ اور کہا کہ فقیر کے نزدیک تو یہ سب ماں بہنیں ہیں۔ مولوی صاحب نے کہا کہ ماں بہنوں کو عوام النّاس میں لے کر بیٹھنا کیا مناسب ہے۔ خواجہ صاحب خاموش ہو رہے +

موسیقی میں بڑی مہارت تھی

مولوی شاہ عبدالعزیز صاحب کا لطیفہ

ان کے ہاں ایک صحبت خاص ہوتی تھیں۔ اُس میں خواجہ میر درد صاحب نالہ عندلیب یعنی اپنے والد کی تصنیفات اور اپنے کلام کچھ کچھ بیان کرتے تھے۔ ایک دن مرزا رفیع سے ہمراہ ملاقات ہوئی خواجہ صاحب نے تشریف لانے کے لئے فرمائش کی۔ مرزا نے کہا۔ صاحب مجھے یہ نہیں بھاتا کہ سو کوے کائیں کائیں کریں اور بیچ میں ایک پدّا بیٹھ کر چوں چوں کرے۔ اس زمانہ کے بزرگ ایسے

مرزا رفیع سودا کا لطیفہ

صاحب کمالوں کی بات کا تحمّل اور برداشت کرنا لازمۂ بزرگی سمجھتے تھے۔ آپ مسکرا کر چپکے ہو رہے +

مرزائے موصوف کی شوخی

مرزائے موصوف نے ایک قصیدہ نواب احمد علی خاں کی تعریف میں کہا ہے اور تمہید میں اکثر شعرا کا ذکر انھیں شوخیوں کے ساتھ کیا ہے جو اِن کے معمولی انداز ہیں۔ چنانچہ اسی کے ضمن میں کہتے ہیں:۔

درد کس کس طرح بلاتے ہیں	کرکے آواز منحنی و حزیں
اور جو احمق ان کے سامع ہیں	دمبدم ان کو یوں کریں تحسیں
جیسے سُبحانَ مَن یَرَانِی بر	لڑکے مکتب کے سب کہیں آمیں
کوئی پوچھے ذرا کہ عالم میں	فخر کس چیز کا ہے ان کے تئیں
شعرو تقطیع ان کے دیواں کی	جمع ہووے تو جیسے نقش نگیں
اس میں بھی دیکھئے تو آخر کار	یا توارد ہوا ہے یا تضمیں
اتنی کچھ شاعری یہ کرتے ہیں	ممخ در.... آسمان وزمیں

خیر یہ شاعرانہ شوخیاں ہیں۔ ورنہ عام عظمت اُن کی جو عالم پر چھائی ہوئی تھی اُسکے اثر سے سودا کا دل بھی بے اثر نہ تھا۔ چنانچہ کہا ہے ؎

سودا بدل کے قافیہ تو اس غزل کو لکھ	اے بے ادب تو درد سے بس دوبدو نہ ہو

دلی محبت

نقل۔ ایک شخص لکھنؤ سے دلّی چلے۔ مرزا رفیع کے پاس گئے اور کہا کہ دلّی جاتا ہوں۔ کسی یار آشنا کو کچھ کہنا ہو تو کہہ دیجئے۔ مرزا بولے کہ بھائی میرا دلّی میں کون ہے۔ ہاں خواجہ میر درد کی طرف جانکلو تو سلام کہہ دینا +

ذرا خیال کرکے دیکھو۔ مرزا رفیع جیسے شخص کو دلّی بھر میں (اور دلّی بھی اُس زمانہ کی دلّی) کوئی آدمی معلوم نہ ہوا۔ اِلّا دہ کیا کیا جواہر تھے اور کیا کیا جوہری۔ سبحان اللہ اُستاد مرحوم نے کیا کیا موتی پرو دئے ہیں:۔

دکھلائے ہم نے آنکھ سے لے کر جو دُرِ اشک	قائل ہماری آنکھ کے سب جوہری ہوئے

خواجہ صاحب کا ایک شعر ہے۔ لطیفہ

توارد

بیگانہ گر نظر پڑے تو آشنا کو دیکھ   بندہ گر آئے سامنے تو بھی خدا کو دیکھ

اسی مضمون کا شعر فارسی کا ہے ؎

بسکہ در چشم و دلم ہر لحظہ اے یارم توئی   ہر کہ آمد در نظر از دور پندارم توئی

ملا شیدا

جب یہ شعر شاعر نے فارسی میں پڑھا تو مُلا شیدا ایک شوخ طبع۔ دہن دریدہ شاعر تھے۔ انھوں نے کہا کہ اگر سگ در نظر آید۔ شاعر نے کہا۔ پندارم توئی۔ مگر انصاف شرط ہے خواجہ صاحب نے اپنے شعر میں اس پہلو کو خوب بچایا ہے۔ رباعی

اے درد یہ درد جی کا کھونا معلوم   جوں لالہ جگر سے داغ دھونا معلوم

گلزار جہاں ہزار پھولے لیکن   میرے دل کا شگفتہ ہونا معلوم

شاہ حاتم کی رباعی بھی اسی مضمون میں لاجواب ہے۔ رُباعی

ان سیم بروں کے ساتھ سونا معلوم!   قسمت میں لکھی ہے خاک سونا معلوم!

حاتم افسوس دی و امروز گذشت   فردا کی رہی اُمید سو نا معلوم!

اساتذہ معاصر

میر تقی اور سودا اور مرزا جان جاناں مظہر ان کے ہم عصر تھے۔ قیام الدین قائم ان کا وہ شاگرد تھا جس پر اُستاد کو فخر کرنا چاہیے۔ اس کے علاوہ ہدایت اللہ خاں ہدایت اور ثناء اللہ خاں فراق وغیرہ بھی نامی شاعر تھے +

خواجہ صاحب ۲۴ صفر یوم جمعہ ۱۱۹۹ھ ۶۸ برس کی عمر میں شہر دہلی میں فوت ہوئے۔ کسی مُرید با اعتقاد نے تاریخ کہی ع

حیف دُنیا سے سدھارا وہ خدا کا محبوب

غزلیات

جگ میں آکر اِدھر اُدھر دیکھا   تو ہی آیا نظر جدھر دیکھا

جان سے ہو گئے بدن خالی   جس طرف تو نے آنکھ بھر دیکھا

نالہ فریاد آہ اور زاری آپ سے ہو سکا سو کر دیکھا
اُن لبوں نے نہ کی مسیحائی ہم نے سو سو طرح سے مر دیکھا

زور عاشق مزاج ہے کوئی درد کو قصہ مختصر دیکھا

ہم نے کس رات نالہ سر نہ کیا پر اُسے آہ کچھ اثر نہ کیا
سب کے یاں ہم ہوئے کرم فرما اس طرف کو کبھی گذر نہ کیا
دیکھنے کو رہے ترستے ہم نہ کیا رحم تو نے پر نہ کیا
تجھ سے ظالم کے پاس میں آیا جان کا میں نے کچھ خطر نہ کیا
کیوں بھویں تانتے ہو بندہ نواز سینہ کس وقت میں سپر نہ کیا
کتنے بندوں کو جان سے کھویا کچھ خدا کا بھی تو نے ڈر نہ کیا
آپ سے ہم گذر گئے کب کے کیا ہے ظاہر میں گو سفر نہ کیا
کونسا دل ہے جس میں خانہ خراب خانہ آباد تو نے گھر نہ کیا

سب کے جوہر نظر میں آئے درد بے ہنر تو نے کچھ ہنر نہ کیا

قتل عاشق کسی معشوق سے کچھ دور نہ تھا پر ترے عہد کے آگے تو یہ دستور نہ تھا
رات مجلس میں ترے حُسن کے شعلے کے حضور شمع کے مُنہ پہ جو دیکھا تو کہیں نور نہ تھا
ذکر میرا ہی وہ کرتا تھا صریحاً لیکن میں نے پوچھا تو کہا خیر یہ مذکور نہ تھا
باوجودیکہ پر و بال نہ تھے آدم کے وہاں پہنچا کہ فرشتے کا بھی مقدور نہ تھا
پرورش غم کی ترے یہاں تئیں تو کی۔ دیکھا! کوئی بھی داغ تھا سینہ میں کہ ناسور نہ تھا
محتسب آج تو میخانہ میں تیرے ہاتھوں دل نہ تھا کوئی کہ شیشہ کی طرح چور نہ تھا

درد کے ملنے سے اے یار بُرا کیوں مانے اس کو کچھ اور سوا دید کے منظور نہ تھا

جگ میں کوئی نہ ٹک ہنسا ہوگا — کہ نہ ہنسنے میں رو دیا ہوگا
اس نے قصداً بھی میرے نالہ کو — نہ سُنا ہوگا گر سُنا ہوگا
دیکھئے غم سے اب کے جی میرا — نہ بچے گا بچے گا کیا ہوگا
دل زمانہ کے ہاتھ سے سالم — کوئی ہوگا کہ رہ گیا ہوگا
حال مجھ غم زدے کا جس جس نے — جب سُنا ہوگا رو دیا ہوگا
دل کے پھر زخم تازہ ہوتے ہیں — کہیں غنچہ کوئی کھلا ہوگا
یک بیک نام لے اُٹھا میرا — جی میں کیا اس کے آگیا ہوگا
میرے نالوں پہ کوئی دُنیا میں — قطعہ بن کیے آہ کم رہا ہوگا
لیکن اس کو اثر خدا جانے — نہ ہوا ہوگا یا ہوا ہوگا
قتل سے میرے وہ جو باز رہا — کسی بد خواہ نے کہا ہوگا

دل بھی اے دردؔ قطرۂ خوں تھا
آنسوؤں میں کہیں گرا ہوگا

مرا جی ہے جب تک تری جستجو ہے — زباں جب تلک ہے یہی گفتگو ہے
خدا جانے کیا ہوگا انجام اس کا — میں بے صبر اتنا ہوں وہ تند خو ہے
تمنا ہے تیری اگر ہے تمنا — تری آرزو ہے اگر آرزو ہے
کیا سیر سب ہم نے گلزار دنیا — گُل دوستی میں عجب رنگ و بو ہے
کسو کو کسو طرح عزت ہے جگ میں — مجھے اپنے رونے سے ہی آبرو ہے
غنیمت ہے یہ دید وادید یاراں — جہاں مُند گئی آنکھ نہ میں ہوں نہ تو ہے

نظر میرے دل کی پڑی دردؔ کس پر
جدھر دیکھتا ہوں وہی روبرو ہے

تہمتیں چند اپنے ذمّے دھر چلے — جس لئے آئے تھے سو ہم کر چلے
زندگی ہے یا کوئی طوفان ہے — ہم تو اس جینے کے ہاتھوں مر چلے

کیا ہمیں کام ان گلوں سے اے صبا ایک دم آئے اِدھر اُدھر چلے
دوستو دیکھا تماشا یاں کا بس تم رہو اب ہم تو اپنے گھر چلے
آہ بس مت جی جلا تب جانیئے جب ترا افسوں کوئی اس پر چلے
شمع کی مانند ہم اُس بزم میں چشم تر آئے تھے دامن تر چلے
ڈھونڈتے ہیں آپ سے اس کو پرے شیخ صاحب چھوڑ گھر باہر چلے
ہم نہ جانے پائے باہر آپ سے وہ ہی آڑے آگیا جیدھر چلے
ہم جہاں میں آئے تھے تنہا ولے ساتھ اپنے اب اُسے لے کر چلے
جوں شرر ہے ہستئ بے بود یاں بارے ہم بھی اپنی باری بھر چلے
ساقیا یاں لگ رہا ہے چل چلاؤ جب تلک بس چل سکے ساغر چلے

درد کچھ معلوم ہے یہ لوگ سب
کس طرف سے آئے تھے کیدھر چلے

ہے غلط گر گمان میں کچھ ہے تجھ سوا بھی جہان میں کچھ ہے
دل بھی تیرے ہی ڈھنگ سیکھا ہے آن میں کچھ ہے آن میں کچھ ہے
لے خبر تیغ یار کہتی ہے باقی اس نیم جان میں کچھ ہے
ان دنوں کچھ عجب ہے دل کا حال دیکھتا کچھ ہے دھیان میں کچھ ہے

درد تو جو کرے ہے جی کا زیاں
فائدہ اس زیان میں کچھ ہے

گلیم بخت سیہ سایہ دار رکھتے ہیں یہی بساط میں ہم خاکسار رکھتے ہیں
بسانِ کاغذِ آتش زدہ مرے گل رو ترے جلے بجھنے اور ہی بہار رکھتے ہیں
یہ کس نے ہم سے کیا وعدۂ ہم آغوشی کہ مثلِ بحر سراسر کنار رکھتے ہیں
ہمیشہ فتح نصیبی ہمیں نصیب رہی جو کچھ کہ اب بھی ہے جی میں سو مار رکھتے ہیں
بلا ہے نشۂ دنیا کہ تا قیامت آہ سب اہل قبر اُسی کا خمار رکھتے ہیں

جہاں کے باغ سے ہم دل سوا نہ پھل پایا — فقط یہی ثمر داغ دار رکھتے ہیں
اگرچہ دخترِ رز کے ہے محتسب درپے — جو ہو سو ہو پر اُسے اب تو یار رکھتے ہیں
ہر ایک شعلۂ غم عشق ہم سے روشن ہے — کہ بیقراری کو ہم برقرار رکھتے ہیں
ہمارے پاس ہے کیا جو کریں فدا تجھ پر — مگر یہ زندگی مستعار رکھتے ہیں
فلک سمجھ تو سہی ہم سے اور گلو گیری! — یہ ایک جیب ہے سو تار تار رکھتے ہیں
بتوں کے جور اٹھائے ہزار ہا ہم نے — جو اس پہ بھی نہ ملیں۔ اختیار رکھتے ہیں
بھری ہے آکے جنھوں میں ہوائے آزادی — حباب دار کُلہ بھی اتار رکھتے ہیں
نہ برق ہیں نہ شرر ہم نہ شعلہ نہ سیماب — وہ کچھ ہیں پر۔ کہ سدا اضطرار رکھتے ہیں
جنھوں کے دل میں جگہ کی ہے نقش عبرت نے — سدا لحد میں وہ لوح مزار رکھتے ہیں
ہر ایک سنگ میں ہے شوخیٔ بتاں پنہاں — خنک یہ سب ہیں یہ دل میں شرار رکھتے ہیں

وہ زندگی کی طرح ایک دم نہیں رہتا
اگرچہ درد اُسے ہم ہزار رکھتے ہیں

رباعی پیدا کرے ہر چند تقدّس بندہ — مشکل ہے کہ حرص سے ہو دل برکندہ
جنت میں بھی اکل و شرب سے نہیں[1]، نجات — دوزخ کا بہشت میں بھی ہوگا دھندہ

سید محمد میر سوز

سوز تخلّص۔ سید محمد میر نام۔ وہی شخص ہیں جنھیں میر تقی نے پاد شاعر[2] مانا ہے۔ پرانی دلّی میں قرادل پورہ ایک محلہ تھا وہاں رہتے تھے۔ مگر اصلی وطن بزرگوں کا بخارا تھا۔ باپ ان کے سید ضیاء الدّین بہت بزرگ شخص تھے۔ تیراندازی میں صاحب کمال مشہور تھے۔ اور حضرت قطب عالم گجراتی کی اولاد

میر صاحب نے پادشاعر مانا ہے

[1] رباعی کے تیسرے مصرعہ میں نہیں دب کر نکلتا ہے۔ اس عہد کے شعرا کا عام محاورہ ہے +
[2] دیکھو صفحہ ۲۱۸ میر صاحب ملک سخن کے بادشاہ تھے جن لفظوں میں چاہا کہہ دیا مگر بات ٹھیک ہے۔ دیوان دیکھ لو۔ باتیں ہی باتیں ہیں۔ باقی خیر دعا نیت +

تخلص تبدیل کیا

ہیں تھے۔ سوز مرحوم پہلے میر تخلص کرتے تھے۔ جب میر تقی مرحوم میر کے تخلص سے عالمگیر ہوئے تو انھوں نے سوز اختیار کیا۔ چنانچہ ایک شعر میں دونوں تخلصوں کا اشارہ کرتے ہیں ؎

کہتے تھے پہلے میر میر تب ہوئے ہزار حیف　　اب جو کہے ہیں سوز سوز یعنی سدا جلا کرو

طرز کلام

جو کچھ حال ان بزرگوں سے سُنا یا تذکروں میں دیکھا اس کی تصدیق ان کا کلام کرتا ہے یعنی معلوم ہوتا ہے کہ ان کی طبع موزوں کے آئینہ کو جس طرح فصاحت نے صفائی سے جلا کی تھی اسی طرح ظرافت اور خوش طبعی نے اس میں جوہر پیدا کیا تھا ساتھ اس کے جس قدر نیکی و نیک ذاتی نے عزت دی تھی اس سے زیادہ وسعت اخلاق اور شیریں کلامی نے ہر دل عزیز کیا تھا اور خاکساری نے سب جوہروں کو زیادہ تر چمکایا تھا۔ آزادگی کے ساتھ وضعداری بھی ضرور تھی۔ جس کا نتیجہ یہ تھا کہ باوجود مفلسی کے ہمیشہ مسندِ عزت پر صاحب تمکین اور اُمرا و رؤسا کے پہلو نشین رہے اور اسی میں معیشت کا گزارہ تھا+

دلی کی مفارقت

شاہ عالم کے زمانہ میں اہل دہلی کی تباہی حد سے گزر گئی تو ۱۱۹۱ھ میں لباس فقیری اختیار کیا اور لکھنؤ چلے گئے۔ مگر وہاں سے ۱۲۱۲ھ میں ناکام مرشد آباد گئے یہاں بھی نصیب نے یاوری نہ کی۔ پھر لکھنؤ میں آئے۔ اب قسمت رجوع ہوئی اور نواب آصف الدولہ ان کے شاگرد ہوئے۔ چند روز آرام سے نہ گزرے تھے کہ خود دنیا سے گزر گئے۔ نواب کی غزلوں کو دیکھو انھیں کا انداز ہے +

صاحب تذکرہ گلزار ابراہیمی لکھتے ہیں "اب کہ ۱۱۹۶ھ ہیں میر موصوف لکھنؤ میں ہیں۔ اب تک ان سید والا تبار سے راقم آثم کی ملاقات نہیں ہوئی۔ مگر اسی برس میں کچھ اپنے شعر اور چند فقرے نثر کے اس خاکسار کو بھیجے ہیں۔ میر سوز شخصے ست کہ ہیچکس را از حلاوتے جز سکوت و اکراہ حاصل نہ شود و ایں نیز قدرت کمال الٰہی ست کہ ہر یکے بلکہ خار و خسے ہنست کہ بکار چند بیاید۔ مس اگر منکرے سوال

کند کہ ناکارہ محض بیفتاد است ع ایست کہ نامش سوختنی ست[1]

حُسن خط

خط شفیعا اور نستعلیق خوب لکھتے تھے۔ ممالک ایران و خراسان وغیرہ میں قاعدہ ہے کہ جب شرفا ضروریات سے فارغ ہوتے ہیں تو ہم لوگوں کی طرح خالی نہیں بیٹھتے۔ مشق خط کیا کرتے ہیں۔ اسی واسطے علی العموم اکثر خوشنویس ہوتے ہیں۔ پہلے یہاں بھی یہی دستور تھا۔ اب خوشنویسی تو بالائے طاق بدنویسی پر بھی حرف ہے +

شہسواری اور تیراندازی

میر موصوف سوار کاری میں شہسوار اور فنون سپاہگری میں ماہر۔ خصوصاً تیراندازی میں قدرانداز تھے۔ ورزش کرتے تھے اور طاقت خداداد بھی اس قدر تھی کہ ہر ایک شخص ان کی کمان کو چڑھا نہ سکتا تھا۔ غرض ۱۲۱۳ھ میں شہر لکھنؤ میں ستّر برس کی عمر میں فوت ہوئے۔ ان کے بیٹے بھی شاعر تھے اور باپ کے تخلّص کی رعایت سے

داغ انکے بیٹے تھے

داغ تخلص کرتے تھے۔ جوانی میں اپنے مرنے کا داغ دیا۔ اور اس سے زیادہ افسوس یہ کہ کوئی غزل ان کی دستیاب نہ ہوئی۔ خود حسین تھے اور حسینوں کے دیکھنے والے تھے۔ آخر غم فراق میں جان دی۔

سلاست زبان

میر سوز مرحوم کی زبان عجب میٹھی زبان ہے۔ اور حقیقت میں غزل کی جان ہے۔

اکثر غزل ہی کہتے تھے

چنانچہ غزلیں خود ہی کہے دیتی ہیں ان کی انشاپردازی کا حسن۔ تکلّف اور صنائع مصنوعی سے بالکل پاک ہے۔ اس خوشنمائی کی ایسی مثال ہے جیسے ایک گلاب کا پھول ہری بھری ٹہنی پر کٹورا سا دھرا ہے اور سبز سبز پتّیوں میں اپنا اصلی جوبن دکھارہا ہے۔ جن اہل نظر کو خدا نے نظر باز آنکھیں دی ہیں وہ جانتے ہیں کہ ایک حُسن خداداد کے سامنے ہزاروں بناوٹ کے بناؤ سنگار قربان ہوا کرتے ہیں۔ البتہ غزل میں دو تین شعر کے بعد ایک آدھ پُرانا لفظ ضرور کھٹک جاتا ہے۔ خیر اس سے قطع نظر کرنی چاہیئے۔ ع فکر معقول بفرما گُل بے خار کجاست +

غزل کا انداز اصلی

غزل لغت میں عورتوں سے باتیں چیتیں ہیں۔ اور اصطلاح میں یہ ہے کہ عاشق

---

[1] دو تذکروں میں اس عبارت کو مطابق کیا۔ کوئی نسخہ مطلب خیز نہ نکلا۔ اس لئے جو کچھ ملا سید موصوف کا تبرک سمجھ کر غنیمت جانا +

اپنے معشوق کے ہجر یا وصل کے خیالات کو وسعت دے کر اس کے بیان سے دل کے ارمان یا غم کا بخار نکالے۔ اور زبان بھی وہ ہو کہ گویا دونوں آمنے سامنے بیٹھے باتیں کر رہے ہیں۔ بس وہ کلام ان کا ہے۔ معشوق کو بجائے جاناں کے فقط جان یا میاں یا میاں جان کہہ کر خطاب کرنا ان کا خاص محاورہ ہے +

ان کے اور میر و سودا کے کلام میں امتیاز

مجالس رنگین کی بعض مجلسوں سے اور ہمارے عہد کے پہلے کے تذکروں سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کا کلام صفائی کا محاورہ اور لطف زبان کے باب میں ہمیشہ سے ضرب المثل ہے۔ ان کے شعر ایسے معلوم ہوتے ہیں جیسے کوئی چاہنے والا اپنے چاہیتے عزیز سے بیٹھا باتیں کر رہا ہے۔ وہ اپنی محبت کی باتوں کو اس طرح شعر میں باندھتے تھے کہ شعر کی موزونیت کے لئے لفظوں کا آگے پیچھے کرنا بھی گوارا نہ سمجھتے تھے میر تقی کہیں کہیں ان کے قریب آجاتے ہیں پھر بھی بہت فرق ہے۔ وہ بھی محاورہ خوب باندھتے تھے۔ مگر فارسی کو بہت نباہتے تھے۔ اور مضامین بلند لاتے تھے۔ سودا بہت دور ہیں کیونکہ مضامین کو تشبیہ و استعارہ کے رنگ میں غوطے دے کر محاورہ میں ترکیب دیتے تھے اور اپنے زور شاعری سے لفظوں کو پس و پیش کر کے اس بندوبست کے ساتھ جڑتے تھے کہ لطف اس کا دیکھے ہی سے معلوم ہوتا ہے +

ان کی غزل کے انداز کی توضیح

میر سوز جیسے سیدھے سیدھے مضمون باندھتے تھے ویسے ہی آسان آسان طرحیں بھی لیتے تھے۔ بلکہ اکثر ردیف کو چھوڑ کر قافیہ ہی پر اکتفا کرتے تھے۔ ان کے شعر کا قوام لفظ محاورہ کی چاشنی پر ہے۔ اضافت۔ تشبیہ۔ استعارہ۔ فارسی ترکیبیں ان کے کلام میں بہت کم ہیں۔ ان لحاظوں سے اُنھیں گویا اُردو غزل کا شیخ سعدی کہنا چاہئے اگر اس انداز پر زبان رہتی یعنی فارسی کے رنگین رنگین خیال اس میں داخل نہ ہوتے اور قوت بیانی کا مادہ اس میں زیادہ ہوتا تو آج ہمیں اس قدر دشواری نہ ہوتی۔ اب دوہری مشکلیں ہیں۔ اول یہ کہ رنگین استعارات اور مبالغہ کے خیالات گویا مثل تکیہ کلام کے زبانوں پر چڑھ گئے ہیں۔ یہ عادت چھڑانی چاہئے۔ پھر اس میں نئے انداز اور سادہ خیالات

کو داخل کرنا چاہیے۔ کیونکہ سالہا سال سے کہتے کہتے اور سُنتے سُنتے کہنے والوں کی زبان اور سُننے والوں کے کان اس کے انداز سے ایسے آشنا ہو گئے ہیں کہ نہ سادگی میں لُطفِ زبان کا حق ادا ہو سکتا ہے۔ نہ سُننے والوں کو مزا دیتا ہے ✦

امتیاز دوم

زیادہ تر **سودا** نے اور کچھ **میر** نے اس طریقہ کو بدلا کہ استعاروں کو ہندی محاورہ کے ساتھ ملا کر ریختہ رنگین بنایا۔ اگر **میر و سودا** اور ان کی زبان میں فرق بیان کرنا ہو تو یہ کہہ دو کہ بہ نسبت عہد سودا کے دیوان میں اُردو کا نوجوان چند سال چھوٹا ہے اور یہی امر کیا باعتبار مضمون۔ اور کیا بلحاظ محاورۂ قدیم ہر امر میں خیال کر لو چنانچہ۔ کو۔ کر علامت مفعول ہے۔ کہو۔ اور کبھو۔ کا قافیہ بھی باندھ جاتے تھے۔ اُنھوں نے سوائے غزل کے اور کچھ نہیں کہا۔ اور اس وقت تک اُردو کی شاعری کی اتنی ہی بساط تھی۔ ۱۲ سطر کے صفحہ سے ۳۰۰ صفحہ کا کُل دیوان ہے اس میں سے ۲۸۸ صفحہ غزلیات۔ ۱۲ صفحہ میں مثنوی۔ رباعی۔ مخمس۔ باقی والسلام۔ آغاز مثنوی کا یہ شعر ہے ؎

مقدار دیوان

دعویٰ بڑا ہے سوز کو اپنے کلام کا — جو غور کیجیے تو ہے کوڑی کے کام کا

سودا کا لطیفہ

نقل۔ ایک دن سودا کے ہاں میر سوز تشریف لائے۔ ان دنوں شیخ علی حزیں کی غزل کا چرچا تھا جس کا مطلع یہ ہے :۔

میگر فتیم بجانا سر راہے گاہے — اوہم از لطف نہاں داشت نگاہے گاہے

میر سوز مرحوم نے اپنا مطلع پڑھا ؎

نہیں نکسے ہے مرے دل کی اُباہے گاہے — اے فلک بہرِ خدا رخصت آہے گاہے

مرزا سُن کر بولے کہ میر صاحب بچپن میں ہمارے یہاں پشور کی ڈومنیاں آیا کرتی تھیں۔ یا تو جب یہ لفظ سُنا تھا یا آج سُنا۔ میر سوز بچارے ہنس کر چپکے ہو رہے۔ پھر مرزا نے خود اسی وقت مطلع کہہ کر پڑھا ؎

نہیں جوں گُل ہوس ابر سیاہے گاہے — کاہ ہوں خشک ہیں لے برق نگاہے گاہے

میاں جرأت کی اُن دنوں میں ابتدا تھی خود جرأت نہ کر سکے ایک اور شخص نے کہا کہ حضرت! یہ بھی کچھ عرض کیا چاہتے ہیں۔ مرزا نے کہا کیوں بھئی کیا؟ جرأت نے پڑھا:-

سرسری ان سے ملاقات ہے گاہے گاہے　　صحبتِ غیر میں گاہے گاہے سرِ راہے گاہے

سب نے تعریف کی اور مرزائے موصوف نے بھی تحسین و آفرین کے ساتھ پسند کیا اسی پر ایک اور مطلع یاد آتا ہے۔ چاہو ظفر کا کہو چاہو ذوق کا سمجھو ؎

اس طرف بھی تمھیں لازم ہے نگاہے گاہے　　دمبدم لحظہ بہ لحظہ نہیں گاہے گاہے

تخلص پر لطیفہ

نقل۔ کسی شخص نے اُن سے آکر کہا کہ حضرت! ایک شخص آپ کے تخلص پر آج ہنستے تھے اور کہتے تھے کہ سوز گوز کیا تخلص رکھا ہے ہمیں پسند نہیں انھوں نے کہنے والے کا نام پوچھا اُس نے بعد بہت سے انکار اور اصرار کے بتایا۔ معلوم ہوا کہ شخص موصوف بھی مشاعرہ میں ہمیشہ آتے ہیں۔ میر سوز مرحوم نے کہا خیر کچھ مضایقہ نہیں۔ اب کے صحبت مشاعرہ میں تم مجھ سے برسرِ جلسہ یہی سوال کرنا۔ چنانچہ انھوں نے ایسا ہی کیا۔ اور باآواز بلند پوچھا حضرت آپ کا تخلص کیا ہے؟ اُنھوں نے فرمایا کہ صاحب قبلہ فقیر نے تخلص تو میر کیا تھا۔ مگر وہ میر تقی صاحب نے پسند فرمایا۔ فقیر نے خیال کیا کہ ان کے کمال کے سامنے میرا نام نہ روشن ہو سکے گا ناچار سوز تخلص کیا (شخص مذکور کی طرف اشارہ کر کے کہا) سنتا ہوں یہ صاحب گوز کرتے ہیں۔ مشاعرہ میں عجیب قہقہہ اُڑا۔ لکھنؤ میں ہزاروں آدمی مشاعرہ میں جمع ہوتے تھے سب کے کان تک آواز نہ گئی تھی۔ کئی کئی دفعہ کہوا کر سنا۔ اِدھر شخص موصوف اُدھر میر تقی صاحب دونوں چپ بیٹھے سنا کیے +

شعر خوانی کا انداز

اُنھوں نے علاوہ شاعری کے شعر خوانی کا ایسا طریقہ ایجاد کیا تھا کہ جس سے کلام کا لطف دوچند ہو جاتا تھا۔ شعر کو اس طرح ادا کرتے تھے کہ خود مضمون کی صورت بن جاتے تھے۔ اور لوگ بھی نقل اتارتے تھے مگر وہ بات کہاں! آواز دردناک تھی۔ شعر نہایت نرمی اور سوز و گداز سے پڑھتے تھے۔ اور اس میں اعضا سے

بھی مدد لیتے تھے۔ مثلاً شمع کا مضمون باندھتے تو پڑھتے وقت ایک ہاتھ سے شمع اور دوسرے کی اوٹ سے وہیں فانوس تیار کر کے بتاتے۔ بے دماغی یا ناراضی کا مضمون ہوتا تو خود بھی تیوری چڑھا کر وہیں بگڑ جاتے۔ اور تم بھی خیال کر کے دیکھ لو ان کے اشعار اپنے پڑھنے کے لئے ضرور حرکات و انداز کے طالب ہیں۔ چنانچہ یہ قطعہ بھی ایک خاص موقع پر ہوا تھا اور عجیب انداز سے پڑھا گیا ؎

گئے گھر سے جو ہم اپنے سویرے — سلام اللہ خاں صاحب کے ڈیرے
وہاں دیکھے کئی طفل پریرو — ارے رے رے ارے رے رے ارے رے

چوتھا مصرع پڑھتے پڑھتے زمین پر گر پڑے گویا پریزادوں کو دیکھتے ہی دل بے قابو ہو گیا اور ایسے نڈھال ہوئے کہ ارے رے رے کہتے کہتے غش کھا کر بے ہوش ہو گئے +

ایک غزل میں قطعہ اس انداز سے سنایا تھا کہ سارے مشاعرہ کے لوگ گھبرا کر اُٹھ کھڑے ہوئے تھے ؎

او مار سیاہ زلف سچ کہہ — بتلا دے دل جہاں چھپا ہو
کُنڈلی تلے دیکھیو نہ ہووے — کاٹا نہ ہفی۔ ترا بُرا ہو

پہلے مصرع پر ڈرتے ڈرتے بچ کر جھکے۔ گویا کنڈلی تلے دیکھنے کو جھکے ہیں۔ اور جس وقت کہا۔ کاٹا نہ ہفی۔ بس دفعتہً ہاتھ کو چھاتی تلے مسوس کر ایسے بے اختیار لوٹ گئے کہ لوگ گھبرا کر سنبھالنے کو کھڑے ہو گئے (صحیح افعی ہے۔ محاورہ میں ہفی کہتے ہیں)

نوازش ان کے شاگرد کا نام ہم لڑکپن میں سُنا کرتے تھے اور کچھ کہتے تھے تو وہی اس انداز میں کہتے تھے۔ مرزا رجب علی بیگ سرور صاحب فسانہ عجائب ان کے شاگرد تھے +

مطلع سر دیوان

سر دیوان پر اپنے جو بسم اللہ میں لکھتا — بجائے مد بسم اللہ مد آہ میں لکھتا

محو کو تیرے نہیں ہے کچھ خیال خوب و زشت ایک ہے اسکو ہوائے دوزخ و باغ بہشت
حاجیو! طوفِ دلِ مستاں کرو تو کچھ ملے ورنہ کعبہ میں دھرا کیا ہے بغیر از سنگ و خشت
ناصحا گر یار ہے ہم سے خفا تو تجھ کو کیا چین پیشانی ہی ہے اس کی ہماری سرنوشت

سوزؔ نے دامن جو ہیں پکڑا تو وہیں چین کر
کہنے لاگا۔ ان دنوں کچھ زور چل نکلا ہے ہشت

بھلا رے عشق تیری شوکت و شاں بھائی میرے تو اڑ گئے اوساں
ایک ڈر تھا کہ جی بچے نہ بچے دوسرے غم نے کھائی میری جاں
بس غم یار ایک دن دو دن اس سے زیادہ نہ ہوجیو مہماں
نہ کہ بیٹھے ہوں پاؤں پھیلا کر اپنے گھر جاؤ خانہ آباداں
عارضی حسن پر نہ ہو مغرور میرے پیارے یہ گو ہے یہ میداں
پھر ہے نے زلف و خال زیر زلف چار دن تو بھی کھیل لے چوگاں

اور تو اور کہہ کے دو باتیں
سوزؔ کہلایا صاحب دیواں

مرا جان جاتا ہے یارو بچالو کلیجہ میں کانٹا گڑا ہے نکالو
نہ بھائی مجھے زندگانی نہ بھائی مجھے مار ڈالو مجھے مار ڈالو
خدا کے لئے مرے اے ہمنشینوں وہ بانکا جو جاتا ہے اسکو بلالو
اگر وہ خفا ہو کے کچھ گالیاں دے تو دم کھا رہو کچھ نہ بولو نہ چالو
نہ آوے اگر وہ تمھارے کہے سے تو منت کرو گھیرے گھیرے منالو
کہو ایک بندہ تمھارا مرے ہے اسے جان کندن سے چل کر بچالو

جلوں کی بری آہ ہوتی ہے پیارے
تم اس سوزؔ کی اپنے حق میں دعا لو

ہوا دل کو میں کہتا کہتا دوانا پر اس بے خبر نے کہا کچھ نہ مانا

کوئی دم تو بیٹھے رہو پاس میرے میاں! میں بھی چلتا ہوں ٹک کے جانا
مجھے تو تمھاری خوشی چاہئے ہے نہیں گو ہو منظور میرا اُٹھانا
گیا ایک دن اس کے کوچے میں ناگہ لگا کہنے چل بھاگ رے پھر نہ آنا
کہاں ڈھونڈوں ہے ہے کدھر جاؤں یارب
کہیں جاں کا پاتا نہیں میں ٹھکانا

کہوں کس سے حکایت آشنا کی سنو صاحب یہ باتیں ہیں خدا کی
دعا دی تو لگا کہنے کہ دُر ہو سُنی میں نے دعا تیری دعا کی
کہا میں نے کہ کچھ خاطر میں ہوگا تمھارے ساتھ جو میں نے وفا کی
گریباں میں ذرا منہ ڈال دیکھو کہ تم نے اس وفا پر ہم سے کیا کی
تو کہتا ہے کہ بس بس چوبچ کر بند وفا لایا ہے دت تیری وفا کی
عدم سے زندگی لائی تھی بہلا کہ دنیا جائے ہے اچھی فضا کی
جنازہ دیکھتے ہی سن ہوا دل کہ ہے ظالم! دغا کی رے دغا کی
تجھے اے سوز کیا مشکل بنی ہے جو ڈھونڈے ہے سفارش اغنیا کی
کوئی مشکل نہیں رہتی ہے مشکل
محبت ہے اگر مشکلکشا کی

دل کے ہاتھوں بہت خراب ہوا جل گیا بل گیا کباب ہوا
اشک آنکھوں سے پل نہیں تھمتا کیا بلا دل ہے دل میں آب ہوا
جن کو نت دیکھتے تھے اب ان کا دیکھنا بھی خیال و خواب ہوا
یار اغیار ہو گیا ہیہات کیا زمانے کا انقلاب ہوا
سارا دیوانِ زندگی دیکھا ایک مصرع نہ انتخاب ہوا
سوز بے ہوش ہو گیا جب سے
تیری صحبت میں باریاب ہوا۔

عاشق ہوا اسیر ہوا مبتلا ہوا کیا جانئے کہ دیکھتے ہی دل کو کیا ہوا
سرشتہ ظلم نے کیا مجھکو واہ واہ تقصیر یہ ہوئی کہ ترا آشنا ہوا
دل تھا بساط میں سو کوئی اسکو لے گیا اب کیا کروں گا اے مرے اللہ کیا ہوا
پاتا نہیں سراغ کروں کس طرف تلاش دیوانہ دل کدھر کو گیا آہ کیا ہوا

سنتے ہی سوزؔ کی خبرِ مرگ خوش ہوا
کہنے لگا کہ پنڈ تو چھوٹا بھلا ہوا

آج اس راہ دل رُبا گذرا جی پہ کیا جانئے کہ کیا گذرا
آہ ظالم نے کچھ نہ مانی بات میں تو اپنا سا جی چلا گذرا
اب تو آ یار بس خدا کو مان پچھلا شکوہ تھا سو گیا گذرا
رات کو نیند ہے نہ دن کو چین ایسے جینے سے اے خدا گذرا

سوزؔ کے قتل پر کمر مت باندھ
ایسا جانا ہے کیا گیا گذرا

یار گر صاحبِ وفا ہوتا کیوں میاں جان! کیا مزا ہوتا
ضبط سے میرے تھم رہا ہے سرشک ورنہ اب تک تو بہہ گیا ہوتا
جان کے کیا کروں بیاں احساں یہ نہ ہوتا تو مر گیا ہوتا
روٹھنا تب تجھے مناسب تھا جو تجھے میں نے کچھ کہا ہوتا

ہاں میاں جانتا تو میری قدر
جو کہیں تیرا دل لگا ہوتا

بلبل کہیں نہ جائیو زنہار دیکھنا اپنے ہی من میں پھولے گی گلزار دیکھنا
نازک ہے دل نہ ٹھیس لگانا اسے کہیں غم سے بھرا ہے اے مرے غمخوار دیکھنا
شکوہ عبث ہے یار کے جوروں کا ہر گھڑی غیروں کے ساتھ شوق سے دیدار دیکھنا
سودا کی بات بھول گئی سوزؔ تجھ کو حیف جو کچھ خدا دکھا دے سو لاچار دیکھنا

کچھ کہہ تو قاصد آتا ہے وہ ماہ — اَلْحَمْدُ لِلّٰہ اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ
جھوٹے کے منہ میں آگ کہوں کیا — اَسْتَغْفِرُ اللہ اَسْتَغْفِرُ اللہ

یار آتا ہے ترے یار کی ایسی تیسی
آزماتا ہے۔ ترے پیار کی ایسی تیسی

میر محمد تقی میرؔ

میر تخلص۔ محمد تقی نام خلف میر عبد اللہ۔ شرفائے اکبر آباد سے تھے۔ سراج الدین علی خاں آرزو۔ زبان فارسی کے معتبر مصنف اور مسلم الثبوت محقق ہندوستان میں تھے۔ گلزار ابراہیمی میں لکھا ہے کہ "میر صاحب کا ان سے دور کا رشتہ تھا اور تربیت کی نظر پائی تھی"۔ عوام میں ان کے بھانجے مشہور ہیں۔ درحقیقت بیٹے میر عبد اللہ کے تھے مگر ان کی پہلی بی بی سے تھے وہ مر گئیں تو خان آرزو کی ہمشیرہ سے شادی کی تھی۔ اس لئے سوتیلے بھانجے ہوئے۔ میر صاحب کو ابتدا سے شعر کا شوق تھا۔ باپ کے مرنے کے بعد دلّی میں آئے اور خان آرزو کے پاس انھوں نے اور اُن کی شاعری نے پرورش پائی۔ مگر خان صاحب حنفی مذہب تھے اور میر صاحب شیعہ اس پر نازک مزاجی غضب! غرض کسی مسئلہ پر بگڑ کر الگ ہو گئے۔ بدنظر زمانہ کا دستور ہے کہ جب کسی نیک نام کے دامنِ شہرت کو ہوا میں اُڑتے دیکھتا ہے تو ایک داغ لگا دیتا ہے۔ چنانچہ تذکرہ شورش میں لکھا ہے کہ خطاب سیادت انھیں شاعری کی درگاہ سے عطا ہوا۔ کہن سال بزرگوں سے یہ بھی سُنا ہے کہ جب انھوں نے میر تخلص کیا تو ان کے والد نے منع کیا کہ ایسا نہ کرو۔ ایک دن خوامخواہ سید ہو جاؤ گے۔ رفتہ رفتہ ہو ہی گئے۔ سوداؔ کا ایک قطعہ بھی سن رسیدہ لوگوں سے سنا ہے مگر

کلیات میں نہیں۔ شاید اس میں یہی اشارہ ہو ؎

بیٹھے تنورِ طبع کو جب گرم کر کے میر   کچھ شیرمال سامنے کچھ نان کچھ پنیر

اخیر میں کہتے ہیں ؎

میری کے اب تو سارے مصالح ہیں مستعد   بیٹا تو گندنا بنے اور آپ کو تھ میر

پھر بھی اتنا کہنا واجب سمجھتا ہوں کہ ان کی مسکینی و غربت اور صبر و قناعت تقوے و طہارت محضر بنا کر ادائے شہادت کرتے ہیں کہ سیادت میں شبہہ نہ کرنا چاہیئے۔ اور زمانہ کا کیا ہے کس کس کو کیا نہیں کہتا۔ اگر وہ سیّد نہ ہوتے تو خود کیوں کہتے ؎

پھرتے ہیں میر خوار کوئی پوچھتا نہیں   اس عاشقی میں عزتِ سادات بھی گئی

غرض ہر چند کہ تخلص ان کا میر تھا۔ مگر گنجفۂ سخن کی بازی میں آفتاب ہو کر چمکے۔ قدردانی نے ان کے کلام کو جواہر اور موتیوں کی نگاہوں سے دیکھا۔ اور نام کو پھولوں کی مہک بنا کر اُڑایا۔ ہندوستان میں یہ بات انہی کو نصیب ہوئی ہے کہ مسافر غزلوں کو تحفہ کے طور پر شہر سے شہر میں لے جاتے تھے +

یہ بھی ظاہر ہے کہ نحوست اور فلاکت قدیم سے اہل کمال کے سر پر سایہ کئے ہیں۔ ساتھ اس کے میر صاحب کی بلند نظری اس غضب کی تھی کہ دنیا کی کوئی بڑائی۔ اور کسی شخص کا کمال یا بزرگی انہیں بڑی نہ دکھائی دیتی تھی۔ اس قباحت نے نازک مزاج بنا کر ہمیشہ دنیا کی راحت اور فارغ البالی سے محروم رکھا اور وہ وضعداری اور قناعت کے دھوکے میں اسے فخر سمجھتے رہے۔ یہ الفاظ گستاخانہ جو زبان سے نکلے ہیں راقم روسیاہ ان کی روح پاک سے عفو قصور چاہتا ہے۔ لیکن خدا گواہ ہے کہ جو کچھ لکھا گیا فقط اس لئے ہے کہ جن لوگوں کو دنیا میں گزارہ کرنا ہے۔ وہ دیکھیں کہ ایک صاحب جوہر کا جوہر یہ باتیں کیونکر خاک میں ملا دیتی ہیں۔ چنانچہ انہیں کے حالات و مقالات عنقریب اس بیان کا ثبوت پیش کرتے ہیں۔ اگرچہ دلّی میں شاہ عالم کا دربار اور اُمرا و شرفا

کی محفلوں میں ادب ہر وقت ان کے لئے جگہ خالی کرتا تھا۔ اور ان کے جوہر کمال اور نیکی اطوار و اعمال کے سبب سے سب عظمت کرتے تھے۔ مگر خالی آدابوں سے خاندان تو نہیں پل سکتے۔ اور وہاں تو خود خزانۂ سلطنت خالی پڑا تھا۔ اس لئے ۱۱۹۰ھ میں دلی چھوڑنی پڑی +

میر صاحب لکھنؤ جاتے ہیں

جب لکھنؤ چلے تو ساری گاڑی کا کرایہ بھی پاس نہ تھا۔ ناچار ایک شخص کے ساتھ شریک ہو گئے، اور دلی کو خدا حافظ کہا۔ تھوڑی دور آگے چل کر اس شخص نے کچھ بات کی۔ یہ اس کی طرف سے منہ پھیر کر ہو بیٹھے۔ کچھ دیر کے بعد پھر اس نے بات کی۔ میر صاحب چیں بجبیں ہو کر بولے کہ۔ صاحب قبلہ آپ نے کرایہ دیا ہے بیشک گاڑی میں بیٹھئے مگر باتوں سے کیا تعلق! اس نے کہا۔ حضرت کیا مضائقہ ہے۔ راہ کا شغل ہے۔ باتوں میں ذرا جی بہلتا ہے۔ میر صاحب بگڑ کر بولے کہ خیر آپ کا شغل ہے میری زبان خراب ہوتی ہے +

مشاعرہ میں تشریف لے جاتے ہیں

لکھنؤ میں پہنچ کر جیسا مسافروں کا دستور ہے۔ ایک سرا میں اترے۔ معلوم ہوا کہ آج یہاں ایک جگہ مشاعرہ ہے۔ رہ نہ سکے۔ اسی وقت غزل لکھی اور مشاعرہ میں جا کر شامل ہوئے۔ ان کی وضع قدیمانہ کھڑکی دار پگڑی۔ پچاس گز کے گھیر کا جامہ۔ ایک پورا تھان پستو لئے کا کمر سے بندھا۔ ایک رومال پڑی دار تہ کیا ہوا اس میں آویزاں۔ مشروع کا پاجامہ جس کے عرض کے پائینچے۔ ناگ پھنی کی انی دار جوتی۔ جس کی ڈیڑھ بالشت اونچی نوک۔ کمر میں ایک طرف سیف یعنی سیدھی تلوار۔ دوسری طرف کٹار۔ ہاتھ میں جریب۔ غرض جب داخل محفل ہوئے۔ تو وہ شہر لکھنؤ۔ نئے انداز۔ نئی تراشیں۔ بانکے ٹیڑھے جوان۔ جمع۔ انہیں دیکھ کر سب ہنسنے لگے۔ میر صاحب۔ بیچارے غریب الوطن۔ زمانہ کے ہاتھ سے پہلے ہی دل شکستہ تھے۔ اور بھی دل تنگ ہوئے۔ اور ایک طرف بیٹھ گئے۔ شمع ان کے سامنے آئی تو پھر سب کی نظر پڑی اور بعض اشخاص نے پوچھا کہ حضور

وضع و لباس

کا وطن کہاں ہے؟ میر صاحب نے یہ قطعہ فی البدیہہ کہہ کر غزل طرحی میں داخل کیا:

کیا بود و باش پوچھو ہو پورب کے ساکنو ہم کو غریب جان کے ہنس ہنس پکار کے
دلی جو ایک شہر تھا عالم میں انتخاب رہتے تھے منتخب ہی جہاں روزگار کے
اس کو فلک نے لوٹ کے ویران کر دیا ہم رہنے والے ہیں اسی اُجڑے دیار کے

سب کو حال معلوم ہوا۔ بہت معذرت کی۔ اور میر صاحب سے عفو تقصیر چاہی۔ کمال کے طالب تھے صبح ہوتے ہوتے شہر میں مشہور ہو گیا کہ میر صاحب تشریف لائے۔ رفتہ رفتہ نواب آصف الدولہ مرحوم نے سُنا اور دو سَو روپیہ مہینا کر دیا +

عظمت و اعزاز جوہر کمال کے خادم ہیں۔ اگرچہ انھوں نے لکھنؤ میں بھی میر صاحب کا ساتھ نہیں چھوڑا مگر انھوں نے بھی بد دماغی اور نازک مزاجی کو جو ان کے ذاتی مصاحب تھے۔ اپنے دم کے ساتھ ہی رکھا۔ چنانچہ کبھی کبھی نواب کی ملازمت میں جاتے تھے +

نواب آصف الدولہ کی فرمایش

ایک دن نواب مرحوم نے ایک غزل کی فرمایش کی۔ دوسرے تیسرے دن جو پھر گئے تو پوچھا کہ۔ میر صاحب ہماری غزل لائے؟ میر صاحب نے تیوری بدل کر کہا۔ جناب عالی! مضمون غلام کی جیب میں تو بھرے ہی نہیں کہ آپ نے فرمائش کی آج غزل حاضر کر دے۔ اُس فرشتہ خصال نے کہا۔ خیر میر صاحب جب طبیعت حاضر ہو گی کہہ دیجئے گا +

میر صاحب کی نازک مزاجی

ایک دن نواب نے بُلا بھیجا۔ جب پہنچے تو دیکھا کہ نواب حوض کے کنارے کھڑے ہیں۔ ہاتھ میں چھڑی ہے۔ پانی میں لال سبز مچھلیاں تیرتی پھرتی ہیں آپ تماشا دیکھ رہے ہیں۔ میر صاحب کو دیکھ کر بہت خوش ہوئے اور کہا کہ میر صاحب کچھ فرمائیے۔ میر صاحب نے غزل سنانی شروع کی۔ نواب سنتے جاتے تھے اور چھڑی کے ساتھ مچھلیوں سے بھی کھیلتے جاتے تھے۔ میر صاحب چیں بجبیں ہوتے اور ہر شعر پر ٹھہر جاتے تھے۔ نواب کہے جاتے تھے کہ ہاں پڑھیے۔ آخر

چار شعر پڑھ کر میر صاحب ٹھہر گئے۔ اور بولے کہ پڑھوں کیا آپ تو مچھلیوں سے کھیلتے ہیں۔ متوجہ ہوں تو پڑھوں۔ نواب نے کہا جو شعر ہوگا آپ متوجہ کر لے گا۔ میر صاحب کو یہ بات زیادہ تر ناگوار گذری۔ غزل جیب میں ڈال کر گھر کو چلے آئے اور پھر جانا چھوڑ دیا۔ چند روز کے بعد ایک دن بازار میں چلے جاتے تھے نواب کی سواری سامنے سے آ گئی۔ دیکھتے ہی نہایت محبت سے بولے کہ میر صاحب آپ نے بالکل ہمیں چھوڑ دیا۔ کبھی تشریف بھی نہیں لاتے۔ میر صاحب نے کہا بازار میں باتیں کرنا آداب شرفا نہیں۔ یہ کیا گفتگو کا موقع ہے۔ غرض بدستور اپنے گھر میں بیٹھے رہے اور فقر و فاقہ میں گزارہ کرتے رہے۔ آخر ۱۲۲۵ھ میں فوت ہوئے۔ اور سو برس کی عمر پائی۔ ناسخ نے تاریخ کہی کہ ع

واویلا مرد شہ شاعراں

تفصیل تصانیف

تصنیفات کی تفصیل یہ ہے کہ چھ دیوان غزلوں کے ہیں۔ چند صفحے ہیں جن میں فارسی کے عمدہ متفرق شعروں پر اردو مصرع لگا کر مثلث اور مربع کیا ہے۔ اور یہ ایجاد ان کا ہے۔ رباعیاں۔ مستزاد چند صفحے۔ ۳ قصیدے منقبت میں اور ایک نواب آصف الدولہ کی تعریف میں چند مخمس اور ترجیع بند مناقب میں۔ چند مخمس شکایت زمانہ میں۔ جن سے بعض اشخاص کی ہجو مطلوب ہے۔ دو واسوخت۔ ایک ہفت بند ملا حسن کاشی کی طرز پر حضرت شاہ ولایت کی شان میں ہے۔ بہت سی مثنویاں جن کی تفصیل عنقریب واضح ہوتی ہے۔ تذکرۂ نکات الشعراء شاعران اردو کے حال کا کہ اب بہت کم یاب ہے ایک رسالہ مسمٰی بہ فیض میر۔ مصحفی اپنے تذکرہ فارسی میں لکھتے ہیں۔ دعویٰ شعر فارسی نہ دارد مگر فارسیش ہم کم از ریختہ نیست می گفت کہ سالے ریختہ موقوف کردہ بودم دراں حال دو ہزار شعر گفتہ تدوین کردم +

رائے غزلوں کے دیوان میر

معلوم ہوتا ہے کہ میر صاحب کو تاریخ گوئی کا شوق نہ تھا علیٰ ہذا القیاس

مرثیہ بھی دیوان میں نہیں۔ غزلوں کے دیوان اگرچہ رطب و یابس سے بھرے ہوئے ہیں۔ مگر جو ان میں انتخاب ہیں وہ فصاحت کے عالم انتخاب ہیں۔ اُردو زبان کے جوہری قدیم سے کہتے آئے ہیں۔ بہتّر اور دو بہتّر نشتر ہیں۔ باقی میر صاحب کا تبرک ہے۔ لیکن یہ بہتّر کی رقم فرضی ہے۔ کیونکہ جب کوئی تڑپتا ہوا شعر پڑھا جاتا ہے تو ہر سخن شناس سے مبالغۂ تعریف میں یہی سُنا جاتا ہے کہ دیکھئے! یہ انھیں بہتّر نشتروں میں سے ہے۔ انھوں نے زبان اور خیالات میں جس قدر فصاحت اور صفائی پیدا کی ہے۔ اتنا ہی بلاغت کو کم کیا ہے۔ یہی سبب ہے کہ غزل اصول غزلیت کے لحاظ میں سودا سے بہتر ہے۔ ان کا صاف اور سلجھا ہوا کلام اپنی سادگی میں ایک انداز دکھاتا ہے۔ اور فکر کو بجائے کاہش کے لذت بخشتا ہے اسی واسطے خواص میں معزز۔ اور عوام میں ہر دلعزیز ہے حقیقت میں یہ انداز میر سوز سے لیا۔ مگر ان کے ہاں فقط باتیں ہی باتیں تھیں۔ انھوں نے اس میں مضمون داخل کیا اور گھریلو زبان کو متانت کا رنگ دے کر محفل کے قابل کیا۔

بہتّر نشتر

چونکہ مطالب کی دقت۔ مضامین کی بلند پروازی۔ الفاظ کی شان و شکوہ۔ بندش کی چُستی لازمہ قصائد کا ہے۔ وہ طبیعت کی شگفتگی اور جوش و خروش کا ثمر ہوتا ہے۔ اسی واسطے میر صاحب کے قصیدے کم ہیں۔ اور اسی قدر درجے میں بھی کم ہیں۔ انھوں نے طالب سخن پر روشن کر دیا ہے کہ قصیدہ اور غزل کے دو میدانوں میں دن اور رات کا فرق ہے۔ اور اسی منزل میں آکر سودا اور میر کے کلام کا حال کُھلتا ہے۔

قصاید کی کیا تعریف ہے

اُمرا کی تعریف میں قصیدہ نہ کہنے کا یہ بھی سبب تھا کہ توکل اور قناعت انہیں بندہ کی خوشامد کی اجازت نہ دیتے تھے۔ یا خود پسندی اور خود بینی جو انھیں اپنے آپ میں غرق کئے دیتی تھی۔ وہ زبان سے کسی کی تعریف نکلنے

نہ دیتی تھی۔ چنانچہ کہتے ہیں اور کیا خوب کہتے ہیں :-

مجھ کو دماغ وصفِ گل و یاسمن نہیں — میں جوں نسیم بادِ فروشِ چمن نہیں
کل جا کے ہم نے میر کے در پر سنا جواب — مدت ہوئی کہ یاں وہ غریب الوطن نہیں

چند مخمس شکایت زمانہ میں بطور شہر آشوب کے کہے ہیں اور ان میں بعض اشخاص کے نام بھی لئے ہیں۔ مگر ایسے کمزور کہے ہیں کہ گویا کچھ نہیں ہیں۔ سمجھ لو کہ قسام ازل نے ان کے دسترخوان سے مدح اور قدح کے دو پیالے اٹھا کر سودا کے ہاں دھر دئے ہیں +

واسوخت دو ہیں اور کچھ شک نہیں کہ لاجواب ہیں۔ اہل تحقیق نے **فغانی** یا **وحشی** کو فارسی میں اور اردو میں انھیں **واسوخت** کا موجد تسلیم کیا ہے۔ سیکڑوں شاعروں نے واسوخت کہے لیکن خاص خاص محاوروں سے قطع نظر کریں تو آج تک اس کوچہ میں میر صاحب کے خیالات و انداز بیان کا جواب نہیں +

مناقب میں جو مخمس اور ترجیع بند وغیرہ کہے ہیں حقیقت میں حسن اعتقاد کا حق ادا کر دیا ہے۔ وہ ان کے صدق دل کی گواہی دیتے ہیں +

مثنویاں مختلف بحروں میں ہیں۔ جو اصول مثنوی کے ہیں وہ میر صاحب کا قدرتی انداز واقع ہوا ہے اس لئے بعض بعض لطف سے خالی نہیں۔ ان میں **شعلۂ عشق** اور **دریائے عشق** نے اپنی خوبی کا انعام شہرت کے خزانہ سے پایا۔ مگر افسوس یہ کہ میر حسن مرحوم کی مثنوی سے دونوں پیچھے رہیں +

جوشِ عشق میں لطافت اور نزاکت کا جوش ہے مگر مشہور نہ ہوئی۔ **اعجاز عشق** و **خواب و خیال** مختصر ہیں اور اس رتبہ پر نہیں پہنچیں۔ **معاملات عشق** ان سے بڑی ہے مگر رتبہ میں گھٹی ہوئی ہے +

مثنوی شکار نامہ میں نواب آصف الدولہ کے شکار کا اور اس سفر کا

مفصل حال لکھا ہے۔ اگرچہ زبان اچھی نہیں مگر کیفیت اور لطف محاورہ سے خالی نہیں۔ اس میں جو متفرق غزلیں جابجا لگائی ہیں وہ عجب لطف دیتی ہیں +

ساقی نامہ، مرغہ کا مرثیہ

ساقی نامہ بہاریہ لکھا ہے اگرچہ مختصر ہے مگر اعلیٰ درجۂ لطافت و فصاحت پر ہے۔ اس کے علاوہ بہت سی مختصر مختصر مثنویاں ہیں۔ ایک مثنوی اپنے مرغہ کے مرثیہ میں لکھی ہے۔ فرماتے ہیں کہ میرا پیارا مرغہ تھا۔ بڑا اصیل تھا۔ بہت خوب تھا۔ اس پر بلّی نے حملہ کیا۔ مرغہ نے بڑی دلاوری سے مقابلہ کیا۔ اور اخیر کو مارا گیا۔ مثنوی تو جیسی ہے ویسی ہے مگر ایک شعر اس کے وقت آخر کا نہیں بھولتا +

جھکا بسوئے قدم سرخروس بیجاں کا — زمیں پہ تاج گرا ہدہد سلیماں کا

مثنوی اپنی بلّی کے حال میں

ایک مثنوی میں کہتے ہیں کہ میری ایک بلّی تھی۔ بڑی وفادار تھی۔ بڑی قانع تھی۔ اس کے بچے نہ جیتے تھے۔ ایک دفعہ پانچ بچے ہوئے۔ پانچوں جیے۔ تین بچے لوگ لے گئے دو رہے۔ وہ دونوں مادہ تھے۔ ایک کا نام موہنی رکھا۔ ایک کا نام مانی۔ موہنی ایک میرے دوست کو پسند آئی وہ لے گئے۔ مانی کے مزاج میں مسکینی اور غربت بہت تھی اس لئے فقیر کی رفاقت نہ چھوڑی۔ اس کے بیان حالات کو بہت طویل دیا ہے +

ایک کتّا اور ایک بلاّ پالا تھا اس کی ایک مثنوی لکھی ہے +

برسات کا سفر

ایک امیر کے ساتھ سفر میں میرٹھ تک گئے تھے۔ اس میں برسات کی تکلیف اور رستہ کی مصیبت بہت بیان کی ہے۔ اس سے یہ بھی قیاس کر سکتے ہیں کہ ہمارے ہموطن ہمیشہ سے سفر کو کیسی آفت سمجھتے ہیں +

مثنوی اپنی بکری کے حال میں

ایک بکری پالی۔ اس کے چار تھن تھے۔ بچہ ہوا تو دودھ ایک ہی تھن میں اُترا۔ وہ بھی اتنا تھا کہ بچہ کو پوری نہ پڑتی تھی۔ بازار کا دودھ پلا پلا کر پالا۔ پھر بچہ کی سرزوری اور سرشوری کی شکایت ہے +

ایک مثنوی آصف الدولہ مرحوم کی آرائشِ کتخدائی میں کہی ہے۔ ایک مختصر

جھوٹ کی طرف خطاب کرکے

مثنوی جھوٹ کی طرف سے خطاب کرکے لکھی ہے۔ اور اس کی بحر مثنوی کے معمولی بحروں سے علیحدہ ہے +

مثنوی اژدر نامہ

مثنوی اژدر نامہ کہ اس کا حال آگے آتا ہے۔ یا اجگر نامہ۔

مثنوی برسات کی شکایت میں

ایک مثنوی مختصر برسات کی شکایت میں لکھی ہے۔ گھر کا گرنا اور مینہ برستے میں گھر والوں کا نکلنا عجیب طور سے بیان کیا ہے۔ اگر خیال کرو تو شاعر کی شورش طبع کے لئے یہ موقع خوب تھا۔ مگر طبیعت مکان سے بھی پہلے گری ہوئی تھی وہ یہاں بھی نہیں اُبھری۔ سودا ہوتے تو طوفان اُٹھاتے +

شاعری فن شریف ہے۔ اراذل میں جاکر خراب ہوگئی

مثنوی **تنبیہ الخیال**۔ اس میں فنِ شعر کی عزت و توقیر کو بہت سا طول دے کر کہا ہے کہ پہلے اس فن شریف کو شرفا اختیار کرتے تھے۔ اب پواج دارا ذل بھی شاعر ہو گئے۔ اس میں ایک بزاز کے لونڈے کو بہت خراب کیا ہے۔ اس کے علاوہ کئی اور چھوٹی چھوٹی مثنویاں ہیں کہ چنداں ذکر کے قابل نہیں +

تذکرۂ شعرائے اُردو

نکات الشعرا۔ شایق شعر کے لئے بہت مفید ہے۔ اس میں شعرائے اُردو کی بہت سی باتیں اس زمانہ کے لوگوں کے لئے دیکھنے کے قابل ہیں۔ مگر وہاں بھی اپنا انداز قائم ہے۔ دیباچہ میں فرماتے ہیں کہ یہ اُردو کا پہلا تذکرہ[1] ہے۔ اس میں ایک ہزار شاعر کا حال لکھوں گا۔ مگر ان کو نہ لوں گا جن کے کلام سے دماغ پریشان ہو۔ ان ہزار میں ایک بیچارہ بھی طعنوں اور ملامتوں سے نہیں بچا۔ **ولی** کہ بنی نوع شعرا کا آدم ہے اس کے حق میں فرماتے ہیں "وے شاعریست از شیطان مشہورتر" **میر خاں کمترین**[2] اسی زمانہ میں ایک قدیمی شاعر دلی کے تھے۔

---

[1] یہ بھی میر صاحب کا دعویٰ ہے۔ ورنہ اس سے پہلے بھی تذکرے مرتب ہو چکے ہیں +

[2] کمترین تخلص۔ میر خاں نام تھا۔ تخلص میں یہ نکتہ رکھا تھا کہ قوم کے افغان تھے۔ ترین فرقہ کا نام تھا۔ کمترین تخلص کیا تھا۔ بہت سن رسیدہ تھے۔ شاہ آبرو اور ناجی کے دیکھنے والوں میں تھے۔ مگر چوتھے طبقہ کے شاعروں میں موجود ہوتے تھے۔ پرانے سپاہی تھے۔ کچھ بہت علم بھی نہ تھا۔ طبقہ اوّل کے رنگ میں ایہام کے شعر کہتے تھے۔ خوش مزاج بھی تھے۔ اور غصیل بھی تھے۔ اور وقت پر جو سوجھ جاتی تھی (باقی برصفحہ آئندہ)

اُنھیں اس فقرہ پر بڑا غصہ آیا۔ ایک نظم میں اوّل بہت کچھ کہا۔ آخر میں آکر کہتے ہیں

ع۔ ولی پر جو سخن لائے اُسے شیطان کہتے ہیں +

عمومی رائے میر صاحب کے کلام پر

یہ تھی مختصر کیفیت میر صاحب کی تصنیفات کی۔ میر صاحب کی زبان شُستہ۔ کلام صاف۔ بیان ایسا پاکیزہ۔ جیسے باتیں کرتے ہیں۔ دل کے خیالات کو جو کہ سب کی طبیعتوں کے مطابق ہیں۔ محاورہ کا رنگ دے کر باتوں باتوں میں ادا کر دیتے ہیں۔ اور زبان میں خدا نے ایسی تاثیر دی ہے کہ وہی باتیں ایک مضمون بن جاتی ہیں۔ اسی واسطے ان میں بہ نسبت اور شعرا کے اصلیت کچھ زیادہ قائم رہتی ہے۔ بلکہ اکثر جگہ یہی معلوم ہوتا ہے گویا نیچر کی تصویر کھینچ رہے ہیں۔ یہی سبب ہے کہ دلوں پر اثر بھی زیادہ کرتی ہیں۔ وہ گویا اُردو کے سعدی ہیں۔ ہمارے عاشق مزاج شعرا کی رنگینیاں۔ اور خیالات کی بلند پروازیاں اُن کے مبالغوں کے جوش و خروش سب کو معلوم ہیں۔

حسرت و یاد کے خیال

مگر اسے قسمت کا لکھا سمجھو کہ ان میں سے بھی میر صاحب کو شگفتگی۔ یا بہار عیش و نشاط یا کامیابی وصال کا لطف کبھی نصیب نہ ہوا۔ وہی مصیبت اور قسمت کا غم جو ساتھ لائے تھے اُس کا دُکھڑا سُناتے چلے گئے۔ جو آج تک دلوں میں اثر اور سینوں میں درد پیدا کرتے ہیں۔ کیونکہ ایسے مضامین اور شعرا کے لئے خیالی تھے۔ ان کے حالی تھے۔ عاشقانہ خیال بھی ناکامی۔ زار نالی۔ حسرت مایوسی۔ ہجر کے لباس میں خرچ ہوئے۔ ان کا کلام صاف کہہ دیتا ہے کہ جس دل سے نکل کر آیا ہوں وہ غم و درد کا پُتلا نہیں حسرت واندوہ کا جنازہ تھا۔ ہمیشہ وہی خیال بسے رہتے تھے۔ بس جو دل پر گزرتے تھے وہی

(بقیہ صفحہ ۲۱۱) اس میں چوکتے نہ تھے۔ صاف کہہ بیٹھتے تھے۔ کوئی ان کی زبان سے بچا نہیں مگر وہ زمانہ بھی ایسا تھا کہ علما۔ شرفا سب سُنتے تھے۔ اور ہنس ہنس کر برداشت کرتے تھے۔ وضع بھی دنیا سے نرالی رکھی تھی۔ ایک بڑی سی گھیردار پگڑی سر پر باندھتے تھے۔ لمبا سا دوپٹہ بل دے کر کمر پر لپیٹتے تھے۔ ایک قلم ہاتھ میں رکھتے تھے۔ اپنے اشعار کہ میر جعفر مرحوم کی زٹل کی کھُرچن ہوتے تھے۔ خود پرچوں پر لکھ کر کمر میں رکھتے تھے۔ اُن دنوں ہر جمعہ کو سعد اللہ خاں کے چوک پر گذری لگتی تھی وہاں جا کھڑے ہوتے تھے۔ لڑکے اور شوقین خوش مزاج خاطر خواہ دام دیتے تھے۔ اور ایک ایک پرچہ خوشی خوشی لے جاتے تھے +

زبان سے کہہ دیتے تھے۔ کہ سننے والوں کے لئے نشتر کا کام کر جاتے تھے +

ان کی غزلیں ہر بحر میں کہیں شربت اور کہیں شیر و شکر ہیں۔ مگر چھوٹی چھوٹی بحروں میں فقط آب حیات بہاتے ہیں۔ جو لفظ مُنہ سے نکلتا ہے تاثیر میں ڈوبا ہوا نکلتا ہے مگر یہ بھی بزرگوں سے معلوم ہوا کہ مشاعرہ یا فرمائش کی غزلیں ایسی نہ ہوتی تھیں جیسی کہ اپنی طبع زاد طرح میں ہوتی تھیں۔ میر صاحب نے اکثر فارسی کی ترکیبوں کو یا ان کے ترجموں کو اُردو کی بنیاد میں ڈال کر ریختہ کیا۔ دیکھو صفحہ ۴۶۔ ۴۷۔ اور اکثروں کو جوں کا توں رکھا۔ بہت ان میں سے پسند عام کے دربار میں رجسٹری ہوئیں۔ اور بعض نامنظور۔ معاصرین نے کہیں برتا مگر بہت کم۔ چنانچہ فرماتے ہیں:۔

چھوٹی چھوٹی بحروں کی غزلیں

فارسی ترکیبیں

ہنگامہ گرم کن جو دلِ ناصبور تھا	پیدا ہر ایک نالہ سے شورِ نشور تھا
یہ چشم شوق طرفہ جگہ ہے دکھاؤ کی	ٹھہرو بقدرِ یک مژہ تم اس مکان میں
کیا کہئے۔ حُسن عشق کے آپ ہی طرف ہوا	دل نام قطرہ خون یہ ناحق تلف ہوا
دل کہ یک قطرہ خوں نہیں ہے بیش	ایک عالم کے سر بلا لایا
ہر دم طرف ہے دل سے مزاجِ کرخت کا	ٹکڑا مرا جگر ہے کہو سنگ سخت[1] کا
اس کا خرام دیکھ کے جایا نہ جائے گا	اے کبک پھر بحال بھی آیا نہ جائے گا
اپنے ہی دل کو نہ ہو وا شد تو کیا حاصل نسیم	گو چمن میں غنچۂ پژمردہ تجھ سے کھل گیا
خواہی پیالہ خواہ سبو کر ہمیں کلال	ہم اپنی خاک پر تجھے مختار کر چلے
یاد ایام کہ یہاں ترک شکیبائی تھا	ہر گلی کوچہ مجھے کوچۂ رسوائی تھا
اے تو کہ یہاں سے عاقبت کار جائے گا	یہ قافلہ رہے گا نہ زنہار جائے گا

تصرفات نادر الکلامی

اس کے علاوہ فارسی کے بعض محاوروں اور اس کی خاص خاص رسموں کا اشارہ بھی کر جاتے تھے کہ انھیں بھی پھر کسی نے پسند نہیں کیا۔ چنانچہ دیوانہ کو پھول کی چھڑیاں

[1] فارسی کا محاورہ ہے تو گوئی جگرم پارۂ سخت است +

مارنے کا ٹوٹکا انھوں نے بھی کیا ہے۔ اور داغ جنوں بھی دیا ہے[1]۔

جاتی ہے نظر حسن پہ گہ چشم پریدن ۔۔۔ یاں ہم نے پر کاہ بھی بیکار نہ دیکھا

بعض جگہ قادر الکلامی کے تصرف کر کے اپنے زور بیان کا جوہر دکھایا ہے۔ چنانچہ فرماتے ہیں:-

ہر چند ناتواں ہوں پر آگیا جو دل میں ۔۔۔ دیں گے ہلا زمیں سے تیرا فلک قلابا[2]

داغ ہے تاباں علیہ الرحمہ کا چھاتی پہ میر ۔۔۔ ہو نجات اس کی بچارا[3] ہم سے بھی تھا آشنا

ہزار شانہ و مسواک و غسل شیخ کرے ۔۔۔ ہمارے عندیہ میں تو ہے وہ خبیث و پلیت

ردیف تاء مثناۃ فوقانی کی غزل میں یہ شعر واقع ہوا ہے۔ ایسے تصرفوں سے یہ نہیں کہہ سکتے کہ انھیں اس لفظ کی صحت نہ تھی۔ سمجھنا چاہیئے کہ زبان کے مالک تھے۔ اور محاورہ کو اصلیت پر مقدم سمجھتے تھے۔

اے خوشا حال اس کا جس کا وہ ۔۔۔ حال عمداً تباہ کرتے تھے

ہے تہِ دل بتوں کا کیا معلوم ۔۔۔ نکلے پردہ سے کیا۔ خدا معلوم

میں بیقرار خاک میں کب تک ملا کروں ۔۔۔ کچھ ملنے یا نہ ملنے کا تو بھی قرار کر

رہوں جا کے مر حضرتِ یار میں ۔۔۔ یہی قصد ہے بندہ درگاہ کا

کھلا نشے میں جو پگڑی کا پیچ اسکی میر ۔۔۔ سمندِ ناز کو اک اور تازیانہ ہوا

آواز ہماری سے نہ رک ہم ہیں دعا یاد ۔۔۔ آوے گی بہت ہم سے فقیروں کی صدا یاد

سب غلطی رہی بازیٔ طفلانہ کی یکسو ۔۔۔ وہ یاد فراموش تھے ہم کو نہ کیا یاد

جز مرتبۂ کل کو حاصل کرے ہے آخر ۔۔۔ ایک قطرہ نہ دیکھا جو دریا نہ ہوا ہوگا

ابر اٹھا تھا کعبہ سے اور جھوم پڑا میخانہ پر ۔۔۔ بادہ کشوں کا جھرمٹ ہے گا شیشہ اور پیمانہ پر

قبلہ اور کعبہ پر گفتگو

کسی شخص نے کہا کہ حضرت اصل محاورہ فارسی کا ہے۔ اہل زبان نے ابر قبلہ کہا ہے۔

---

[1] دیکھو صفحہ ۴۵۔ [2] اصل قلابہ ہے۔ [3] بیچارہ کا مخفف ہے۔ اور ہم سے آشنا تھا۔ بعینہٖ ترجمہ فارسی کا محاورہ ہے کہ بیچارہ با ماہم آشنا بود۔ اردو میں ہمارا آشنا کہتے ہیں۔

ابر کعبہ نہیں کہا۔ میر صاحب نے کہا کہ ہاں **قبلہ** کا لفظ بھی آسکتا ہے مگر کعبہ سے ذرا مصرع کی ترکیب گرم ہو جاتی ہے۔ اور یہ سچ فرمایا۔ جنھیں زبان کا مزا ہے وہی اس لطف کو سمجھتے ہیں۔ خیال کے لفظ میں جو تصرّف میر صاحب نے فرمایا ہے عنقریب واضح ہوگا۔ اکثر الفاظ ہیں کہ اب مؤنث ہیں۔ میر صاحب نے انھیں مذکر باندھا ہے :۔

خیال میں تصرف تذکیر و تانیث

ملائے خاک میں کس کس طرح کے عالم یاں — نکل کے شہر سے ٹک سیر کر مزاروں کا

کل جس کی جاں کنی پہ سارا جہان ٹوٹا — آج اس مریض غم کا ہچکی میں جان ٹوٹا

احوال خوش انھوں کا ہم بزم ہیں جو تیرے — افسوس ہے کہ ہم نے واں کا نہ بار پایا

بعض جگہ مذکر کو مؤنث بھی کہہ جاتے ہیں ؎

کیا ظلم ہے اس خونیٔ عالم کی گلی میں — جب ہم گئے دو چار نئی دیکھیں مزاریں

مثنوی **شعلۂ عشق** میں کہتے ہیں ؎

خلق یکجا ہوئی کنارے پر — حشر برپا ہوئی کنارے پر

میر صاحب کی تصویر دیکھو

میر صاحب میانہ قد۔ لاغر اندام۔ گندمی رنگ تھے۔ ہر کام متانت اور آہستگی کے ساتھ بات بہت کم۔ وہ بھی آہستہ۔ آواز میں نرمی اور ملائمت۔ ضعیفی نے ان سب صفتوں کو اور بھی قوی کیا تھا کیونکہ نثو برس کی عمر بھی آخر ایک اثر رکھتی ہے۔ مرزا قتیل مشاعرہ سے آکر کسی دوست کو خط تحریر کرتے ہیں۔ اس میں جلسہ کے حالات بھی لکھتے ہیں[2] "حضرۃ میر صاحب باوصف خوش گوئی بدستور بودہ۔ تمام جسم مبارک ایشاں رعشہ داشت آواز ہم کس نمی شنید۔ مگر من و خدا کہ غزلہا خوب گفتہ بودند"

مرزا قتیل کی تحریر

عادات و اطوار نہایت سنجیدہ اور متین اور صلاحیت اور پرہیزگاری نے اسے عظمت دی تھی۔ ساتھ اس کے قناعت اور غیرت حد سے بڑھی ہوئی تھی۔ اسی کا نتیجہ ہے کہ اطاعت تو درکنار نوکری کے نام کی بھی برداشت نہ رکھتے تھے۔ لیکن زمانہ جس کی حکومت سے کوئی سر نہیں اُکسا سکتا۔ اس کا قانون بالکل اس کے برخلاف ہے۔

[1] ان کے علاوہ دیکھو صفحہ ۱۷۴۔ [2] دیکھو رقعات قتیل میں رقعہ نمبر ۹۳ +

نتیجہ یہ کہ فاقے کرتے تھے۔ دُکھ بھرتے تھے اور اپنی بد دماغی کے سایہ میں دُنیا و اہلِ دنیا سے بیزار گھر میں بیٹھے رہتے تھے۔ ان شکایتوں کے جو لوگوں میں چرچے تھے۔ وہ خود بھی اس سے واقف تھے۔ چنانچہ ایک مخمّس شہر آشوب کے مقطع میں کہتے ہیں ؎

حالت تو یہ کہ مجکو غموں سے نہیں فراغ　　دل سوزشِ درونی سے جلتاہے جوں چراغ
سینہ تمام چاک ہے سارا جگر ہے داغ　　ہے نام مجلسوں میں مرا میرِ بے دماغ
از بسکہ کم دماغی نے پایا ہے اشتہار

غیرتِ مزاج اور آزادیٔ طبع

باوجود اس کے اپنے سرمایۂ فصاحت کو دولتِ لازوال سمجھ کر امیر غریب کسی کی پروا نہ کرتے تھے بلکہ فقر کو دین کی نعمت تصوّر کرتے تھے۔ اور اسی عالم میں معرفتِ الٰہی پر دل لگاتے تھے۔ چنانچہ ان کی اس ثابت قدمی کا وصف کسی زبان سے نہیں ادا ہو سکتا کہ اپنی بے نیازی اور بے پروائی کے ساتھ دنیائے فانی کی مصیبتیں جھیلیں اور جو اپنی آن بان تھی اُسے لئے دُنیا سے چلے گئے۔ اور جس گردن کو خدا نے بلند پیدا کیا تھا۔ سیدھا خدا کے ہاں لے گئے۔ چند روزہ عیش کے لالچ سے یا مفلسی کے دُکھ سے اُسے دُنیا کے نااہلوں کے سامنے ہرگز نہ جھکایا ان کا کلام کہے دیتا ہے کہ دل کی کلی اور تیوری کی گرہ کبھی کھلی نہیں۔ باوجود اس کے

خود پسندی

اپنے ملکِ خیال کے ایک بلند نظر بادشاہ تھے اور جتنی دُنیا کی سختی زیادہ ہوتی۔ اسی قدر بلند نظری کا دماغ زیادہ بلند ہوتا تھا۔ سب تذکرے[1] نالاں ہیں کہ اگر یہ غرور اور بے دماغی فقط اُمرا کے ساتھ ہوتی تو معیوب نہ تھی۔ افسوس یہ ہے کہ اوروں کے کمال بھی اُنھیں دکھائی نہ دیتے تھے اور یہ امر ایسے شخص کے دامن پر نہایت بدنما دھبہ ہے جو کمال کے ساتھ صلاحیت اور نیکو کاری کا خلعت پہنے ہو۔ بزرگوں کی تحریری روایتیں اور تقریری حکایتیں ثابت کرتی ہیں کہ

[1] دیکھو تذکرہ حکیم قدرت اللہ قاسم مرحوم ۔

خواجہ حافظ شیرازی اور شیخ سعدی کی غزل پڑھی جائے تو وہ سر ہلانا گناہ سمجھتے تھے۔ کسی اور کی کیا حقیقت ہے۔ جو اشخاص اس زمانہ میں قدردانی کے خزانچی تھے۔ ان کے خیالات عالی اور حوصلے بڑے تھے۔ اس لئے یہ بے دماغیاں ان کے جوہر کمال پر زیور معلوم ہوتی ہیں۔ خوش نصیب تھے کہ آج کا زمانہ نہ دیکھا۔ میر قمرالدین منت[1]۔ دلی میں ایک شاعر گذرے ہیں کہ علوم رسمی کی قابلیت سے عماید دربار شاہی میں تھے وہ میر صاحب کے زمانہ میں مبتدی تھے۔ شعر کا شوق بہت تھا۔ اصلاح کے لئے اُردو کی غزل لے گئے۔ میر صاحب نے وطن پوچھا۔ انھوں نے سونی پت علاقہ پانی پت بتلایا۔ آپ نے فرمایا کہ سید صاحب۔ اُردوئے معلّٰی خاص دلی کی زبان ہے۔ آپ اس میں تکلیف نہ کیجئے۔ اپنی فارسی وارسی کہہ لیا کیجئے +

میر قمرالدین منت کی شاگردی

سعادت یار خاں رنگین۔ نواب طہماسپ بیگ خاں قلعدار شاہی کے بیٹے تھے ۱۴۔۱۵ برس کی عمر تھی۔ بڑی شان و شوکت سے گئے۔ اور غزل اصلاح کے لئے پیش کی۔ سن کر کہا کہ صاحب زادے! آپ خود امیر ہیں اور امیر زادے ہیں۔ نیزہ بازی تیر اندازی کی کثرت کیجئے۔ شہسواری کی مشق فرمائیے۔ شاعری دل خراشی و جگر سوزی کا کام ہے۔ آپ اس کے درپے نہ ہوں۔ جب انھوں نے بہت اصرار کیا تو فرمایا کہ آپ کی طبیعت اس فن کے مناسب نہیں۔ یہ آپ کو نہیں آنے کا۔ خواہ مخواہ میری اور اپنی اوقات ضائع کرنی کیا ضرور ہے۔ یہی معاملہ شیخ ناسخ کے ساتھ گذرا[2] +

سعادت یار خاں رنگین کی شاگردی

دلی میں میر صاحب نے ایک مثنوی کہی۔ اپنے تئیں اژدہا قرار دیا۔ اور شعرائے عصر میں سے کسی کو چوہا۔ کسی کو سانپ۔ کسی کو بچھو۔ کسی کو کھنکھجورا۔ وغیرہ وغیرہ ٹھیرایا۔ ساتھ اس کے ایک حکایت لکھی کہ دامن کوہ میں ایک خونخوار اژدہا رہتا تھا۔ جنگل کے حشرات الارض جمع ہو کر اس سے لڑنے لگے۔ جب سامنا ہوا تو اژدہے نے ایک ایسا دم بھرا کہ سب فنا ہو گئے۔ اس قصیدہ کا نام اجگر نامہ

اژدر نامہ کی کیفیت

[1] میر نظام الدین ممنون ان کے بیٹے بڑے صاحب کمال اور نامور شاعر تھے۔ [2] دیکھو صفحہ ۳۴۵ +

قرار دیا۔ اور مشاعرہ میں لاکر پڑھا۔ محمد امان نثار[1]۔ شاہ حاتم کے شاگردوں میں ایک مشاق موزوں طبع تھے۔ اُنھوں نے وہیں ایک گوشہ میں بیٹھ کر چند شعر کا قطعہ لکھا اور اسی وقت سر مشاعرہ پڑھا۔ چونکہ میر صاحب کی یہ بات کسی کو پسند نہ آئی تھی۔ اس لئے اس قطعہ پر خوب قہقہے اُڑے اور بڑی واہ واہ ہوئی۔ ور میر صاحب پر جو گذرنی تھی سو گذری۔ چنانچہ مقطع قطعہ مذکور کا یہ ہے :۔

حیدرِ کرار نے وہ زور بخشا ہے نثار ایک دم میں دو کروں اژدر کے کلّے چیر کر

پونے تین شاعر

لکھنؤ میں کسی نے پوچھا کہ کیوں حضرت آج کل شاعر کون کون ہے؟ کہا ایک تو سودا دوسرا یہ خاکسار ہے۔ اور کچھ تامل کر کے کہا۔ آدھے خواجہ میر درد۔ کوئی شخص بولا کہ حضرت! اور میر سوز صاحب؟ چیں بجبیں ہو کر کہا کہ میر سوز صاحب بھی شاعر ہیں؟ انھوں نے کہا کہ آخر استاد نواب آصف الدولہ کے ہیں۔ کہا کہ خیر یہ ہے تو پونے تین سہی۔ مگر شرفا میں ایسے تخلص ہم نے کبھی نہیں سُنے۔ میر صاحب کے سامنے مجال کس کی تھی جو کہے۔ کہ اِن بیچارے نے میر تخلص کیا تھا۔ وہ آپ نے چھین لیا۔ ناچار اب اُنھوں نے ایسا تخلص اختیار کیا کہ نہ آپ کو پسند آئے نہ آپ اُسے چھینیں۔ دیکھو صفحہ ۱۹۸+

شائقین کلام کے ساتھ بے دماغی

لکھنؤ کے چند عمائد و اراکین جمع ہو کر ایک دن آئے کہ میر صاحب سے ملاقات

[1] سعادت اللہ معمار کے بیٹے تھے اور میاں استاد معمار کی اولاد میں تھے جنھوں نے دلی کی جامع مسجد بنائی تھی نثار کے بزرگ اور وہ خود عمارت میں کمال رکھتے تھے۔ نثار شعر بھی خوب کہتے تھے۔ چنانچہ زمینِ سخن میں ریختہ کا دیوان ضخیم یادگار چھوڑا ہے۔ دلی آباد تھی تو اُمرائے شہر کے مکانات اپنے کمال سے مضبوط کرتے تھے۔ اور عزت سے گزران کرتے تھے۔ دلی تباہ ہوئی تو یہ بھی لکھنؤ چلے گئے۔ وہاں بھی فنِ آبائی سے عزت پائی اور ہمیشہ اُمرا و رؤسا کی مصاحبت میں زندگی بسر کی۔ شاہ حاتم کے نامی شاگردوں میں تھے۔ میاں رنگین نے بھی مجالس رنگین میں ان کا ذکر کیا ہے۔ صاحب دیوان ہیں مگر اب دیوان کم یاب ہے۔ میر صاحب کی اور اُن کی اکثر چھیڑ چھاڑ رہتی تھی +

کریں اور اشعار سُنیں۔ دروازہ پر آکر آواز دی۔ لونڈی یا ماما نکلی۔ حال پوچھ کر اندر گئی۔ ایک بوریا لاکر ڈیوڑھی میں بچھایا۔ انھیں بٹھایا۔ اور ایک پُرانا سا حقّہ تازہ کر کے سامنے رکھ گئی۔ میر صاحب اندر سے تشریف لائے۔ مزاج پرسی وغیرہ کے بعد اُنھوں نے فرمایش اشعار کی۔ میر صاحب نے اوّل کچھ ٹالا۔ پھر صاف جواب دیا کہ صاحب قبلہ میرے اشعار آپ کی سمجھ میں نہیں آنے کے۔ اگرچہ ناگوار ہوا مگر بنظر آداب و اخلاق اُنھوں نے اپنی نارسائی طبع کا اقرار کیا اور پھر درخواست کی اُنھوں نے پھر انکار کیا۔ آخر اُن لوگوں نے گراں خاطر ہو کر کہا کہ حضرت! انوری و خاقانی کا کلام سمجھتے ہیں۔ آپ کا ارشاد کیوں نہ سمجھیں گے۔ میر صاحب نے کہا کہ یہ درست ہے مگر اُن کی شرحیں مصطلحات اور فرہنگیں موجود ہیں۔ اور میرے کلام کے لئے فقط محاورۂ اہلِ اُردو ہے۔ یا جامع مسجد کی سیڑھیاں اور اس سے آپ محروم۔ یہ کہہ کر ایک شعر پڑھا؎

عشق بُرے ہی خیال پڑا ہے چین گیا آرام گیا　　دل کا جانا ٹھیر گیا ہے صبح گیا یا شام گیا

اور کہا کہ آپ بموجب اپنی کتابوں کے کہیں گے کہ خیال کی "ی" ظاہر کرو۔ پھر کہیں گے کہ "ی" تقطیع میں گرتی ہے۔ مگر یہاں اس کے سوا جواب نہیں کہ محاورہ یہی ہے۔

بے دماغی کا اتفاقی ثمرہ

جب نواب آصف الدولہ مرگئے سعادت علی خاں کا دور ہوا تو یہ دربار جانا چھوڑ چکے تھے۔ وہاں کسی نے طلب نہ کیا۔ ایک دن نواب کی سواری جاتی تھی۔ یہ تحسین کی مسجد پر سرراہ بیٹھے تھے۔ سواری سامنے آئی سب اُٹھ کھڑے ہوئے۔ میر صاحب اسی طرح بیٹھے رہے۔ سید انشا خواصی میں تھے۔ نواب نے پوچھا کہ انشا یہ کون شخص ہے؟ جس کی تمکنت نے اُسے اُٹھنے بھی نہ دیا۔ عرض کی جناب عالی یہ وہی گدائے متکبّر جس کا ذکر حضور میں اکثر آیا ہے گزارے کا وہ حال اور مزاج کا یہ عالم۔ آج بھی فاقہ ہی سے ہوگا۔ سعادت علی خاں نے خلعت بحالی اور ایک ہزار روپیہ دعوت بھجوایا۔ جب چوبدار لے کر گیا۔ میر صاحب نے

واپس کردیا اور کہا کہ مسجد میں بھجوائیے۔ یہ گنہگار اتنا محتاج نہیں۔ سعادت علی خاں جواب سُن کر متعجب ہوئے۔ مصاحبوں نے پھر سمجھایا۔ غرض نواب کے حکم سے سید انشا خلعت لے کر گئے اور اپنی طرز پر سمجھایا کہ نہ اپنے حال پر! بلکہ اپنے عیال پر رحم کیجئے اور بادشاہ وقت کا ہدیہ ہے۔ اسے قبول فرمائیے۔ میر صاحب نے کہا کہ صاحب! وہ اپنے ملک کے بادشاہ ہیں۔ میں اپنے ملک کا بادشاہ ہوں۔ کوئی ناواقف اس طرح پیش آتا تو مجھے شکایت نہ تھی۔ وہ مجھ سے واقف میرے حال سے واقف۔ اس پر اتنے دنوں کے بعد ایک دس روپے کے خدمتگار کے ہاتھ خلعت بھیجا۔ مجھے اپنا فقر و فاقہ قبول ہے مگر یہ ذلت نہیں اُٹھائی جاتی۔ سید انشا کی لسانی اور لفاظی کے سامنے کس کی بات پیش جا سکتی۔ میر صاحب نے قبول فرمایا اور دربار میں کبھی کبھی جانے لگے۔ نواب سعادت علی خاں مرحوم ان کی ایسی خاطر کرتے تھے کہ اپنے سامنے بیٹھنے کی اجازت دیتے تھے اور اپنا پیچوان پینے کو عنایت فرماتے تھے۔

نواب کس قدر تعظیم کرتے تھے

میر صاحب کو بہت تکلیف میں دیکھ کر لکھنؤ کے ایک نواب انھیں مع عیال اپنے گھر لے گئے اور محل سرا کے پاس ایک مکان رہنے کو دیا۔ کہ نشست کے مکان میں کھڑکیاں باغ کی طرف تھیں۔ مطلب اس سے یہی تھا کہ ہر طرح ان کی طبیعت خوش اور شگفتہ رہے۔ یہ جس دن وہاں آکر رہے کھڑکیاں بند پڑی تھیں۔ کئی برس گذر گئے اسی طرح بند پڑی رہیں کبھی کھول کر باغ کی طرف نہ دیکھا۔ ایک دن کوئی دوست آئے انھوں نے کہا کہ ادھر باغ ہے۔ آپ کھڑکیاں کھول کر کیوں نہیں بیٹھتے؟ میر صاحب بولے کہ کیا ادھر باغ بھی ہے؟ انھوں نے کہا کہ اسی لئے نواب آپ کو یہاں لائے ہیں کہ جی بہلتا رہے اور دل شگفتہ ہو۔ میر صاحب کے پھٹے پُرانے مسودے غزلوں کے پڑے تھے ان کی طرف اشارہ کرکے کہا کہ میں تو اس باغ کی فکر میں ایسا لگا ہوا ہوں کہ اس باغ کی خبر بھی نہیں۔ یہ کہہ کر چپکے ہو رہے۔ کیا محویت ہے! کئی برس گزر جائیں۔ پہلو میں باغ ہو۔ اور کھڑکی

معروفیتِ خیال اور عالم محویت

تک نہ کھولیں۔ خیر۔ ثمرہ اس کا یہ ہوا کہ اُنھوں نے دنیا کے باغ کی طرف نہ دیکھا۔ خدا نے اُن کے کلام کو وہ بہار دی کہ سالہا سال گذر گئے۔ آج تک لوگ ورقے اُلٹتے ہیں اور گلزار سے زیادہ خوش ہوتے ہیں +

شیخ ابراہیم ذوق کی روایت

اُستاد مرحوم ایک دیرینہ سال شخص کی زبانی بیان کرتے تھے کہ ایک دن میر صاحب کے پاس گئے۔ نکلتے جاڑے تھے۔ بہار کی آمد تھی۔ دیکھا کہ ٹہل رہے ہیں۔ چہرہ پر افسردگی کا عالم ہے۔ اور رہ رہ کر یہ مصرع پڑھتے ہیں ع

اب کے بھی دن بہار کے یوں ہی گذر گئے

یہ سلام کر کے بیٹھ گئے۔ تھوڑی دیر بعد اُٹھے۔ اور سلام کر کے چلے آئے۔ میر صاحب کو خبر بھی نہ ہوئی۔ خدا جانے دوسرے مصرع کے فکر میں تھے۔ یا اس مصرع کی کیفیت میں محو تھے +

قناعت اور بلند نظری

گورنر جنرل اور اکثر صاحبان عالی شان جب لکھنؤ میں جاتے تو اپنی قدر دانی سے یا اس سبب سے کہ ان کے میر منشی اپنے علو حوصلہ سے ایک صاحب کمال کی تقریب واجب سمجھتے تھے۔ میر صاحب کو ملاقات کے لئے بُلاتے۔ مگر یہ پہلو تہی کرتے اور کہتے کہ مجھ سے جو کوئی ملتا ہے تو یا مجھ فقیر کے خاندان کے خیال سے یا میرے کلام کے سبب سے ملتا ہے۔ صاحب کو خاندان سے غرض نہیں۔ میرا کلام سمجھتے نہیں۔ البتّہ کچھ انعام دیں گے۔ ایسی ملاقات سے ذلت کے سوا کیا حاصل +

ظرافت طبع

محلّہ کے بازار میں عطّار کی دُکان تھی۔ آپ بھی کبھی کبھی اس دُکان پر جا بیٹھتے تھے۔ اس کا نوجوان لڑکا بہت بناؤ سنگار کرتا رہتا تھا۔ میر صاحب کو بُرا معلوم ہوتا تھا۔ اس پر فرماتے ہیں ؎

کیفیتیں عطّار کے لونڈے میں بہت ہیں　　اس نسخہ کی کوئی نہ رہی ہم کو دوا یاد

کسی وقت طبیعت شگفتہ ہو گئی ہوگی۔ جو فرماتے ہیں ؎

میر کیا سادے ہیں بیمار ہوئے جس کے سبب　　اسی عطّار کے لڑکے سے دوا لیتے ہیں

بقا کے شعر سے توارد

اسی عہد میں بقاء اللہ خاں بقا[1] نے دو شعر کہے ؎

ان آنکھوں کا نت گریہ دستور ہے دوآبہ جہاں میں یہ مشہور ہے
سیلاب سے آنکھوں کے رہتے ہیں خرابے میں ٹکڑے جو میرے دل کے بستے ہیں دوآبے میں

میر صاحب نے خدا جانے سُن کر کہا یا توارد ہوا ؎

وے دن گئے کہ آنکھیں دریا سی بہتیاں تھیں سوکھا پڑا ہے اب تو مدّت سے یہ دوآبہ

اس پر بقا نے بگڑ کر یہ قطعہ کہا ؎

میر نے گر ترا مضمون دوآبے کا لیا اے بقا تو بھی دعا دے جو دعا دینی ہو
یا خدا میر کی آنکھوں کو دوآبہ کردے اور بینی کا یہ عالم ہو کہ تربینی ہو

لیکن میر صاحب نے اسی کو جہ میں ایک مضمون اور نکالا ہے کہ وہ سب سے الگ ہے ؎

میں راہِ عشق میں تو آگے ہی دو دِلا تھا پر پیچ پیش آیا قسمت سے یہ دوراہا

بقا نے اور مضامین بھی میر صاحب کے باب میں صرف کئے ہیں۔ ان میں سے ایک قطعہ ہے:۔

میر صاحب پھر اس سے کیا بہتر اس میں ہو وے جو نام شاعر کا
لے کے دیواں پکارتے پھرئے ہر گلی کوچہ کام شاعر کا
توبہ زاہد کی توبہ تلّی ہے چلتے بیٹھے تو شیخ پہ چلّی ہے
پگڑی اپنی سنبھالئے گا میرؔ اور بستی نہیں یہ دلّی ہے

کسی استاد کا شعر فارسی ہے:۔

ایک اور توارد

بہ گردِ تربتم امشب ہجوم بلبل بود مگر چراغ مزارم ز روغن گل بود

میر صاحب کے شعر میں بھی اس رنگ کا مضمون ہے مگر خوب بندھا ہے ؎

جائے روغن دیا کرے ہے عشق خون بلبل چراغ میں گل کے

[1] دیکھو بقا کا حال صفحہ ۱۵۴+

شیخ سعدی کا شعر ہے ؎

دوستاں منع کنندم کہ چرا دل بتو دادم — باید اوّل بہ تو گفتن کہ چنیں خوب چرائی — سعدی

چاہنے کا ہم پہ یہ خوباں جو دھرتے ہیں گناہ — ان سے بھی پوچھو کوئی تم اتنے کیوں پیارے ہوئے — میر صاحب

دست خواہم زد بدامانِ سکندر روز حشر — شوخ لیلیٰ زادہ ام را رشک مجنوں کردہ است — ناصر علی

دیکھ آئینہ کو یار ہوا محو ناز کا — خانہ خراب ہو جیو آئینہ ساز کا — میر صاحب

زندگی بر گردنم افتاد بیدل چارہ نیست — شاد باید زیستن ناشاد باید زیستن — بیدل

گوشہ گیری اپنے بس میں ہے نہ ہے آوارگی — کیا کریں اے میر صاحب بندگی بیچارگی — میر صاحب

محمد امان نثار میر صاحب کے شعروں پر ہمیشہ شعر کہا کرتے تھے۔ ان کا شعر ہے:۔

ہم آگے ہی سمجھے تھے وہ گھر کو سدھاریں گے — جس وقت گجر باجا ماتھا مرا ٹھنکا تھا — نثار

بھوؤں تئیں تم جس دن سج نکلے تھے اک چیرا[2] — اس دن ہی تمھیں دیکھے ماتھا مرا ٹھنکا تھا — میر صاحب

اکثر اشعار میں میر اور مرزا کے مضمون لڑ گئے ہیں۔ اس رتبہ کے شاعروں کو ن کہہ سکتا ہے کہ سرقہ کیا۔ دوسرے ایک عہد تھا۔ ایک شہر تھا۔ اسی وقت غل مچتا۔ دیکھو صفحہ ۲۷۲ و ۲۲۲ و ۲۴۳۔ ان دونوں بزرگوں کے کلام میں چشمکیں ہوتی تھیں۔ چنانچہ مرزا فرماتے ہیں :۔

نہ پڑھیو یہ غزل سودا تو ہرگز میر کے آگے — وہ ان طرزوں سے کیا واقف وہ یہ انداز کیا سمجھے

سودا تو اس غزل کو غزل در غزل ہی لکھ — ہونا ہے تجکو میر سے استاد کی طرف

میر صاحب فرماتے ہیں ؎

طرف ہونا مرا مشکل ہے میر اس شعر کے فن میں — یوں ہی سودا کبھی ہوتا ہے سو جاہل ہے کیا جانے

مرزا رفیع سودا ۔ خواجہ میر درد ۔ مرزا جان جاناں مظہر ۔ قائم ۔ یقین وغیرہ ان کے ہمعصر تھے ۔ اور مصحفی ۔ جرأت اور میر انشاء اللہ خاں نے آخر عہد میں ظہور کیا +

[1] دیکھو صفحہ ۲۱۸ ۔ [2] یعنی جس دن تم بھوؤں تک جھکا ہوا بانکا چیرا باندھ کر نکلے تھے ۔ اسی دن ہم سمجھ گئے کہ اب دلوں کی خیر نہیں +

میر صاحب کے بیٹے لکھنؤ میں ملے تھے۔ باپ کے برابر نہ تھے۔ مگر بدنصیبی میں فرزند خلف تھے۔ ایک پیر مرد بے پروا مستغنی المزاج تھے۔ میر عسکری نام۔ میر کلّو مشہور تھے عرش تخلص تھا۔ خود شاعر صاحب دیوان تھے۔ اور چند شاگرد بھی تھے۔ ایک شعر اُن کی غزل مشاعرہ کا لکھنؤ میں زبان زدِ خاص و عام ہے۔

آسیا کہتی ہے ہر صبح بآواز بلند رزق سے بھرتا ہے رزّاق دہن پتھر کے

میر صاحب کی غزلیں

برقع کو اُٹھا چہرہ سے وہ بُت اگر آوے اللہ کی قدرت کا تماشا نظر آوے

اے ناقۂ لیلیٰ دو قدم راہ غلط کر مجنوں زخود رفتہ کبھو راہ پر آوے

ٹک بعد مرے میرے طرفداروں کنے تو کوئی بھیجیو ظالم کہ تسلی تو کر آوے

کیا ظرف ہے گردون تنک حوصلہ کا جو

آشوب فغاں کے مرے عہدے سے بر آوے

ممکن نہیں آرام دے بیتابی جگر کی جب تک نہ پلک پر کوئی ٹکڑا نظر آوے

مت ممتحن باغ ہو اے غیرت گلزار گل کیا کہ جسے آگے ترے بات کر آوے

کھلنے میں ترے منہ کی کلی پھاڑے گریباں ہلنے میں ترے ہونٹوں کے گلبرگ تر آوے

ہم آپ سے جاتے رہے ہیں ذوق خبر میں اے جان بلب آمدہ رہ تا خبر آوے

کہتے ہیں ترے کوچہ سے میر آنے کہے ہے جب جانئے وہ خانہ خراب اپنے گھر آوے

ہے جی میں غزل در غزل اے طبع یہ کہئے

شاید کہ نظیری کے بھی عہدے سے بر آوے

جب نام ترا لیجئے تب چشم بھر آوے اس زندگی کرنے کو کہاں سے جگر آوے

تلوار کا بھی مارا خدا رکھے ہے ظالم یہ تو ہو کوئی گور غریباں میں در آوے

میخانہ وہ منظر ہے کہ ہر صبح جہاں شیخ دیوار پہ خورشید کا مستی سے سر آوے

کیا جانیں وہ مرغانِ گرفتارِ چمن کو
جن تک کہ بصد ناز نسیم سحر آوے

تو صبح قدم رنجہ کرے ٹک تو ہے ورنہ
کس واسطے عاشق کی شبِ غم بسر آوے

ہر سو سرِ تسلیم رکھے صید حرم ہیں
وہ صید فگن تیغ بکف تا کدھر آوے[1]

دیواروں سے سر مارتے پھرنے کا گیا وقت
اب تو ہی مگر آپ کبھو در سے در آوے

واعظ نہیں کیفیت میخانہ سے آگاہ
یک جرعہ بدل ورنہ یہ مندیل دھر آوے

صناع ہیں سب خوار ازانجملہ ہوں میں بھی
ہے عیب بڑا اس میں جسے کچھ ہنر آوے

اے وہ کہ تو بیٹھا ہے سرِ راہ پہ زنہار
کہیو جو کبھو میر بلاکش ادھر آوے

مت دشت محبت میں قدم رکھ کہ خضر کو
ہر گام پہ اس رہ میں سفر سے حذر آوے

کوفت سے جان اب پر آئی ہے
ہم نے کیا چوٹ دل پہ کھائی ہے

لکھتے رقعہ لکھے گئے دفتر
شوق نے بات کیا بڑھائی ہے

آرزو اس بلند بالا کی
کیا بلا میرے سر پہ لائی ہے

دیدنی ہے شکستگی دل کی
کیا عمارت غموں نے ڈھائی ہے

ہے تصنع کہ لعل ہیں وہ لب
یعنی اک بات سی بنائی ہے

دل سے نزدیک اور اتنا دور
کِسے اُس کو کچھ آشنائی ہے

بے ستوں کیا ہے کوہکن کیسا
عشق کی زور آزمائی ہے

جس مرض میں کہ جان جاتی ہے
دلبروں ہی کی وہ جدائی ہے

یاں ہوئے خاک سے برابر ہم
واں وہی ناز خود نمائی ہے

ایسا ہوتا ہے زندۂ جاوید
رفتۂ یار تھا جب آئی ہے

مرگ مجنوں سے عقل گم ہے میر
کیا دِوانے نے موت پائی ہے

[1] امیر خسرو کا شعر ہے ؎ ہمہ آہوانِ صحرا سرِ خود نہادہ برکف ✦ بامیدآں کہ روزے بہ شکار خواہی آمد

کہتے ہیں جاں بلب تھے ہم دوریٔ بتاں سے — آئے ہیں پھر کے یارو ابکے خدا کے یاں سے
تصویر کے سے طائر خاموش رہتے ہیں ہم — جی کچھ اُچٹ گیا ہے اب نالہ و فغاں سے
جب کوندتی ہے بجلی تب جانبِ گلستاں — رکھتی ہے چھیڑ میری خاشاکِ آشیاں سے
کیا خوبی اس کے مُنہ کی اے غنچے نقل کرئے — تُو تو نہ بول ظالم بُو آتی ہے دہاں سے
آنکھوں ہی میں رہے ہو دل سے نہیں گئے ہو — حیران ہوں یہ شوخی آئی تمھیں کہاں سے
سبزانِ باغ سارے دیکھے ہوئے ہیں اپنے — دلچسپ کاہے کو ہیں اس بیوفا جواں سے
کی شُست و شوبدن کی جس دن بہت سُئی نے — دھوئے ہیں ہاتھ میں نے اس دن سے اپنی جاں سے
خاموشی ہی میں ہم نے دیکھی ہے مصلحت اب — ہر ایک سے حال دل کا مدت کہا زباں سے

اتنی بھی بدمزاجی ہر لحظہ میرؔ تم کو
اُلجھاؤ ہے زمیں سے جھگڑا ہے آسماں سے

اے نکیلے یہ تھی کہاں کی ادا؟ — کھُب گئی تیری جی میں بانکی ادا
جادو کرتے ہیں اک نگاہ کے بیچ — ہائے رے چشم دلبراں کی ادا
بات کہنے میں گالیاں دے ہے — سُنتے ہو میرے بدزباں کی ادا
دل چلے جائے ہیں خرام کے ساتھ — دیکھی چلنے میں ان بتاں کی ادا

خاک میں مل کے میرؔ ہم سمجھے
بے ادائی تھی آسماں کی ادا

سخن مشتاق ہے عالم ہمارا — بہت عالم کرے گا غم ہمارا
پڑھیں گے شعر رو رو لوگ بیٹھے — رہے گا دیر تک ماتم ہمارا
نہیں ہے مرجع آدم اگر خاک — کدھر جاتا ہے قدِ خم ہمارا
زمین و آسماں زیر و زبر ہیں — نہیں کم حشر سے اودھم ہمارا

ـــــــــــــــــ

[1] میر سوز مرحوم نے بھی یہ مضمون خوب باندھا ہے ؎

دعویٰ کیا تھا گل نے اس رُخ سے رنگ و بو کا — ماریں صبا نے دھولیں شبنم نے مُنہ میں تھوکا

کسو کے بال برہم دیکھتے میر
ہوا ہے کام دل برہم ہمارا

جان اپنا جو ہم نے مارا تھا	کچھ ہمارا اسی میں وارا تھا
کون لیتا تھا نام مجنوں کا	جب کہ عہدِ جنوں ہمارا تھا
کوہ و فرہاد سے کہیں آگے	سر مرا اور سنگ خارا تھا
ہم تو تھے محو دوستی اس کے	گو کہ دشمن جہان ہمارا تھا
لطف سے پوچھتا تھا ہر کوئی	جب تلک لطف کچھ تمھارا تھا
آستاں کی کسو کے خاک ہوا	آسماں کا بھی کیا ستارہ تھا
پاؤں چھاتی پہ میرے رکھ چلنا	یاں کبھو اس کا یوں گزارہ تھا
موسم گل میں ہم نہ چھوٹے حیف	گشت تھا دید تھا نظارہ تھا
اس کے ابرو جو ٹک جھکے ایدھر	قتل کا تیغ سے اشارہ تھا

عشق بازی میں کیا موئے ہیں میر
آگے ہی جی اُنھوں نے ہارا تھا

آیا ہے ابر جب کا قبلہ سے تیرا تیرا	مستی کے ذوق میں ہیں آنکھیں بہت سی خیرا
خجلت سے ان لبوں کی پانی ہو یہ چلے ہیں	قند و نبات کا بھی نکلا ہے خوب شیرا
مجنوں نے حوصلے سے دیوانگی نہیں کی	جا گر سے اپنی جانا اپنا نہیں دتیرا
اس راہ زن سے مل کر دل کیونکہ کھو نہ بیٹھیں	انداز و ناز اُچکے غمزہ اُٹھائی گیرا
کیا کم ہے ہولناکی صحرائے عاشقی کی	شیروں کو اس جگہ پر ہوتا ہے قشعریرا
آئینہ کو بھی دیکھو پر ٹک ادھر بھی دیکھو	حیران چشم عاشق دکھے ہے جیسے ہیرا
نیت پر سب بنا ہے یاں مسجد اک بڑی تھی	پیرِ مغاں موا سو اس کا بنا خطیرا
ہمراہ خوں تلک ہو ٹک پاؤں کے چھونے سے	ایسا گناہ مجھ سے وہ کیا ہوا کبیرا

لہ اُس زمانہ میں اکثر اُستاد جان کو مذکر باندھتے تھے +

غیرت سے میر صاحب سب جذب ہو گئے تھے
نکلا نہ بوند لوہو سینہ جو اُن کا چیرا

مت صبح و شام تو پےٴ ایذائے تیسر ہو — ایسا نہ ہو کہ کام ہی اُس کا اخیر ہو
ہو کوئی بادشاہ۔ کوئی یاں وزیر ہو — اپنی بلا سے بیٹھ رہے جب فقیر ہو
جنت کی منت اُن کے دماغوں سے کب اُٹھے — خاک رہ اُس کی جن کے کفن کا عبیر ہو
کیا لو[^1] آپ و تاپ سے ہو بیٹھیں کارِ عشق — سوکھے جگر کا خون تو رواں جوئے شیر ہو
چھاتی قفس میں داغ سے ہو کیوں نہ رشکِ باغ — جوشِ بہار تھا کہ ہم آئے اسیر ہو
یاں برگ گل اُڑاتے ہیں پرکالۂ جگر — جا عندلیب تو نہ مری ہمصفیر ہو
اس کے خیال خط میں کسے یاں دماغِ حرف — کرتی ہے بے مزہ جو قلم کی صریر ہو
زنہار اپنی آنکھ میں آتا نہیں وہ صید — پھوٹا دوسار جس کے جگر کا نہ تیر ہو
ہوتے ہیں میکدے کے جواں شیخ جی بُرے — پھر درگذر یہ کرتے نہیں گو کہ پیر ہو
کس طرح آہ خاک مذلت سے میں اُٹھوں — افتادہ تر جو مجھ سے مرا دستگیر ہو
حد سے زیادہ جور و ستم خوشنما نہیں — ایسا سلوک کر کہ تدارک پذیر ہو
دم بھر نہ ٹھیرے دل میں نہ آنکھوں میں یک پل — اتنے سے قد پہ تم بھی قیامت شریر ہو
ایسا ہی اس کے گھر کو بھی آباد دیکھیو — جس خان و ماں خراب کا یہ دل مشیر ہو
تسکین دل کے واسطے ہر کم بغل کے پاس — انصاف کریئے کب تئیں مخلص فقیر ہو

اک وقت خاص حق میں مرے کچھ دعا کرو
تم بھی تو میر صاحب قبلہ فقیر ہو

دلِ پُر خوں کی اک گلابی سے — عمر بھر ہم رہے شرابی سے
جی ڈھہا جائے ہے سحر سے آج — رات گذرے گی کس خرابی سے
کھلنا کم کم کلی نے سیکھا ہے — اس کی آنکھوں کی نیم خوابی سے

[^1]: یہ اور کئی شعر مندرجہ ان کے دیوانوں میں دیکھے اسی طرح لکھے تھے اس لئے حرف بہ حرف لکھے گئے +

برقع اُٹھتے ہی چاند سا نکلا — داغ ہوں اس کی بے حجابی سے

کام تھے عشق میں بہت پر میر
ہم ہی فارغ ہوئے شتابی سے

دل عجب شہر تھا خیالوں کا — لوٹا مارا ہے حسن والوں کا

جی کو جنجال دل کو ہے اُلجھاؤ — یار کے حلقہ حلقہ بالوں کا

موئے دلبر سے مشکبو ہے نسیم — حال خوش اس کے خستہ حالوں کا

نہ کہا کچھ نہ آ پھرا نہ ملا — کیا جواب اُن مرے سوالوں کا

دم نہ لے اُس کی زلفوں کا مارا
میر کاٹا جئے نہ کالوں کا

ہے غزل میر یہ شفائی کی — ہم نے بھی طبع آزمائی کی

اس کے ایفائے عہد تک نہ جیے — عمر نے ہم سے بیوفائی کی

وصل کے دن کی آرزو ہی رہی — شب نہ آخر ہوئی جدائی کی

اسی تقریب اس گلی میں رہے — منتیں ہیں شکستہ پائی کی

دل میں اس شوخ کے نہ کی تاثیر — آہ نے آہ نارسائی کی

کاسۂ چشم لے کے جوں نرگس[1] — ہم نے دیدار کی گدائی کی

زور و زر کچھ نہ تھا تو بارے میر
کس بھروسے سے آشنائی کی

ہو گئی شہر شہر رُسوائی — اے مری موت تو بھلی آئی

یک بیاباں برنگ صورت جرس — مجھ پہ ہے بیکسی و تنہائی

نہ کھنچے تجھ سے ایک جا نقاش — اس کی تصویر وہ ہے ہرجائی

---

[1] آتش نے بھی خوب کہا ہے۔ — آنکھیں نہیں ہیں چہرے پہ تیرے فقیر کے
دو ٹھیکرے ہیں بھیک کے دیدار کے لئے

سر رکھوں اس کے پاؤں پر لیکن دست قدرت یہ میں کہاں پائی

میرؔ جب سے گیا ہے دل تب سے
میں تو کچھ ہو گیا ہوں سودائی

اہلی شیرازی کے شعر پر مصرع لگا کر مثلث کا ایجاد اپنی زبان میں دکھاتے ہیں ؎

کل تک تو فریبندہ ملاقات تھی پہلی
امروز یقیں شد کہ نداری سر اہلی بیچارہ ز لطف تو بدل داشت گماں ہا

کیا کہوں میں عاشق و معشوق کا راز و نیاز
ناقہ را میراند لیلی سوئے خلوت گاہ ناز ساربان در رہ حدی میخواند و مجنوں می گریست

ایک مثلث سید انشا کا یاد آ گیا کیا خوب مصرع لگایا ہے ؎

اگرچہ سیکڑوں اس جا پہ تھے کھڑے زن و مرد
نشد قتیل ولیکن کہ یک کس از سر درد سرے بہ نعش من خستہ جاں بجنباند

مربع پانچویں دیوان میں سے

جو اے قاصد وہ پوچھے میرؔ بھی ایدھر کو چلتا تھا تو کہیو جب چلا تھا میں تب اس کا دم نکلتا تھا
سما افسوس۔ بیتابی سے تھا کل قتل میں میرے تڑپتا تھا ادھر میں یار اودھر ہاتھ ملتا تھا

مربع فارسی پر

سکندر ہے نہ دارا ہے نہ کسریٰ ہے نہ قیصر ہے یہ بیت المال ملک بیوفا بے وارثا گھر ہے
نہ در جانم ہوا باقی نہ اندر دل ہوس ماندہ بیا ساقی کہ ایں ویرانہ از بسیار کس ماندہ

خاتمہ

رات آخر ہو گئی مگر جلسہ جما ہوا ہے اور وہ سما بندھ رہا ہے کہ ہر دل سے صدا آتی ہے

ع یا الٰہی تا قیامت بر نیاید آفتاب

اس مشاعرہ کے شعراء کا کچھ شمار نہیں۔ خدا جانے یہ کتنے ہیں۔ اور آسمان پر تارے کتنے ہیں۔ سُننے والے ایسے مشتاق کہ شمع پر شمع پانی ہوتی ہے مگران کے شوق کا شعلہ دھیما نہیں ہوتا یہی آواز چلی آتی ہے ؎

ساقیا لگ رہا ہے چل چلاؤ
جب تلک بس چل سکے ساغر چلے

آزاد بھولتے ہو؟ دلوں کی نبض کس نے پائی ہے؟ جانتے نہیں کہ دفعتاً اُکتا جاتے ہیں۔ پھر ایسے گھبرا جاتے ہیں کہ ہاتھوں سے نکل جاتے ہیں۔ بس اب باقی داستان فرداشب۔ ایلو صبح ہوگئی طول کلام کو ملتوی کرو ؎

عزیزو مست سخن ہو دیا کہ سوتے ہو
اُٹھو اُٹھو کہ بس اب سر پہ آفتاب آیا

چوتھا دَور

تمہید

قہقہوں کی آوازیں آتی ہیں۔ دیکھنا اہل مشاعرہ آن پہنچے۔ یہ کچھ اور لوگ ہیں۔ ع ان کا آنا غضب کا آنا ہے

ایسے زندہ دل اور شوخ طبع ہوں گے کہ جن کی شوخی اور طرّاری طبع بار متانت سے ذرا نہ دبے گی۔ اتنا ہنسیں اور ہنسائیں گے کہ مُنہ تھک جائیں گے۔ مگر نہ ترقی کے قدم آگے بڑھائیں گے۔ نہ اگلی عمارتوں کو بلند اُٹھائیں گے۔ انھیں کوٹھوں پر کودتے پھاندتے پھریں گے۔ ایک مکان کو دوسرے مکان سے سجائیں گے۔ اور ہر شے کو رنگ بدل بدل کر دکھائیں گے۔ وہی پھول عطر میں بسائیں گے۔ کبھی ہار بنائیں گے کبھی طرّے سجائیں گے کبھی انھیں کو پھولوں کی گیندیں بنالائیں گے اور وہ گلبازی کریں گے کہ ہولی کے جلسے گرد ہو جائیں گے۔ ان خوش نصیبوں کو زمانہ بھی اچھا ملے گا۔ ایسے قدردان ہاتھ آئیں گے کہ ایک ایک پھول ان کا چمن زعفران کے مول بکے گا۔

اس دور میں میاں رنگین سب سے نئے گلدستے بنا کر لائے اور اہل جلسہ کے سامنے سجائے یعنی ریختہ میں سے ریختی نکالی۔ ہم ضرور کہتے کہ ہندوستان کی عاشقانہ شاعری نے اپنے اصل پر رجوع کی۔ لیکن چونکہ پہلے کلام کی بنیاد اصلیت پر تھی۔ اور اس کی بنیاد فقط یاروں کے ہنسنے ہنسانے پر ہے۔ اس لئے سوائے تمسخر کے اور کچھ نہیں کہہ سکتے۔ بلکہ اگر لکھنؤ کے قیصر باغ اور وہاں کے معاملات کی تخم ریزی دیوان رنگین اور دیوان سید انشا کو کہیں تو کچھ بدگمانی یا تہمت میں داخل نہیں۔ اگرچہ اصل ایجاد میاں رنگین کا ہے مگر سید انشا نے ان سے کچھ زیادہ ہی

سگھڑاپا دکھایا ہے ؂

ان صاحب کمالوں کے عہد میں صدہا باتیں. بزرگوں کی متروک ہوگئیں پھر بھی جس قدر باقی ہیں وہ اشعار مفصلۂ ذیل سے معلوم ہوں گی۔ البتہ شیخ مصحفی کے بعض الفاظ سے معلوم ہوتا ہے کہ انھیں بزرگوں کی میراث سے محبت زیادہ ہے۔ سید انشا اور جرأت نے ان میں سے بہت کچھ چھوڑ دیا۔ مگر نت۔ ٹک۔ انکھڑیاں۔ زور (یعنی بہت) بے تکلف بولتے ہیں۔ اور۔ وا چھڑے۔ بھلا رے۔ جھگڑا۔ اجی سید موصوف کا انداز خاص ہے۔ ہاں اُنھوں نے کلام کا انداز ایسا رکھا ہے کہ جو چاہتے ہیں سو کہہ جاتے ہیں۔ نہیں معلوم ہوتا کہ ان کا روزمرہ یہی ہے یا مسخرہ پن کرتے ہیں۔ بہر حال چند شعر لکھتا ہوں جن سے معلوم ہو کہ اس وقت تک کیا کیا قدیمی محاورے باقی تھے جو اب متروک ہیں۔ اور باقی الفاظ ان بزرگوں کی غزلوں سے معلوم ہوں گے جو ان کے حال کے بعد لکھی گئی ہیں۔ چنانچہ شیخ مصحفی کہتے ہیں:

ٹک ہم کو بھی خاک سے اُٹھا لے ۔۔۔ او دامن اُٹھا کے جانے والے

تربت پہ میری پائے حنائی نہ رکھ میاں ۔۔۔ کر رحم اب تو قبر میں آتش فشاں نہ ہو

شب ہجر صحرائے ظلمات نکلی ۔۔۔ میں جب آنکھ کھولی بہت رات نکلی

تو اے مصحفی اب تو گرم سخن ہو ۔۔۔ شب آئیں دراز اور بہت رات نکلی

دل مرے سوگ میں مت کر تو برادر میلا ۔۔۔ یاں سمجھ جاتے ہیں ہوتا ہے جو تیور میلا

ہے لطف سیر شب ماہ ان حسینوں میں ۔۔۔ جنھوں کے رہتی ہے افشاں چنی جبینوں میں

انھوں کو صاحب خرمن سبھی سمجھتے ہیں
جو مصحفی کے ہیں کہلاتے خوشہ چینوں میں

باغباں ہے مجھے کیا کام ترے گلشن سے ۔۔۔ پھرتے پھرتے کبھی ایدھر بھی میں آجاتا ہوں

ہوں تو گھڑی پکڑی کی شکل حباب ۔۔۔ لیکن آب و ہوا کے ہاتھ میں ہوں

تم جو پوچھو ہو سدا حال زیبا ہم سے ۔۔۔ یہ ہنسی خوب نہیں اے گل خنداں ہم سے

حیراں سی جو نگاہیں رہ جاتیاں ہیں تیری　　　کیا آنکھیں آرسی سے شرماتیاں ہیں تیری

اُس گُل کی باغ میں جو حنا نے چلائی بات[1]　　　غنچے نے مسکرا کے کہا ہم نے پائی بات

شہرت بزیرِ آسماں رکھتی تھی حاتم کی سخا　　　اس کا نہیں ملا نشاں کیا جانے وہ کیدھر گئی

تن کے نشیمن سے سفر دشوار اُسے آیا نظر　　　سو بار جان مضطرب ایدھر گئی اُودھر گئی

ناسور داغ سینہ کو مار الحیات اپنا سمجھ　　　تن خاک کا پھر ڈھیر ہے کُھلا جو یہ انگر گئی

گویا زمین کربلا تھی قتل گاہِ عاشقاں　　　جو بدلی آئی اس طرف یاراں چشم تر گئی

بکھیر دے جو وہ زلفوں کو اپنے مکھڑے پر　　　تو مارے شرم کے آئی ہوئی گھٹا پھر جائے

مصحفی نظم غزل میں ہے یہ ان کا مقدور

جو جو طرزیں کہ ہم ایجاد کیا کرتے ہیں

نرگس نے گُل کی دید کو آنکھیں جو کھولیاں　　　کچھ جی میں جو سمجھ گئیں کلیاں نہ بولیاں

دہشت نے حیلہ جو ہی رکھا نت مسیح کو ہ　　　آخر نہ پٹیاں مرے زخموں کی کھولیاں

میں ہی جانوں ہوں جو کچھ مجھ سے ادائیں کی ہیں　　　تیری آنکھوں نے جفائیں سی جفائیں کی ہیں!

کیا روٹھ گیا مجھ سے مرا یار الٰہی　　　کیوں آنکھ ملاتا وہ نہیں کچھ تو سبب ہے

نہ ترے حُسن کے دن اور نہ بہاریں وہ رہیں　　　نہ وہ جالی نہ وہ محرم نہ ازاریں وہ رہیں

نہ نہ کھوئے کبھی گھر آ کے مرے حوریوں نے　　　جب تلک بیٹھی رہیں رونٹ ہی مارے وہ رہیں

تیرے بن ہم نے نہ دیکھا کبھی پریوں کی طرف　　　گو خط و خال کو نت اپنے سنوارے وہ رہیں

دم شماری ہے اب انجام ریاکاری شیخ　　　نہ وہ تسبیح کے دانے نہ شماریں وہ رہیں

مل گئے خاک میں کیا کیا نہ دفینان بزرگ

نہ وہ لوحیں نہ مجر نہ مزاریں وہ رہیں

اے خوشا حال انھوں کا کہ جو کوچہ میں ترے　　　خاک پنڈے پہ ملے بیٹھے ہیں آسن مارے

اور سید انشاء اللہ خاں کہتے ہیں :۔

---

[1] بات چلائی دہی امروہہ والی بات ہے +

دشتِ جنوں میں اے وائے ویلا سونے نہ پائے ٹک پاؤں پھیلا
انگھڑیاں سرخ ہو گئیں جب سے دیکھ لیجے کمال بوسہ کا
ٹک آنکھ ملاتے ہی کیا کام ہمارا تسپر یہ غضب پوچھتے ہو نام ہمارا
ایک چھوڑا نہ زندہ جاں تو نے ٹھور رکھا سبھوں کو ہاں تو نے
بھلا رے یہ دماغ سمجھا ہے آپ کو شاخ زعفراں تو نے
جو ہاتھ اپنے سبزہ کا گھوڑا لگا تو سلفے کا اور اُس پہ کوڑا لگا
اجی چشم بد دور نام خدا تمھیں کیا بھلا سُرخ جوڑا لگا
چہرہ مریض غم کا ترے زرد ہے سو ہے عیسےٰ کئے دوا نہ رہے درد ہے سو ہے
نکل کے وادیٔ وحشت سے دیکھ اے مجنوں کہ زور دھوم سے آتا ہے ناقۂ لیلا
ہے نام خدا وا چھڑے کچھ زور تماشا یہ آپ کی رنگت
گات ایسی غضب قہر پھبن اور جھمکڑا اللہ کی قدرت

اور جرأت کہتے ہیں

نالۂ موزوں سے مصرع آہ کا چسپاں ہوا زور یہ مطلع مرا سرد فترِ دیواں ہوا
جنھوں کے نامے پہنچتے ہیں یار تک دن رات اُنھیں کا کاش کہ جرأت بھی نامہ بر ہوتا
وہ ایک تو ہے بھبھوکا سا تسپہ اے جُرأت اکڑ تکڑ ہے قیامت ہے بانکپن کی سی
دیکھنا ٹک یاد ہیں ہم کو بھی کیا عیاریاں تیری خاطر کرتے ہیں غیروں کی خاطر داریاں
بہہ گیا جوں شمع تن سارا اگر اچھا ہوا نت کے رونے سے چھُٹی اے چشم تر اچھا ہوا
سبھی انعام نت پاتے ہیں اے شیریں دہن تجھ سے کبھی تو ایک بوسہ سے ہمارا منہ بھی میٹھا کر

خبر اس کو نہیں کرتا کوئی کہ میاں! مفت ہے مرتا کوئی
کسی گل کے لئے تم آپ گل ہو گل نہ کھاؤ جی ابھی ننھا کلیجا ہے۔ نہ داغ اس کو لگاؤ جی
آتشِ عشق کو سینہ میں عبث بھڑکایا اب کھو کھینچوں ہوں میں آہِ شرر بار کہ تو

کل واقف کار اپنے سے کہتا تھا وہ یہ بات
جُرأت کے جو گھر رات کو مہمان گئے ہم

کیا جانئے کمبخت نے کیا ہم پہ کیا سحر
جو بات نہ تھی اپنے ماننے کی مان گئے ہم

تم اور کسی شہر چلے ہو تو بس اپنے
عالم ہی وہ نظروں میں نہیں سارے نگر کا

باہم ہی نہیں ہیں یا نہیں غیر
اودھر کو جو تو نظر کرے گا

ہر دم جو اپنے سامنے وہ گلعذار ہے
جیدھر کو آنکھ اُٹھاتے ہیں باغ وبہار ہے

کھینچ کر آہ جو میں ہاتھ جگر پر رکھا
دامن اُس نے بھی اُٹھا دیدۂ تر پر رکھا

تھی مری شکل کل اُس بن یہ گلستاں کے بیچ
جیسے بیٹھے خفقانی کوئی زنداں کے بیچ

لے چلے غیر کو گھر اپنے بلا ئیں سے تم
انکھڑیوں سے کبھی یوں ہم کو اشارہ نہ ہوا

جس پہ نت تیغ کھچے اور سدا جور رہے
تو ہی انصاف کر اب کیونکہ نہ وہ ٹھور رہے

جرأت یہ غزل سُن کے بہ تغییر قوافی
تکلیف سخن گوئی کی دی پھیر کسی نے

اس غزل میں ایک غزل تو اور جُرأت پڑھ سنا
زور ہی لذت ہمیں تو دی ترے اشعار نے

یار کا آستان پایا ہے
زور دل نے مکان پایا ہے

شیخ قلندر بخش جُرأت

جرأت تخلص شیخ قلندر بخش مشہور۔ اصلی نام یحییٰ امان تھا۔ اکبرآبادی مشہور ہیں۔ مگر باپ ان کے حافظ امان۔ خاص دہلی[1] کے رہنے والے تھے۔ ہر تذکرہ میں لکھا ہے کہ ان کے خاندان کا سلسلہ رائے امان محمد شاہی سے ملتا ہے اور امان کا لفظ اکبری زمانہ سے ان کے خاندان کے ناموں کا خلعت چلا آتا ہے۔ حکیم قدرت اللہ خاں قاسم فرماتے ہیں کہ ان کے بزرگ دربار شاہی میں دربانی کی خدمت رکھتے تھے۔ لطیفہ۔ بزرگوں کا قول سچ ہے کہ اگر کسی کے والدین اور بزرگوں

[1] رائے مان کا کوچہ دلی کے چاندنی چوک میں۔ انھیں کے نام سے مشہور ہوا +

کی لیاقت اور حیثیت دریافت کرنی ہو تو اُس کے نام کو دیکھ لو۔ یعنی جیسی لیاقت ہوگی ویسا ہی نام رکھیں گے۔ حقیقت حال یہ ہے کہ رائے امان محمد شاہی عہد میں دربان تھے۔ اگرچہ اس زمانہ کے دربان بھی آجکل کے بڑے بڑے عہدہ داروں سے بہتر ہوتے تھے مگر زیادہ تر وجہ شہرت کی یہ ہوئی کہ جس وقت نادرشاہ نے قتل عام کا حکم دیا تو بعض اشخاص نے ننگ و ناموس کا پاس کرکے جان کا خیال نہ کیا اور اپنے اپنے گھر کا بندوبست رکھا۔ نادری سپاہی جب وہاں پہنچے تو تلوار کا تلوار سے جواب دیا۔ اس میں طرفین سے جانیں ضائع ہوئیں۔ امن کے بعد جب نادری مقتولوں کی اور ان کے اسباب قتل کی تحقیقات ہوئی تو وہ لوگ پکڑے آئے۔ ان میں رائے امان بھی تھا۔ چنانچہ شال پٹکوں سے ان کے گلے گھونٹے اور مار ڈالا[1]+

جُرأت میاں جعفر علی حسرت[2] کے شاگرد تھے۔ علاوہ فنِ شاعری کے نجوم میں ماہر تھے اور موسیقی کا بھی شوق رکھتے تھے۔ چنانچہ ستار خوب بجاتے تھے۔ اوّل نواب محبّت خاں خلف حافظ رحمت خاں نواب بریلی کی سرکار میں نوکر ہوئے۔ میر انشاءاللہ خاں کی اور ان کی صحبتیں بہت گرم رہتی تھیں۔ چنانچہ حسب حال یہ شعر کہا تھا ؎

بسکہ گلچیں تھے سدا عشق کے ہم بُستاں کے
ہوئے نوکر بھی تو نواب محبت خاں کے

سنہ ۱۲۱۵ھ میں لکھنؤ پہنچے اور مرزا سلیمان شکوہ کی سرکار میں ملازم ہوئے۔ ایک دفعہ تنخواہ کو دیر ہوئی۔ حسن طلب میں ایک غزل کا مقطع لکھا ؎

جرأت اب بند ہے تنخواہ تو کہتے ہیں یہ ہم
کہ خدا دیوے نہ جبتک تو سلیماں کب دے

فارسی کی ضرب المثل ہے۔ تا خدا نہ دہد سلیماں کے دہد۔ میاں جرأت کے حال میں بلکہ

---

[1] دیکھو نادرنامہ عبدالکریم + [2] حسرت بھی نامی شاعر تھے مگر اصلی پیشہ عطاری تھا۔ دیوان موجود ہے۔ پھیکے شربت کا مزا آتا ہے۔ مرزا رفیع نے انھیں کی شان میں غزل کہی ہے جس کا مطلع ہے ؎

بغداد کا آندھی سے اُڑا ڈھیر ہوا پر
ہر مرغ اُسے کھاکے ہوا اسیر ہوا پر

اسی طرح ہجو کی آندھی میں ساری دکان کا خاکہ اُڑا دیا ہے +

کیونکر آنکھوں سے معذور ہو گئے

ساری کتاب میں افسوس کی بات ہے تو یہ ہے کہ عین جوانی میں آنکھوں سے معذور ہو گئے۔ بعض کہتے ہیں کہ یہ حادثہ چیچک سے ہوا۔ مگر استاد مرحوم نے ایک دن فرمایا کہ نیکی بدی زمانہ کی دو آنکھیں ہیں۔ نیکی کی آنکھ نے اُن کے کمال کو بڑی قدردانی سے دیکھا۔ بدی کی آنکھ نہ دیکھ سکی اور ایک بدنما داغ اُن کے دامن پر دکھایا مشہور کرتے ہیں کہ پہلے وہ اصلی اندھے نہ تھے بعض ضرورتوں سے شوخیٔ عمر کا مقتضا ہے۔ خود اندھے بنے۔ رفتہ رفتہ اندھے ہو گئے +

تفصیل اجمال بہ عبرت احوال

بزرگوں کا قول ہے کہ شرافت و نجابت غریبی پر عاشق ہے۔ دولت اور نجابت آپس میں سوکن ہے۔ یہ حق ہے اور سبب اس کا یہ ہے کہ شرافت کے اصول و آئین غریبوں ہی سے خوب نبھتے ہیں۔ امارت آئی قیامت آئی۔ دولت آئی شامت آئی۔ میاں جرأت کی خوش مزاجی۔ لطیفہ گوئی۔ مسخراپن کی حد سے گزری ہوئی تھی اور ہندوستان کے امیروں کو نہ اس سے ضروری کوئی کام۔ نہ اس سے زیادہ کوئی نعمت ہے۔ کہتے ہیں مرزا قتیل۔ سید انشا کا۔ اور اُن کا یہ حال تھا کہ گھر میں رہنے نہ پاتے تھے۔ آج ایک امیر کے ہاں ہیں۔ دوسرے دن دوسرے امیر آئے۔ سوار کیا اور ساتھ لے گئے ۴۔۵ دن وہاں رہے۔ کوئی اور نواب آئے۔ وہاں سے وہ لے گئے۔ جہاں جائیں۔ آرام و آسایش سے زیادہ عیش کے سامان موجود۔ رات دن قہقہے اور چہچہے۔ ایک بیگم صاحب نے گھر میں ان کے چٹکلے اور نقلیں سُنیں۔ بہت خوش ہوئیں۔ اور نواب صاحب سے کہا کہ ہم بھی باتیں سُنیں گے۔ گھر میں لاکر کھانا کھلاؤ۔ پردے یا چلمنیں چھٹ گئیں۔ اندر وہ بیٹھیں باہر یہ بیٹھے۔ چند روز کے بعد خاص خاص بیبیوں کا برائے نام پردہ رہا۔ باقی گھروالے سامنے پھرنے لگے۔ رفتہ رفتہ یگانگی کی یہ نوبت ہوئی کہ آپ بھی باتیں کرنے لگیں۔ گھر میں کوئی دادا۔ نانا۔ کوئی ماموں چچا کہتا۔ شیخ صاحب کی آنکھیں دُکھنے آئیں۔ چند روز ضعف بصر کا بہانہ کرکے ظاہر کیا کہ آنکھیں معذور ہو گئیں۔ مطلب یہ تھا کہ اہل حسن کے دیدار سے آنکھیں

سُکھ پائیں۔ چنانچہ بے تکلف گھروں میں جانے لگے۔ اب پردہ کی ضرورت کیا؟ یہ بھی قاعدہ ہے کہ میاں بیوی جس مہمان کی بہت خاطر کرتے ہیں نوکر اس سے جلنے لگتے ہیں۔ ایک دن دوپہر کو سوکر اُٹھے۔ شیخ صاحب نے لونڈی سے کہا کہ بڑے آفتابے میں پانی بھرلا۔ لونڈی نہ بولی۔ انھوں نے پھر پکارا۔ اس نے کہا کہ بیوی جاضرور میں لے گئی ہیں۔ ان کے منہ سے نکل گیا کہ غیبانی دوالی ہوئی ہے۔ سامنے تو رکھا ہے۔ دیتی کیوں نہیں بیوی دوسرے دالان میں تھیں۔ لونڈی گئی اور کہا کہ دُوئی بیوی یہ موا کہتا ہے کہ وہ بندہ اندھا ہے۔ یہ تو خاصا سُجَکھا ہے۔ ابھی میرے ساتھ یہ واردات گزری۔ اُس وقت یہ راز کُھلا۔ مگر اس میں شُبہہ نہیں کہ آخر آنکھوں کو رو بیٹھے ؎

مزن فال بد کا ورد حالِ بد مبادا کسے کو زند فال بد

جراُت اگرچہ علوم تحصیلی میں ناتمام تھے۔ بلکہ زبان عربی سے ناواقف تھے۔ لیکن اس کوچہ کے رستوں سے خوب واقف تھے اور طبع موزوں طوطی و بُلبل کی طرح ساتھ لائے تھے آخر عمر تک لکھنؤ میں رہے اور وہیں ۱۲۲۵ھ ہجری میں فوت ہوئے۔ شیخ ناسخ نے تاریخ کہی ؎

جب میاں جراُت کا باغ دہر سے گلشن فردوس کو جانا ہوا
مصرعِ تاریخ ناسخ نے کہا ہائے ہندوستان کا شاعر موا
۱۲۲۵ھ

کلام ہر جگہ زبان پر ہے۔ دیوان تلاش سے مل جاتا ہے۔ اس میں ہر طرح کی غزلیں ہیں۔ رباعیاں۔ چند مخمس۔ واسوخت۔ چند ہجویں اور تاریخیں ہیں۔ دیوان میں رطب و یابس بہت نہیں ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ جو استادوں کے طریقے پاتے ہیں اُنھیں سلیقہ سے کام میں لائے ہیں۔ اس پر کثرت مشق نے صفائی کا رنگ دیا ہے کہ سب کوتاہیوں کا پردہ ہوگیا۔ اور اُنھیں خود صاحب طرز مشہور کر دیا۔ ان کی نکتہ یابی اور سخن فہمی کی بڑی دلیل یہ ہے کہ قصیدہ وغیرہ

لاحول و لاقوۃ کیا بھانڈا پھوٹا ہے

قصیدہ پر ہاتھ نہ ڈالا

اقسام شعر پر ہاتھ نہ ڈالا۔ بلکہ زبان فارسی کی طرف خیال بھی نہیں کیا۔ مناسب طبع دیکھ کر غزل کو اختیار کیا اور اُمرا اور ارباب نشاط کی صحبت نے اُسے اور بھی چمکایا۔ انھوں نے بالکل میر کے طریقے کو لیا۔ مگر اس کی فصاحت پر ایک شوخی اور بانکپن کا انداز ایسا بڑھایا جس سے پسند عام نے شہرت دوام کا فرمان دیا۔ عوام میں کمال کی دھوم مچ گئی۔ اور خواص حیران رہ گئے۔ ان کی طرز انھیں کا ایجاد ہے اور آج تک انھیں کے لئے خاص ہے۔ جیسی اس وقت مقبول خلائق تھی۔ آج تک ویسی ہی چلی آتی ہے۔ خصوصیت اس میں یہ ہے کہ فصاحت اور محاورہ کی جان ہے۔ فقط حُسن و عشق کے معاملات ہیں۔ اور عاشق و معشوق کے خیالات گویا اس میں شراب ناب کا سرور پیدا کرتے ہیں۔ ان کی طبیعت غزل کے لئے عین مناسب واقع ہوئی تھی۔ حریف۔ ظریف۔ خوش طبع۔ عاشق مزاج تھے۔ البتہ استعداد علمی اور کاوش فکری۔ شاعری کا جُزو اعظم ہے۔ ان کی طبیعت بجائے محنت پسند ہونے کے عشرت پسند تھی۔ تعجب یہ ہے کہ زمانہ نے شکّر خورے کو شکّر دے کر تمام عمر قدردان اور نازبردار امیروں میں بسر کردی۔ جہاں رات دن اس کے سوا اور چرچا ہی نہ تھا۔ اگر ان کی طبیعت میں یہ باتیں نہ ہوتیں اور وہ استعداد علمی سے طبیعت میں زور اور فکر میں قوّت غور پیدا کرتے تو اتنا ضرور ہے کہ اصناف سخن پر قادر ہو جاتے مگر پھر یہ لطف اور شوخیاں کہاں۔ بلبل میں شوریدہ مزاجی نہ ہوتی تو یہ چہچہے کب ہوتے۔ نہیں گلہائے بہاری تمھاری ہوا پر ہوتے تو فصل بہار کے مزے کب ہوتے۔ بات یہ ہے کہ طبیعت میں تیزی اور طرّاری تھی۔ مگر نزلے کا زور اور طرف جا گرا تھا۔ یہی سبب ہے کہ کلام میں بلند پروازی۔ لفظوں میں شان و شکوہ اور معنوں میں دقّت نہیں جس نے قصیدہ تک نہ پہنچنے دیا۔ اور غزل کے کوچہ میں لا ڈالا۔ اس عالم میں جو جو باتیں اُن پر اور ان کے دل پر گزرتی تھیں سو کہہ دیتے تھے۔ مگر ایسی کہتے تھے کہ اب تک دل

غزل میں کیا انداز ہے

بھڑک اُٹھتے ہیں۔ مشاعرے میں غزل پڑھتے تھے تو جلسے کے جلسے لوٹ جاتے تھے۔ سید انشا باہمہ فضل و کمال رنگا رنگ کے بہروپ بدل کر مشاعرہ میں دھوم دھام کرتے تھے۔ وہ شخص فقط اپنی سیدھی سادی غزل میں وہ بات حاصل کرلیتا تھا +

میر تقی مرحوم کا ارشاد

مرزا محمد تقی خاں ترقی کے مکان پر مشاعرہ ہوتا تھا۔ اور تمام امرائے نامی و شعرائے گرامی جمع ہوتے تھے۔ میر تقی مرحوم بھی آتے تھے۔ ایک دفعہ جرأت نے غزل پڑھی اور غزل بھی وہ ہوئی کہ تعریفوں کے غُل سے شعر تک سُنائی نہ دیے۔ میاں جرأت یا تو اس جوش سرور میں جو کہ اس حالت میں انسان کو سرشار کردیتا ہے یا شوخی مزاج سے میر صاحب کے چھیڑنے کے ارادہ سے ایک شاگرد کا ہاتھ پکڑ کے ان کے پاس آکر بیٹھے اور کہا کہ حضرت! اگرچہ آپ کے سامنے غزل پڑھنی بےادبی اور بےحیائی ہے مگر خیر اس بیہودہ گو نے جو یاوہ گوئی کی آپ نے سماعت فرمائی؟ میر صاحب تیوری چڑھا کر چپکے ہو رہے۔ جرأت نے پھر کہا میر صاحب کچھ ہوں ہاں کرکے پھر ٹال گئے۔ جب انھوں نے بہ تکرار کہا تو میر صاحب نے جو الفاظ فرمائے وہ یہ ہیں[1] "کیفیت اس کی یہ ہے کہ تم شعر تو کہہ نہیں جانتے ہو اپنی چوما چاٹی کہہ لیا کرو۔" میر صاحب مرحوم شاعروں کے ابوالآبا تھے۔ کیسے ہی الفاظ میں فرمائیں مگر جوہری کامل تھے۔ جواہر کو خوب پرکھا۔ اس میں کچھ شبہہ نہیں کہ عاشق و معشوق کے راز و نیاز اور حُسن و عشق کے معاملوں کو جس شوخی اور چونچلے سے انھوں نے برتا ہے وہ انھی کا حصّہ تھا۔ آج تک دوسرے کو نصیب نہیں ہوا۔ **میر** اور **سودا** کی غزلوں پر اکثر غزلیں لکھی ہیں۔ اُن کے کلام ملوک الکلام تھے۔ مگر یہ اپنی شوخی سے جو لطف پیدا کر جاتے ہیں تڑپا جاتے ہیں +

[1] دیکھو تذکرہ حکیم قدرت اللہ خاں قاسم +

میر	برقع کو اٹھا چہرہ سے وہ بت اگر آئے	اللہ کی قدرت کا تماشا نظر آئے
سودا	اس دل کی تفِ آہ سے کب شعلہ بر آئے	بجلی کو دمِ سرد سے جس کو حذر آئے
مصحفی	ہرگز نہ مرادِ دلِ معشوق بر آئے	یارب نہ شبِ وصل کے پیچھے سحر آئے
جرأت	اُس پردہ نشیں سے کوئی کس طرح بر آئے	جو خواب میں بھی آئے تو منہ ڈھانک کو آئے
ذوق بعالم نوجوانی	ناقص کا صفا کیش سے مطلب نہ بر آئے	جو کور ہو عینک سے اُسے کیا نظر آئے
"	فردوس میں ذکر اُس لبِ شیریں کا گر آئے	پانی دہنِ چشمۂ کوثر میں بھر آئے
میر	اب کر کے فراموش تو ناشاد کرو گے	پر ہم جو نہ ہوں گے تو بہت یاد کرو گے
سودا	جس روز کسی اور پہ بیداد کرو گے	یہ یاد رہے ہم کو بہت یاد کرو گے
جرأت	ہے کس کا جگر جس پہ یہ بیداد کرو گے	لو ہم تمھیں دل دیتے ہیں کیا یاد کرو گے
میر	مدعی مجھ کو بہت صاف بُرا کہتے ہیں	چُپکے تم سُنتے ہو بیٹھے اسے کیا کہتے ہیں
سودا	تو نے سودا کے تئیں قتل کیا کہتے ہیں	یہ اگر سچ ہے تو ظالم اسے کیا کہتے ہیں
جرأت	آئینہ رُخ کو ترے اہل صفا کہتے ہیں	اس پہ دل اٹکے ہے میرا اسے کیا کہتے ہیں

سودا کا ایک مطلع مشہور ہے[1]۔ اُستاد مرحوم اس پر جرأت کا مطلع پڑھا کرتے تھے۔ ایک مصرع یاد ہے۔ دوسرا بھول گیا۔ اب سارا دیوان چھان مارا۔ نہیں ملتا۔ معلوم ہوتا ہے کہ زبان بزبان یہاں تک آپہنچا وہاں دیوان میں نہ درج ہوا۔ ناسخ اور آتش کے اکثر اشعار کا یہی حال ہے۔ معتبر اشخاص کی زبانی سُن چکا ہوں جو کہ خود اُن کے مشاعروں میں شامل ہوتے تھے مگر اب دیوانوں میں وہ اشعار نہیں ملتے۔ استاد مرحوم کے صدہا شعروں کا حال راقم آثم جانتا ہے کہ خود یاد ہیں یا ایک دو زبانوں پر ہیں۔ یہ رہیں تو فراموشی کا مال ہے۔ کارساز کریم اُن کے مجموعہ کو بھی تکمیل کو پہنچائے۔ سودا کا مطلع ہے ؎

سودا	کہہ دیکھ تو رستم سے سر تیغ تلے دھر دے	پیارے یہ ہمیں سے ہو ہر کارے و ہر مردے
جرأت	پہلا مصرع یاد نہیں دوسرا حاضر ہے	ہر شہرے و ہر رسمے۔ ہر کارے و ہر مردے

[1] میرے شفیق قدیم حافظ ویران فرماتے ہیں +

ہمارے آگے ترا جب کسی نے نام لیا	دلِ ستم زدہ کو ہم نے تھام تھام لیا	میر
چمن میں صبح جو اس جنگجو کا نام لیا	صبا نے تیغ کا موجِ رواں سے کام لیا	سودا
پاس جا بیٹھا جو میں کل اک ترے ہمنام کے	رہ گیا بس نام سنتے ہی کلیجہ تھام کے	جرأت
چمن میں گل نے جو کل دعوئی جمال کیا	جمال یار نے منہ اس کا خوب لال کیا	میر
برابری کا تری گل نے جب خیال کیا	صبا نے مار تمانچہ منہ اس کا لال کیا	سودا
جو تیغ یار نے خوں ریزی کا خیال کیا	تو عاشقوں نے بھی منہ اسکا خوب لال کیا	جرأت

طائر شہرت نے ابھی پر پرواز نہ نکالے تھے جو مرزا رفیع اور میر سوز کے جلسہ میں ایک لطیفہ ہوا۔ دیکھو صفحہ ۱۹۷۔ سچ ہے شاعر اپنی شاعری ماں کے پیٹ سے لے کر نکلتا ہے۔ ان کے کلام میں بعض نکتے ایسے بھی ہیں کہ جن پر خاص لوگوں کی نظریں اٹکتی ہیں مثلاً:- (بعض نکتے قابل گرفت ہیں۔)

ہو کے آزردہ جو ہم سے پرے پھرتے ہیں　　ہاتھ ہم اپنے کلیجے پہ دھرے پھرتے ہیں

مصرع گرم ہے لیکن پرے پرے پھرتے ہیں کہتے تو محاورہ پورا ہو جاتا۔

کبھی وہ چاند کا ٹکڑا ادھر بھی آ نکلے　　ذرا تو دیکھ منجم مرے ستارے دن

دکھادے شکل کہ دیوار و در سے سر اپنا　　کہاں تلک کوئی تیرے قرار پر مارے

ہجوم داغ نے یہ کی ہے تن پہ گلکاری　　کہ پہنے ہوں تنِ عریاں لباس پھلکاری

ظہور اللہ خاں نوا سے کسی معاملہ میں بگاڑ ہو گیا تھا۔ انھوں نے ان کی ہجو میں ایک ترجیع بند کہا۔ اور حقیقت میں بہت خوب کہا جس کا شعر ترجیع یہ ہے:-

(ظہور اللہ خاں نوا)

ظہور حشر نہ ہو کیوں جو کلچڑی گنجی
حضور بلبل بستاں کرے نوا سنجی

خان موصوف نے بھی بہت کچھ کہا مگر اس نے شہرت نہیں پائی۔ چنانچہ ان کے ترجیع بند کا فی الحال یہی ایک شعر یاد ہے ؎

رات کو کہنے لگا جورو کے منہ پر ہاتھ پھیر
قدرتِ حق سے لگی ہے ہاتھ اندھے کے بٹیر

ظہور اللہ خاں نوا ۱۲۴۰ ہجری میں ...

کریلا[1]۔ ایک پرانم بھانڈ دلی کا رہنے والا۔ نواب شجاع الدولہ کے ساتھ گیا تھا اور اپنے فن میں صاحب کمال تھا۔ ایک دن کسی محفل میں اس کا طائفہ حاضر تھا۔ شیخ جرأت بھی وہاں موجود تھے۔ اس نے نقل کی۔ ایک ہاتھ میں لکڑی لے کر دوسرا ہاتھ اندھوں کی طرح بڑھایا۔ ٹٹول ٹٹول کر پھرنے لگا۔ اور کہنے لگا کہ حضور شاعر بھی اندھا شعر بھی اندھا مضمون بھی اندھا ؎

صنم سنتے ہیں تیرے بھی کمر ہے کہاں ہے کس طرف کو ہے کدھر ہے[2]

شیخ صاحب بہت خفا ہوئے گریہ بھی سید انشا اور مرزا قتیل کے جتھے کے جزو اعظم تھے گھر آکر اُنھوں نے بھی اس کی ہجو کہہ دی اور خوب خاک اُڑائی۔ اُسے سُن کر کریلا بہت کڑوایا۔ چنانچہ دوسرے جلسہ میں پھر اندھے کی نقل کی۔ اسی طرح لاٹھی لے کر پھرنے لگا۔ ان کی ایک غزل ہے ؎

امشب تری زلفوں کی حکایات ہے واللہ کیا رات ہے کیا رات ہے کیا رات ہے واللہ

ہر رات کے لفظ پر لکڑی کا سہارا بدلتا تھا۔ کیا رات ہے۔ کیا رات ہے۔ کیا رات ہے واللہ۔ اس غزل کے ہر شعر کا دوسرا مصرع ایک ہی ڈھنگ پر ہے۔ چنانچہ ساری غزل کو محفل میں اسی طرح پڑھتا پھرا۔ شیخ صاحب اور بھی غصہ ہوئے اور پھر آکر ایک ہجو کہی ترجیع بند تھا ؎

اگلا جھولے بگلا جھولے ساون ماس کریلا پھولے

اس کو بھی خبر ہوئی۔ بہت جلا بُھنا۔ پھر کسی محفل میں ایک زچا کا سوانگ بھرا اور

[1] عہد محمد شاہی اور اس سے پس کا زمانہ خوشحالی کے لحاظ سے بہشتی زمانہ تھا۔ دربار سے جو امیر کسی طرف جاتا تھا وہ ضروری چیزیں اور کاروبار کے آدمی دلی سے اپنے ساتھ لے جاتا تھا تاکہ ہر کام۔ ہر رسم۔ ہر بات اور کارخانے کا محاورہ وہی ہو جو دار الخلافہ کا ہے۔ نواب سراج الدولہ مرشد آباد کے صوبہ ہو کر گئے تو علاوہ منصب داروں اور ملازموں کے۔ کئی بھانڈ۔ دو تین گویئے۔ دو تین رنڈیاں۔ ایک دو بھگتیے۔ دو تین نان بائی۔ ایک دو کنجڑے اور بھڑبھونجے تک بھی ساتھ لے گئے۔ اور وہ ایسا وقت تھا کہ دلی کا بھڑبھونجا بھی دس بارہ روپے مہینے بغیر دلی سے نہ نکلتا تھا۔ [2] یہ شعر شاہ مبارک آبرو کا ہے۔

ظاہر کیا کہ اس کے پیٹ میں بھتنا گھس گیا ہے۔ خود ملا بن کر بیٹھا اور جس طرح جنات اور سیانوں میں لڑائی ہوتی ہے اسی طرح جھگڑتے جھگڑتے بولا کہ ارے نامراد کیوں غریب ماں کی جان کا لاگو ہوا ہے۔ جرأت ہے تو باہر نکل آ کہ ابھی جلا کر خاک کر دوں۔ آخر اب کی دفعہ انھوں نے ایسی خبر لی کہ کریلا خدمت میں حاضر ہوا۔ خطا معاف کروائی اور کہا کہ اگر آسمان کے تارے توڑ لاؤں گا تو بھی اس کا چرچا وہیں تک رہے گا جہاں تک دائرہ محفل ہے۔ آپ کا کلام منہ سے نکلتے ہی عالم میں مشہور ہو جائے گا اور پتھر کی لکیر ہو گا کہ قیامت تک نہ مٹے گا۔ بس اب میری خطا معاف فرمایئے۔

اگرچہ روایت کہن سال لوگوں سے سُنی ہے۔ مگر کئی نسخے کلیات کے نظر سے گزرے جو ہجو اس میں ہے وہ ایسی نہیں ہے جس پر ایک بھانڈ اس قدر گھبرا جائے کہ آ کر خطا معاف کروا لے۔

لطیفہ۔ ایک دن میر انشاء اللہ خاں جرأت کی ملاقات کو آئے۔ دیکھا تو سر جھکائے بیٹھے کچھ سوچ رہے ہیں۔ انھوں نے پوچھا کہ کس فکر میں بیٹھے ہو؟ جرأت نے کہا کہ ایک مصرع خیال میں آیا ہے۔ چاہتا ہوں کہ مطلع ہو جائے۔ انھوں نے پوچھا کہ کیا ہے؟ جرأت نے کہا کہ خوب مصرع ہے مگر جب تک دوسرا مصرع نہ ہو گا تب تک نہ سناؤں گا۔ نہیں تو تم مصرع لگا کر چھین لو گے۔ سید انشا نے بہت اصرار کیا آخر جرأت نے پڑھ دیا ع

اُس زلف پہ پھبتی شبِ دیجور کی سوجھی

سید انشا نے فوراً کہا کہ ع

اندھے کو اندھیرے میں بہت دور کی سوجھی

جرأت ہنس پڑے اور اپنی لکڑی اُٹھا کر مارنے کو دوڑے۔ دیر تک سید انشا آگے آگے بھاگتے پھرے اور یہ پیچھے پیچھے ٹٹولتے پھرے۔ اللہ اکبر! کیا شگفتہ مزاج

لوگ تھے۔ کیا خوش دلی اور فارغ البالی کے زمانے تھے +

سید انشا نے اُن کے نام کا معمہ کہا تھا۔ سر مونڈی نگوڑی گجراتن۔ لطیفہ اس میں یہ تھا کہ گجراتن ان کی ماں کا نام تھا +

نوّاب محبت خاں کے مختار نے ایک دفعہ جاڑے میں معمولی پوشاک دینے میں کچھ دیر کی۔ جرأت نے رباعی کہہ کر کھڑے کھڑے خلعت حاصل کیا۔ رُباعی

مختاری پہ آپ کیجئے گا نہ گھمنڈ — کہتے ہیں جسے نوکری ہے بیخ ارنڈ
سرمائی دلائیے ہماری ورنہ — تم کھاؤ گے گالیاں جو ہم کھائیں گے ٹھنڈ

غزل

لگ جا گلے سے تاب اب اے نازنیں نہیں — ہے ہے خدا کے واسطے مت کر نہیں نہیں
کیا رک کے وہ کہے ہے جو ٹک اس سے لگ چلوں — بس بس پرے ہو شوق بہ اپنے تئیں نہیں
پہلو میں کیا کہیں جگر و دل کا کیا ہے رنگ — کس روز اشک خونی سے تر آستیں نہیں
فرصت جو پاکے کہئے کبھو درد دل سو ہائے — وہ بدگماں کہے ہے کہ ہم کو یقیں نہیں
آتش سی پھنک رہی ہے مرے تن بدن میں آہ — جب سے کہ روبرو وہ رُخ آتشیں نہیں
اس بن جہان کچھ نظر آتا ہے اور ہی — گویا وہ آسمان نہیں وہ زمیں نہیں
کیا جانے کیا وہ اس میں ہے لوٹے ہے جسپہ دل — یوں اور کیا جہان میں کوئی حسیں نہیں
سُنتا ہے کون کس سے کہوں درد بیکسی — ہمدم نہیں ہے کوئی مرا ہمنشیں نہیں
ہر چند ہے بہ لطف شب ماہ سیر باغ — اندھیر پر یہی ہے کہ وہ مہ جبیں نہیں
آنکھوں کی راہ نکلے ہے کیا حسرتوں سے جی — وہ روبرو جو اپنے دم واپسیں نہیں
طوفان گریہ کیا کہیں کس وقت ہمنشیں — موج سرشک تا فلک ہفتمیں نہیں

حیرت ہے مجکو کیونکہ وہ جرأت ہے چین سے
جس بن قرار جی کو ہمارے کہیں نہیں

امشب کسی کا کل کی حکایات ہے واللہ — کیا رات ہے کیا رات ہے کیا رات ہے واللہ
دل چھین لیا اس نے دکھا دستِ حنائی — کیا ہات ہے کیا ہات ہے کیا ہات ہے واللہ
عالم ہے جوانی کا جو اُبھرا ہوا سینہ — کیا گات ہے کیا گات ہے کیا گات ہے واللہ
دشنام کا پایا جو مزہ اُس کے لبوں سے — صلوات ہے صلوات ہے صلوات ہے واللہ

جرأت کی غزل جس نے سُنی اُس نے کہا واہ
کیا بات ہے کیا بات ہے کیا بات ہے واللہ

طرح مشاعرہ کا مستزاد ہے۔ مصحفی اور سید انشا نے بھی طبع آزمائی کی ہے۔ ہر ایک کے حال میں دیکھ کر مقابلہ کرو انھوں نے سراپا باندھا ہے:-

جادو ہے نگہ چھب ہے غضب قہر ہے مکھڑا — اور قد ہے قیامت
غارت گرِ دیں وہ بُت کافر ہے سراپا — اللہ کی قدرت

اٹھکھیلی ہے رفتار میں گفتار کی کیا بات — ہر بات جگت ہے
اور رنگ رُخِ یار سے گویا کہ بھبو کا — پھر تس پہ ملاحت

ہیں بال یہ بکھرے ہوئے مکھڑے پہ دھواں دھار — جوں دود بشعلہ
حُسنِ بتِ کافر ہے خُدائی کا جھگڑا — ٹک دیکھیو صورت

ابرو فنِ خونریزی میں اُس کے ہیں غضب طاق — شمشیر برہنہ
آنکھوں کا یہ عالم ہے کہ آنکھوں سے نہ دیکھا — افسوں ہے اشارت

کان ایسے کہ کانوں سے سُنے ویسے نہ اب تک — نے آنکھوں سے دیکھے
بالے کے تصوّر میں مجھے گھیرے ہے گویا — اک حلقۂ حیرت

بینی یہ خوش اسلوب کہ نتھنوں کی پھڑک دیکھ — تڑپے ہے دو عالم
ہے اس کو لبِ یار کے بوسہ کی تمنّا — ارمان ہے حسرت

دانتوں کی صفا کیا کہوں موتی کی لڑی ہے — لب لعل کے ٹکڑے
مستی ہے بلا تس پہ رکھے پان کا بیڑا — سو شوخی کی رنگت

دل خوں کرے وہ دست حنابستہ بھرا اس میں — سمرن کی پھبن ہائے

ہے وضع تو سادی سی پہ کیا کیا نہیں پیدا — شوخی و شرارت

اُس اُبھرے ہوئے گات کی کیا بات جسے دیکھ — سب ہاتھ ملے ہیں

اور ہائے رے ہر بات میں گردن کا وہ ڈورا — ہے دامِ محبت

گلشن میں پھرے ٹک تو وہیں آتشِ گُل کی — گرمی سے عرق آئے

ہر گام پہ چلنے میں کمر کھائے ہے لچکا — اللہ رے نزاکت

ہیں قہر سرین گول وہ اور ہائے کہوں کیا — رانوں کی گدازی

فرق اس میں نہیں فرق سے لے تابکفِ پا — ہے طرفہ لطافت

ہے عشوہ و انداز و ادا ناز و کرشمہ — اور گرمی و شوخی

ہر عضو پہ آنکھ اسکے وہ کافر ہے سراپا — ایک موہنی مورت

بھولے سے جو ہم نام لیں تو رُک کے کہے یوں — اس نام کو کم لو

پھر اس میں جو رُک جائیے تو جھٹ سے یہ کہنا — بس دیکھ لی چاہت

جرأت یہ غزل گرچہ کہی ایسی ہے تو نے — ہے خوب سراپا

پر کہہ کے وہ اشعار کر اب اس کو دو غزلا — ہو جس سے کہ وحشت

جز بیکسی و یاس نہیں ہے کوئی جس جا — ہے اپنی وہ تربت

افسوس کرے کون بجز دستِ تمنا — ہوں کشتۂ حسرت

جو میں نے کہا اس سے دکھا مجھ کو رُخ اپنا — بس دے نہ اذیت

تو کیا کہوں کس شکل سے جھنجھلا کے وہ بولا — تو دیکھے گا صورت؟

یہ رہ گئی اس کی کہ بس چھا گئی یک بار — آنکھوں کی سپیدی

پیمان گسل آیا نہ وہ وعدۂ فردا — تا صبح قیامت

سودائے محبت جو نہیں ہے تجھے اے دل — تو پھر مجھے بتلا

کیوں چاک کئے اپنے گریباں کو ہے پھرتا — آنکھوں پہ ہے وحشت

سو بار زباں گرچہ مری کٹ گئی جوں شمع اور پھر ہوئی پیدا
پر محفلِ قاتل میں مرے منہ سے نہ نکلا یک حرف شکایت

اب گھر میں بلانے سے اگر آتی ہیں سو سوچ بدنام سمجھ کر
آواز ہی تو در پہ مجھے آ کے سُنا جا ازراہِ مروّت

آلودہ ہوا خوں سے دلا دامن قاتل بسمل ہو جو تڑپا
افسوس صد افسوس کہ یہ تو نے کیا کیا؟ اے ننگ محبت

جو ولولۂ شوق سے ہو مضطر و بیتاب نکلا ہی پڑے دل
کیا قہر ہے کیا ظلم ہے محبوب گر اُس کا ہو صاحبِ عصمت

کیا خاک رہیں چین سے بیچینی کے مارے بس ہے یہ پرکھا
ہم ہو گئے جس کے وہ ہوا ہائے نہ اپنا کیا کیجئے قسمت

چُپ اِن دنوں رہتا ہے جو وہ صورت تصویر کچھ اور ہے خفقان
لگ جائے بھلا اس سے مرے کیوں دل کو نہ دھڑکا ہے موجبِ حیرت

دل دے کے عجب ہم تو مصیبت میں پھنسے ہیں اک پردہ نشیں کو
نے جانے کا گھر اس کے ہے مقدور ہمارا نے رہنے کی طاقت

یا مجھ کو بلاتا تھا وہ یا آپ تھا مجھ پاس صحبت کی تھی گرمی
اب اس کو خدا جانے دیا کس نے یہ بھڑکا جو ایسی ہے نفرت

لے نام مرا کوئی تو دے سیکڑوں دشنام گن گن کے وہ قاتل
بیرحمی و بیدردی سے پروانہ ہو اصلا سن مرگ کی حالت

آنا مرا سن در پہ کہیں گھر سے چلا جائے دیکھوں تو نہ دیکھے
اور کوئی سفارش جو کرے میری تو کیا کیا کھینچے وہ مذلت

گر خواب میں دیکھے مجھے تو چونک اُٹھے اور پھر موندے نہ آنکھیں
آواز جو میری سی سنے تو وہیں گھبرا کھانے لگے دہشت

افسوس کہ گردوں نے عجب رنگ دکھایا   نقشا ہی وہ بدلا
لے جان مری! خانۂ تن سے تو نکل جا   ہو جائے فراغت

کس منہ سے کروں عشوہ گری اُسکی بیاں مَیں   اللہ رے ادائیں
مل بیٹھے ہم اور وہ کبھی قسمت سے جو یکجا   طرفہ ہوئی صحبت

بیتاب ہو لگ چلنے کا جو مَیں نے کیا عزم   دے بیٹھے وہ گالی
کچھ اور کیا قصد تو کس ناز سے بولے   بل بے تری جرأت

اجل گر اپنی خیالِ جمالِ یار میں آئے   تو پھر بجائے فرشتہ پری مزار میں آئے[1]
بھلا پھر اُس کو اُٹھانے میں کیوں نہ دیر لگے   کسی کی موت کسی کے جو انتظار میں آئے
بیک کرشمہ جو بے اختیار کر ڈالے   وہ عشوہ ساز کسی کے کب اختیار میں آئے
پس از فنا جو ترے دل جلے کی خاک اُڑے   تو مضطرب سا دھواں ایک نظر غبار میں آئے
خراب کیونکہ نہ ہو شہرِ دل کی آبادی   ہمیشہ لوٹنے والے ہی اس دیار میں آئے
فغاں پھر اس کی ہو لبریز یاس کیونکہ نہ آہ   بزیرِ دام جو مرغِ چمن بہار میں آئے
بلائیں لے کے ہونے لگوں نثار تو بس   کہے ہے ہنس کے وہ ایسے جی اب پیار میں آئے
نہ پوچھ مجھ سے وہ عالم کہ صبح نیند سے اُٹھ   جب انگڑائیوں کو وہ ملتے ہوئے خمار میں آئے
نہ کیونکہ حد سے فزوں تر ہو رتبۂ گریہ   کہ اب تو حضرتِ دل چشمِ اشکبار میں آئے
ٹلیں نہ واں سے اگر ہم کو گالیاں لاکھوں   وہ دینے غیرتِ گل ایک کیا ہزار میں آئے
مگر نہ کہئے کہ مضطر ہو تو نہ کیونکہ بھلا   وہ دوڑ دوڑ تمھارے نہ رہگزار میں آئے

اُٹھے جہاں سے نہ جرأت اُٹھا کے دردِ فراق
الٰہی موت بھی آئے تو وصلِ یار میں آئے

یاد آتا ہے تو کیا پھرتا ہوں گھبرایا ہوا   چنپئی رنگ اُس کا اور جوبن وہ گدرایا ہوا
بات ہی اوّل تو وہ کرتا نہیں مجھ سے کبھی   اور جو بولے بھی ہے کچھ منہ سے تو شرمایا ہوا

[1] کس دھوم دھام کی غزل تھی مگر۔ آئے۔ کہیں واحد ہے کہیں جمع ہو گیا ہے +

جا کے پھر آؤں نہ جاؤں اس گلی میں دوڑ دوڑ — پر کروں کیا میں نہیں پھرتا ہے دل آیا ہوا

بے سبب جو مجھ سے ہے وہ شعلہ خو سرگرمِ جنگ — میں تو ہوں حیراں کہ یہ کس کا ہے بھڑکایا ہوا

وہ کرے عزمِ سفر تو کیجئے دنیا سے کوچ — ہے ارادہ دل میں مدت سے یہ ٹھیرایا ہوا

نوکِ مژگاں پر دلِ پژمردہ ہے یوں سرنگوں — شاخ پر جھک آئے ہے جوں پھول مرجھایا ہوا

جاؤں جاؤں کیا لگایا ہے اجی بیٹھے رہو — ہوں میں اپنی زیست سے آگے ہی اکتایا ہوا

تیری دوری سے یہ حالت ہو گئی اپنی کہ آہ — عنقریبِ مرگ ہر اک اپنا ہمسایا ہوا

کیا کہیں اب عشق کیا کیا ہم سے کرتا ہے سلوک — دل یہ بیتابی کا اک پتلا ہے بٹھلایا ہوا

ہے قلق سے دل کی یہ حالت مری اب تو کہ میں — چار سو پھرتا ہوں اپنے گھر میں گھبرایا ہوا

حکم بارِ مجلس اب جرأت کو بھی ہو جائے جی
یہ بچارہ کب سے دروازہ پہ ہے آیا ہوا

نہ جواب لے کے قاصد جو پھرا شتاب اُلٹا — میں زمیں پہ ہاتھ مارا بہ صد اضطراب اُلٹا

دمِ وصل اُس نے رخ سے جو نہ ٹک نقاب اُلٹا — ہمیں لگ گیا دم اس دم بہ صد اضطراب اُلٹا

ترے دور میں ہو میکش کوئی کیا فلک کہ تیری — وہ ہے شکل جوں دھرا ہو قدحِ شراب اُلٹا

یہ دغا کی میں نے تقصیر مجھے کہتے بے وفا ہو — مری بندگی ہے صاحب یہ ملا خطاب اُلٹا

مرے بخت ہیں وہ رو کش کہ وہ دے جو وعدۂ شب — تو پہنچ کے تا بہ مغرب پھرے آفتاب اُلٹا

کسی نسخہ میں پڑھے تھا وہ مقامِ دلنوازی — مجھے آتے جوں ہی دیکھا ورقِ کتاب اُلٹا

وہ بہا کے کاسۂ سر مرے خوں میں شکلِ کشتی — کہے ہے کہ دیکھو نکلا یہ ہوا حباب اُلٹا

مرے دل نے داغ کھایا جو یہ بوئے سوختہ ہے — یہ جلا بس ایک پہلو نہ گیا کباب اُلٹا

غزل اور پڑھ تو جرأت کہ گیا جو یہاں سے گھر کو
تو کلام سننے تیرا میں پھرا شتاب اُلٹا

میں تڑپ کے سنگِ تربت بصد اضطراب اُلٹا — مری قبر پر وہ آ کر جو پھرا شتاب اُلٹا

مرے سو سوال سُن کر رہا وہ خموش بیٹھا — نہیں یہ بھی کہنے کی جا کہ ملا جواب اُلٹا

جو ترے لکھے ہے بخت واژوں وہ غنی سے مل ہو مفلس — کہ رہے یہ آب دریا قدح حباب اُلٹا
شب وصل یہ قلق تھا یہ وہ سو گیا تو منہ سے — نہ ذرہ بھی یں دوپٹہ زرہ حجاب اُلٹا[1]
ہمیں ہے خیال اس کا کہ جو آیا خواب میں ڈ — تو زباں پہ اُس کی ڈر سے نہ وہ ہم نے خواب اُلٹا
اسی در تک آؤں گا میں کہ نہیں ہے دل کہے میں — مجھے پھیرتے عبث ہو زرہِ عتاب اُلٹا
طلب اس سے کل جو مے کی تو بھرا ہوا زمیں پہ — مجھے شوخ نے دکھا کر قدح شراب اُلٹا
جو کنار مقصد اپنی لگے بہ کے ناؤ کا ہے — تو ہوا تھپیڑ مارے لگے بہنے آب اُلٹا

کسی تذکرہ میں پڑھنے مرے شعر جو لگا وہ
تو ہوا نے دوں ہی جُرأت ورق کتاب اُلٹا

اس ڈھب سے کیا کیجئے ملاقات کہیں اور — دن کو تو ملو ہم سے رہو رات کہیں اور
کیا بات کوئی اُس بُت عیار کی سمجھے — بولے ہے جو ہم سے تو اشارات کہیں اور
اس ابر میں پاؤں میں کہاں دختر رز کو — رہتی ہے مدام اب تو وہ بذات کہیں اور
جس رنگ مری چشم سے برسے ہے پڑا خوں — اس رنگ کی دیکھی نہیں برسات کہیں اور

گھر اُس کو بُلا نذر کیا دل تو وہ جرأت
بولا کہ یہ بس کیجے مدارات کہیں اور

جب یہ سنتے ہیں کہ ہمسایہ ہیں آپ آئے ہوئے — کیا در و بام پہ ہم پھرتے ہیں گھبرائے ہوئے
آپ سے میں تو نہ جاؤں پہ کروں کیا کہ وہیں — دل بیتاب لئے جائے ہے دوڑائے ہوئے
گھر میں بے یار ہے شکل اپنی یہ دل کے ہمراہ — دو گنہگار ہوں جوں قید میں ٹھلائے ہوئے
آئے ہو دست بقبضہ ہو تو پھر دیر ہے کیا — سر تسلیم کو ہم بیٹھے ہیں نہوڑائے ہوئے
آج بھی اس کے جو آنے کی نہ ٹھیری تو بس آہ — ہم وہ کر بیٹھیں گے جو دل میں ہیں ٹھیرائے ہوئے
پیرہن چاک ترے در پہ جو کل کرتا تھا — آج لوگ اُس کو لئے جاتے ہیں کفنائے ہوئے
مُردنی پھر گئی مُنہ پر مرے جن کی خاطر — رنگ مہندی کیا وہ پڑے پھرتے ہیں چمکائے ہوئے

---

[1] دیکھو یہاں بھی فاعلیت (نے) محذوف ہے اور یہ پُرانا جوہر ہے +

ابر تصویر کی مانند ہم اس محفل میں رو نہیں سکتے پہ آنکھوں میں ہیں اشک آئے ہوئے
لوگ گر ہم سے یہ کہتے ہیں کہ چلتے ہو جی وہاں اپنے بیگانے سب اس بزم میں ہیں آئے ہوئے
دل میں تب سوچ کے اس بات کو رو دیتے ہیں کیا کہیں ان سے کہ ہیں ہم تو نکلوائے ہوئے

کرکے موزوں انھیں جرأت غزل اک اور بھی پڑھ
دل میں جو تازہ مضامین ہوں ٹھیرائے ہوئے

خوف کچھ کھاتے ہی بیدار ہم اے وائے ہوئے شب کو تم خواب میں پھر آئے تو گھبرائے ہوئے
بے خودی پر نہ ہماری تحیر ہو کوئی آئیں کیا آپ میں جی ہم ہیں کہیں آئے ہوئے
رنگ اور اس میں نظر آتا ہے کچھ حضرت دل اشک سرخ آنکھوں میں پھرتے ہو جو چمکائے ہوئے
رشک کی جا ہے غرض شہر خموشاں بھی کہ وہاں سوتے کیا چین سے ہم پاؤں کو پھیلائے ہوئے
دیکھیو شوخی کہ کوچے میں دل عاشق کو کیسی اٹھکیلی سے جاتا ہے وہ ٹھکرائے ہوئے
جوش وحشت سے گریباں کو کر چاک ہم آہ سرخ آنکھیں کئے کیا بیٹھے ہیں جھنجلائے ہوئے
جام دیتے نہیں مجھکو جو دم بادہ کشی یہ تو فرماؤ کہ تم کس کے ہو بہکائے ہوئے
حسرت اے ہمنفساں سیر چمن مفت گئی نخل بستاں سے قفس میں کئی لٹکائے ہوئے
دور چھوڑا ہمیں گلشن سے یہ رونے کی ہے جا کہ سزاوار اسیری بھی نہ ہم ہائے ہوئے

دم رخصت کے جرأت کوئی اس کافر سے
اک مسلمان کو کیوں جلنے ہو تڑپائے ہوئے

میر حسن

حسن تخلص۔ میر غلام حسن نام۔ خاص دہلوی تھے۔ پرانی دلی میں سید واڑہ ایک محلہ تھا۔ وہاں پیدا ہوئے تھے۔ عالم شباب میں والد کے ساتھ فیض[1] آباد گئے اور نواب

[1] پہلے فیض آباد حاکم نشین شہر تھا۔ لکھنؤ ایک قصبہ تھا۔ آصف الدولہ مرحوم کو اس کے آباد کرنے کا شوق ہوا۔ زیادہ تر یہاں رہنے لگے۔ ان کے سبب سے امرا کو بھی یہاں رہنا پڑا اور عمارات کا تعمیر کرنا واجب ہوا مگر دو گھرے تھے ایک قدم یہاں رہتا تھا اور ایک قدم وہاں ؛

سرفراز جنگ خلف نواب سالار جنگ کی سرکار میں ملازم ہوئے۔ کچھ مدت مقام مذکور میں رہے۔ پھر لکھنؤ میں آ گئے۔ خندہ جبیں۔ شگفتہ مزاج۔ ظریف طبع تھے اور اس میں تہذیب و شائستگی کو کبھی ہاتھ سے نہ دیتے تھے۔ میانہ قد۔ خوش اندام۔ گورا رنگ۔ جملہ قوانین شرافت اور آئین خاندان میں اپنے والد کے پابند تھے۔ اتنا تھا کہ ڈاڑھی منڈاتے تھے۔ اللہ اللہ عہد جوانی بھی ایک عالم رکھتا ہے۔ ع

حلیہ اور طرز لباس

جوانی کجائی کہ یادت بخیر

سر پہ بانکی ٹوپی۔ تن میں تن زیب کا انگرکھا۔ پھنسی ہوئی آستینیں۔ کمر سے دوپٹہ بندھا رہے اک بانکپن بھی بے دماغی میں تو زیبا ہے بڑھا دو چین ابرو پر ادائے کج کلاہی کا

اصلاح سخن

جب تک دلی میں رہے پہلے اپنے والد سے پھر خواجہ میر درد سے اصلاح لیتے رہے اودھ میں جا کر میر ضیاء الدین ضیا کے شاگرد ہوئے۔ اور مرزا رفیع سودا کو بھی غزل دکھائی۔ لکھنؤ میں آ کر ان کے کلام نے شہرت کا رنگ اُڑایا۔ ان کے اشعار غزل کے اصول میں گلاب کے پھول ہیں اور محاورات کی خوش بیانی مضامین عاشقانہ کے رنگ میں ڈوبی ہوئی ہے۔ میر سوز کا انداز بہت ملتا ہے۔ اہل تذکرہ کہتے ہیں کہ قصیدہ اس رتبہ پر نہ تھا۔ اور کچھ اس کا تعجب نہیں کیونکہ دونوں کوچوں میں مسافت بعید کا فاصلہ ہے

انداز کلام

مثنوی بدر منیر

حقیقت سحر البیان بے نظیر اور بدر منیر کا قصہ بے نظیر لکھا۔ اور اس مثنوی کا نام سحر البیان رکھا ہے۔ زمانہ نے اس کی سحر البیانی پر تمام شعرا اور تذکرہ نویسوں سے محضر شہادت لکھوایا۔ اس کی صفائی زبان اور لطف محاورہ اور شوخی مضمون اور طرز ادا اور ادا کی نزاکت۔ اور جواب و سوال کی نوک جھوک حد توصیف سے باہر ہے۔ اس کی فصاحت کے کانوں میں قدرت نے کیسی سناوٹ رکھی تھی! کیا اسے سو برس آگے والوں کی باتیں سُنائی دیتی تھیں؟ کہ جو کچھ اس وقت کہا صاف وہی محاورہ اور وہی گفتگو ہے جو آج ہم تم بول رہے ہیں۔ اس عہد کے شعراء کا کلام دیکھو! ہر صفحہ میں بہت سے الفاظ اور ترکیبیں ایسی ہیں کہ آج متروک اور مکروہ سمجھی جاتی ہیں۔ اس کا کلام

(سوا چند الفاظ کے) جیسا جب تھا ویسا ہی آج دلپذیر و دلکش ہے۔ کیا کہتا ہوں! آج کس کا منہ ہے جو اُن خوبیوں کے ساتھ شعر بھی موزوں کر سکے۔ خصوصاً ضرب المثل (کہاوت) کو اس خوبصورتی سے شعر میں مسلسل کر جاتے ہیں کہ زبان چٹخارے بھرتی ہے اور نہیں کہہ سکتی کہ یہ کیا میوہ ہے۔ عالم سخن کے جگت گرو مرزا رفیع سودا اور شاعروں کے سرتاج میر تقی میر نے بھی کئی کئی مثنویاں لکھیں فصاحت کے کتب خانے میں اس کی الماری پر جگہ نہ پائی۔ کتاب مذکور ہر گھر۔ ہر دکان بلکہ اس کے اشعار ہر زبان پر جاری ہیں اس لئے یہاں درج کرنے کی ضرورت نہیں۔

بدر منیر اور گلزار نسیم پر رائے

ہمارے ملک سخن میں سیکڑوں مثنویاں لکھی گئیں۔ مگر ان میں فقط دو نسخے ایسے نکلے جنھوں نے طبیعت کی موافقت سے قبول عام کی سند پائی۔ ایک سحر البیان دوسرے گلزار نسیم اور تعجب یہ کہ دونوں کے رستے بالکل الگ الگ ہیں اس واسطے آزاد کو واجب ہے کہ کچھ لکھے اور اہل سخن سے اپنی رائے کی صحت و سقم کا حال پوچھے۔ مثنوی حقیقت میں ایک سرگذشت یا بیان ماجرا ہے۔ جسے تاریخ کا شعبہ سمجھنا چاہئے۔ اس واسطے اس کے اصول میں لکھا ہے کہ چاہئے نہایت سلیس گفتگو میں ہو جس طرح ہم تم باتیں کرتے ہیں۔

میر حسن مرحوم نے اسے لکھا اور ایسی صاف زبان۔ فصیح محاورے۔ اور میٹھی گفتگو میں۔ اور اس کیفیت کے ساتھ ادا کیا جیسے آب رواں۔ اصل واقعہ کا نقشہ آنکھوں میں کھنچ گیا۔ اور ان ہی باتوں کی آوازیں کانوں میں آنے لگیں جو اس وقت وہاں ہو رہی تھیں۔ باوجود اس کے اصول فن سے بال بھر اِدھر یا اُدھر نہ گرے۔ قبول عام نے اسے ہاتھوں میں لے کر آنکھوں پر رکھا۔ اور آنکھوں نے دل و زبان کے حوالے کیا اُس نے خواص اہلِ سخن کی تعریف پر قناعت نہ کی بلکہ عوام جو حرف بھی نہ پہچانتے تھے وظیفوں کی طرح حفظ کرنے لگے۔ ارباب نشاط نے محفلوں میں اس کی نغمہ سرائی کر کے

لوگوں کو ہنسایا اور رُلایا ٭

پنڈت دیا شنکر نے گلزار نسیم لکھی اور بہت خوب لکھی۔ اس کا رستہ اُس سے بالکل الگ تھا۔ کیونکہ پنڈت صاحب نے ہر مضمون کو تشبیہ کے پردہ اور استعارہ کے پیچ میں ادا کیا۔ اور وہ ادا معشوقانہ خوش ادائی نظر آئی۔ اس کے بیچ وہی بانکپن کی مروڑ ہیں جو پریزادیں بانکا دوپٹا اوڑھ کر دکھاتی ہیں۔ اور اکثر مطالب کو بھی اشاروں اور کناروں کے رنگ میں دکھایا ہے۔ باوجود اس کے زبان فصیح۔ اور کلام شُستہ اور پاک ہے۔ اختصار بھی اس مثنوی کا ایک خاص وصف ہے جس کا ذکر کرنا واجب ہے کیونکہ ہر معاملہ کو اس قدر مختصر کر کے ادا کیا ہے جس سے زیادہ ہو نہیں سکتا۔ اور ایک شعر بیچ میں سے نکال لو تو داستان برہم ہو جاتی ہے۔ ان باتوں کے لحاظ سے واجب تھا کہ کتاب خاص پسند ہوتی۔ باوجود اس کے عام و خاص سب میں شہرت پائی۔ اس کے نکتوں اور باریکیوں کو سمجھیں یا نہ سمجھیں مگر سب لیتے ہیں اور پڑھتے ہیں۔ جتنی سمجھ میں آتی ہے۔ اسی پر خوش ہوتے ہیں اور لوٹے جاتے ہیں۔

اختصار کیونکر ہوا

مثنوی مذکور جب پہلے انھوں نے لکھی تو بہت بڑی تھی۔ خواجہ آتش اپنے استاد کے پاس اصلاح کو لے گئے اُنھوں نے کہا۔ بھیا اتنی بڑی کتاب دیکھے گا کون؟ وہ اپنا دہ یک کا قانون یہاں بھی جاری کرو۔ (اس کنایہ میں یہ اشارہ تھا کہ پنڈت صاحب فوج شاہی میں منشی تھے۔ اور بموجب قانون حکومت کے سب کی تنخواہوں میں سے وہ یکی کاٹ لیتے تھے گھر گھر میں اس شکایت کا چرچا تھا۔ یہ مثنوی مذکور لے گئے اور اختصار کیا تو ایسا نچوڑا کہ عطر نکال لیا)

بدر منیر کے علاوہ اکمسا اور مثنوی لکھی ہے۔

ایک موقع پر میر حسن مرحوم کا سفر۔ شاہ مدار کی چھڑیوں کے ساتھ مطابق پڑا چنانچہ سفر مذکور کا حال ایک مثنوی کے قالب میں ڈھالا ہے۔ اس میں فیض آباد کی تعریف اور لکھنؤ[1] کی ہجو کی ہے اس سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ اس وقت عورتوں کی پوشاک وہاں کیا تھی اور چھڑیوں کے اور جانے والوں کی جزئیات رسوم کیا کیا تھے۔ میں نے یہ مثنوی دلی کی تباہی سے پہلے دیکھی

[1] فی الحقیقت اس وقت لکھنؤ ایسی ہی حالت میں تھا ٭

تھی۔ اب نہیں ملتی۔ لوگ بہت تعریف لکھتے ہیں مگر حق یہ ہے کہ بدر منیر کو نہیں پہنچتی۔ تیسری مثنوی اور بھی تھی مگر مشہور نہ ہوئی +

دیوان

دیوان اب نہیں ملتا۔ حکیم قدرت اللہ خاں قاسم فرماتے ہیں کہ انواع سخن سے لبریز ہے۔ صاحب گلزار ابراہیمی ۱۱۹۶ھ میں کہتے ہیں کہ سید موصوف نے اپنا کلام مجھے بھیجا ہے اور خط جو لکھا ہے اُس کی اصل عبارت یہ ہے" از سائر اقسام اشعار۔ ابیات مدونۂ من ہشت ہزار بیت است۔ تذکرہ در ریختہ ہم نوشتہ و اصلاح سخن از میر ضیا گرفتہ ام۔ مدتیست کہ از دہلی وارد لکھنؤ گشتہ با نواب سالار جنگ و خلف ایشاں ملقب بہ نوازش علی خاں سرفراز جنگ بہادر میگذرانم"۔ افسوس خدا نے رشید اولاد دی مگر کسی نے اپنے بزرگ کے نام کو روشن کرنے کا خیال نہ کیا۔ اُس کے کئی سبب ہوئے۔ بیٹوں کو نہ زمانہ نے وسعت دی۔ نہ حصول ثواب نے فرصت دی۔ اور اُس وقت چھاپہ بھی کلکتہ سے اس طرف نہ آیا تھا۔ پوتے میر انیس مرحوم وغیرہ ہوئے۔ اُنھیں ان کے پاک اعتقاد اور حُسن نیت نے مبارک زمانہ دیا اور زمانہ نے ایسے بلند درجہ پر بٹھایا۔ جہاں سے دادا کا کمال بہت چھوٹا نظر آیا۔ وہ یہ سمجھتے تھے کہ ہمارا ذاتی کمال دادا کی تعریف اور شہرت سے بے نیاز ہے۔ یہ سب درست لیکن موجودہ نسل چند روز کے بعد اور آئندہ نسلیں مدت تک افسوس کریں گی۔ زمانہ بدل گیا اور بدلتا جاتا ہے۔ وہ وقت تو گیا۔ پھر یہ وقت بھی نہ پائیں گے۔ آج یہ نوبت ہے کہ پانچ غزلیں بھی پوری نہ ملیں جو اس کتاب میں درج کرتا۔ خلاصہ کلام یہ کہ ۱۲۰۱ھ اول محرم کو دار فانی سے رحلت کی۔ مفتی گنج میں نواب قاسم علی خاں کے باغ کے پچھواڑے دفن ہوئے۔ عمر کا حال نہ کھلا۔ لکھتے ہیں کہ ۵۰ برس سے زیادہ پائی۔ دو صاحبزادوں نے نام پایا۔ میر خلیق۔ میر خلق۔ شیخ مصحفی نے تاریخ کہہ کر حق آشنائی ادا کیا۔ فاطاریخ

میر حسن مرحوم کے خط کی عبارت

چوں حُسن آں بُلبلِ خوش داستاں ‏ ‏ ‏ ‏ رُو ازیں گلزار رنگ و بو بتافت

بسکہ شیریں بود نطقش مصحفی ‏ ‏ ‏ ‏ شاعر شیریں زباں تاریخ یافت

غزل

جو چاہے آپ کو تو اُسے کیا نہ چاہیئے
انصاف کر تو چاہیئے پھر یا نہ چاہیئے

مجھ ایسا تجھکو چاہے نہ چاہے عجب نہیں
تجھ سا جو چاہے مجھ کو تو پھر کیا نہ چاہیئے

کس کو سُنا کے کہتے ہو میں چاہتا نہیں
اب کیوں جی ہم بُرے ہوئے اچھا نہ چاہیئے

گر پاس تیرے بیٹھوں تو معذور رکھ مجھے
جس جا پہ شمع ہوئے تو پروانہ چاہیئے

عیش و وصال صحبتِ یاراں فراغِ دل
اِس ایک جان کے لئے کیا کیا نہ چاہیئے

دیتے ہو تم دکھائی جو ہمراہ غیر کے
اس طرح سے غرض تمھیں دیکھا نہ چاہیئے

اب جیسے اک حسنؔ سے ہنسے تھے تو ہنس لئے
پر اس طرح ہر ایک سے ٹھٹھا نہ چاہیئے

یہ طرفہ تر کہ تیری سنبھلتی نہیں زباں
اور تیرے سامنے مری چلتی نہیں زباں

میرا تو دل جلا تری باتوں سے شمع رُو
تو بھی تو یکہ کیا تری جلتی نہیں زباں

کل عہد کچھ کیا تھا۔ دیا قول آج کچھ
پھر کہیو تو کہ میری بدلتی نہیں زباں

سرگرم سوز عشق رہے ہے یہ مثل شمع
تن گھل گیا ہے اور پگھلتی نہیں زباں

سو سو طرح سے کرتا ہوں تقریر میں حسنؔ
عہدہ سے حال دل کے نکلتی نہیں زباں

وہ جب تک کہ زلف سنوارا کیا
کھڑا اس پہ میں جان وارا کیا

ابھی دل کو لے کر گیا میرے آہ
وہ چلتا رہا میں پکارا کیا

قمارِ محبت میں بازی سدا
وہ جیتا کیا اور میں ہارا کیا

کیا قتل اور جان بخشی بھی کی
حسنؔ اُس نے احسان دوبارہ کیا

سیّد انشاء اللہ خاں

انشاء تخلص۔ سید انشاء اللہ خاں نام۔ بیٹے حکیم **میر ماشاء اللہ خاں** کے تھے۔[1] اگرچہ خاندان کے اعتبار سے بھی نامی گرامی شخص تھے۔ مگر ان کی اپنی ناموری نے باپ کے نام کو بلکہ خاندان کو نئی شہرت سے جلوہ دیا۔ بزرگ ان کے ہندوستان میں نجف اشرف سے آئے تھے اور بعض کہتے ہیں کہ خطۂ کشمیر کے سادات صحیح النسب سے ہیں۔ وہاں کسی زمانہ میں سمرقند سے آئے تھے۔ پھر دلی میں آکر سکونت اختیار کی۔ رفتہ رفتہ اُمرائے شاہی میں داخل ہوئے اور بعض ان میں طبل و نقارہ سے بلند آوازہ ہوئے۔ بموجب پیشہ خاندانی کے میر ماشاء اللہ خاں دربار شاہی میں طبیب تھے اور زُمرۂ اُمرا میں داخل تھے۔ اُن کے خاندان کی خوبیوں اور گھر کے چال چلن کو دلّی اور لکھنؤ کے شرفا سب مانتے تھے۔ ادنیٰ نمونہ یہ ہے کہ ان کے ہاں عورتوں کی پوشاک گھر میں دھوئے تھے یا جلا دیتے تھے۔ دھوبی کو نہ دیتے تھے کہ نامحرم کے ہاتھ میں عورتوں کا لباس نہ جائے +

غرض سلطنت چغتائیہ کے ضعف میں میر ماشاء اللہ خاں کو مرشد آباد جانا پڑا۔ وہاں بھی اعزاز و اکرام سے رہے اور جس طرح اگلے وقتوں میں خاندانی امیرزادے تعلیم پاتے تھے اسی طرح سید انشا کو سب ضروری علوم و فنون سے ماہر کیا۔ باپ کے لئے

[1] مصدر تخلص کرتے تھے۔ مصدر اور انشا کی مناسبت قدرتی واقع ہوئی۔ مصدر بدیہہ گوئی میں مشہور تھے۔ ایک شعر اُن کا بھی یاد رکھنا چاہیئے ؎ خدا کرے کہ مرا مجھ سے مہرباں نہ پھرے + جہاں پھرے تو پھرے تو پر دُجان جان پھرے
اخلاق ۔ مروّت ۔ سخاوت میں آشنا و بیگانہ کے ساتھ برابر تھے۔ امیر الامرا نواب ذوالفقار خاں کے عہد میں دلّی میں آئے تھے۔ اُس وقت سامان امارت کے ساتھ دو ہاتھی بھی ساتھ تھے۔ مرشد آباد میں نواب سراج الدولہ کی رفاقت میں تھے تو ۱۸ ہاتھی دروازہ پر جھومتے تھے۔ سید انشا وہیں پیدا ہوئے تھے +

مثال دے سکتے ہیں کہ عزیز بیٹے کو اس خوبصورتی سے تعلیم کیا مگر بیٹا جو جوہر دار طبیعت اپنے ساتھ لایا تھا۔ اُس کی کوئی مثال نہیں ہے۔ جب یہ ہونہار نونہال تعلیم کے چمن سے نکلا، تو ہر ریشہ میں کونپل۔ پتّے۔ پھول پھل کی قوائے مختلفہ موجود تھیں۔ اس طرح کہ جس سرزمین پر لگے وہیں کی آب وہوا کے بموجب بہار دکھلانے لگے۔ ایسا طباع اور عالی دماغ آدمی ہندوستان میں کم پیدا ہوا ہو گا۔ وہ اگر علوم میں کسی ایک فن کی طرف متوجہ ہوتے تو صدہا سال تک وحید عصر گنے جاتے۔ طبیعت ایک ہیولیٰ تھی کہ ہر قسم کی صورت پکڑ سکتی تھی۔ باوجود اس کے شوخی[1] اس قدر کہ سیماب کی طرح ایک جا قرار نہ تھا۔ چنانچہ کلیات ان سب مراتب کے لئے محضر شہادت ہے۔ ان کی طبیعت جو شیر کی طرح کسی کا جھوٹا شکار نہ کھاتی تھی۔ پیشہ آبائی پر مائل نہ ہوئی لیکن چونکہ ایسے رنگارنگ خیالات کا سوائے شاعری کے اور فن میں گزارہ نہیں اس لئے شاعری کی طرف جُھکے جس سے انھیں ربط خداداد تھا۔ اس کوچہ میں بھی اپنا رستہ سب سے جُدا نکال کر داخل ہوئے +

اُنھوں نے کسی سے اصلاح نہیں لی۔ والد کو ابتدا میں کلام دکھایا۔ حق یہ ہے کہ شعر شاعری کا کوچہ جہان سے نرالا ہے۔ جو لوگ ذہن کے بھدّے ہیں ان کے لئے تو اُستاد کی محنت ہی برباد ہے۔ مگر یاد رہے کہ جس قدر مبتدی زیادہ تیز و طباع ہو اُتنا ہی زیادہ اُستاد کا محتاج ہے۔ جیسے ہونہار بچھیرا کہ اچھے چابک سوار کے کوڑے تلے نکلتا ہے جب ہی جوہر نکالتا ہے نہیں تو بے ڈھنگے ہاتھ پاؤں مارتا ہے بلکہ بد ہو جاتا ہے اسی طرح تیز اور نوجوان طبیعت زبردست استاد کے قلم کے نیچے نہ نکلے تو گمراہ ہو جاتی ہے۔ چنانچہ پرکھنے والوں نے عرفی کے کلام میں یہی کھوٹ نکالی ہے۔ الغرض جب ہندوستان میں تباہی عام ہوئی تو سید انشا مرشد آباد سے دلّی میں آئے۔ اُس وقت

---

[1] لڑکپن میں طالب علمی کرتے تھے۔ مگر ساتھ ہی گانے کا بھی شوق تھا۔ کافیہ حفظ کرتے تھے اور ستار پر بجاتے تھے اَلْکَلِمَۃُ لَفْظٌ وُضِعَ لمعنی مفرداً دِ دُ +

دلی کا دربار ایک ٹوٹی پھوٹی درگاہ اور سجادہ نشین اُس کے شاہ عالم بادشاہ تھے۔ شاہ موصوف نے کہ خود بھی شاعر تھے۔ خواہ قدردانی شاعرانہ سے خواہ اُس نظر شفقت سے جو بادشاہوں کو اپنے خانہ زادوں سے چاہیے (اور یہ خاندان تیموریہ کا خاصہ تھا) اس نوجوان پر خلعت عزت کے ساتھ شفقت کا دامن اُڑھایا۔ سید انشا اہل دربار میں داخل ہوئے۔ چنانچہ اپنے اشعار کے ساتھ لطایف وظرایف سے کہ ایک چمن زعفران تھا گل افشانی کرکے محفل کو لُٹا لُٹا دیتے تھے۔ اور یہ عالم ہوا کہ شاہ عالم کو ایک دم جُدائی اُن کی ناگوار ہوگئی +

سید انشا اور اہل دہلی کے معرکے

دلی میں اُس وقت سودا اور میر جیسے لوگ نہ تھے۔ مگر بڈھے بڈھے شوقین تھے۔ کہ ان ہی بزرگوں کے نام لینے والے تھے۔ مثلاً حکیم ثناءاللہ خاں فراق شاگرد میر درد حکیم قدرت اللہ خاں قاسم شاگرد خواجہ میر درد۔ شاہ ہدایت۔ میاں شکیبا شاگرد میر۔ میاں عظیم بیگ شاگرد سودا۔ میر قمرالدین منت والد میر ممنون ساکن سونی پت۔ شیخ ولی اللہ محب[1] وغیرہ حضرات تھے کہ دربار بادشاہی سے خاندانی اعزاز رکھتے تھے۔ اور خاص و عام انھیں چشم ادب سے دیکھتے تھے۔ اگرچہ یہ لوگ نوشت و خواند میں پختہ مگر بعض ان میں سے اپنے اپنے فن میں بھی کامل ہوں مگر وہ جامعیت کہاں۔ اور جامعیت بھی ہو تو وہ بچارے بڈھے پراتم پُرانی لکیروں کے فقیر۔ یہ طبیعت کی شوخی۔ زبان کی طراری۔ تراشوں کی نئی پھبن۔ ایجادوں کا بانکپن کہاں سے لائیں۔ غرض رشک بھی تلامیذ رحمانی کا خاصہ ہے یا تو غریب الوطن نوجوان کو بے رفیق و بے یار سمجھ کر کہن سال مشاقوں نے کچھ تعریضیں کیں۔ یا یہ کہ مشاعرہ میں اس بلند نظر کے حسب دلخواہ اس کے کلام کی عزت نہ ہوئی۔ بہرحال سید انشا کو شبہہ ہوا کہ میری مخالفت پر سب دلی والے موافق ہوگئے +

مرزا عظیم بیگ کا معرکہ

اگرچہ یہ بزرگ بھی پُرانے مشاق تھے مگر وہ نوجوان شہباز جس کے سینہ میں

[1] سودا کے شاگرد تھے۔ اقسام سخن سے دیوان آراستہ کیا تھا۔ مرزا سلیمان شکوہ کی غزل بنایا کرتے تھے۔ وہ لکھنؤ گئے تو چند روز بعد یہ بھی گئے۔ اور وہیں دنیا سے گئے +

علوم و فنون کے زور بھرے تھے۔ اور طراری اور براقی کے بازو اُڑائے لئے جاتے تھے۔ کسی کو خاطر میں کب لاتا تھا۔ خدا جانے طرفین نے زبان سے کیا کچھ کہا ہوگا۔ مگر غزلوں کے مقطع میں فخریہ چشمکیں ہونے لگ گئیں اور ساتھ ہی نکتہ چینی کی عینکیں لگ گئیں۔ ان میں مرزا عظیم بیگ تھے کہ سودا کے دعویٰ شاگردی اور پرانی مشق کے گھمنڈ نے ان کا دماغ بہت بلند کر دیا تھا۔ وہ فقط شدبد کا علم رکھتے تھے مگر اپنے تئیں ہندوستان کا صائب کہتے تھے اور خصوصاً ان معرکوں میں سب سے بڑھ کر قدم مارتے تھے۔ چنانچہ وہ ایک دن میر ماشاءاللہ خاں کے پاس آئے اور غزل سُنائی کہ بحرِ رجز میں تھی۔ مگر ناواقفیت سے کچھ شعر رمل میں جا پڑے تھے۔ سید انشا بھی موجود تھے۔ تاڑ گئے۔ حد سے زیادہ تعریف کی اور اصرار سے کہا کہ مرزا صاحب اسے آپ مشاعرہ میں ضرور پڑھیں۔ مدعی کمال کہ مغزِ سخن سے بیخبر تھا۔ اُس نے مشاعرہ[1] عام میں غزل پڑھ دی۔ سید انشا نے وہیں تقطیع کی فرمائش کی۔ اُس وقت اُس غریب پر جو گزری سو گزری مگر سید انشا نے اُس کے ساتھ سب کو لے ڈالا۔ اور کوئی دم نہ مار سکا۔ بلکہ ایک مخمس بھی پڑھا جس کا مطلع یہ ہے:۔

گر تو مشاعرہ میں صبا آج کل چلے کہیو عظیم سے کہ ذرا وہ سنبھل چلے
اتنا بھی اپنی حد سے نہ باہر نکل چلے پڑھنے کو شب جو یار غزل در غزل چلے
بحرِ رجز میں ڈال کے بحرِ رمل چلے

اگرچہ مرزا عظیم بیگ نے بھی گھر جا کر اسی مخمس کی طرح میں اپنی بساط بموجب دل کا بخار نکالا مگر وہ مشت بعد از جنگ تھی۔ چند بند اُس کے انتخاباً لکھتا ہوں۔ کیونکہ اور بند بسبب بے لطفی اور نادرستی کے قابلِ تحریر بھی نہیں۔ مرزا عظیم بیگ کہتے ہیں ؎

[1] نواب امین الدولہ معین الملک ناصر جنگ عرف مرزا میڈھو۔ امیر تخلص خلف وزیر الممالک نواب شجاع الدولہ چند روز دلّی میں آکر رہے تھے۔ اخلاق۔ مروّت۔ سخاوت میں ایسے تھے جیسا کہ وزیرزادوں کو ہونا چاہیے۔ مشاعرہ میں شعرا اور اکثر امرا و شرفا کی ضیافت بھی کرتے تھے۔ اُن ہی کے ہاں یہ معرکہ ہوا تھا +

وہ فاضلِ زمانہ ہو تم جامعِ علوم　تحصیل صرف و نحو سے جن کی مچی ہے دھوم
رمل و ریاضی حکمت و ہیئت جفر نجوم　منطق بیاں معانی کہیں سب زمیں کو چوم
تیری زباں کے آگے نہ دہقاں کا ہل چلے

اک دو غزل کے کہنے سے بن بیٹھے ایسے طاق　دیوان شاعروں کی نظر سے رہے بہ طاق
ناصر علی نظیری کی طاقت ہوئی ہے طاق　ہر چند ابھی نہ آئی ہے فہمید جفت و طاق
ٹنگڑی تلے سے عرفی و قدسی نکل چلے

تھا روز فکر بس کہ کہوں معنی و مثال　تجنیس و ہم رعایت لفظی و ہم خیال
طرق رجز رمل نہ لیا ہس کے گو سنبھال　نادانی کا مرے نہ ہو دانا کو احتمال
گو تم بقدر فکر یہی کر عمل چلے

از بسکہ اپنے آپ کو کتنا ہی سمجھو دُور　یہ خوب جانتے ہیں مجھے جو ہیں ذی شعور
وہ بحر کون سی ہے نہیں جس پہ یاں عبور　کب میری شاعری میں پڑے شبہہ سے قصور
بن کر قمل[1] نکالنے کو تم خلل چلے

موزونی و معانی میں پایا نہ تم نے فرق　تبدیل بحر سے ہوئے بحرِ خوشی میں غرق
روشن ہے مثلِ مہر یہ از غرب تا بہ شرق　شہ زور اپنے زور میں گرتا ہے مثلِ برق
وہ طفل کیا گرے گا جو گھٹنوں کے بل چلے

کم ظرفی سے تمھیں تو یہی آئی ہے اُمنگ　کیجے نمود خلق میں اب کر سخن کی جنگ
اپنے تئیں تو بخشتے آتا ہے یار ننگ　اتنا بھی رکھیے حوصلہ فوارہ سان تنگ
چلو ہی بھر جو پانی میں گز بھر اُچھل چلے

کیوں جنگ گفتگو کو تم اُٹھ دوڑے اس قماش　کرتے جو بھاری پائچہ ہوتا نہ پردہ فاش
پر سمجھیں کب یہ بات جو کندے ہوں ناتراش　تیغِ زباں کو میاں میں رکھئے تم اپنے کاش
ناحق جو تم ازار سے باہر نکل چلے

اب سید انشا کے طائر فخر کی بلند پروازی اور زیادہ ہوئی۔ ہر غزل میں مضامین فخریہ کا

[1] جوں۔

جوشش ہونے لگا[1]۔ یہاں تک کہا کہ میرا اور ان لوگوں کا کلام ایسا ہے جیسے کلام الٰہی اور مسیلمہ کذاب کا الفیل ما الفیل +

بادشاہ تک نوبت پہنچ گئی

مشاعرہ میں بادشاہ بھی اپنی غزل بھیجا کرتے تھے اور بادشاہوں کا کلام جیسا ہوتا ہے وہ ظاہر ہے۔ سید انشا نے حضور میں عرض کی کہ فلاں فلاں اشخاص حضور کی غزل پر تمسخر اور مضحکہ کرتے ہیں۔ بادشاہ اگرچہ ان خانہ زادان قدیم پر ہر طرح قدرت رکھتے تھے۔ مگر اتنا کیا کہ مشاعرہ میں غزل بھیجنی موقوف کردی۔ یاروں کو بھی خبر لگ گئی نہایت رنج ہوا چنانچہ بعد اس کے جو مشاعرہ ہوا[2] تو اس میں کمریں باندھ باندھ کر آئے۔ اور ولی اللہ محب نے یہ قطعہ پڑھا ؎

مجلس میں ٹھکے چاہئے جھگڑا شعرا کا ایسے ہی کسی صاحب توقیر کے آگے

یہ بھی کوئی دانش ہے کہ پہنچے یہ قضایا اکبر تئیں یا شاہ جہانگیر کے آگے

مرزا عظیم بیگ نے کہا بابا میں نے اپنی عرض حال میں اپنے استاد کے ایک شعر پر قناعت کی ہے کہ ابھی تضمین ہو گیا ؎

عظیم اب گو ہمیشہ سے ہے یہ شعر کہنا شعار اپنا طرف ہر اک سے ہو بحث کرنا نہیں ہے کچھ افتخار اپنا

کئی سکھن باز کھنڈ گویوں میں ہو نہ ہوا اعتبار اپنا جنھوں کی نظروں میں ہم سبک ہیں دیا انھیں کو وقار اپنا

عجب طرح کی ہوئی فراغت گدھوں پہ ڈالا جو بار اپنا

دریائے مواج کے آگے گھاس پھوس کی کیا حقیقت تھی۔ **سید انشا غزل** فخریہ کہہ کر لائے تھے وہ پڑھی جس کا ہر شعر دلوں پر توپ کے گولہ کا کام کرتا تھا +

[1] پھر تو مرزا کا یہ عالم ہو گیا کہ حکیم صاحب کے سنائے بغیر مصرع کسی کے سامنے نہ پڑھتے۔ سناتے وقت کہتے۔ بابا دیوار گوش دارد اور چپکے چپکے پڑھا کرتے +

[2] یہ مشاعرہ ایک خطرناک معرکہ تھا۔ حریفوں نے تیر و تفنگ اور اسلحہ جنگ سنبھالے تھے بھائی بند اور دوستوں کو ساتھ لیا تھا۔ بعض کو ادھر ادھر لگا رکھا تھا۔ اور بزرگان دین کی نیازیں مان مان کر مشاعرہ میں گئے تھے +

اک طفل دبستاں ہے فلاطوں مرے آگے — کیا منہ ہے ارسطو جو کرے چوں مرے آگے

کیا مال بھلا قصر فریدوں مرے آگے — کانپے ہے پڑا گنبدِ گردوں مرے آگے

مرغان اولی اجنحہ مانند کبوتر — کرتے ہیں سدا عجز سے غوں غوں مرے آگے

منہ دیکھو تو نقارچی پیل فلک بھی — نقارے بجا کر کہے دوں دوں مرے آگے

ہوں وہ جبروتی کہ گروہِ حکما سب — چڑیوں کی طرح کرتے ہیں چوں چوں مرے آگے

بولے ہے یہی خامہ کہ کس کس کو میں باندھوں — بادل سے چلے آتے ہیں مضموں مرے آگے

مجرے کو مرے خسرو پرویز ہو حاضر — شیریں بھی کہے آکے بلاؤں مرے آگے

کیا آکے ڈرا دے مجھے زلفِ شب یلدا — ہے دیو سپید سحری جُوں مرے آگے

وہ بام فلک کا کہکشاں نام ہے جس کا — کیا دخل جو بُل کھاکے کرے نوں مرے آگے

بعد اُن کے حکیم میر قدرت اللہ خاں قاسم کے سامنے شمع آئی۔ انھوں نے اتنا کہا کہ سیّد صاحب ذرا اس الفیل مالفیل کو بھی ملاحظہ فرمائیے۔ میر مشاعرہ[1] کو خیال ہوا کہ سیّد انشا کی ہجو کہی ہوگی۔ مبادا شرفا میں بے لطفی حد سے بڑھ جائے اُسی وقت اُٹھے کہ دونوں میں صلح کرادیں۔ سیّد انشا نے بھی شرافت خاندانی اور علوّ حوصلہ کا کام کیا۔ اُٹھ کر حکیم صاحب کے گلے لپٹ گئے اور کہا کہ حضرت حکیم صاحب! آپ میرے بنی عم۔ اس پر صاحب علم۔ صاحب فضل۔ خاک بدہنم۔ بھلا میں آپ پر طنز کروں گا۔ البتہ مرزا عظیم بیگ سے شکایت ہے کہ وہ خوا مخواہ بددماغی کرتے ہیں۔ اور داد دینی تو درکنار۔ شعر پر سر تک نہیں ہلاتے۔ آخر کس برتے پر۔ غرض کہ سب کی صلح پر خاتمہ ہوگیا ٭

بادشاہ اور سید انشا کے ناز و نیاز

دلی میں اگرچہ بادشاہ اُس وقت فقط بادشاہ شطرنج تھا یہاں تک کہ مال و دولت کے ساتھ

[1] نواب کے اخلاق کا یہ عالم تھا کہ پہلے مسند تکیہ لگا کر جلسہ میں بیٹھا کرتے تھے۔ مرزا عظیم بیگ نے اپنے دوستوں سے کہا کہ ہمیں کیا غرض ہے جو مسند نشینوں کے جلسوں میں جاکر حاشیہ نشین بنیں۔ نواب نے بہت عار سے کہلا بھیجا کہ آپ صاحب تشریف لائیں کچھ مضائقہ نہیں میں بھی احباب کے ساتھ چاندنی پر بیٹھوں گا۔ اُس دن سے مسند اٹھا ڈالی۔ ہرچند اکثر اعزہ اور شرفا نے کہا۔ ہرگز نہ مانا۔ سب کے برابر بیٹھتے رہے ٭

غلام قادر نابکار نقد بصارت تک بھی لے گیا تھا۔ مگر یہ اپنا مطلب ہزار طرح سے نکال لیتے تھے۔ مثلاً جمعرات کا دن ہوتا تو باتیں کرتے کرتے دفعتاً خاموش ہوتے اور کہتے کہ۔ پیر و مرشد غلام کو اجازت ہے؟ بادشاہ کہتے۔ خیر باشد۔ کہاں؟ کہاں؟ یہ کہتے۔ حضور آج جمعرات ہے۔ غلام۔ نبی کریم جائے۔ شاہ دین و دنیا کا دربار ہے کچھ عرض کرے۔ شاہ عالم بہ ادب کہتے کہ ہاں ہاں بھئی ضرور چاہئے۔ سید انشاء اللہ خاں ہمارے لئے بھی کچھ عرض کرنا۔ یہ عرض کرتے کہ حضور! غلام کی اور آرزو کون سی ہے؟ یہی دین کی آرزو۔ یہی دُنیا کی مراد؟ یہ کہہ کر پھر خاموش ہوتے۔ بادشاہ کچھ اور بات کرنے لگتے۔ ایک لحہ کے بعد پھر یہ کہتے کہ پیر و مُرشد! پھر غلام کو اجازت ہو۔ بادشاہ کہتے کہ ہیں اے بھئی میر انشاء اللہ خاں ابھی تم گئے نہیں؟ یہ کہتے حضور بادشاہ عالیجاہ کے دربار میں غلام خالی ہاتھ کیونکر جائے۔ کچھ نذر و نیاز۔ کچھ چراغی کو تو مرحمت ہو! بادشاہ کہتے ہاں بھئی درست درست! مجھے تو خیال ہی نہیں رہا۔ جیب میں ہاتھ ڈالتے اور کچھ روپے نکال کر دیتے۔ میر انشاء اللہ لیتے اور ایک دو فقرہ دعائیہ کہہ کر پھر کہتے کہ حضور دوسری جیب میں بھی دست مبارک جائے تو فدوی کا کام چلے کیونکہ وہاں سے پھر کر بھی تو آنا ہے۔ بادشاہ کہتے کہ ہاں ہاں بھئی سچ ہے سچ ہے۔ بھلا وہاں سے دو دو کھجوریں تو کسی کو لا کر دو۔ بال بچے کیا جانیں گے کہ آج تم کہاں گئے تھے۔ اگرچہ ان فقروں سے یہ کام نکال لیتے تھے لیکن پھر کب تک؟ آخر دلّی سے دل اُچاٹ ہوا۔ لکھنؤ میں آصف الدولہ کی سخاوتوں نے حاتم کے نام کا خاتمہ کر دیا تھا اور لوگ بھی کمال کے ایسے جویا تھے کہ جو دلّی سے گیا پھر نہ آیا۔ اس لئے اُدھر کا رُخ کیا۔ جاتے ہی علم و فضل کے زور اور کمال کے شور سے توپ خانے لگا دئے کہ تمام مشاعرے گونج اُٹھے۔ اور اسی نمک خواری قدیم کے سلسلہ سے مرزا سلیمان شکوہ کی سرکار میں پہنچے۔ وہ شاہ عالم کے بیٹے تھے۔ باپ دادا کے خانہ زادوں پر شفقت واجب تھی۔ اس کے علاوہ شاعر بھی تھے۔ چنانچہ عام اہل دہلی کے علاوہ شعرا کا مجمع دونوں وقت

انشا ... پہنچے

اُن کے ہاں رہتا تھا۔ سودا۔ میر ضاحک ۔میر سوز وغیرہ کا ورق زمانہ اُلٹ چکا تھا۔ مصحفی۔ جرأت ۔ مرزا قتیل وغیرہ شاعروں اور شعر فہموں کے جلسے رہتے تھے۔ جو محفل ایسی گلشن فصاحت کے گلدستوں سے سجائی جاوے وہاں کی رنگینیاں کیا کچھ ہوں گی۔ جی چاہتا تھا کہ اُنکی باتوں سے گلزار کھلادوں مگر اکثر پھول ایسے فحش کے کانٹوں میں اُلجھے ہوئے ہیں کہ کاغذ کے پُرزے ہوتے جاتے ہیں۔ اس لئے صفحہ پر پھیلاتے ہوئے ڈر لگتا ہے +

پہلے مرزا سلیماں شکوہ مصحفی سے اصلاح لیا کرتے تھے۔ جب سید انشا پہنچے تو مصحفی کا مصحف طاق پر رکھا گیا۔ بزرگوں سے سُنا اور طرز کلام سے بھی معلوم ہوتا ہے کہ شاہزادہ موصوف کے سر دیوان کی غزل اور اکثر اور غزلیں بھی سید ممدوح کی اصلاح کی ہوئی یا کہی ہوئی ہیں۔ چنانچہ پہلا ہی مطلع اِس مطلب کو روشن کرتا ہے ؎

دل اب تو عشق کے دربار میں ڈالا تَوَکَّلْتُ عَلَی اللہِ تعالےٰ

کیونکہ سید انشا ایسی تضمینوں کے بادشاہ تھے +

سید انشا اگرچہ شاہزادۂ موصوف اور تمام اُمرا و رؤسا کے درباروں میں معزز و مکرم تھے۔ مگر ہمت عالی کا عقاب ہمیشہ اپنے پروں کو دیکھتا رہتا تھا ۔ وہاں تفضل حسین[1] خاں ایک شخص تھے کہ بعد ابوالفضل اور سعداللہ[2] خاں شاہجہانی کے

خان علا

[1] بلکہ وزیر علی خاں کی مسند نشینی میں اُن کی مختاری داخل تھی۔ اور پھر وزیر علی خاں کا اخراج اور سعادت علی خاں کی مسند نشینی بھی اُن ہی کی حسن تدبیر سے ہوئی تھی ۔ انھوں نے انگریزی اور لاطینی زبان بھی سیکھی تھی۔ نیوٹن صاحب کے ڈفرسل وغیرہ کا ترجمہ فارسی میں کیا تھا اور کئی دفعہ کلکتہ گئے تھے +

[2] یہ چنیوٹ کے رہنے والے اور عبدالحکیم سیالکوٹ کے رہنے والے تھے ۔ دونوں گمنام گھروں کے لڑکے تھے اور ساتھ پڑھتے تھے۔ عبدالحکیم اگرچہ اوّل سبق میں پیش قدم تھے۔ مگر قسمت کے یہی پیش قدم نکلے۔ یہاں تک کہ پڑھتے پڑھتے شاہجہاں کے وزیر ہوگئے اور علامہ کا خطاب علم و فضل کی شہرت پر طرہ ہوا۔ سوائے نام کے کوئی تصنیف کا نام نہیں چھوڑا۔ البتہ شاہجہاں نامہ میں ایک مراسلہ اُن کا لکھا ہوا ہے مگر علامہ ابوالفضل کے کلام سے نسبت بھی نہیں۔ چنیوٹ میں ایک مسجد ہے اُس کے مناو ہلانے سے ہلتے ہیں۔ کہتے ہیں کہ سنگ لرزاں کے ہیں +

علامہ کا خطاب اگر ہوا تو ان کے لئے تسلیم ہوا ہے وہ اپنے علم اور حسن تدبیر سے ادھر معتمد سرکار انگریزی کے ادھر رکن سلطنت لکھنؤ کے اور مشیر تدبیر سعادت علی خاں کے تھے۔ ان کی صحبت میں ایک مجموعہ فضل و کمال کا تھا۔ وہاں سید انشا بھی جایا کرتے تھے۔ وہ بھی ان کی لیاقت اور خاندان کے لحاظ سے پہلوئے عزت میں جگہ دیتے تھے۔ اور فکر میں تھے کہ کوئی مناسب حال صورت نکالیں۔ ایک دن جوش تقریر میں سید انشا ایک لفظ بول گئے کہ اُس کے دو معنی تھے مگر اردو میں جو معنی ہیں وہ اس قابل نہیں کہ ایسے جلسوں میں ذکر آئے۔ چونکہ یہ خود بھی مزاج شناسی کے ارسطو تھے اس لئے کہتے تو کہہ گئے مگر خان علامہ کی نظر تاڑ کر بولے کہ زبان مارواڑی میں بیوقوف کو کہتے ہیں۔ اُنھوں نے کچھ سوچ کر کہا کہ خیر خان صاحب! انداز معلوم ہو گیا جلد کوئی صورت ہو جائے گی۔ انشاء اللہ تعالیٰ۔ دوسرے ہی دن سعادت علی خاں سے اُن کی بزرگی اور اُن کے ذاتی کمالات کا ذکر کر کے کہا۔ کہ آپ کی صحبت میں اُن کا ہونا شغل صفرائے وکبرائے سے بہتر ہوگا۔ وہ سُن کر مشتاق ہوئے۔ دوسرے دن خاں صاحب سید انشا کو لے گئے اور ملازمت ہوتے ہی ایسے شیر و شکر ہوئے کہ پھر نواب کو اُن کے سوا کسی کی بات میں مزا ہی نہ آتا تھا۔

اس میں شک نہیں کہ تہذیب طبعی کی آگ اور شوق انتظام نے نواب کے دماغ کو خشک کر دیا تھا۔ مگر جیتی جان کے لئے شگفتگی کا بھی ایک وقت ضرور ہوتا ہے۔ اور سید انشا تو وہ شخص تھے کہ ہر بزم میں گلدستہ اور ہر چمن میں پھول۔ چنانچہ کوئی خاص خدمت نہیں حاصل کی۔ مگر درباداری کے ساتھ ہر دم کی مصاحبت تھی۔ اس عالم میں انھوں نے عامہ خلایق خصوصاً اہل کمال اور اہل خاندان کی کار برآری سے نیکی اور نیک نامی کی دولت کمائی کہ جس سے زیادہ کوئی خزانہ نہیں ہو سکتا۔ ہزاروں کو مراتب اعلیٰ پر پہنچا دیا۔ مگر آپ شاعر ہی رہے۔ چنانچہ عنقریب اُن کے حال سے کچھ اشارے معلوم ہوں گے ۔

زمانہ کا دستور ہے کہ صحت میں سے بیماری اور زندگی میں سے موت پیدا کر دیتا ہے۔ اسی مصاحبت سے ہنسی ہنسی میں مخالفت پیدا ہو گئی جس کا انجام یہ ہوا کہ وہ چہکتا ہوا بلبل اپنے گھر کے پنجرے میں بند کیا گیا۔[1] اور وہاں سے اس گمنامی کے ساتھ زمین کا پیوند ہوا کہ کسی کو خبر نہ ہوئی۔ بسنت سنگھ نشاط کی تاریخ سے معلوم ہوتا ہے کہ ۱۲۳۳ھ میں فوت ہوئے۔ تاریخ :-

خبرِ انتقال میر انشا		دلِ غمدیدہ تا نشاط شنفت

سال تاریخ او ز جانِ اجل		عرنی وقت بود انشا گفت

۱۲۳۳ = ۱۲۳۰ + ۳

قصائف کی تفصیل

اِن کے حالات سے معلوم ہوتا ہے کہ تصنیفات کا ذخیرہ بہت کچھ ہوگا مگر جو میری نظر سے گذرا ہے ان میں سے ایک کُلیّات ہے اس میں (۱) اردو غزلوں کا دیوان تمام و کمال (۲) دیوان ریختی اور ریختی میں پہیلیاں اور مستزاد۔ طلسمات کے نسخے قواعد پشتو (۳) قصائد اردو۔ حمد۔ نعت۔ مدح بزرگان دین۔ مدح بادشاہ دہلی اور تعریف اُمرا میں (۴) قصائد بزبان فارسی (۵) دیوان غزل ہائے فارسی تمام ہے مگر مختصر ہے (۶) مثنوی شیر برنج فارسی میں (۷) مثنوی فارسی بے نقط اس کی سُرخیوں کے بھی مصرع بے نقط ہیں۔ (۸) شکار نامہ نواب سعادت علی خاں کا بزبان فارسی۔ (۹) ہجویں۔ گرمی۔ بھڑوں۔ کھٹملوں۔ مکھیوں۔ پسوؤں وغیرہ کی شکایت میں اور متفرق اشخاص کی ہجویں۔ (۱۰) مثنوی عاشقانہ (۱۱) ہاتھی اور چنچل پیاری ہتھنی کی شادی۔ (۱۲) متفرق اشعار۔ معمّے۔ رباعیاں۔ قطعے فارسی اُردو وغیرہ۔ تاریخیں جن میں اکثر مادّے قابل یاد رکھنے کے ہیں۔ پہیلیاں۔ چیستانیں (۱۳) دیوان بے نقط (۱۴) مأتہ عامل زبان عربی کی فارسی میں (۱۵) مرغ نامہ اُردو میں۔ مُرغ بازی کے قواعد مثنوی کے طور پر لکھے ہیں۔ مگر جو اپنے تسخر کے قواعد ہیں وہ اس میں نہیں بھولے +

---

[1] تبتل کے رقعوں سے معلوم ہوتا ہے کہ ۱۲۲۵ھ میں وہ موقوف ہو کر خانہ نشین ہوئے تھے مگر معلوم نہیں ہوتا کہ یہی آخری خانہ نشینی تھی۔ یا بعد اُس کے پھر بھی بحال ہو گئے +

۲۔ **دریائے لطافت**۔ قواعد اُردو۔ منطق۔ معانی۔ بیان وغیرہ میں +

۳۔ **ایک داستان** نثر اُردو میں ایسی لکھی ہے کہ ایک لفظ بھی عربی فارسی کا نہیں آنے دیا باوجود اس کے اُردو کے رُتبہ سے کلام نہیں گرا۔ ہاں وہی چوچلے وہی چہلیں اُس میں چلی جاتی ہیں۔ مقدار میں ۵۰ صفحہ کی ہو گی۔ تھوڑی عبارت نمونہ کے طور پر لکھتا ہوں :۔

"اب یہاں سے کہنے والا یوں کہتا ہے۔ ایک دن بیٹھے بیٹھے یہ بات اپنے دھیان چڑھی کوئی کہانی ایسی کہئے جس میں ہندی چھٹ اور کسی بولی کی پٹ نہ ملے۔ باہر کی بولی اور گنواری کچھ اس کے بیچ میں نہ ہو۔ تب میرا جی پھول کر کلی کے روپ کھلے۔ اپنے ملنے والوں میں سے ایک کوئی بڑے پڑھے لکھے پرانے دُھرانے ٹھاگ بڑے ڈھاگ یہ کھڑاگ لگائے سر ہلا کر مُنہ تھتا کر ناک بھوں چڑھا کر۔ گلا پُھلا کر۔ لال لال آنکھیں پتھرا کر کہنے لگے" یہ بات ہوتی دکھائی نہیں دیتی ہندوی پن بھی نہ نکلے۔ اور بھاکھا پن بھی نہ ٹھس جائے۔ جیسے بھلے مانس اچھوں سے اچھے لوگ آپس میں بولتے چالتے ہیں۔ جوں کا توں وہیں سب ڈول رہے اور چھاؤں کسی کی نہ پڑے۔ یہ نہیں ہونے کا۔ میں نے اُن کی ٹھنڈی سانس کی پھانس کا ٹھوکا کھا کر جھنجھلا کر کہا۔ میں کچھ ایسا بڑ بولا نہیں جو رائی کو پربت کر دکھاؤں اور جھوٹ سچ بول کر انگلیاں نچاؤں۔ اور بے سُری بے ٹھکانے کی اُلجھی سُلجھی تانیں لئے جاؤں۔ مجھ سے نہ ہو سکتا تو بھلا مُنہ سے کیوں نکالتا۔ جس ڈھب سے ہونا اس بکھیڑے کو ٹالتا۔ اب اس کہانی کا کہنے والا یہاں آپ کو جتاتا ہے اور جیسا کچھ اُسے لوگ پکارتے ہیں کہہ سُناتا ہے۔ اپنا ہاتھ مُنہ پر پھیر کر موچھوں کو تاؤ دیتا ہوں اور آپ کو جتاتا ہوں۔ جو میرے داتا نے چاہا تو وہ تاؤ بھاؤ اور راؤ چاؤ اور کود پھاند اور لپٹ جھپٹ دکھاؤں۔ آپ کے دھیان کا گھوڑا جو بجلی سے بھی بہت چنچل اچپلاہٹ میں ہے۔ دیکھتے ہی ہرن کے روپ اپنی

چوکڑی بھول جائے۔ **چوتکا**

گھوڑے پہ اپنے چڑھ کے آتا ہوں میں ۔۔۔ کرتب جو جو ہیں سب دکھاتا ہوں میں

اس چاہنے والے نے جو چاہا تو ابھی ۔۔۔ کہتا جو کچھ ہوں سو کر دکھاتا ہوں میں

غزلوں کا دیوان۔ عجب طلسمات کا عالم ہے۔ زبان پر قدرت کامل۔ بیان کا لطف۔ محاوروں کی نمکینی۔ ترکیبوں کی خوشنما تراشیں۔ دیکھنے کے قابل ہیں۔ مگر یہ عالم ہے کہ ابھی کچھ ہیں۔ ابھی کچھ ہیں۔ جو غزلیں یا غزلوں میں اشعار بااصول ہو گئے۔ وہ ایسے ہیں کہ جواب نہیں۔ اور جہاں طبیعت اور طرف جا پڑی۔ وہاں ٹھکانا نہیں۔ غزلوں میں غزلیت کے اصول کی پابندی نہیں۔ سبب یہ ہے کہ وہ سخن آفریں ایک ذخیرہ وافر مضامین و الفاظ کا اپنے پاس رکھتا تھا۔ اُس سے جس قسم کی مخلوق چاہتا تھا پیدا کر لیتا تھا۔ جس مشاعرہ میں انھوں نے یہ غزل طرح کی پڑھی ہے ؎

لگا کے برف میں ساقی صراحیِ مے لا ۔۔۔ جگر کی آگ بجھے جلد جس سے وہ شے لا

کُل پانچ شعر کی غزل تھی۔ جراُت اور مصحفی تک موجود تھے۔ مگر سب نے غزلیں ہاتھ سے رکھ دیں کہ اب پڑھنا بے حاصل ہے۔ ایک مستزاد کی طرح میں جب انھوں نے مسلسل تین غزلیں پڑھیں تو مشاعرہ میں ایک قیامت برپا ہو گئی تھی۔ مصحفی و جُراُت جب بھی موجود تھے اور غزلیں اب بھی حاضر ہیں۔ یہ عالم ہے جیسے مرصع زیور کے سامنے تنکوں کا کھیل۔ جراُت ایک موقع پر کہتے ہیں ؎

مستزاد بے مثال

اب تلک آنکھوں میں ساقی ہے نشہ چھایا ہوا ۔۔۔ چنپئی رنگ اُس کا اور جوبن وہ گدرایا ہوا

اور سید انشا کہتے ہیں ؎

برق چشمک زن ہے ساقی ابر ہے آیا ہوا ۔۔۔ جام مے دے تو کہ جی جاتا ہے مچلایا ہوا[1]

ریختی کا ایجاد

ریختی کا شوخ رنگ سعادت یار خاں رنگین کا ایجاد ہے مگر سید انشا کی طبع

---

[1] مقطع نے تو خانہ کردیا ہے دل لگایا ہے کہیں انشا نے شاید دوستو ؎ اِن دنوں آتا نظر ہے سخت گھبرایا ہوا ؎

رنگین نے بھی موجد سے کم سگھڑاپا نہیں دکھایا۔ یہ ظاہر ہے کہ عیش و نشاط اور صحبتِ اربابِ نشاط ایسی پلید باتوں کے حق میں وہ تاثیر رکھتی ہے جو نباتات کے حق میں کھات اثر کرتی ہے۔ چنانچہ دلی کے فاقہ مستوں میں کم اور لکھنؤ میں قرار واقعی ترقی اس کی ہوئی۔ قطع نظر وضع اور لباس کے۔ جان صاحب کا دیوان اس کا نمونہ موجود ہے۔ اس صورت میں زنانہ مزاجی اور بے ہمتی اور بزدلی جو عام لوگوں میں پیدا ہوئی اس کا ایک محرک اسی ایک ایجاد کو سمجھنا چاہیئے۔ اس انداز میں جو پہیلیاں اور طلسمات کے نسخے لکھے ہیں ان کا انداز بیان عجیب لطف دکھاتا ہے *

ہندوستان کی زبانیں ان کے گھر کی لونڈی تھیں

ہندوستان کی مختلف زبانیں اُن کے گھر کی لونڈی ہیں۔ ابھی پنجاب میں کھڑے ہیں ابھی پورب میں بیٹھے باتیں کرتے ہیں۔ ابھی برج باشی ہیں۔ ابھی مرہٹے۔ ابھی کشمیری۔ ابھی افغان۔ سب زبانوں میں کچھ نہ کچھ کہا ہے۔ یہاں پوربی کے دو شعر ہیں وہ لکھتا ہوں کہ قریب الفہم ہیں۔ مطلع و مقطع پوربی زبان میں :-

مِیتھکرڑی ہیں پھکر بھئی مبھت آئے کے   جھاؤ میاں کو بھنوئیہ جو ہنکس گھمائے کے
انساللہ کھان میاں ٹسے بھاجل جھینٔ ہیں   صدرہ پڑھیں ہیں جن سیتی طلسم آئے کے

ان کے الفاظ جو موتی کی طرح ریشم پر ڈھلکتے آتے ہیں اس کا سبب یہی کہہ سکتے ہیں کہ قدرتی فصاحت اور صفائی کلام کے سبب سے ہے۔ اور کلام کا بندوبست جو ارگن باجے کی کساوٹ رکھتا ہے یہ بندش کی چستی اور استخوان بندیِ الفاظ کی خوبی ہے مگر عجیب بات یہ ہے کہ اُن کی زبان جو فصاحت کا سانچہ ہے اس سے اگر بےمعنی الفاظ بھی ترکیب کھا کر نکلتے ہیں تو مزا ہی دیتے ہیں۔ یہ زیادہ تر ان ہجوؤں سے ثابت ہوتا ہے جو شیخ مصحفی کے معرکوں میں لکھیں اور یہاں شدت فحش کے سبب سے قلم انداز ہوئیں *

رائے قصائد پر

قصائد بڑی دھوم دھام کے ہیں۔ الفاظ کی شکوہ۔ طبیعت کی بلند پروازی کی کوئی حد نہیں مگر سیدھے چلتے چلتے ایک ایسی چال بدلتے ہیں کہ انسان حیران رہ جاتا ہے

وہ یہی بات ہے کہ اپنی زبان دانی کے جوش اور قوت بیانی کے مزے میں آکر کبھی کوئی شوخ مضمون۔ کبھی کوئی خوش آیندہ ترکیب اور نئی تراش ایسی سوجھ جاتی ہے کہ اُسے باندھے بغیر نہیں رہ سکتے۔ اور وہاں قصیدہ کی متانت اور وقار کے اصول ہاتھ سے جاتے رہتے ہیں۔ اس میں کبھی تو کلام میں شوخی اور ایک قسم کا بانکپن پیدا ہو جاتا ہے اور کبھی متبذل ہو جاتا ہے۔ مگر پھر لطف یہ ہے کہ قدرتی لذت جو زبان میں ہے وہ کلام کو بدمزہ نہیں ہونے دیتی۔ اور اسی واسطے جس دربار یا جلسہ میں قصیدہ پڑھتے تھے۔ سبحان اللہ اور واہ واہ کہنے کے سوا سُننے والوں کو ہوش نہ ہوتا تھا۔ اس بے اعتدالی کا یہ سبب تھا کہ طبیعت میں طاقت بہت تھی مگر اُس پر قابو نہ تھا۔ ان قصیدوں میں مزا وہاں آتا ہے جہاں ممدوح کی تعریف کرتے کرتے دفعتاً کہتے ہیں کہ دارائے ایران تجھے ایران میں بیٹھا کہہ رہا ہے اور جھٹ چند شعر فارسی کے اسی طرح کہہ جاتے ہیں۔ گویا ایک آغائے تازہ ولایت آیا اور اپنی چنین و چنان کے ساتھ شیرۂ شیراز کے دو دو گھونٹ سب کو پلا گیا۔ اس کے برابر ایک عَرَبُ الْعَرَبَا جبّہ پہنے۔ عبا اور عمامہ سجے سامنے آکھڑا ہوتا ہے۔ پھر شاہ بخارا ترکستان سے ترکی میں آواز دیتا ہے اور ساتھ ہی عالی جاہ کابل اپنی افغانی میں یہ کہتا ہے اور برج کی گوپیاں یوں کہتی ہیں۔ وغیرہ وغیرہ۔ اور پنجاب میں جھنگ سیالے کی جٹیاں یوں کہتی ہیں۔ وغیرہ وغیرہ۔ غرض اس بیان کی کیفیت ان کے دیوان کے دیکھنے سے معلوم ہوتی ہے۔ **فارسی** میں وہ انتہائے درجہ کی قدرت رکھتے تھے۔ اُس میں جب نظم یا نثر کہتے تھے تو یہی معلوم ہوتا تھا گویا بلبل شیراز سامنے بول رہا ہے۔ مگر قباحت مذکورہ کا پردہ یہاں زیادہ تر کھلتا ہے۔ کیونکہ لفاظی کا لشکر ان کے آگے مسلح حاضر ہے۔ مضمون جاہیں تو آسمان سے تارے اتار لائیں۔ مگر فارسی قصائد میں بھی طبیعت کو روک سکتے نہیں۔ قصیدہ کے اصول کو کھو کر۔ محاورہ کی نمکینی اور بول چال کی شوخی سے کلام میں مزا پیدا کرتے ہیں

اور بے شک اِس مطلب میں کامیاب ہوتے ہیں۔ کیونکہ ادائے مطالب اور فصاحت کلام کے لحاظ سے اس زبان پر بھی قدرت کامل رکھتے تھے۔ ایک قصیدہ بے نقط کو بہت سی صنعتوں سے مرصع کر کے زورِ طبع دکھایا ہے۔ بلکہ بڑے فخر کے ساتھ اس کا نام طور الکلام رکھا ہے اور اس پر اُنھیں خود بھی بڑا ناز ہے ❊

دیوان فارسی کا یہی حال ہے۔ باتوں ہی باتوں کا مزا ہے۔ جس غزل کو دیکھو دو ایرانی ہیں کہ کھڑے باتیں کر رہے ہیں۔ اور فقط مسخرا پن۔ مضمون کو دیکھو تو کچھ بھی نہیں۔ یہ سب کچھ ہے مگر لطف زبان اور خوبیٔ بیان کی تعریف نہیں ہو سکتی۔ اور اس میں کچھ شبہ نہیں کہ اگر چند ساعت کے لئے اپنے رفیق طبعی یعنی مسخرے سے جُدا ہوتے اور ذرا زبان کو قابو میں رکھتے تو خدا جانے اپنے زمانے کے خاقانی و انوری ہوتے یا سعدی و خسرو۔ چنانچہ ایک ایرانی تازہ وارد کو کسی موقع پر نظم میں رقعہ لکھ کر بھیجا ہے۔ اس سے قدرت زبان اور لطف بیان کے ساتھ یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ اس وقت گھر سے نکلنا بند تھا۔

رقعہ منظوم

تو اے نسیم سحرگہ ز جانب انشا	برو بجانب حاجب علیؔ شیرازی
سلام شوق رسان دگر بعجز و نیاز	کہ می سزد بکمالِ تو ہر قدر نازی
بلے ز نفخۂ روح القدس مدد داری	ازاں مسیح زمان و سراسر اعجازی
ہمائے عالمِ قدسی سہیم تو عنقاست	چو طائران بہشتِ بریں خوش آوازی
قصیدہ و غزلِ فی البدیہ ات دیدم	علوِ مرتبہ داری بلند پروازی
کسے بہ پیش تو دیگر چہ لاف شعر زند	بفکر سعدیِ شیراز را تو انبازی
بسانِ رستمِ دستانی اے نکو کردار	بہر طرف کہ کنی قصد رخش می تازی
ہنوز قید نہ داری چو سروِ آزادی	بہر کجا کہ دلت می کشد سرافرازی
تو سر بمُہر نۂ ہمچو نامۂ شاہاں	اگرچہ فقرۂ مخصوص مطلبِ رازی
بایں جریمہ کہ حاضر بخدمت نشدم	توقع ایں کہ ز چشم خودم نیندازی

بدون حکم وزیر الممالک اے آغا — چساں کنم حرکت نوکری ست یا بازی
نماز روزہ معاف ست عذر اگر باشد — بگو برائے چہ دیگر بشکوہ پردازی
بعید نیست پئے سیر اگر بخانۂ من — قدم گذاری گاہے ز لطف بنوازی

عربی میں بھی وہ خاموش نہ تھے۔ چنانچہ یہ قطعے نمونہ دکھاتے ہیں۔ **قطعہ**

سکت الحبیب متانۃ — بُقِیَ التَّلَذُّذُ سَارِبا
جُلَسَائُہٗ یَسْتَحْسِنُوْنَ — وَیَزْعُمُوْنَ مُحَاکِیًا
رَبِّ عَلٰی رَحْمَتِکَ الْوَاقِیَہْ — أَسْئَلُکَ الصِّحَّۃَ وَالْعَافِیَہْ
اَنْتَ مُغِیْثُ الْفُقَرَا اَھِبْ لَنَا — عَافِیَۃٌ کَافِیَۃٌ شَافِیَہْ

آیات قرآنی اور عربی فقروں کی تضمین

عربی فقرے اس خوبی سے تضمین کرتے ہیں جیسے انگوٹھی پر نگینہ۔ چنانچہ سر دیوان غزل کا مطلع ہے۔

صنما برب کریم یہاں وہ ہر ایک تیرا ہے مبتلا — کہ اگر اَلَسْتُ بِرَبِّکُمْ تو کہے تو کہدیں ابھی بَلٰی
اے عشق مجھے شاہد اصلی کو دکھلا — قُمْ خُذْ بِیَدِیْ وَفَّقَکَ اللّٰہُ تَعَالٰے
مجھے کیا ملائک عرش سے مجھے عشق تیرا ہے اے خدا — بہت انکو لکھوں تو وَالسَّلَامُ عَلٰی مَنِ اتَّبَعَ الْھُدٰی

رُبَاعِیات

بھاتا ہے یہ بھوک پیاس سب کچھ سہنا — اور روزوں میں انتظار مغرب رہنا
آپس میں سحر گہی کی چہلیں اور پھر — بِالصَّوْمِ غَدًا نَوَیْتُ ان کا کہنا

آرام و نشاط و عیش کردند ہجوم — ایجاب و قبول جلگی شد معلوم
با دختر رز پیر مغاں عقد بست — قَدْ قُلْتُ قَبِلْتُ بِالصَّدَاقِ الْمَعْلُوْمِ

میں کوچۂ عشق کی جو کرتا ہوں سیر — آرام میں اور اُس میں تو ذاتی ہے بیر
ہر گام مری زباں پہ جاری انشا — رَبِّ یَسِّرْ ہے اور تَمِّمْ بِالْخَیْرِ

مثنوی شیر برنج پر رائے

مثنوی شیر برنج فارسی زبان میں مولانا روم کی طرز میں لکھی ہے۔ مگر نہیں معلوم ہوتا کہ تمسخر کرتے ہیں یا تتبع کرتے ہیں۔ کیونکہ زبان کہیں فقط روزمرہ ہے۔ کہیں عالم جبروت ولاہوت سے پرے کے الفاظ لاکر لفاظی کرتے ہیں۔ اور جا بجا عربی زبان کہیں شعر کہیں مصرع ہوتے

جاتے ہیں۔ مضامین فقط ظرافت کی باتیں اور حکایتیں ہیں۔ انھیں نظم کر کے معرفت و طریقت میں لاتے ہیں ٭

غرض کھیر میں لون ڈال کر تصوّف کو تمسخر کر دیا ہے۔ مگر یہ بچپن کا کلام معلوم ہوتا ہے۔ شکار نامہ سعادت علی خاں کا فارسی میں ہے زبان کی شیرینی اور ترکیب کی چُستی اور اُس میں طبیعت کی شوخیوں نے جو لطف پیدا کیا ہے دیکھنے سے تعلق رکھتا ہے۔ اس مقام پر چند شعر لکھے بغیر نہیں رہ سکتا۔

شکار نامہ

اینکہ کنوں میگذرد در شمار ۔۔۔ بست فزوں از دو صد و یک ہزار

ساختہ در خامۂ انشا وطن ۔۔۔ چند ہزار آہوئے مُشکِ ختن

بہ کہ کنوں صید مضامیں کنم ۔۔۔ بارگی ناطقہ را زیں کنم

در تمہید کلام گُہر

از مددِ شبیر خدائے وَدُود ۔۔۔ صورتِ عنقائے طرب پر کشود

ذہن و ذکا رقص چو طاؤس کرد ۔۔۔ مست شدہ آہوئے صحرا نورد

طائرِ اقبال بہ نشو و نما ۔۔۔ سایہ فگن گشت بسانِ ہما

خیر دلا صبح سعادت دمید ۔۔۔ فصلِ گُل و بادِ بہاری وزید

در تعریف حضورِ پُر نور

اشرفِ خیلِ وزرائے زماں ۔۔۔ ناظمِ ملکِ ہمہ ہندوستان

صفدر و منصور و سخی و شجاع ۔۔۔ بست کمر از پئے قتلِ سباع

تاختہ از خانہ بہ عزمِ شکار ۔۔۔ کرد برو برج اسد جاں نثار

در تعریفِ خیمہ و خرگاہ و نوبت و نقارہ وَمَا یَتَعَلَّقُ بِذٰلِکَ

تاکہ بزد خیمۂ زرّیں طناب ۔۔۔ آمدہ در برج حمل آفتاب

گشت ز نقّارہ صدائے بلند ۔۔۔ زندہ بماں زندہ بماں بے گزند

دزدِ بل نقرہ در آید بجوشش — تا بتواں تا بتواں۔ ہاں خروشش
حلّتِ صید است در آئینِ من — دینِ من و دینِ من و دینِ من
واشدہ زیں ساں دہنِ کرّنا — باد بدہ۔ بادیدہ۔ باد عا
دشمنِ ایں خانہ جگر خوں بود — دوں بود و۔ دوں بود و۔ دوں بود
عیش بردل از حدِ اندازہ شد — رسمِ کہن از سرِ نو تازہ شد
غلغلۂ کوس بکیواں رسید — آب شدہ زہرۂ دیوِ سفید
کوہ چو غرّیدنِ پیلش شنید — صورتِ خرطومِ وے از دور دید
گفت بروں آمدہ از زیرِ ابر — صورِ سرافیل پئے صید بیر
وقت ہماں است کہ سیمرغِ قاف — بگذرد از قلّۂ لاف و گزاف
آنچہ ندیدست فریدوں بخواب — جملہ مہیا است درادر رکاب
چونکہ بدید ایں ہمہ عظم و شکوہ — لرزہ بر افتاد بر اندامِ کوہ

تاریخ

نوج ظفر موج بایں عزّ و جاہ — کرد رسانید چو بر اوجِ ماہ
شوکتش انشا بخطِ زر نوشت — نقرۂ تاریخ مظفر نوشت
۱۲۲۰ھ

تعریفِ اسپ

خود چو بر اسپِ عربی بر نشست — آمدہ بر فوجِ غزالاں شکست
اسپ چہ اسپِ اشہبِ بادِ صبا — اسپ مگہ شہ رخِ گلگوں قبا
اسپ بایں شوخی دلچسپ کو؟ — حور بگو۔ اسپ مگو۔ اسپ کو؟
اسپ مداں لمعۂ شرق است ایں — اسپ کجا جشمکِ برق وَشت ایں
پیش روِ جودتِ طبعِ سلیم — گام نہد بر بُرد دوشِ نسیم
زیب دہِ کوہ و بیابانِ نجد — قیس اگر بنگرد آید بہ وجد

سیرت لیلےٰ رسدش در خیال　　باہمہ چالاکی و حسن و جمال

بیندش ار نادرِ کشور ستاں　　وصف کند باہمہ ایرانیاں

آگے نادر کی زبانی جو اشعار ہیں وہ ترکی ہیں کے ہیں اور پھر مطلب شروع کیا ہے +
ہجویں اُردو میں ہیں۔ خیال کر لینا چاہئے کہ جنھیں بانکپن غزل اور قصیدہ میں
سیدھا سیدھا نہیں چلنے دیتا اُنھوں نے وہاں کیسا کچھ رنگ اُڑایا ہوگا +
مثنوی عاشقانہ مختصر ہے اور کوئی بات اس کی قابل اظہار نہیں۔ ایک ہاتھی
اور چنچل پیاری ہتھنی کی حکایت کہیں انگریزی سے ان کے ہاتھ آگئی ہے۔ نظر باز
کی آنکھ خود ایسے مضامین کی تاک میں رہتی تھی۔ یہ تو تیار مال تھا غرض اس کی
شادی جس سامان سے کی ہے وہ تماشا دیکھنے کے قابل ہے +

متفرق اشعار قطعے۔ خطوط منظوم۔ اور رباعیاں اور پہیلیاں چیستانیں۔
لطائف سے دیوان مالامال ہیں۔ مگر بنیاد سب کی تمسخر پر ہے۔ طالب کمال کو سمجھ
چاہئے۔ کہ بہت کچھ اس میں قابل لینے کے ہے۔ اور بہت کچھ مہمل مہملات +
دیوان بے نقط ایک معمولی طبع آزمائی ہے۔ اس میں کوئی بات قابل تحریر نہیں +
مثنوی مائتہ عامل زبان عربی کی نظم فارسی میں ہے۔ اگرچہ وہ بڈھے ہو کر بھی
بچوں سے آگے دوڑتے تھے۔ مگر یہ بھی اوائل عمر کی معلوم ہوتی ہے[1] +
دریائے لطافت قواعد اُردو میں ہے۔ اس کتاب میں بھی اگرچہ انداز کلام میں
وہی تمسخر اور شوخی ہے۔ مگر یہ پہلی کتاب قواعد اُردو کی ہے جو ہمارے اہل
زبان نے اُردو میں لکھی ہے۔ اس میں اول اُردو بولنے والوں کے مختلف فرقہ
کی زبانوں کے نمونے دکھائے ہیں۔ اور اُن میں حق زباں دانی اور سخن فہمی کا
ادا کیا ہے۔ پھر قواعد بیان کئے ہیں اور ظرافت سے لے کر فحش تک کوئی بات
نہیں چھوڑی۔ لیکن طالب فن اس میں سے بھی اکثر نکتے ایسے حاصل کر سکتا ہے

[1] ایک مختصر مثنوی میں پشتو زبان کے قواعد نظم کئے ہیں +

کہ چند روز کے بعد ڈھونڈے گا اور نہ پائے گا +

بعد اس کے کئی بابوں میں عروض۔ قافیہ۔ منطق۔ معانی۔ بیان وغیرہ فروع بلاغت کو زبان اردو میں لائے ہیں۔ یہ مرزا قتیل کی تصنیف ہے۔ مگر اس حمام میں سب ننگے تھے۔ ان کے ہاں بھی سوائے شہیدپن کے دوسری بات نہیں پھر بھی حق یہ ہے کہ جو کچھ ہے لطف سے خالی نہیں ہے۔ عروض میں ان کے اصول اور قواعد لکھے ہیں۔ مگر تقطیع میں مفاعیلن مفاعیلن مفاعیلن مفاعیلن کی جگہ کہتے ہیں پری خانم۔ پری خانم۔ پری خانم۔ اور فاعلن فاعلن فاعلن فاعلن۔ چِت لگن۔ چِت لگن۔ چت لگن چت لگن۔ اور سے

مفعول مفاعیلن مفعول مفاعیلن بی جان پری خانم بی جان پری خانم

اور۔ فاعلن مفاعیلن فاعلن مفاعیلن چت لگن پری خانم چِت لگن پری خانم

اصطلاحیں بھی نئی نئی رکھی ہیں۔ چنانچہ نظم کی قسموں میں مُثَلَّث کا نام تکڑا اور مربّع کا نام چوکڑا رکھا ہے وغیرہ وغیرہ منطق میں بھی اپنی اصطلاحیں الگ نکالی ہیں + چنانچہ

علم .... گیان	نسبت ثبوتیہ .... مان لینا
علم حصولی .... پردھیان	نسبت سلبی .... پوراتوڑ
علم حضوری ..... آپ گیان	بدیہی .... پرگھٹ
تصوّر .... دھیان	نظری .... گپت
تصدیق ..... جوں کا توں	تسلسل .... اُلجھاسوت
موضوع .... بول	دَور .... ہیرپھیر
محمول .... بھرپور	مطابقت .... ٹھیک ٹھیک
رابطہ .... جوڑ	تضمنی .... کھسر
نسبت .... ملاپ	التزامی .... اوپری لگاؤ
قضیہ .... بات	

اسی طرح معانی بیان وغیرہ ہیں +

ہندی اور ملکی خصوصیتیں

ہندی اور ملکی خصوصیتوں کے مضامین کو سودا نے بہت اچھی طرح سے باندھا ہے مگر سید انشا نے کبھی اُچھلتے کودتے خوب قدم مارے ہیں اور یہ بات لطف سے خالی نہیں۔ کیونکہ اپنے ملک کے ہر تے۔ عرب۔ نجد۔ ایران سے بے ستون اور قصر شیریں توران سے جیحون و سیحون کو ہندوستان میں لانا کیا ضرور ہے۔ ایسی باتوں سے فصاحت میں دشواری اور اشکال پیدا ہوتے ہیں۔ چنانچہ سید موصوف کہتے ہیں +

لیا گر عقل نے مُنہ میں دل بیتاب کا گٹکا ۔۔۔ تو جوگی جی دھرا رہ جائے گا سیماب کا گٹکا

صنم خانہ میں جب دیکھا بُت ناقوس کا جوڑا ۔۔۔ لگا ٹھاکر کے آگے ناچنے طاؤس کا جوڑا

ملے بارے سے جو ہر تالی کرکے راکھ کا جوڑا ۔۔۔ تو تلنے سر جی اُگلیں کوئی نوسے لاکھ کا جوڑا

نہیں کچھ بھید سے خالی یہ تلسی داس جی صاحب ۔۔۔ لگایا ہے جو اک بھونرے سے تم نے آنکھ کا جوڑا

لپٹ کر کرشن جی سے رادھکا ہنس کر لگیں کہنے ۔۔۔ ملا ہے چاند سے لو اندھیرے پاکھ کا جوڑا

یہ سچ سمجھو کہ انشا ہے جگت سیٹھ اس زمانہ کا ۔۔۔ نہیں شعر و سخن میں کوئی اسکے ساکھ کا جوڑا

اے عشق اجی آؤ مہاراجوں کے راجہ ڈنڈوت ہے تم کو

کر بیٹھے ہو تم لاکھوں کروڑوں ہی کے سر چٹ اک آن میں چٹ پٹ

یہ جو مہنت بیٹھے ہیں رادھا کے کنڈ پر ۔۔۔ اوتار بن کے گرتے ہیں پریوں کے جھنڈ پر

ہے نور بصر مردمکِ دیدہ میں پنہاں مانند کنھیا

سو اشک کے قطروں سے پڑا کھیلے ہے جھرمٹ اور آنکھیں ہیں نگھٹ

دلِ ستم زدہ بیتابیوں نے لوٹ لیا ۔۔۔ ہمارے قبلہ کو وہابیوں نے لوٹ لیا

سُنایا رات کو قصہ جو ہیر رانجھے کا ۔۔۔ تو اہلِ درد کو پنجابیوں نے لوٹ لیا

یوں چلے مژگاں سے اشکِ خونفشاں کی میدنی ۔۔۔ جیسے بہرائچ چلے بالے میاں کی میدنی

اور مقطع کی اکڑ تکڑ دیکھنے کے قابل ہے:۔

ریشانہ دیکھ انشا کو قشونِ شاہ میں ۔۔۔ سب یہ کہتے ہیں کہ آئی سیستاں کی میدنی

پھبن۔ اکڑ۔ چھب۔ نگاہ۔ سج دھج۔ جمال و طرز خرام آٹھوں
نہ ہو ویں اُس بت کے گر پجاری تو کیوں ہو میلے کا نام آٹھوں

غرض کُل تصنیفات کی ہیئت مجموعی دیکھ کر معلوم ہوتا ہے کہ نئے نئے تصرّف اور ایجادوں کے لحاظ سے سیّد انشا فن انشا کی قلمرو میں بادشاہ علی الاطلاق تھے۔ اور اس اعتبار سے اُنھیں اُردو کا امیر خسرو کہیں تو بیجا نہیں۔ بلکہ قصیدہ طور الکلام میں جہاں صنائع مختلفہ کی ذیل میں اُنھوں نے ایک مصرع لکھا ہے کہ تین زبانوں میں پڑھا جاتا ہے۔ وہاں فخر کی موچھوں پر خوب تاؤ دئے ہیں اور کہا ہے کہ امیر خسرو نے تین لفظ کا ایک جملہ ایسا لکھا تھا اور فخر کیا تھا مجھے ایسا پُورا مصرع ہاتھ آیا۔ یہ فقط ممدوح کی مدح کی برکت ہے۔ اگرچہ آج یہ صنعتیں بیکار ہیں مگر اس احسان کا شکریہ کس زبان سے ہو کہ ہماری زبان میں نئی نئی تشبیہیں۔ شگفتہ استعاروں کے رستے کھولے۔ اس سے بڑھ کر یہ کہ ان میں فارسی اضافت کی گرہ کو نہایت خوبصورتی کے ساتھ کھولا ہے۔ غزلوں میں اُس کے اشارے معلوم ہوں گے*

تصرفات میں سینہ زوری

اس میں بھی کچھ کلام نہیں کہ جو جو تصرّف یا ایجاد کئے ان میں بعض جگہ سینہ زوری بھی ہے مگر خوش ادائی اور خوش نمائی میں کچھ شبہ نہیں۔ درحقیقت ان کی تیزی طبع نے عالم وجود میں آنے کے لئے بھی تیزی دکھائی۔ اگر وہ سو برس بعد پیدا ہوتے تو ہماری زبان کا فیشن نہایت خوبصورتی سے بدلتے۔ دیکھو وہ قصیدہ جو اُنھوں نے جارج سوم کی تہنیت جشن میں کہا ہے:۔

انھیں سو برس بعد پیدا ہونا چاہئے تھا

قصیدہ در تہنیتِ جشن

کلیاں پھولوں کی نبا کرائے بوئے سمن	کہ ہوا کھانے کو نکلیں گے جوانانِ چمن
عالم اطفال نباتات پر ہو گا کچھ اور	گورے کالے سبھی بیٹھیں گے نئے کپڑے پہن
کوئی شبنم سے چھڑک بالوں پہ اپنے پوڈر	کرسئ ناز پہ جلوہ کی دکھاوے گا پھبن

شاخ نازک سے کوئی ہاتھ میں لے کر اک کیت
ہو الگ سب سے نکلے گا نرالا جوبن

نسترن بھی نئی صورت کا دکھادے گا رنگ
کوچ پر ناز کے جب پاؤں رکھے گا بن ٹھن

اپنے گیلاس شگوفہ بھی کریں گے حاضر
آگے جب غنچۂ گل کھولیں گے بوتل کے دہن

اہل نظارہ کی آنکھوں میں نظر آویں گے
باغ میں نرگس شہلا کے ہوائے جتون

اور ہی جلوے نگاہوں کو لگیں گے دینے
اُودی باناتِ کی کُرتی سے شکوہ سوسن

پتے بل بل کے بجادیں گے فرنگی طنبور
لالہ لادے گا سلامی کو بنا کر پلٹن

کھینچ کر تار رگِ ابر بہاری سے کئی
خود نسیم سحر آوے گی بجاتی ارگن

اپنی سنگینیں چمکتی ہوئی دکھلادیں گے
آپڑے گی جو کہیں نہر پہ سورج کی کرن

نئے نوازی کے لئے کھول کر اپنی منقار
آکے دکھلاوے گی بلبل بھی جو ہے اُسکا فن

اردلی کے جو گراں ڈیل ہیں ہو نگے سب جمع
آن کر اپنا بگل پھونکے گا جب سُکھ درسن

آئے گا نذر کو شیشہ کی گھڑی لے کے حباب
یاسمیں پتّوں کی پینس میں چلے گی بن ٹھن

نکہت آوے گی نکل کھول کلی کا کمرا
ساتھ ہووے گی نزاکت بھی جو ہے اُسکی بہن

حوض صندوق فرنگی سے مُشابہ ہوں گے
اس میں ہو دینگے پریزاد بھی سب عکس فگن

ایک جگہ گھوڑے کی تعریف میں کہتے ہیں :-

ہے اس آفت کا سبک سیر کہ راکب اس کا
حاضری کھائے جو کلکتہ تو لندن میں ٹِفن

شعرخوانی

ان کا پڑھنا بھی ایک انداز خاص رکھتا تھا جس سے شعر کی شان اور لطف کلام دوبالا ہو جاتا تھا یہاں تک کہ اکثر اشخاص مشاعرہ میں اپنی غزل ان سے پڑھوایا کرتے تھے۔ کیونکہ ان کی زبان آتش تاثیر کی چقماق تھی اس سے نکل کر گرمی سخن ایک سے دو چند بلکہ دہ چند ہو جاتی تھی۔ بیشک اُنھیں میر و مرزا کے صاف کئے ہوئے رستے ہاتھ آئے مگر اُن رستوں میں اُچھلتے کودتے ایسے بے باک اور بے لاگ جاتے ہیں جیسے کوئی اچھا بھکیت منجھے ہوئے ہاتھ تلوار کے پھینکتا جاتا ہے +

چال ڈھال اور سج دھج

دیوان دیکھنے سے ان کے حالات و عادات کی تصویر سامنے کھچ جاتی ہے جبکہ

وہ مشاعرہ میں آتے تھے یا دربار کو جاتے تھے۔ ایک طرف آداب معقولیت سے سلام کیا۔ ایک طرف مسکرا دیا۔ ایک طرف منہ چڑا دیا۔ کبھی مقطع مرد معقول۔ کبھی دلی کے بانکے۔ کبھی آدھی داڑھی اُڑا دی۔ کبھی چار ابرو کی صفائی بنا دی۔

کلیات کو دیکھو تو یہی حالت اشعار کی ہے۔ اور اس میں شک نہیں کہ تفریح و تضحیک کے اعتبار سے کسی جلسہ میں اُن کا آنا بھانڈ کے آنے سے کم نہ تھا۔ پس مُصحفی نے ان کی ہجویات کے ضمن میں کچھ جھوٹ نہیں کہا۔

واللہ کہ شاعر نہیں تو بھانڈ ہے بھڑوے

اگرچہ جس محدود دائرے میں ہمارے فارس و ہند کے شعرا پا بزنجیر پھر رہے ہیں۔ یہ بیچارے بھی دوڑتے پھرتے ہیں۔ پھر بھی وہ شعرائے رائج الوقت کے اصول مفروضہ میں عاشقانہ مضامین کے پابند نہیں۔ اس کا ایک سبب یہ بھی تھا کہ اول تو اکثر غزلیں اور قصائد ان کے سنگلاخ زمین میں ہوتے تھے۔ پھر اس میں قافیے ایسے گُڈھب لیتے تھے کہ عاشقانہ مضمون کم آسکتے تھے اسی واسطے قانون کلام یہ رکھا تھا کہ کیسا ہی قافیہ ہو اور کیسا ہی مضمون جس برجستہ پہلو سے بندھ جائے چھوڑنا نہیں چاہیے۔ ساتھ اس کے یہ ہے کہ شاعر کو زیادہ تر کام عوام سے ہوتا ہے۔ جنھیں مضامین عشقیہ کے بعد کچھ لطف ہے تو ظرافت میں ہے۔ اس لئے ان کی طبیعت جو اسی آسمان کی زہرہ ہے ہر آن نیا جلوہ دیتی تھی۔ چنانچہ پابند اُن رُسوم و قیود کے اپنے گھر بیٹھ کر جو چاہیں سو کہیں۔ وہ جب یاروں کے جلسہ میں یا مشاعرہ کے معرکہ میں آکر فانوس جادو روشن کرتے تھے تو تحسین اور واہ وا سے دھواں دھار ہو کر محفل بیلون ہو جاتی تھی۔ حق یہ ہے کہ وہ اپنی طرز کے آپ بانی تھے اور آپ ہی اُس کا خاتمہ کر گئے۔

ان کے کلام میں بے اعتدالی ہے بے علمی کے سبب نہیں

لوگ کہتے ہیں کہ سید انشا کا کلام ہر جگہ قابل سند نہیں۔ یہ بات درست ہے مگر ان کی بے اعتدالیاں کچھ جہالت کے سبب سے نہ تھیں بلکہ عمداً تھیں۔ یا بے پروائی کے سبب سے تھیں کہ اپنی طبع وقاد اور جامعیت استعداد کے سامنے قواعد اور اہل قواعد کو خاطر میں

نہ لاتے تھے۔ سچ ہے کہ ان کے جوش کمال نے تیزیٔ طبع کے تیزاب سے اصول اور قواعد کو پانی پانی کر دیا۔ الفاظ اور محاورات میں بہت سے تصرّف کئے۔ یہ تصرّف اگر صرف معدود مقاموں میں ہوتے تو شکایتیں نہ ہوتیں کیونکہ اُس زبان آور سے زیادہ قادر زبان اور زباں داں کون ہے۔ خصوصاً جب کہ استعداد علمی سے مسلح ہو۔ لیکن افراط نے ہمیں بھی خاموش کر دیا ہے۔ اور وہ نشۂ کمال کا مست کسی کے کہنے کی پروا بھی نہ کرتا تھا بلکہ کوئی شامت کا مارا گرفت کر بیٹھتا تھا تو کبھی سند سے۔ کبھی دلائل بجا و بیجا سے۔ اور ساتھ ہجو وں کے توپ خانوں سے چاند ماری کا نشانہ بن جاتا تھا۔ بہرحال ان کے کلام سے واقف حال اور طالب کمال بہت کچھ فائدے اُٹھا سکتا ہے۔ اکثر اچھوتے ایجاد ہیں کہ گُل نوبہار کی طرح سر پر رکھنے کے قابل ہیں۔ بہت سے تھوڑی تبدیلی یا تراش سے انوکھے ہو جاتے ہیں۔ بہت سے وہ ہیں جن پر سوا اس کے کچھ نہیں کہہ سکتے ع خطائے بزرگاں گرفتن خطا ست لوگ کہتے ہیں کہ سید انشا[1] کا کلام رندانہ ہے اور جو اس میں ہزل ہے نہ بقدر نمک

[1] اس کا سبب یہ تھا کہ ان کے بزرگوں کو سرکار سے شہدوں کی تقسیم وظائف کی خدمت سپرد تھی۔ ان کے بھائی جب جب دلّی میں آئے تو وہ بھی ایک پارے کا کنٹھا گلے میں پہنتے تھے اور وضع بھی اسی قسم کی رکھتے تھے۔ چنانچہ میر انشاء اللہ خاں نے آزادوں کے انداز میں ایک مستزاد کہہ کر داد زباندانی کی دی ہے اور غزلوں میں بھی اسی طرز کا پرتو دکھایا ہے۔ دریائے لطافت میں شہدے کی تحقیق سید انشا خود فرماتے ہیں" شہد و شخصے را گویند کہ از برہنگی سر و پا۔ و کشیدن بار دیگرے بر دوش و سرد خطا بہائے۔ او۔ اَبے۔ ادبے۔ بجا۔ ایسے۔ تیسے۔ چند الفاظ فحش لکھے ہیں۔ دغیرہ وغیرہ عار نداشتہ باشد و اگر لک روپیہ یا اشرفی یا قطعہ ہائے جواہر در مکانے گزاشتہ باشند و شہدہ دراں تنہا برود و نگہبانے ہم نباشد ہرگز دست بہیچ چیز نخواہد برد۔ انبوہ ایں فرقہ متصل مسجد جامع دار الخلافہ۔ خصوصاً چاوڑی یافتہ می شود۔ بلکہ کمال شہدہ ہمین است کہ لور اشہدہ جامسجد گویند و برائے شہدہ ہا نامہائے عجیب و لہجہ غریب بود۔ گرگج۔ جمّا۔ بدھوا۔ ٹلوا۔ روشن چراغ دہوا۔ راجے خاں۔ نہال بیگ میر آسوری یعنی میر عاشوری۔ بڑے خوجی۔ شیخ رانجھے۔ ابوامالی یعنی ابوالمعالی۔ ڈھول محمد۔ کیوُخاں۔ این است اسمائے متبرکہ۔ حالا طرز گفتار باید شنید" چونکہ ان کی گفتگو میں فحش فاحش تھا۔ اس لئے احتراز کیا گیا۔ غرض شہدے بھی عجیب چیز ہیں۔ ذرا نام ان کا آگیا تھا دیکھئے صفحہ کا صفحہ خراب کر گئے۔

ہے بلکہ غذا کی مقدار سے بڑھی ہوئی ہے۔ یہ بات بھی درست ہے۔ مگر اس کا سبب یہ ہے کہ وقت حاکم جابر ہے۔ اور پسند عام اس کا واضع قانون ہے۔ اس وقت شاہ و اُمرا سے لے کر گدا اور غربا تک انھیں باتوں سے خوش ہوتے تھے۔ اور قدردانی یہ کہ ادنیٰ ادنیٰ[1] نظموں پر وہ کچھ دیتے تھے جو آجکل کے مصنفوں کو کتابوں پر نصیب نہیں ہوتا۔ سیّد انشا اگر یہ نہ کرتے تو کیا کرتے۔ پیٹ کو کاٹ کر کہاں پھینک دیتے۔ ہنگامۂ ہستی کے جوانمرد اسے بھی ایک قسم کا کمال سمجھتے ہیں کہ کسی رستہ میں درماندہ نہ رہیں۔ جو پتھر سدِّ راہ ہو اُسے ٹھوکر مار کر ہٹائیں۔ اور آگے نکل جائیں۔ انصاف کی آنکھیں دیکھ رہی ہیں کہ جو کچھ وہ کامل ہزار فن کر گیا ہے۔ ہر ایک کا کام نہ تھا۔ نواب مصطفےٰ خاں شیفتہ کا گلشن بیخار جب دیکھتا ہوں تو خار نہیں کٹار کا زخم دل پر لگتا ہے۔ سید موصوف کے حال میں لکھتے ہیں "ہیچ صنف را بطریقہ راسخہ شعرانہ گفتہ"۔ یہ بھی کہہ سکتے ہیں کہ اُنھوں نے اس رستہ میں قدم کیوں رکھا جو ایسے کیچڑ میں دامن آلودہ ہوئے۔ لیکن شہرستان تجارب کے سَیر کرنے والے جانتے ہیں کہ جب رواج عام کا راجہ ہولی کھیلتا ہے تو بڑے بڑے معقول وضعدار اشخاص اُس کی چھینٹیں فخر سمجھ کر سر و دستار پر لیتے ہیں۔ پس وہ اور اُن کے معاصر ملک چھوڑ کر کہاں نکل جاتے؟ یہیں رہنا تھا اور انھیں لوگوں سے لے کر گزران کرنی تھی اور لطف یہ تھا کہ اس میں بھی آن تان اور عظمت خاندان قائم تھی۔ ان کے آقا بھی اُن سے اپنایت کے طریقہ سے پیش آتے تھے۔ ان ہی چاہیتے چاہنے والوں کی فرمائشیں ہوتی تھیں۔ جو نہ دھری جاتی تھیں۔ نہ اُٹھائی جاتی تھیں۔ اور وہ کچھ چھوٹے

بے اعتدالیوں کا عذر معقول

[1] ایک شعر پر سید انشا اور شیخ مصحفی پر شکر رنجی ہوگئی۔ اور طبیعتوں کی شوخی نے زبانوں کی بے باکی کے ساتھ مل کر بڑے بڑے معرکے کئے۔ اُس وقت آصف الدولہ شکار میں تھے۔ چنانچہ انھوں نے اپنے لکھنؤ میں نہ ہونے پر ہزاروں افسوس کئے اور بڑے اشتیاق سے اُن ہجوؤں کو منگا کر سُنا اور انعام بھیجے فی الحقیقۃ ایک ایک مصرع ان کا ہنسی اور قہقہوں کا منتر ہے۔ لیکن آج اگر اُنھیں لکھ بھی دے تو عدالت با انصاف میں مجرم ہو کر جواب دہی کرنی پڑتی ہے +

لوگ نہ تھے جو سمجھائے سے سمجھ جائیں یا ٹالے سے ٹل جائیں۔ کبھی تو شاہ عالم بادشاہ دہلی تھے۔ کبھی مرزا سلیمان شکوہ تھے۔ کبھی سعادت علی خاں والی اودھ وغیرہ وغیرہ۔ چنانچہ اکثر غزلیں ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ کسی عالم میں سعادت علی خاں کی زبان سے ایک مصرع نکل گیا۔ اس کی غزل کا پورا کرنا ان کا کام تھا۔ ایک دفعہ کسی شخص کی پگڑی بے ڈھنگی بندھی تھی۔ سعادت علی خاں نے کہا کہ ع

فرمائشیں

پگڑی تو نہیں ہے یہ فرانسیس کی ٹوپی

تمام غزل دیکھو ان کی غزلوں میں ؛

انوکھی فرمائشیں

سعادت علی خاں نواڑے میں لیٹے ہوئے میر انشاءاللہ خاں کی گود میں سر دھرا ہوا سرور کے عالم میں دریا کی سیر کرتے چلے جاتے تھے۔ لب دریا ایک حویلی پر لکھا دیکھا۔ حویلی نقی علی خاں بہادر کی۔ کہا کہ انشا دیکھیو کسی نے تاریخ کہی مگر نظم نہ کر سکا۔ بھئی تم نے دیکھا بہت خوب مادہ ہے۔ اسے رباعی کر دو۔ اُسی وقت عرض کی ؎

نہ عربی نہ فارسی نہ ترکی ۔۔۔ نہ سم کی نہ تال کی نہ سر کی

یہ تاریخ کہی ہے کسی لُرکی ۔۔۔ حویلی علی نقی خاں بہادر کی

شاہ نصیر مرحوم سید انشا سے ملے

تا ئید اُس کی اس روایت سے ہوتی ہے کہ جب شاہ نصیر دہلوی لکھنؤ میں گئے، اور زمین ہائے سنگلاخ میں گلزار لگا کر مشاعروں کو رونق دی تو سید انشا سے بھی ملے جو کہ دتی والوں کے رواج کار کا بیڑا اُٹھائے بیٹھے تھے اور کہا کہ بھئی میر انشاءاللہ خاں! میں فقط تمھارے خیال سے یہاں آیا ہوں ورنہ لکھنؤ میں میرا کون بیٹھا تھا جس کے پاس میں آتا۔ اُس وقت بہت رات گئی تھی۔ میر انشاءاللہ خاں نے کہا کہ شاہ صاحب یہاں کے دربار کا عالم کچھ اور ہے۔ کیا کہوں۔ لوگ جانتے ہیں کہ میں شاعری کر کے نوکری بجا لاتا ہوں۔ مگر میں خود نہیں جانتا کہ کیا کر رہا ہوں ؛ دیکھیو صبح کا گیا گیا شام کو آیا تھا۔ کمر کھول رہا تھا جو چوبدار آیا کہ جناب عالی پھر یاد فرماتے ہیں۔ گیا تو دیکھتا ہوں کہ کوٹھے پر فرش ہے۔ چاندنی رات ہے۔ پٹے دار چھپر کھٹ میں آپ بیٹھے ہیں۔ پھولوں کا گہنا

سامنے دھرا ہے۔ ایک گجرا ہاتھ میں ہے اُسے اُچھالتے ہیں اور پاؤں کے اشارے سے چھپر کھٹ آگے بڑھتا جاتا ہے۔ میں نے سلام کیا۔ حکم ہوا کہ انشا کوئی شعر تو پڑھو۔ اب فرمایئے ایسی حالت میں کہ اپنا ہی قافیہ تنگ ہو شعر کیا خاک یاد آئے۔ خیر اُس وقت یہی سمجھ میں آیا۔ وہیں کہہ کر پڑھ دیا ؎

لگا چھپر کھٹ میں چار پیّے اُچھالا تو نے جو لے کے گجرا
تو موج دریا سے چاندنی میں وہ ایسا چلتا تھا جیسے بجرا

یہی مطلع سُن کر خوش ہو گئے۔ فرمایئے اسے شاعری کہتے ہیں؟ اسی طرح کی اور تقریبیں اُنھیں پیش آتی تھیں کہ بیان آیندہ سے واضح ہوگا۔ غرض اس معاملہ میں میاں بیتاب کا قول لکھ رکھنے کے قابل ہے۔ کہ سیّد انشا کے فضل و کمال کو شاعری نے کھویا اور شاعری کو سعادت علی خاں کی مصاحبت نے ڈبویا۔

لطیفہ رنگین

ایک دن نواب صاحب کے ساتھ بیٹھے کھانا کھا رہے تھے۔ اور گرمی سے گھبرا کر دستار سر سے رکھ دی تھی۔ منڈا ہوا سر دیکھ کر نواب کی طبیعت میں چُہل آئی۔ ہاتھ بڑھا کر پیچھے سے ایک دھول ماری۔ آپ نے جلدی سے ٹوپی سر پر رکھ لی اور کہا۔ سبحان اللہ بچپن میں بزرگ سمجھایا کرتے تھے وہ بات سچ ہے کہ ننگے سر کھانا کھاتے ہیں تو شیطان دھولیں مارا کرتا ہے۔

سعادت علی خاں کہ ہر امر میں سلیقہ اور صفائی کا پابند تھا اُس نے حکم دیا تھا کہ اہل دفتر خوشخط لکھیں اور فی غلطی ایک روپیہ جُرمانہ۔ اتفاقاً اعلیٰ درجے کے اہل انشا میں ایک مولوی صاحب تھے انھوں نے فرد حساب میں اجناس کو اجناس لکھ دیا۔ سعادت علی خاں تو ہر شے پر خود نظر رکھتے تھے۔ ان کی بھی نگاہ پڑ گئی۔ مولویوں کو جواب دینے میں کمال ہوتا ہے انھوں نے کچھ قاموس کچھ صراح سے اجنا کے معنی بتائے۔ کچھ قواعد نحو سے ترخیم میں لے گئے۔ نواب نے اُنھیں اشارہ کیا اُنھوں نے مارے رباعیوں اور قطعوں کے مُلتو کر دیا۔ ؎ رباعی

اجناس کی فرد پر یہ اجنا کیسا؟ یاں ابر لغات کا گرجنا کیسا؟
گو ہوں اجنا کے معنے جو چیز اُگے لیکن یہ نئی اُپج اپجنا کیسا؟

ان مولوی صاحب کا نام مولوی سجن تھا۔ چنانچہ اُس کا اشارہ کرتے ہیں:۔

ترخیم کے قاعدے سے سجنا لکھئے اور لفظ خود جنا کو خجنا لکھئے
گر ہم کو اجی نہ لکھئے ہووے لکھنا تو کرکے مرخم اُس کو اجنا لکھئے
اجناس کے بدلے لکھئے اجنا کیا خوب قاموس کی رعد کا گرجنا کیا خوب؛
از روئے لغت نئی اُپج کی لی ہے اس تان کے بیچ کا اُپجنا کیا خوب!

پوربی لہجہ میں

اجناس کے موقعن میں اجنا آیا سلمائے علوم کا یہ سجنا آیا
اجنا چیزیست کاں بروید ز زمیں یہ تخم لغت کا لو اُپجنا آیا

ایک باہرے کے حریف سے لطیفہ

رات بہت گئی تھی اور اُن کے لطائف و ظرایف کی آتش بازی چھُٹ رہی تھی۔ یہ رخصت چاہتے تھے اور موقع نہ پاتے تھے۔ نواب کے ایک مصاحب باہرے کے رہنے والے اکثر اہل شہر کی باتوں پر طعن کیا کرتے تھے اور نواب صاحب سے کہا کرتے تھے کہ آپ خواہ مخواہ سید انشا کے کمال کو بڑھاتے چڑھاتے ہیں۔ حقیقت میں وہ اتنے نہیں۔ اس وقت انھوں نے بقا کا یہ مطلع نہایت تعریف کے ساتھ پڑھا:۔

دیکھ آئینہ جو کہتا ہے کہ اللہ رے میں اس کا میں دیکھنے والا ہوں بقا واہ رے میں

سب نے تعریف کی۔ نواب نے بھی پسند کیا۔ انھوں نے کہا کہ حضور سید انشا سے اس مطلع کو کہوائیں۔ نواب نے ان کی طرف دیکھا۔ مطلع حقیقت میں لاجواب تھا۔ انھوں نے بھی ذہن لڑایا۔ فکر نے کام نہ کیا۔ انھوں نے پھر تقاضا کیا۔ سید موصوف نے فوراً عرض کی کہ جناب عالی مطلع تو نہیں ہوا مگر شعر حسب حال ہو گیا ہے حکم ہو تو عرض کروں؎

ایک ملکی کھڑا دروازہ پہ کہتا تھا رات آپ تو بہتیرے جا پاڑہ رہے باہرے میں

بہت سے لطائف اُن کے بباعث شدت بے اعتدالی کے قلم انداز کرنے پڑے۔ جو کچھ

کر لکھتا ہوں یہ بھی لایق تحریر نہیں سمجھتا۔ لیکن اس نظر سے بیجا نہیں کہ جو لوگ خار حنظل سے گل عبرت چنتے ہیں۔ اُنھیں اُس میں سے ایک مشہور مصنف کی شوخیٔ طبع کا نمونہ معلوم ہوگا۔ اور دیکھیں گے کہ اس صاحب کمال کو زمانہ شناسی اور اہل زمانہ سے مطلب برآری کا کیسا ڈھب تھا۔ ایک دن نواب نے روزہ رکھا اور حکم دیا کہ کوئی آنے نہ پائے۔ سید انشا کو ضروری کام تھا۔ یہ پہنچے۔ پہرہ دار نے کہا کہ آج حکم نہیں آگے آپ مالک ہیں۔ باوجود انتہائے مرحمت کے یہ بھی مزاج سے ہشیار رہتے تھے۔ تھوڑی دیر تامل کیا۔ آخر کمر کھول دستار سر سے بڑھا قبا اُتار ڈالی اور دوپٹہ عورتوں کی طرح سے اوڑھ کر ایک ناز و انداز کے ساتھ سامنے جا کھڑے ہوئے۔ جوں ہی اُن کی نظر پڑی۔ آپ انگلی ناک پر دھر کر بولے :-

میں تیرے صدقے نہ رکھ اے مری پیاری روزہ بندی رکھ لے گی ترے بدلے ہزاری روزہ

نواب بے اختیار ہنس پڑے۔ جو کچھ کہنا سُننا تھا وہ کہا اور ہنستے کھیلتے چلے آئے +

ان کے حالات سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ اُنھوں نے عامۂ خلائق خصوصاً اہل دہلی کی رفاقت اور رواج کار کا بیڑا اُٹھایا ہوا تھا۔ چنانچہ لکھنؤ میں میر علی صاحب ایک مرثیہ خواں تھے کہ علم موسیقی میں اُنھوں نے حکما کا مرتبہ حاصل کیا تھا مگر اپنے گھر ہی میں مجلس کر کے پڑھتے تھے۔ کہیں جا کر نہ پڑھتے تھے۔ نواب نے اُن کے شہرۂ کمال سے مشتاق ہو کر طلب کیا اُنھوں نے انکار کیا اور کئی پیغام سلام کے بعد یہ بھی کہا کہ اگر وہ حاکم وقت ہیں تو میں بھی سیادت کے اعتبار سے شاہزادہ ہوں اُنھیں میرے یہاں آنے سے کیا عار ہے؟ نواب نے کہا کہ سید میرے ہاں ہزاروں سے زیادہ ہیں میر صاحب نے اگر فخر پیدا کیا تو یہی کیا کہ سید تھے اب ڈوم بھی ہو گئے خیر اُنھیں اختیار ہے۔ میر علی صاحب نے یہ سُن کر خیالات چند در چند سے فوراً دکن کا ارادہ کیا۔ سید انشا جو شام کو گھر آئے تو دیکھا کہ کچھ سامان سفر ہو رہا ہے۔ سبب پوچھا تو معلوم ہوا کہ میر علی صاحب لکھنؤ سے جاتے ہیں۔ چونکہ آپ کے

بھتیجے بھانجے بھی اُن کے شاگرد ہیں۔ وہ بھی اُستاد کی رفاقت کرتے ہیں میر علی صاحب کے جانے کا سبب پوچھا تو وہ معاملہ معلوم ہوا۔ اُسی وقت کمر باندھ کر پہنچے سعادت علی خاں نے متحیّر ہوکر پوچھا کہ خیر باشد! پھر کیوں آئے؟ انھوں نے ایک غزل پڑھی جس کا ایک شعر یہ ہے :۔

دولت بنی ہے اور سعادت علی بنا یارب بنا بنی ہیں ہمیشہ بنی رہے

پھر کہا کہ حضور! غلام جو اس وقت رخصت ہوکر چلا تو دل نے کہا کہ اپنے دولھا کی دُلھن (عروسِ سلطنت) کو ذرا دیکھوں! حضور! واقعی کہ بارہ ابھرن سولہ سنگار سے سجی تھی۔ سر پر جھومر۔ وہ کون؟ مولوی دلدار علی صاحب۔ کانوں میں جُھمکے وہ کون؟ دونوں صاحبزادے گلے میں نولکھا ہار۔ وہ کون؟ خان علامہ۔ غرض اسی طرح چند زیوروں کا نام لے کر کہا کہ حضور غور جو کرتا ہوں تو ناک میں نتھ نہیں۔ دل دھک سے ہوگیا کہ اللہ سہاگ کو قائم رکھے۔ یہ کیا! نواب نے پوچھا کہ پھر وہ کون؟ کہا حضور! نتھ۔ میر علی صاحب! بعد اس کے کیفیت مفصّل بیان کی۔ نواب نے ہنس کر کہا کہ ان کی دور اندیشیاں بیجا ہیں۔ میں ایسے صاحب کمال کو فخر لکھنؤ سمجھتا ہوں۔ غرض اس شہرت بے اصل کے لئے ترقی کا پروانہ اور ۵۰۰ روپیہ کا خلعت لے کر وہاں سے پھرے۔

جان بیلی صاحب کی ملاقات

جان بیلی صاحب کہ اس عہد میں رزیڈنٹ اودھ تھے اگرچہ سید انشا کا نام اور شہرۂ عام سُنتے تھے مگر دیکھا نہ تھا۔ جب سید انشا نواب سعادت علی خاں کے پاس ملازم ہوئے تو ایک دن صاحب کے آنے کی خبر ہوئی۔ نواب نے کہا انشا آج ہم تمھیں بھی صاحب سے ملائیں گے۔ عرض کی کہ حضور کی ہر طرح پرورش ہے مگر فدوی کے باب میں کچھ تقریب ملاقات کی ضرورت نہیں۔ غرض جس وقت صاحب ممدوح آئے نواب اور وہ آمنے سامنے کرسیوں پر بیٹھے۔ سید انشا نواب کے پیچھے کھڑے ہوکر رومال ہلاتے تھے۔ باتیں کرتے کرتے صاحب نے ان کی طرف

دیکھا۔ اُنھوں نے ایک چہرہ کی لی۔ انھوں نے آنکھیں نیچی کر لیں۔ مگر دل میں حیران ہوئے کہ اس آدمی کی کیسی صورت ہے؟ یہ خیال کرتے ہی پھر نظر پڑی۔ اب کی دفعہ انھوں نے ایسا چہرہ بدلا کہ اس سے بھی عجیب۔ وہ شرما کر اور طرف دیکھنے لگے۔ پھر جو دیکھا تو انھوں نے ایسا منہ بنایا کہ اُس سے بھی الگ تھا۔ آخر نواب سے پوچھا کہ یہ مصاحب آپ کے پاس کب ملازمت میں آئے؟ میں نے آج ہی اُنھیں دیکھا ہے۔ نواب نے کہا کہ ہاں آپ نے نہیں دیکھا۔ سید انشاء اللہ خاں یہی ہیں۔ جان بیلی صاحب بہت ہنسے۔ ان سے ملاقات کی۔ پھر تو انکی جادو بیانی نے ایسا تسخیر کیا کہ جب آتے۔ پہلے پوچھتے کہ سید انشا کجاست؟ جان بیلی صاحب کے ساتھ علی نقی خاں میر منشی رزیڈنٹی بھی آیا کرتے تھے۔ اُن کی اِن کی عجیب لطف کی چوٹیں ہوتی تھیں۔ ایک دن اثنائے گفتگو میں کسی کی زبان سے نکلا ع

میر منشی صاحب کے ساتھ لطیفہ

شاید کہ پلنگ خفتہ باشد۔ اُنھوں نے کہا کہ گلستاں کے ہر شعر میں مختلف روایتیں ہیں اور لطف یہ ہے کہ کوئی کیفیت سے خالی نہیں۔ چنانچہ ہو سکتا ہے۔ ع

شاید کہ پلنگ خفیہ باشد۔ سعادت علی خاں نے سید انشا کی طرف دیکھا انھوں نے عرض کی کہ حضور! میر منشی صاحب بجا فرماتے ہیں غلام نے بھی ایک نسخۂ گلستاں میں یہی دیکھا تھا:۔

تا مرد سخن نگفیہ باشد   عیب و ہنرش نہفیہ باشد

در بیشہ گماں مبر کہ خالی ست   شاید کہ پلنگ خفیہ باشد

بلکہ وہ نسخہ بہت صحیح اور محشی تھا اس میں گفیہ اور نہفیہ کے کچھ معنی بھی لکھے تھے۔ میر منشی صاحب! آپ کو یاد ہیں؟ وہ نہایت شرمندہ ہوئے۔ جب وہ رخصت ہوتے تو سید انشا کہا کرتے کہ میر منشی صاحب کا اللہ بیلی۔

میر منشی صاحب کا اللہ بیلی

انجر اور ینجر کا لطیفہ

ایک دن اُسی جلسہ میں کچھ ایسا تذکرہ آیا کہ سعادت علی خاں نے کہا کہ انجر بالفتح بھی درست ہے۔ جان بیلی صاحب نے کہا کہ خلاف محاورہ ہے۔ سعادت علی خاں

بولے کہ خیر لغت کے اعتبار سے جب درست ہے تو استعمال میں کیا مضایقہ۔ اتنے میں سید انشا آ گئے۔ جان بیلی صاحب نے کہا کہ کیوں سید انشا ہِجر اور ہَجر میں تم کیا کہتے ہو؟ اُنھیں یہاں کی خبر نہ تھی بے ساختہ کہہ بیٹھے کہ ہِجر بالکسر! مگر ساتھ ہی سعادت علی خاں کی تیوری تاڑ گئے اور فوراً بولے کہ حضور جب ہی تو جامی فرماتے ہیں ؎

شبِ وصل است و طے شد نامۂ ہجر   سَلَامٌ ھِیَ حَتّٰی مَطْلَعِ الْفَجْر

یہ سُنتے ہی سعادت علی خاں شگفتہ ہو گئے اور اہل دربار ہنس پڑے۔

سید انشا نے پنڈت جی کا روپ دھارا

مرزا سلیمان شکوہ کا مکان لبِ دریا تھا۔ معلوم ہوا کہ کل یہاں ایک اشنان کا میلہ ہے۔ سید انشا نے کہ رنگت کے گورے۔ بدن کے فربہ۔ صورت کے جامہ زیب تھے۔ پنڈتان کشمیر کا لباس درست کر کے سب سامان پوجا پاٹ کا تیار کیا صبح کو سب سے پہلے دریا کے کنارے۔ ایک مہنت دھرم مورت بن کر جا بیٹھے اور خوب زور شور سے اشلوک پڑھنے اور منتر جپنے شروع کر دئے۔ لوگ اشنان کے لئے آنے لگے مگر عورت مرد بچہ بوڑھا جو آتا۔ الفربہ خواہ مخواہ مرد آدمی دیکھ کر اُنھیں کی طرف جھکتا۔ یہ اُنھیں پوجا کرواتے تھے۔ تلک لگاتے تھے جن دوستوں سے راز کہہ رکھا تھا انھوں نے مرزا سلیماں شکوہ کو خبر کی۔ وہ مع اہل جلسہ اُسی وقت لبِ بام آئے۔ دیکھیں تو فی الحقیقت اناج۔ آٹا۔ پیسے۔ کوڑیوں کے ڈھیر لگے ہیں۔ وہ بھی اس قدر کہ اور سب سے زیادہ۔ اس میں تفریحِ طبع یا لیاقت ہر فنی کے اظہار کے ساتھ نکتہ یہ تھا کہ حضور خانہ زاد کو وبالِ دوش نہ سمجھیں۔ نہ اس شاعری کا پابند جانیں۔ جس کوچہ میں جائے گا اوروں سے کچھ اچھا ہی نکلے گا۔

فائق کے ساتھ لطیفہ

فائق تخلص۔ ایک فلک زدہ شاعر تھا۔ خدا جانے کس بات پر خفا ہوا کہ اُن کی ہجو کہی اور خود لا کر سُنائی۔ اُنھوں نے بہت تعریف کی۔ بہت اُچھلے بہت کودے۔ اور پانچ روپے بھی دئے۔ جب وہ چلا تو بولے ذرا ٹھیرئے گا۔ ابھی آپ کا حق باقی ہے قلم اُٹھا کر یہ قطعہ لکھا اور حوالہ کیا:—

فائق بے حیا چو ہجوم گفت — دلِ من سوخت سوخت سوختہ بہ
صلہ اش پنج روپیہ دادم — دہنِ سگ بہ لقمہ دوختہ بہ

حافظ احمد یار کے ساتھ لطائف

دلی میں حافظ احمد یار ایک معقول صحبت یافتہ نامور حافظ تھے۔ اور سرکار شاہی میں حافظان قرآن میں نوکر تھے۔ اگرچہ دنیا میں ایسا کون شخص تھا جس سے سید انشا یارانہ نہ برتیں۔ مگر حافظ احمد یار کے بڑے یار تھے۔ اُن کا سجع کہا تھا۔ ع اللہ حافظ احمد یار ۔ حافظ صاحب ایک دن ملنے گئے رستہ میں مینہ آگیا اور وہاں پہنچنے تک موسلا دھار برسنے لگا۔ یہ جاکر بیٹھے ہی تھے جو حرم سرا سے ننگے منگے ایک کھاروے کی لنگی باندھے آپ دوڑے آئے اُنھیں دیکھتے ہی اُچھلنے لگے۔ ہاتھ پھیلا پھیلا کر گرد پھرتے تھے اور کہے جاتے تھے ۔

بھر بھر چھاجوں برست نور — ردّ بلیاں دُشمن دور

حافظ مذکور جب رخصت ہوتے تھے تو ہمیشہ کہا کرتے تھے ع اللہ حافظ احمد یار ایسے ایسے معاملے ہزاروں تھے کہ دن رات بات بات میں ہوتے رہتے تھے +

نہایت افسوس کے قابل یہ بات ہے کہ سعادت علی خاں کے ہاتھوں سید انشا کا انجام اچھا نہ ہوا۔ اس کے مختلف سبب ہیں۔ اوّل تو یہ کہ اگرچہ اپنی ہمہ رنگ طبیعت کے زور سے انھوں نے انھیں پرچا لیا تھا۔ مگر درحقیقت اُن کے اور ان کے معاملہ کا مصداق ان کا مطلع تھا۔

رات وہ بولے مجھ سے ہنس کر چاہ میاں کچھ کھیل نہیں
میں ہوں جھنسوڑا اور تو ہے مقطع میرا تیرا میل نہیں

مخالفت طبع

اکثر میلوں تماشوں میں چلنے کے لئے کچھ احباب کا تقاضا کچھ ان کی طبیعت اصلی کا تقاضا تھا۔ غرض اُنھیں جانا ضرور اور یہ سعادت علی خاں کی طبع کے بالکل مخالف۔ اکثر ایسا ہوا کہ وہ اپنے کاغذات دیکھ رہے ہیں۔ مصاحبوں کے ساتھ یہ بھی حاضر ہیں۔ اس میں ایک آدھ لطیفہ بھی ہو جاتا ہے۔ انھوں نے عرض کی

حضور غلام کو اجازت ہے؟ وہ بولے کہ ہوں! کہاں؟ اُنھوں نے کہا کہ حضور آج آٹھوں کا میلہ ہے۔ اُنھوں نے کہا لَا حَولَ وَلَا قُوَّۃ۔ سید انشا بولے کہ مناسب تو یہ تھا کہ حضور بھی تشریف لے چلتے۔ نواب نے کہا۔ انشا ایسے ناروا مقاموں میں جانا تمھیں کس نے بنایا ہے؟ عرض کی۔ حضور وہاں تو جانا ایک اعتبار سے فرض عین ہے اور ایک نظر سے واجب کفائی ہے۔ ایک لحاظ سے سنّت ہے۔ پھر سب کی توجیہیں بھی الگ الگ بیان کیں۔ آخر اسی عالم مصروفیت میں سُنتے سُنتے دق ہوکر نواب نے کہہ دیا۔ قصّہ مختصر کرو۔ اور جلدی سدھارو۔ اُسی وقت موچھوں پر تاؤ دے کر بولے۔ کون ہے آج سوا سید انشا کے جو کچھ کہے۔ اُسے عقل سے۔ نقل سے۔ آیت سے اور روایت سے ثابت کردے۔ ایسی باتیں بعض موقع پر نواب کو موجب تفریح ہوتی تھیں۔ بعض دفعہ بمقتضائے طبیعت اصلی مکدر ہوجاتے تھے۔ خصوصاً جب کہ رخصت کے وقت خرچ مانگتے تھے۔ کیونکہ وہ شاہ عالم نہ تھا۔ سعادت علی خاں تھا۔ ؎

گر جاں طلبی مضایقہ نیست ۔۔۔ زر می طلبی سخن درین است

تقدیر یا تقدیر! غضب یہ ہوا کہ ایک دن سرِدربار بعض شرفائے خاندانی کی شرافت و نجابت کے تذکرے ہورہے تھے۔ سعادت علی خاں نے کہا کہ کیوں بھئی ہم بھی نجیب الطرفین ہیں۔ اسے اتفاق تقدیر کہو۔ یا زیادہ گوئی کا ثمرہ سمجھو۔ سید انشا بول اُٹھے کہ حضور بلکہ انجب۔ سعادت علی خاں حرم[1] کے شکم سے تھے وہ چپ اور تمام دربار درہم برہم ہوگیا۔ اگرچہ انھوں نے

[1] معتبر لوگوں کی زبانی معلوم ہوا کہ جب گنّا بیگم دختر قزلباش خاں اُمید کے حُسن و جمال اور سلیقے اور سگھڑاپے اور حاضر جوابی اور موزونی طبع کی شہرت ہوئی تو نواب شجاع الدولہ نوجوان تھے اُس سے شادی کرنی چاہی۔ بزرگوں نے حسب آئین بادشاہ سے اجازت مانگی۔ فرمایا کہ اس کے لئے ہم نے تجویز کی ہوئی ہے۔ ایک خاندانی سیدزادی لڑکی کو حضور نے بنظر ثواب خود بیٹی کرکے پالا تھا۔ اُس کے ساتھ شادی کی اور اس دھوم دھام سے کی کہ شاید کسی شہزادی کی ہوئی ہو۔ یہی سبب تھا کہ شجاع الدولہ اور تمام خاندان ان کی بڑی عظمت کرتے تھے۔ دُلھن بیگم صاحب ان کا نام تھا۔ اور آصف الدولہ کی والدہ تھیں۔ سعادت علی خاں کو بچپن میں منگلو کہتے تھے کہ منگل کو پیدا ہوئے تھے۔ بیگم کے دل میں جو (باقی صفحہ ۲۹۵ پر)

پھر اور باتیں بنا بنا کر بات کو مٹانا چاہا۔ مگر کمانِ تقدیر سے تیر نکل چکا تھا۔ وہ کھٹک دل سے نہ نکلی کہ وَلَدُ الجَارِیَۃِ اَعجَبُ ✦

اب نواب کے انداز بدلنے لگے اور اس فکر میں رہنے لگے کہ کوئی بہانہ انکی سخت گیری کے لئے ہاتھ آئے۔ یہ بھی انواع و اقسام کے چٹکلوں سے اُس کے آئینۂ عنایت کو چمکاتے مگر دل کی کدورت صفائی کی صورت نہ ہونے دیتی تھی۔ ایک دن سید انشا نے بہت ہی گرم لطیفہ سنایا۔ سعادت علی خاں نے کہا کہ انشا! جب کہتا ہے ایسی بات کہتا ہے کہ نہ دیکھی ہو نہ سُنی ہو۔ یہ موچھوں پر تاؤ دے کر بولے کہ حضور کے اقبال سے قیامت تک ایسی ہی کہے جاؤں گا کہ دیکھی ہو نہ سُنی ہو۔ نواب تو تاک میں تھے چیں بجبیں ہو کر بولے کہ بھلا زیادہ نہیں! فقط دو لطیفے روز سنا دیا کیجئے۔ مگر شرط یہی ہے کہ نہ دیکھے ہوں نہ سُنے ہوں نہیں تو خیر نہ ہوگی۔ سید انشا سمجھ گئے کہ یہ انداز کچھ اَور ہیں۔ خیر۔ اُس دن سے دو لطیفے روز تو انھوں نے سنانے شروع کر دیئے۔ مگر چند روز میں یہ عالم ہوگیا کہ دربار کو جانے لگتے تو جو پاس بیٹھا ہوتا اُسی سے کہتے کہ کوئی نقل۔ کوئی چٹکلا یاد ہو تو بتاؤ۔ ذرا نواب کو سُنائیں۔ وہ کہتا کہ جناب بھلا آپ کے سامنے اور ہم چٹکلے کہیں! یہ کہتے کہ میاں کوئی بات چڑیا کی چنونے کی جو تمھیں یاد ہو کہہ دو۔ میں نون مرچ لگا کر اُسے خوشش کرلوں گا۔ اسی اثنا میں ایک دن ایسا ہوا کہ سعادت علی خاں نے اُنھیں بلا بھیجا۔ یہ کسی اَور امیر کے ہاں گئے ہوئے تھے۔ چوبدار نے آکر عرض کی کہ گھر نہیں ملے۔ خفا ہو کر حکم دیا کہ ہمارے سوا کسی اَور کے ہاں نہ جایا کرو۔ اِس قیدِ بے زنجیر نے اُنھیں بہت دق کیا۔ تازہ مصیبت یہ ہوئی کہ تعالی اللہ خاں نوجوان بیٹا مر گیا۔ اس صدمہ سے حواس میں فرق آگیا۔ یہاں تک کہ ایک دن سعادت علی خاں کی سواری اُن کے مکان کی طرف سے نکلی۔ کچھ

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۲۹۴) خیالات ان کے باب میں تھے اکثر ظاہر بھی ہو ہی جاتے تھے۔ مگر زیرکی اور دانائی کے آثار بچپن ہی سے عیاں تھے۔ نواب شجاع الدولہ کہا کرتے تھے۔ کہ بیگم اگر منگھو کے سر پر تم ہاتھ رکھوگی تو تمھارے دوپٹے کا پھریرا لگائے گا۔ لشکر کا علم نربدا کے اُس پار گاڑے گا ✦

غم و غصہ۔ کچھ دل بے قابو۔ غرض سرِ راہ کھڑے ہو کر سخت و سُست کہا۔ سعادت علی خاں نے جا کر تنخواہ بند کر دی۔ اب جنون میں کیا کسر رہی*

سعادت یار خاں رنگین اُن کے بڑے یار تھے اور دستار بدل بھائی تھے۔ چنانچہ سید انشا خود کہتے ہیں:-

عجب رنگینیاں ہوتی ہیں کچھ باتوں میں اے انشا ۔ بہم مل بیٹھتے ہیں جب سعادت یار خاں اور ہم

خان موصوف کہا کرتے تھے کہ لکھنؤ میں سید انشار کے وہ وہ رنگ دیکھے۔ جن کا خیال کر کے دُنیا سے جی بیزار ہوتا ہے۔ ایک تو وہ اوج کا زمانہ تھا کہ سعادت علی خاں کی ناک کے بال تھے۔ اپنی کمال لیاقت اور شگفتہ مزاجی کے سبب سے مرجع خلائق تھے۔ دروازے پر گھوڑے۔ ہاتھی۔ پالکی۔ نالکی کے ہجوم تھے رستہ نہ ملتا تھا۔ دوسری وہ حالت کہ پھر جو میں لکھنؤ گیا تو دیکھا کہ ظاہر درست تھا۔ مگر درخت اقبال کی جڑ کو دیمک لگ گئی تھی۔ میں ایک شخص کی ملاقات کو گیا۔ وہ اثنائے گفتگو میں دوستانِ دُنیا کی ناآشنائی اور بے وفائی کی شکایت کرنے لگے۔ میں نے کہا البتہ ایسا ہے۔ پھر بھی زمانہ خالی نہیں انھوں نے زیادہ مبالغہ کیا۔ میں نے کہا کہ ایک ہمارا دوست انشا ہے کہ دوست کے نام پر جان دینے کو موجود ہے وہ خاموش ہوئے اور کہا کہ اچھا زیادہ نہیں۔ آج آپ اُن کے پاس جائیے اور کہئے کہ ہمیں ایک تربوز خود بازار سے لا کر کھلا دو۔ موسم کا میوہ ہے کچھ بڑی بات بھی نہیں ہے۔ میں نے کہا کہ بھلا یہ بھی کچھ فرمایش ہے۔ وہ بولے کہ بس یہی فرمایش ہے۔ مگر شرط یہ ہے کہ وہ خود لا کر کھلائیں۔ بلکہ ۴ر کے پیسے بھی آپ مجھ سے لے جائیں۔ میں اُسی وقت اُٹھ کر پہنچا۔ انشا عادتِ قدیم کے بموجب دیکھتے ہی دوڑے۔ صدقہ قربان گئے۔ جم جم آئیے۔ نت نت آئیے۔ بلائیں لینے لگے۔ میں نے کہا یہ نازو انداز ذرا طاق میں رکھو۔ پہلے ایک تربوز تو لا کر کھلاؤ۔ گرمی نے مجھے جلا دیا۔ اُنھوں نے آدمی کو پکارا۔ میں نے کہا کہ آدمی کی سہی نہیں۔ تم آپ جاؤ۔ اور ایک اچھا سا شہیدی تربوز دیکھ کر لاؤ۔

اُنھوں نے کہا کہ نہیں آدمی معقول ہے۔ اچھا ہی لائے گا۔ میں نے کہا نہیں کھاؤنگا تو تمھارا ہی لایا ہوا کھاؤں گا۔ اُنھوں نے کہا تو دیوانہ ہے! یہ بات کیا ہے۔ تب میں نے داستان سُنائی۔ اُس وقت انھوں نے ایک ٹھنڈی سانس بھری اور کہا کہ بھائی وہ شخص سچا اور ہم تم دونوں جھوٹے۔ کیا کروں ؟ ظالم کی قید میں ہوں سو اور بار کے گھر سے نکلنے کا حکم نہیں۔ **نیسواس نگ**۔ میاں رنگین بیان کرتے ہیں کہ میں سوداگری کے لئے گھوڑے لے کر لکھنؤ گیا اور سرا میں اُترا۔ شام ہوئی تو معلوم ہوا کہ قریب ہی مشاعرہ ہوتا ہے۔ کھانا کھا کر میں بھی جلسہ میں پہنچا ابھی دو تین سو آدمی آئے تھے۔ لوگ بیٹھے باتیں کرتے تھے۔ حقّہ پی رہے تھے۔ میں بھی بیٹھا ہوں۔ دیکھتا ہوں کہ ایک شخص مَیلی کُچیلی روئی دار مرزئی پہنے۔ سر پر ایک میلا سا پھینٹا۔ گھٹنا پاؤں میں۔ گلے میں پنیکیوں کا توبڑا ڈالے ایک لکڑ کا حقہ ہاتھ میں لئے آیا۔ اور سلام علیکم کہہ کر بیٹھ گیا۔ کسی کسی نے اُس سے مزاج پُرسی بھی کی۔ اُس نے اپنے توبڑے میں ہاتھ ڈال کر تمباکو نکالا اور اپنی چلم پر سُلفا جما کر کہا کہ بھئی ذرا سی آگ ہو تو اس پر رکھ دینا۔ اُسی وقت آوازیں بلند ہوئیں اور گُڑگُڑی۔ سِٹک۔ پیچوان سے لوگ تواضع کرنے لگے۔ وہ بے دماغ ہو کر بولا۔ کہ صاحب! ہمیں ہمارے حال پر رہنے دو۔ نہیں تو ہم جاتے ہیں۔ سب نے اُسکی بات کے لئے تسلیم اور تعمیل کی۔ دم بھر کے بعد پھر بولا کہ کیوں صاحب ابھی مشاعرہ شروع نہیں ہوا؟ لوگوں نے کہا جناب لوگ جمع ہوتے جاتے ہیں سب صاحب آجائیں تو شروع ہو۔ وہ بولا کہ صاحب ہم تو اپنی غزل پڑھ دیتے ہیں! یہ کہہ کر توبڑے میں سے ایک کاغذ نکالا۔ اور غزل پڑھنی شروع کر دی:۔

کمر باندھے ہوئے چلنے کو یاں سب یار بیٹھے ہیں	بہت آگے گئے باقی جو ہیں تیار بیٹھے ہیں
نہ چھیڑ اے نکہتِ بادِ بہاری راہ لگ اپنی	تجھے اٹکھیلیاں سوجھی ہیں ہم بیزار بیٹھے ہیں
تصوّر عرش پر ہے اور سر ہے پائے ساقی پر	غرض کچھ اور دُھن میں اس گھڑی میخوار بیٹھے ہیں

بسانِ نقشِ پائے رہرواں کوے تمنا میں | نہیں اُٹھنے کی طاقت کیا کریں لاچار بیٹھے ہیں
یہ اپنی چال ہے اُفتادگی سے اب کہ پہروں تک | نظر آیا جہاں پر سایۂ دیوار بیٹھے ہیں
کہاں صبر و تحمل۔ آہ ننگ و نام کیا شے ہے | میاں رو پیٹ کر ان سب کو ہم یکبار بیٹھے ہیں
نجیبوں کا عجب کچھ حال ہے اس دَور میں یارو | جہاں پوچھو یہی کہتے ہیں ہم بیکار بیٹھے ہیں

بھلا گردش فلک کی چین دیتی ہے کسے انشا
غنیمت ہے کہ ہم صورت یہاں دو چار بیٹھے ہیں

وہ تو غزل پڑھ۔ کاغذ پھینک۔ سلام علیک کہہ کر چلے گئے۔ مگر زمین و آسمان میں سناٹا ہو گیا اور دیر تک دلوں پر ایک عالم رہا۔ جس کی کیفیت بیان نہیں ہو سکتی۔ غزل پڑھتے میں مَیں نے بھی پہچانا۔ حال معلوم کیا تو بہت رنج ہوا اور گھر پر جا کر پھر ملاقات کی۔ **چوتھی دفعہ** جب لکھنؤ گیا تو پوچھتا ہوا گھر پہنچا۔ افسوس جس دروازہ پر ہاتھی جھومتے تھے وہاں دیکھا کہ خاک اُڑتی ہے اور کُتّے لوٹتے ہیں۔ ڈیوڑھی پر دستک دی۔ اندر سے کسی بُڑھیا نے پوچھا کہ کون ہے بھائی؟ (وہ اُن کی بی بی تھیں) میں نے کہا کہ سعادت یار خاں دلّی سے آیا ہے۔ چونکہ سیّد انشا سے انتہائے درجہ کا اتحاد تھا۔ اُس عفیفہ نے پہچانا۔ دروازہ پر آکر بہت روئیں اور کہا کہ بھیّا ان کی تو عجب حالت ہے۔ اے لو مَیں ہٹ جاتی ہوں۔ تم اندر آؤ۔ اور دیکھ لو۔ میں اندر گیا۔ دیکھا کہ ایک کونے میں بیٹھے ہیں۔ تن برہنہ ہے۔ دونوں زانوؤں پر سر دھرا ہے۔ آگے راکھ کے ڈھیر ہیں۔ ایک ٹوٹا سا حقہ پاس رکھا ہے۔ یا تو وہ شان و شکوہ کے جمگھٹ دیکھتے تھے وہ گرمجوشی اور چہلوں کی ملاقاتیں ہوتی تھیں یا یہ حالت دیکھی بے اختیار دل بھر آیا۔ میں بھی وہیں زمین پر بیٹھ گیا۔ اور دیر تک رویا۔ جب جی ہلکا ہوا تو میں نے پکارا کہ سیّد انشا۔ سیّد انشا۔ سر اُٹھا کر اس نظر حسرت سے دیکھا۔ جو کہتی تھی کہ کیا کروں۔ آنکھ میں آنسو نہیں۔ میں نے کہا کیا حال ہے؟ ایک ٹھنڈی سانس بھر کر کہا کہ شکر ہے۔ پھر

اس طرح سر کو گھٹنوں پر رکھ لیا کہ پھر نہ اُٹھایا۔

بعض فلاسفۂ یونان کا قول ہے کہ مدّت حیات ہر انسان کی سانسوں کے شمار پر ہے۔ میں کہتا ہوں کہ ہر شخص جس قدر سانس یا جتنا رزق اپنا حصّہ لایا اُسی طرح ہر شئے کہ جس میں خوشی کی مقدار اور ہنسی کا اندازہ بھی داخل ہے وہ لکھوا کر لایا ہے۔ سیّد موصوف نے اُس ہنسی کی مقدار کو جو عمر بھر کے لئے تھی تھوڑے وقت میں صرف کر دیا۔ باقی وقت یا خالی رہا یا غم کا حصّہ ہو گیا۔

غزلیات

جھڑکی سہی ادا سہی چینِ جبیں سہی — یہ سب سہی پر ایک نہیں کی نہیں سہی

مرنا مرا جو چاہے تو لگ جا گلے سے ٹک — اب ہی کا دم یہ میرا دمِ واپسیں سہی

گر نازنیں کے کہنے سے مانا بُرا ہو کچھ — میری طرف تو دیکھئے میں نازنیں سہی

آگے بڑھے جو جاتے ہو کیوں کون ہے یہاں — جو بات ہم کو کہنی ہے تم سے نہیں سہی

منظور دوستی جو تمھیں ہے ہر ایک سے
اچھا تو کیا مضائقہ اِنشا سے کیں سہی

یہ نہیں برق اک فرنگی ہے — رعد و باراں قشون جنگی ہے

کوئی دنیا سے کیا بھلا مانگے؟ — وہ تو بیچاری آپ ننگی ہے

واہ دِلّی کی مسجدِ جامع — جس میں بَرّاق فرش سنگی ہے

حوصلہ ہے فراخ رندوں کا — چرخ کی پر بہت سی تنگی ہے

لگ گئے عیب سارے اُس کے ساتھ — یوں کہا جس کو مرد بنگی ہے

ڈرو وحشت کی دھوم دھام سے تم — وہ تو اک دیونی و بنگی ہے

جوگی جی صاحب آپ کی بھی واہ — دھرم مورت عجب کوڈھنگی ہے

آپ ہی آپ ہے پکار اُٹھتا — دل بھی جیسے گھڑی فرنگی ہے

چشم بد دور شیخ جی صاحب کیا ازار آپ کی اونٹگی ہے
شیخ سعدیِ وقت ہے انشا
تُو ابو بکر سعد زنگی ہے

جگر کی آگ بُجھے جس سے جلد وہ شے لا لگا کے برف میں ساقی صراحیِ مے لا
قدم کو ہاتھ لگاتا ہوں اُٹھ کہیں گھر چل خُدا کے واسطے اتنے تو پاؤں مت پھیلا
نکل کے وادیِ وحشت سے دیکھ اے مجنوں کہ زور دھوم سے آتا ہے ناقۂ لیلا
گرا جو ہاتھ سے فرہاد کے کہیں تیشہ درونِ کوہ سے نکلی صدائے وادیلا
نزاکت اُس گُلِ رعنا کی دیکھیو انشا
نسیمِ صبح جو چھو جائے رنگ ہو مَیلا

جمال و عظمتِ داور و خالقِ ملکوت خیال کر کے یہ کہتا ہوں بھلا رے جبروتا
نمودِ سطوتِ پروردگار ہے دیکھو جہاں تلک کہ کرے کام یہ نظر کا ثبوت
مجسطا اس میں ہے تمثال جلوہ واجب اگرچہ آئینۂ ممکنات ہے ناسُوت
زہے کریم کہ کرّوبیوں کو جس نے دیا مدام مشغلۂ سیرِ گُلشنِ لاہوت
حسنؑ حسینؑ کی خاطر سے بخش دیوے گا گناہگاروں کو قصرِ زمرّد و یاقُوت
کہ جس میں سیکڑوں حوریں ہزار ہا غلماں ہر ایک مثلِ قمر ہیں بدونِ ریش و بُرُوت
بہ یُمنِ سُبحہ سُبْحَانَ رَبِّیَ الْاَعْلٰے عطا کرے جو تفضّل سے قدسیوں کا قُوت
بغیر اُس کے کرم کے نہیں بن آتی بات ہزار گرچہ پڑھا کیجئے دعائے قنُوت
بیان ذات کے اوصاف کس سے ہوں انشا
صفات جس کی ہیں حمّال عرش ہیں مبہُوت

خیال کیجئے کیا کام آج میں نے کیا جب اُن نے دی مجھے گالی سلام میں نے کیا
کہا یہ صبر نے دل سے کہ لو خدا حافظ کہ حقِ بندگی اپنا تمام میں نے کیا
جنوں یہ آپ کی دولت ہوئی نصیب مجھے کہ ننگ و نام کو چھوڑا یہ نام میں نے کیا

لگا یہ کہنے کہ خیر۔ اختلاط کی خوبی حوالے یار کے خالی جو جام میں نے کیا
جھڑک کے کہنے لگے لگ چلے بہت اب تم کبھی جو بھول کے اُن سے کلام میں نے کیا
کیا زبانیِ دل کر بیاں یہ کہتا ہے صنم کو اپنے غرض اب تو رام میں نے کیا
کہیں نہ مانیو۔ بہتان ہے یہ سب اُس پر ہنسی کے واسطے یہ اتہام میں نے کیا
تمھارے واسطے تم اپنے دل میں غور کرو کبھی کسی سے نہ ہو جو مدام میں نے کیا
مقیم کعبۂ دل جب ہوا تو زاہد کو روانہ جانب بیت الحرام میں نے کیا
مزا یہ دیکھئے گا شیخ جی رُکے اُلٹے جو اُن کا بزم میں کل احترام میں نے کیا
عجب طرح کے مزے چاندنی میں دیکھے رات قرار جا کے جو بر پشتِ بام میں نے کیا

ہوس یہ رہ گئی صاحب نے پر کبھی نہ کہا
آج سے تجھے انشا غلام میں نے کیا

دیوار پھاندنے میں دیکھو گے کام میرا جب دھم سے آکہوں گا۔صاحب سلام میرا
ہمسایہ آپ کے میں لیتا ہوں اک حویلی اس شہر میں ہوا گر چندے مقام میرا
جو کچھ کہ عرض کی ہے سو کر دکھاؤں گا میں واہی نہ آپ سمجھیں یُونہی کلام میرا
اچھا مجھے ستاؤ جتنا کہ چاہو۔ میں بھی سمجھوں گا گر ہے انشاء اللہ نام میرا
میں غش ہوا۔کہا جو ساقی نے مجھ سے ہنسکر یہ سبز جام تیرا اور سُرخ جام میرا
پوچھا کسی نے مجھکو اُن سے کہ کون ہے یہ تو بولے ہنس کے یہ بھی ہے اک غلام میرا

محشر کی تشنگی سے کیا خوف سید انشا
کوثر کا جام دے گا مجھ کو امام میرا

ہیں زور حُسن سے وہ نہایت گھمنڈ پر نامِ خُدا نگاہ پڑے کیوں نہ ڈنڈ پر
تعویذ لعل ہی کے نہ پھبرئیے گھمنڈ پر اِک نیلا ڈورا باندھئے اس گورے ڈنڈ پر
یارب سدا سہاگ کی میدھی رچا کرے پتے نچیں کھچیں رہے آفت ارنڈ پر
یہ باڑھ میری کاٹ کے ذی کس نے اس قدر جو تم رگڑ رہے ہو سروہی کو زنڈ پر

دو تین دن تو ہو چکے اب پھر چلو وہیں فیروز شہ کی لاٹھ کے اس چوتھے کھنڈ پر

وہ پہلوان سادہ لبِ جُو پہ ڈنڈ پیل بولا کہ کوئی غش ہو تو ایسے بھسنڈ پر

گلبرگ تر سمجھ کے لگا بیٹھی ایک چونچ بلبل ہمارے زخم جگر کے کھرنڈ پر

انشا بدل کے قافیے رکھ چھیڑ چھاڑ کے

چڑھ بیٹھ ایک اور بچھیرے اکنڈ پر

یہ جو مہنت بیٹھے ہیں رادھا کے کنڈ پر اوتار بن کے گرتے ہیں پریوں کے جھنڈ پر

اے موسم خزاں لگے آنے کو تیرے آگ بُلبل اُداس بیٹھی ہے اک سوکھے ڈُنڈ پر

شِو کے گلے سے پاربتی جی لپٹ گئیں کیا ہی بہار آج ہے برمھا کے رُنڈ پر

راجہ جی ایک جوگی کے چیلے پہ غش ہیں آپ عاشق ہوئے ہیں واہ عجب لُنڈ مُنڈ پر

انشا نے سُن کے قصۂ فرہاد یوں کہا

کرتا ہے عشق چوٹ تو ایسے ہی مُنڈ پر

غزل آزادوں کے لہجہ میں

جو چاہے تو مجھ سے ہنسوڑے کی خبر تو یوں دیکھ اُس گھوڑے جوڑے کی خبر

کُدا دے نشہ کے مرے رخش کو میاں ساقی اس سُلفے کوڑے کی خبر

دکھائی مجھے سیر باغِ ارم الٰہی ہو اِس سبزہ گھوڑے کی خیر

ہنسایا جو میں نے تو بولے۔ نہیں نظر آتی کچھ اس نگوڑے کی خیر

لگا بیٹھ انشا کو ٹھوکر تو ایک

ارے اپنے سونے کے توڑے کی خیر

مستزاد

گو صولتِ اسکندر و گو حشمتِ دارا
اے صاحبِ فطرت
پڑھ فاعتبروا یا اولی الابصار کا آیا
تا ہو تجھے عبرت

مستانہ جو میں نے قدحِ بنگ چڑھایا
در عالمِ وحشت
تب خضر پکارا کہ ھنیئًا مریئًا
اب دیکھ حلاوت!

ہے جی میں فقیروں کی طرح کھینچ لنگوٹا
اور باندھ کے تہمت
جا کنجِ خرابات میں ٹک گھونٹیے سبزا
یوں کیجے عبادت

اے عشق اجی آیئے سائیں اجی مولا
یاں کیجے عنایت
مرشد مرے مالک مرے ہادی مرے داتا
دیجے مجھے نعمت

ماتھے پہ مرے خط الف اللہ کا کھینچو
سونپو مجھے بستر
تم مونڈ گرو پیر یہ بندہ ہوا چیلا
جی سے کرے خدمت

میں خاک نشیں ہوں گا گروہِ فقرا سے
کیا سمجھے ہو مجھ کو
رومال چھڑی لے کے جو ٹک کھینچوں اداسا
دکھلاؤں کرامت

گر سیر کناں دیر میں جانکلوں تو بولوں
ناقوس کو سن کر
ہاں برہمنِ بتکدہ عشق است صدارا
ہے تجھ سے بھی الفت

خوش رہتے ہیں چار ابرو کی بتلا کے صفائی
مانند قلندر
نہ ہم کو غمِ دزد نہ اندیشۂ کالا
ہے خوب فراغت

درویش بلانوش بلا چٹ ہیں میاں دوست
پینک میں جو آدیں
افعی کو مسل کر کریں افیون کا گھولا
ہیں ایسے ہی آفت

گاڑھے ہیں ہم اس سے بھی جو نشے کو ہلا کر
للکارے تھا یوں ہیں
دیتا ہوں ہلا کنگرۂ عرشِ معلّی
رکھتا ہوں یہ طاقت

آزادوں کے لہجہ میں غزل تو نے سنائی از بہرِ تفنن
اب اپنی تو بولی کے کچھ اشعار کہہ انشا ہو جس میں ظرافت

ہے نام خدا دا چھڑے کچھ زور تماشا یہ آپ کی رنگت
گات ایسی غضب قہر پھبن اور جھگڑا اللہ کی قدرت

میں نے جو کہا ہوں میں ترا عاشقِ شیدا اے کانِ ملاحت
فرمانے لگے ہنس کے سنو اور تماشا یہ شکل یہ صورت

الحاد و تصوّف میں جو تھا فرق بہم یاں اصلا نہ رہا کچھ
پردہ جو تعیّن کا محبت نے اٹھایا کثرت ہوئی وحدت

تاثیر ہے کیا خاک میں اس نجد کی کہہ دے تو مجھ کو تو بارے
ہر پھر کے جو آ نکلے ہے یاں ناقۂ لیلیٰ اے جذبِ محبت

کعبہ کا کروں طوف کہ بت خانہ کو جاؤں کیا حکم ہے مجھ کو
ارشاد مرے حق میں بھی کچھ ہووے گا آیا اے پیرِ طریقت

ہوں پرتوِ روح القدس اس عہد میں میں بھی عیسےٰ کی طرح سے
یوں چاہئے بے ساختہ رہبانِ کلیسا میری کرے بیعت

آئے جو مرے گھر میں وہ شب راہِ کرم سے میں موند دی کنڈی
منہ پھیر لگے کہنے تعجب سے کہ یہ کیا ایں تیری یہ طاقت؟

ٹوٹا کریں اس طور مزے غیر ہمیشہ ٹک سوچو تو دل میں
ترسا کرے ہر وقت یہ بندہ ہی تمھارا اللہ کی قدرت

دیوار چمن پھاند کے پہنچے جو ہم ان تک اک تاک کی اُدجھل
ترساں ہو یہ فرمانے لگے کوٹ کے ماتھا اے وائے فضیحت

خورشید چھپا شام ہوئی شیخ جیو صاحب اب دیکھئے کیا ہو
چڑیوں نے لیا آ کے درختوں پہ بسیرا چوں چوں کرو حضرت

لے برق کی زنجیر کو ٹک سونڈ میں اپنی ... اے ابر کے ہاتھی
سیندور لگا ماتھے پہ اُس رنگ شفق کا ... با عظمت و شوکت

چل آٹھوں کے میلے کی ذرا دید کریں ہم ... ہے سیر کی جا گہ
ہم بیٹھ چڑھا یاروں کے بھر بیل رکدوا ... مت رعد کی سن دھت

شب محفل ہولی میں جو وارد ہوا زاہد ... رندوں نے لپٹ کر
ڈاڑھی کو دیا اس کی لگا بندر قطونا ... اور بجنے لگی گت

تب مغبچے کہنے لگے ٹک پر بلونا جو ... رکھ ناک پہ اُنگلی
اور آئے جی آئے سے بُرا ماننے سو بھڑوا ... ہے موسم عشرت

کشمیری معلم کو جو اک طفل نے ناگہ ... انگور کے دانے
لا کر دئے اور اُن سے کہا کھائیو میوا ... ہے قسم ولایت

لہجہ میں تکشمیر کے مقطع ہو یہ بولے ... شاگرد سے اپنے
چل سامنے سے میرے اُٹا کر بنیں لے جا ... بن میں نہیں لذت

یَیسا تہ انگر ناک ہے بر رو جیسے تجھ کو ... سو کوڑی کے دس ہیں
بابا یہ تا کیا ہے یہ چھٹا زانت ہے اس کا ... کانا نہ بنے مت

اب اور ردیف اور قوافی میں غزل پڑھ ... لیکن اسی ڈھب سے
تا شاعروں کے آگے ہو اس بزم میں انشا ... ظاہر تری شوکت

لینے جو بلائیں لگے ہم آپ کی چٹ پٹ ... تو بول اُٹھے جھٹ
چل جا ابے سے واہ زبر رو ہو پرے ہٹ ... ہے یہ بھی بناوٹ

ان آنکھوں کو میں حلقۂ زنجیر کروں گا ... ایسا ہی بلا ہوں
چھوڑوں ہوں کوئی آپ کے دروازے کی چوکھٹ ... جب تک نہ کھلے پٹ

مر جائے لہو چھانٹ نہ گونگا ہو وہ کیونکر ... جو شخص کہ دیکھے
سُرخی تری آنکھوں کی اور ابرو کی کھچاوٹ ... سُرمہ کی گھلاوٹ

ہے معدنِ انوارِ الٰہی دلِ عاشق سوچو تو عزیزو
اس چھوٹی سی جا گہ میں یہ وسعت یہ سماوٹ اللہ رے جمگھٹ

کیا پھبتی ہے اے نامِ خدا ابھرے آنا ہونٹوں پہ تمھارے
اک بوسہ کے صدمہ سے دھواں دھار نلاہٹ مستی کی اوداہٹ

میں روپ بدل اور ہی چپکے سے جو پہنچا بیٹھے تھے جہاں وہ
سُن کہنے لگے میرے دبے پاؤں کی آہٹ ہے ایک تونٹ کھٹ

تھی گرم یہ کچھ مجلسِ مے رات کہ ساقی سب کہتے تھے ناہد
ہے توبہ شکن آج صراحی کی غٹا غٹ بھلا رے جماوٹ

اس دائے رے بالیدگی اور چنپئی رنگت یہ گات یہ سج دھج
اور جامۂ شبنم کی وہ چولی کی بھساوٹ بازو کی گلاوٹ

مت چھیڑو مجھے دیکھو ابھی کہنے لگوگے اچھا کیا تم نے
چولی مری ٹکڑے ہوئی دامن بھی گیا پھٹ لگ جائے گی یہ رٹ

ہے نورِ بصر مردمکِ دیدہ میں پنہاں یوں جیسے کنھیا
سو اشک کے قطروں سے بڑا کھیلے ہے جھرمٹ اور آنکھیں ہیں پنگھٹ

اے عشق اجی آدِ مہاراجوں کے راجہ ڈنڈوت ہے تم کو
کر بیٹھے ہو تم لاکھوں کروڑوں ہی کے سر چٹ اک آن میں جھٹ پٹ

پھرتا ہے سما آنکھوں میں اب تک وہی انشا ہے ظالم ارے کیوں
باہم وہ لپٹ سونے میں آجانی رکاوٹ وہ پیار کی کروٹ

وہ سیج بھری پھولوں کی مخمل کے وہ تکیے کمخواب کی پوشش
بردے وہ تمامی کے وہ سونے کا چھپر کھٹ اور اُس کی سجاوٹ

ہے یہ اُس مہ جبین کی تصویر یا کسی حورِ عین کی تصویر
بن گئی دودِ آہ مجنوں میں ایک محمل نشین کی تصویر

اپنے داغِ جگر میں سوجھی ہے — مجھ کو اُس نازنین کی تصویر
دیکھ لے اُس کے چینِ پیشانی — ہے یہ خاقانِ چین کی تصویر
نظر آتی ہے اشکِ انشا میں
جبرئیلِ امین کی تصویر

مل گئے سینہ سے سینہ پھر یہ کیسا اضطراب — مرمٹے پر بھی گیا اپنے نہ دل کا اضطراب
کیوں پڑی ڈھلکیں نہ آنکھیں آنسوؤں کے بوجھ سے — ہے دلِ صد پارہ کو سیماب کا سا اضطراب
روح کا یہ حال ہے یاں قافلہ سے پڑکے دُور — کررہی ہو جس طرح محمل میں لیلا اضطراب
پوچھتے کیا ہو کہ تیرے دل میں کیا ہے مجھ سے پوچھ — اور کیا یاں خاک ہوگی جوش ہے یا اضطراب
دم لگا گھٹنے اجی میں کیا کہوں کل رات کو — تم نہ آئے تو کیا یاں جی نے کیا کیا اضطراب
کس غضب تھا پھاند کر دیوار آدھی رات کو — دھم سے میرا کودنا اور وہ تمہارا اضطراب
تھا وہ دھڑکا پر مزے سے ساتھ صدقے اُس کے جی — پھر کرے اپنے نصیب اللہ ویسا اضطراب
اُس کی چاہت میں جوانی اپنی جو تھی چل بسی — ہے پر اب تک جی کو اک جیسے کا تیسا اضطراب
پیرو مرشد کا یہ مصرع حسبِ حالِ انشا کے ہے
مرمٹے تب بھی گیا اپنے نہ دل کا اضطراب

غزل بر مصرع نواب سعادت علی خاں

پگڑی تو نہیں ہے یہ فراسیس کی ٹوپی — یاں وقتِ سلام اُترے ہے ابلیس کی ٹوپی
ہے شیخ کے سر ایسی ہی تلبیس کی ٹوپی — جس سے کہ پڑی کانپے ہے ابلیس کی ٹوپی
دیتے ہیں کُلہ اپنے مُریدوں کو جو صُوفی — کہتے ہیں یہی تھی سرِ جرجیس کی ٹوپی
سو جھکی ہوئی ہے یہ منقص کہ جہاں میں — ایسی تو نہ ہوگی کسی سائیس کی ٹوپی
ہُدہُد کو خوشی تب ہوئی جس دم نظر آئی — ہاتھوں میں سلیمان کے بلقیس کی ٹوپی
کل سوزنِ عیسٰے میں پرو خطِّ شعاعی — خورشید نے سی حضرتِ ادریس کی ٹوپی
کیوں واسطے جرّاب کے میری نہ ہو حاضر — غلمان کی اور حورِ فرادیس کی ٹوپی
پریوں کے گھروں میں وہی چوری کے مزے لیں — جن پاس ہو جنّوں کی جو ائیس کی ٹوپی

ممکن ہو تو دھر دیجیے بنا کر ترے سر پر زربفت مہ و زہرہ و برجیس کی ٹوپی
انگریز کے اقبال کی ہے ایسی ہی رتی آدبختہ ہے جس میں فراسیس کی ٹوپی

انشا مرے آغا کی سلامی کو جھکے ہے
سکانِ سراپردۂ تقدیس کی ٹوپی

مجھے کیوں نہ آوے ساقی نظر آفتاب اُلٹا کہ پڑا ہے آج خُم میں قدحِ شراب اُلٹا
عجب اُلٹے ملک کے ہیں اجی آپ بھی کہ تم سے کبھی بات کی جو سیدھی تو ملا جواب اُلٹا
چلے تھے حرم کو رہ میں ہوئے اک صنم پہ عاشق نہ ہوا ثواب حاصل یہ ملا عذاب اُلٹا
یہ شبِ گذشتہ دیکھا وہ خفا سے کچھ ہیں گویا کہیں حق کرے کہ ہووے یہ ہمارا خواب اُلٹا
ابھی جھڑ لگا دے بارش کوئی مست بھر کے نعرہ جو زمیں پہ پھینک مارے قدحِ شراب اُلٹا
یہ عجیب ماجرا ہے کہ بروزِ عیدِ قرباں وہی ذبح بھی کرے ہے وہی لے ثواب اُلٹا
ہوئے وعدہ پر جو جھوٹے تو نہیں ملاتے تیور اسے لو دیکھا کچھ تماشا یہ سنو عتاب اُلٹا
کھڑے چپ ہو دیکھتے کیا مرے دل اُجڑ گئے کو وہ گنہ تو کہدو جس سے یہ دہ خراب اُلٹا

غزل اور قافیوں میں نہ کہے سو کیونکہ انشا
کہ ہوا نے خود بخود آ ورقِ کتاب اُلٹا

مجھے چھیڑنے کو ساقی نے دیا جو جام اُلٹا تو کیا بہک کے میں نے اُسے اک سلام اُلٹا
سحر ایک ماش پھینکا مجھے جو دکھا کے اُن نے تو اشارہ میں نے تاڑا کہ ہے لفظِ شام اُلٹا
یہ بلا دھواں نشہ ہے مجھے اس گھڑی تو ساقی کہ نظر پڑے ہے سارا در و صحن و بام اُلٹا
بڑھوں اس گلی سے کیونکر کہ وہاں تو میرے دل کو کوئی کھینچتا ہے ایسا کہ پڑے ہے گام اُلٹا
درِ میکدہ سے آئی مہک ایسی ہی مزے کی کہ پچھاڑ کھا گرا واں دلِ تشنہ کام اُلٹا
نہیں اب جو بوسہ دیتے تو سلام کیوں لیا تھا مجھے آپ پھیر دیجے وہ مرا سلام اُلٹا
لگے کہنے اب مولع تجھے ہم کہا کریں گے کہیں اُن کے گھر سے بڑھکر جو پھرا غلام اُلٹا
مجھے کیوں نہ مار ڈالے تری زلف اُلٹ کے کافر کہ سکھا رکھا ہے تو نے اُسے لفظ رام اُلٹا

نرے سیدھے سادے ہم تو بھلے آدمی ہیں یارو ہمیں کج جو سمجھے سو خود ولدالحرام اُلٹا
تو جو باتوں میں رُکے گا تو یہ جانوں گا کہ سمجھا مرے جان و دل کے مالک نے مرا کلام اُلٹا
فقط اس لفافہ پر ہے کہ خط آشنا کو پہنچے
تو لکھا ہے اُس نے انشا یہ ترا ہی نام اُلٹا

پرتو سے چاندنی کے ہے صحنِ باغ ٹھنڈا پھولوں کی سیج پر آکر دے چراغ ٹھنڈا
شفقت سے ہاتھ تو دھر ٹک دل پہ میرے تا ہو یہ آگ سا دہکتا سینہ کا داغ ٹھنڈا
مے کی صراحی ایسی لا برف میں لگا کر جس کے دھوئیں سے ساقی ہو وے دماغ ٹھنڈا
تجنیس جس دنی کی ہو جوشس چشم یارو ہم نے مدام پایا اُس کا اُجاغ ٹھنڈا
ہیں ایک شخص لاتے خس کی شراب انشا
دھودھا گلاب سے تو کر رکھ ایاغ ٹھنڈا

شیخ غلام ہمدانی مصحفی

مصحفی تخلص۔ غلام ہمدانی نام۔ باپ کا نام ولی محمد۔ امروہہ کے رہنے والے تھے۔ آغاز جوانی تھا۔ جو دلّی میں آکر طالب علمی کی۔ طبیعت میں موزونیت خداداد تھی۔ اس میں قوت بہم پہنچائی۔ ابتدا سے غربت اور مسکینی اور ادب کی پابندی طبیعت میں تھی۔ ساتھ اس کے خوش خُلقی اور خوش مزاجی تھی جس نے بزرگان دہلی کی صحبتوں تک رسائی دی تھی۔ مشاعرہ بھی کیا کرتے تھے انہی سامانوں کا سبب تھا کہ سب شاعر اور معزز اشخاص اس میں شامل ہوتے تھے۔ دلّی کا اُس وقت یہ عالم تھا کہ خود وہاں کے گھرانے گھر چھوڑ چھوڑ کر نکلے جاتے تھے۔ اسلئے انھیں بھی شہر چھوڑنا پڑا۔ وطن یہاں نہ تھا مگر دلی میں خدا جانے کیا میٹھا ہے کہ خود کہتے ہیں ؎

لکھنؤ جاتے ہیں

دلّی کہیں ہیں جس کو زمانہ میں مصحفی میں رہنے والا ہوں اُسی اُجڑے دیار کا

اسی طرح اپنے کلام میں اکثر جگہ دلّی کے رہنے کا فخر کرتے ہیں۔ غرض آصف الدولہ

کا زمانہ تھا کہ لکھنؤ پہنچے۔ اور مرزا سلیماں شکوہ کی سرکار میں (جو دلّی والوں کا معمولی ٹھکانا تھا) ملازم ہوئے۔ چنانچہ اکثر غزلوں میں بھی اس کے اشارے ہیں۔ ایک شعر اُن میں سے ہے

تخت طاؤس پہ جب ہووے سلیماں کا جلوس ۔۔۔ مُورچھل ہاتھ میں ہیں بالِ ہما کا لے لوں

شیخ مصحفی کی لیاقت اور استعداد

غرض کثرتِ مشق سے اپنی اُستادی کو خاص و عام میں مسلم الثبوت کیا۔ علمیت کا حال معلوم نہیں ۔ مگر تذکروں سے اور خود اُن کے دیوانوں سے یہ ثابت ہے کہ زبانِ فارسی اور ضروریاتِ شعری سے باخبر تھے۔ اور نظم و نثر کی کتابوں کو اچھی طرح دیکھ کر معلوماتِ وسیع اور نظر بلند حاصل کی تھی +

شوقِ کمال

شوق کمال کا یہ حال تھا کہ لکھنؤ میں ایک شخص کے پاس کلیات نظیری تھا اُس زمانہ میں کتاب کی قدر بہت تھی۔ مالک اُس کا بہ سبب نایابی کے کسی کو عاریۃً بھی نہ دیتا تھا۔ اُن سے اتنی بات پر راضی ہوا کہ خود آکر ایک جزو لے جایا کرو۔ وہ دیکھ لو تو واپس کر کے اور لے جایا کرو۔ اُن کا گھر شہر کے اُس کنارہ پر تھا اور وہ اِس کنارہ پر۔ چنانچہ معمول تھا کہ ایک دن درمیان وہاں جاتے اور جز بدل کر لے آتے۔ ایک دفعہ جب وہاں سے لاتے تو پڑھتے آتے۔ گھر پر آکر نقل یا خلاصہ کرتے۔ اور جاتے ہوئے بھر پڑھتے جاتے۔ ہم لوگوں کے حال پر افسوس ہے کہ آج چھاپہ کی بدولت وہ وہ کتابیں دُکانوں میں پڑی ہیں جو ایک زمانہ میں دیکھنے کو نصیب نہ ہوتی تھیں۔ مگر بے پروائی ہمیں آنکھ اُٹھا کر نہیں دیکھنے دیتی۔ تعجب ہے اُن لوگوں سے جو یہ شکایت کرتے ہیں کہ پہلے بزرگوں کی طرح اب لوگ صاحب کمال نہیں ہوتے۔ پہلے جو لوگ کتاب دیکھتے تھے تو اُس کے مضمون کو اس طرح دل و دماغ میں لیتے تھے جس سے اُس کا اثر دلوں میں نقش ہوتے تھے۔ آج کل کے لوگ پڑھتے بھی ہیں تو اس طرح صفحوں سے عبور کر جاتے ہیں۔ گویا بکریاں ہیں کہ باغ میں گھس گئی ہیں۔ جہاں مُنہ پڑ گیا ایک بکّہ بھی بھر لیا۔ باقی کچھ خبر نہیں۔ ہوس کا بجر وا ہا اُن کی گردن پر سوار ہے۔ وہ دبلائے لئے جاتا ہے یعنی امتحان پاس کر کے ایک سند لو اور کوئی نوکری لے کر بیٹھ رہو۔ اور

افسوس یہ ہے کہ نوکری بھی نصیب نہیں +

انداز کلام

محاورات قدیم میں انھیں میر سوز۔ سودا اور میر کا ایک آخری ہمزبان سمجھنا چاہیے۔ وہ سید انشا اور جرأت کی نسبت دیرینہ سال تھے۔ یا تو بڑھاپے نے پرواز کے بازو ضعیف کر دئے تھے۔ یا قدامت کی محبت نئی شے کے حُسن کو حسین کر کے نہ دکھاتی تھی۔ جیسے آزاد ناقابل کہ ہزار طرح چاہتا ہے۔ مگر اُس کا دل نئی شائستگی سے کسی عنوان اثر پذیر نہیں ہوتا۔ شیخ موصوف نے لکھنؤ میں صدہا شاگرد کئے مگر اب تک یہ کسی تذکرہ سے نہیں ثابت ہوا کہ وہ خود کس کے شاگرد تھے[1]۔ انھوں نے بڑی عمر پائی۔ اور اپنے کلام میں اس کے اشارے بھی کئے ہیں۔ بڑھاپے میں پھر شادی کی تھی۔ طبیعت کی رنگینی نے مسی کی مدد سے دانتوں کو رنگین کیا تھا۔ چنانچہ سید انشا نے اپنی ہجو میں سب اشارے کئے ہیں۔ غرض جب تک زندہ رہے لکھنؤ میں رہے۔ اور وہیں ۱۲۴۰ھ ہجری میں فوت ہوئے۔ سید انشا۔ جرأت۔ میر حسن وغیرہ شعراء اُن کے ہمعصر ہیں +

بڑھاپے میں شادی

عام تذکرے گواہی دیتے ہیں کہ ان کی تصنیفات میں چھ دیوان اردو کے تمام و کمال ہیں۔ جن میں ہزاروں غزلیں۔ اور بہت سے قصیدے۔ اور ابیات اور رباعیاں اور معمولی تضمینیں ہیں۔ چنانچہ ایک قصیدے کے دعائیہ میں کہتے ہیں:۔

مصحفی آج دعا مانگے ہے تجھ سے یارب	ایکہ ہے ذات تری سب پہ غفور اور رحیم
یہ جو دیوان چھوڑ دوں اُسکے ہیں مانندِ سُہیل	بزم شاہاں میں لباس ان کا ہے جلدِ ادیم

دیوان ہفتم ہشتم

دو تذکرے شعرائے اُردو کے لکھے ہیں۔ ایک تذکرہ فارسی کا۔ اور ایک دیوان فارسی لکھا۔ مگر راقم کے پاس جو اُن کے دیوان ہیں۔ اُن میں سے ایک پر دیوان ہفتم لکھا ہے۔ اور ایک دیوان اور ہے۔ اُس میں سید انشا کے جھگڑے بھی ہیں۔ یہ آٹھواں[2] ہوگا کہ سب سے آخر ہے +

[1] سراپا سخن میں لکھا ہے کہ امانی کے شاگرد تھے۔

[2] بڑھاپے نے بہرا بھی کر دیا تھا۔ چنانچہ ساتویں دیوان میں ہے ؎ مصحفی آپ کو دانستہ بنایا ہے اصم + رنج تا مجھ کو نہ پہنچے سخن بدگو سے + عمر نے جب عشرۂ ہشتم میں رکھا ہے قدم۔ مصحفی کیا ہو سکے مجھ ناتوان دراز سے +۔ (بقیہ حاشیہ بر صفحہ ۳۱۲)

رائے غزلوں پر

دیوان اُن کی استادی کو مسلّم الثبوت کرتے ہیں۔ انواع و اقسام کی صدہا غزلیں ہیں جو غزلیں نہایت سنگلاخ زمینوں میں لکھی ہیں اُن سے معلوم ہوتا ہے کہ کثرت مشق سے کلام پر قدرت کامل پائی ہے۔ الفاظ کو پس و پیش اور مضمون کو کم و بیش کر کے اس درو بست کے ساتھ شعر میں کھپایا ہے کہ جو حق اُستادی کا ہے ادا ہو گیا ہے۔ ساتھ اسکے اصل محاورہ کو بھی ہاتھ سے نہیں جانے دیتے۔ ایسے موقع پر کچھ کچھ سودا کا سایہ پڑتا ہے جہاں سادگی ہے وہاں ایسا معلوم ہوتا ہے کہ میر سوز کے انداز پر چلتے ہیں۔ اسی کوچہ میں اکثر شعر میر صاحب کی جھلک دکھلاتے ہیں مگر جو اُن کے جوہر ہیں وہ انہی کے ساتھ ہیں یہ اس ڈھنگ میں تو بھسینڈے ہو جاتے ہیں۔ بات یہ ہے کہ طبیعت رواں تھی۔ پُرگوئی کے سبب سے وہ لطف کلام میں پیدا نہ ہوا۔ غزلوں میں سب رنگ کے شعر ہوتے تھے۔ کسی طرز خاص کی خصوصیت نہیں۔ بعض تو صفائی اور برجستگی میں لاجواب ہیں۔ بعض میں یہی معمولی باتیں ہیں جنھیں ڈھیلی ڈھیلی بندشوں میں باندھ کر پھُسر پھُسر برابر کہتے چلے گئے ہیں۔ اس کا سبب یا تو پُرگوئی ہے جس کی تفصیل آگے آتی ہے یا دلی اور امروہہ کا فرق ہے +

قصیدے خوب ہیں اور اکثر اُن میں نہایت مشکل زمینوں میں ہیں۔ کچھ حمد و نعت۔ کچھ مرزا سلیماں شکوہ۔ اور حکام لکھنؤ کی شان میں ہیں۔ ان میں بڑے بڑے الفاظ۔ بلند مضمون۔ فارسی کی عمدہ ترکیبیں۔ اُن کی درست نشستیں۔ جو جو اُس کے لوازم ہیں سب موجود ہیں۔ البتہ بندشوں کی چستی اور جوش و خروش کی تاثیر کم ہے۔ شاید کثرت کلام نے اُسے دھیما کر دیا۔ کیونکہ دریا کا پانی دو پہاڑوں کے بیچ میں گھُٹ کر بہتا ہے۔ تو بڑے زور شور سے بہتا ہے۔ جہاں پھیل کر بہتا ہے وہاں زور کچھ نہیں رہتا۔ یا شاید ضروری فرمائشیں اتنی مہلت نہ دیتی ہوں گی کہ طبیعت کو روک کر غور سے کام سرانجام کریں +

بقیہ حاشیہ صفحہ ۳۱۱۔ آٹھواں دیوان اس کے بعد لکھا تو ۸۰ کے قریب مرے ہوں گے +

فارسی دیوان ہند کے شعرائے رائج الوقت سے کچھ زیادہ نہیں +

تذکرے — تذکرے خوب لکھے ہیں اور چونکہ اُستادوں کے زمانہ سے قریب تھے اور سن رسیدہ لوگوں کی صحبت کے موقع حاصل تھے اس لئے اچھے اچھے حالات بہم پہنچائے ہیں اور اُن میں اپنے شاگردوں کی بھی فہرست دی ہے +

تاریخیں — اکثر واقعات کی تاریخیں لکھی ہیں اور خوب لکھی ہیں +

غرض ہر شعر کی شاخ کو لیا ہے اور جو قواعد و ضوابط اُس کے پُرانے اُستادوں نے باندھے ہیں ان کا حق حرف بحرف بلکہ لفظ بلفظ پورا ادا کیا ہے۔ ہاں اپنے ہمعصروں کی طرح طبیعت میں چلبلاہٹ اور بات میں شوخی نہیں پائی جاتی کہ یہ کچھ اپنے اختیار میں نہیں۔ خداداد بات ہے۔ سید انشا ہمیشہ قواعد کے رستہ سے ترچھے ہو کر چلتے ہیں۔ مگر وہ ان کا ترچھاپن بھی عجب بانکپن دکھاتا ہے۔ یہ بھی مطلب کو بہت خوبی اور خوش اسلوبی سے ادا کرتے ہیں مگر کیا کریں وہ امروہہ پن نہیں جاتا ذرا اکڑ کر چلتے ہیں تو اُن کی شوخی بڑھاپے کا ناز بے نمک معلوم ہوتا ہے۔ سید انشا سیدھی سادھی باتیں بھی کہتے ہیں تو اس انداز سے ادا کرتے ہیں کہ کہتا اور سُنتا گھڑیوں رقص کرتا ہے اور چٹخارے بھرتا ہے۔ ان کا یہ حال ہے کہ اصول سے ناپ کر اور قواعد سے تول کر بات کہتے ہیں۔ پھر بھی دیکھو تو کہیں پھیکے ہیں اور کہیں سیٹھے ہیں۔ سچ کہا ہے کہنے والے نے کہ فصاحت اور بلاغت کے لئے کوئی قاعدہ نہیں۔ جس کی زبان میں خدا مزہ دیدے ہزار اصول و قواعد کی کتابیں اس پر قربان ہیں +

(حاشیہ: کلام میں شوخی نہیں لطفی اور بندش سُست تھی)

شعر میگویم بہ از آبِ حیات — من ندانم فاعلاتن فاعلات

ظرافت طبع کا انداز — ایک سقنی کو دیکھ کر شیخ صاحب کی شوخیِ طبع کے مُنہ میں پانی بھر آیا ہے۔ اسی غزل کے چند شعر ظریفانہ انداز میں ہیں ملاحظہ فرمائیے:۔

لنگی کی سج دکھا کر سقنی نے مار ڈالا — پانی بھرے ہے یارو یاں فرزی دوشالا

کافر کا نشۂ حسن ہو جائے ہے دوبالا — کاندھے پہ مشک لیکر جب قد کو خم کرے ہے

دریائے خوں میں کیونکر ہم نیم قد نہ ڈوبیں ٭ لنگی کے رنگ سے جب واں تاکمر ہو لالا[1]

یہ سب کچھ صحیح ہے مگر جس شخص کا قلم آٹھ دیوان لکھ کر ڈال دے اُس کی اُستادی میں کلام کرنا انصاف کی جان پر ستم کرنا ہے ٭

کثرتِ مشق اور پُرگوئی

اُن کی مشاقی اور پُرگوئی کو سب تذکروں میں تسلیم کیا ہے۔ سن رسیدہ لوگوں کی زبانی سُنا کہ دو تین تختیاں پاس دھری رہتی تھیں۔ جب مشاعرہ قریب ہوتا تو اُن پر اور مختلف کاغذوں پر طرح مشاعرہ میں شعر لکھنے شروع کرتے تھے اور برابر لکھتے جاتے تھے۔ لکھنؤ شہر تھا۔ عین مشاعرہ کے دن لوگ آتے۔ ۸ رسے ۱۰ ر تک اور جہاں تک کسی کا شوق مدد کرتا وہ بتا دیتا۔ یہ اُس میں سے ۹ ۱۱ ۱۲ شعر کی غزل نکال کر حوالہ کر دیتے تھے اُن کے نام کا مقطع کر دیتے تھے اور اصل سبب

غزلیں بیچتے تھے مُفلسی کا سبب

کمزوری کا یہ تھا کہ بڑھاپے میں شادی بھی کی تھی۔ چنانچہ سب سے پہلے تو ایک سالا تھا وہ شعر چُن کر لے جاتا۔ پھر سب کو دے کر جو کچھ بچتا وہ خود لیتے اور اُس میں کچھ لون مرچ لگا کر مشاعرہ میں پڑھ دیتے وہی غزلیں دیوانوں میں لکھی چلی آتی ہیں۔ بلکہ ایک مشاعرہ میں جب شعروں پر بالکل تعریف نہ ہوئی تو انھوں نے تنگ ہو کر غزل زمین پر دے ماری اور کہا کہ ردئے فلاکت سیاہ جس کی بدولت کلام کی یہ نوبت پہنچی ہے۔ کہ اب کوئی سُنتا بھی نہیں۔ اس بات کا چرچا ہوا تو یہ عقدہ کُھلا کہ اُن کی غزلیں بکتی ہیں۔ اچھے اچھے شعر تو لوگ مول لے جاتے ہیں جو رہ جاتے ہیں وہ ان کے حصہ میں آتے ہیں ٭

روانیٔ طبع

پانی پت کے ایک شخص اُس زمانہ میں چکلے داری کے سبب سے لکھنؤ میں رہتے تھے۔ ان کے ہاں شیخ مصحفی بھی آیا کرتے تھے۔ ایک دن کاغذ کا جُز ہاتھ میں لئے آئے اور الگ بیٹھ کر کچھ لکھنے لگے۔ سامنے ایک ورق رکھا تھا۔ اُسے دیکھ دیکھ کر اس

[1] عبرۃ۔ اگرچہ غزل مذکور ہزل ہے مگر قابل عبرۃ یہ امر ہے کہ نامی آدمی کے نام کے ساتھ لگ کر گمنامی بھی نام پاتی ہے۔ چنانچہ جب تک شیخ مصحفی کا نشان بلند رہے گا۔ اُسی میں کمارو سے کی لُنگی کا پھریرا بھی لہراتا رہے گا ٭

طرح لکھے جاتے تھے جیسے کوئی نقل کرتا ہے۔ ایک شخص نے پوچھا کہ حضرت یہ کیا ہے جس کی آپ نقل کر رہے ہیں۔ لائیے میں لکھ دوں۔ اُنھوں نے کہا کہ ایک شخص نے کچھ مضمون مثنوی میں لکھوانے کے لئے فرمایش کی تھی۔ اُس کا تقاضا مدت سے تھا۔ کچھ تو مجھے یاد نہ رہتا تھا۔ کچھ فرصت نہ ہوتی تھی۔ آج اُس نے بہت شکایت کی اور مطلب لکھ کر دے دیا۔ وہ نظم کر رہا ہوں۔ اس سے روانی طبع اور مشق سخن کو قیاس کرنا چاہیئے۔

میر تقی مرحوم کی سند

ایک مشاعرہ میں میر تقی مرحوم بھی موجود تھے۔ شیخ مصحفی نے غزل پڑھی:۔

تنہا نہ وہ ہاتھوں کی حنا لے گئی دل کو ۔ مکھڑے کے چھپانے کی ادا لے گئی دل کو

جب یہ شعر پڑھا ؎

یاں لعل فسوں ساز نے باتوں میں لگایا ۔ دے پیچ اِدھر زلف اُڑا لے گئی دل کو

تو میر صاحب قبلہ نے بھی فرمایا کہ بھئی ذرا اس شعر کو پھر پڑھنا۔ ان کا اتنا کہنا ہزار تعریفوں کے برابر تھا۔ شیخ موصوف اسی قدر الفاظ کو فرمان آل تمغا اپنے کمال کا سمجھے بلکہ کئی دفعہ اُٹھ اُٹھ کر سلام کئے۔ اور کہا کہ میں اس شعر پر اپنے دیوان میں ضرور لکھوں گا کہ حضرت نے دوبارہ پڑھوایا تھا۔ وہ اپنی غزلوں میں ملکی خصوصیتوں کے مضمون بھی لیتے ہیں مگر نہ اپنے ہمعصر سید انشا کی طرح بہتات سے نہ جرأت کی طرح کمی سے۔ چنانچہ کہتے ہیں۔

ملکی خصوصیتوں کے مضامین باندھتے تھے

دیکھا نہ میں نے ہند میں جب خشکۂ پیشاوری ۔ لینے برنج اے مصحفی روح اپنی پیشاور گئی

نہ کیونکہ سیر کرے شہر دُوں کے سینوں میں ۔ جو خال چشم کہ برسوں رہا ہو مینوں میں

کیوں نہ دل نظارگی کا جائے ٹوٹ ۔ لکھنؤ میں حُسن کی بندھتی ہے پوٹ

تختۂ آب چمن کیوں نہ نظر آئے سپاٹ ۔ یاد آئے مجھے جسدم وہ نگبنود کا گھاٹ

بعض جگہ اپنے وطن کا محاورہ یاد آجاتا ہے اور کہہ دیتے ہیں:۔

تیغ نے اُس کی کلیجا کھالیا ۔ اُس نے آتے ہی مجھے سنگوا لیا

چمن میں چل کے کرا اے مصحفی تو نالہ و آہ جو جی چلا ہو ترا امتحان بلبل کو

نہ میں صحرا میں نہ گلشن میں نکل جاؤں گا خو گرِ شہر ہوں یاں خاک میں رُل جاؤں گا

انھیں عادت تھی اکثر جگہ معاصرین پر چوٹ بھی کر جاتے تھے۔ چنانچہ کہا ہے:۔

شاعرانہ فخریہ

کچھ میں جرأت نہیں ہوں مصحفیِ سحر بیاں میرو مرزا سے لڑا نے یہ غزل جاؤں گا

اور تو ثانی کوئی اس کا نہیں مصحفی کا ہے قتیل البتہ چوٹ

اکثر غزلوں کے مقطع میں اپنے فخریے اور ملکِ سخن بادشاہی کے دعوے۔ اور شاعرے کا اپنے دم قدم سے قائم ہونا۔ اور سب شعرا کو اپنا خوشہ چین کہہ دینا ایک بات تھی۔ اور یہ دعویٰ کچھ بے جا بھی نہ تھا۔ مگر جب سید انشا اور جرأت وہاں پہنچے تو نتیجہ بہت بُرا ظاہر ہوا۔ چنانچہ ان معرکوں کے بعض حالات مناسب حال لکھتا ہوں۔ اگرچہ ان میں بھی اکثر باتیں خلاف تہذیب ہیں۔ مگر فن زبان کے طلب گاروں کا خیال اس معاملہ میں کچھ اور ہے۔ وہ خوب سمجھتے ہیں کہ نظم اردو میں چند خیالات معمولی ہیں اور بس۔ عام مطالب کے ادا کرنے میں قوت بیانیہ کا اثر نہایت ضعیف ہے ہاں ہجو کا کوچہ ہے کہ اس میں ایک چٹک جو شاعر کے دل کو لگی ہوتی ہے۔ تو وہ تاثیر کلام سے مل کر سوتے دلوں کی بغل میں ذرا گدگدی کر جاتی ہے۔ بیان میں صفائی اور زبان میں گرمی و طراری پیدا کرنی چاہو تو ایسے کلاموں کا پڑھنا ایک عمدہ اوزار زبان کے تیز کرنے کا ہے۔ مرزا رفیع کی ہجویں انکی کلیات میں موجود ہیں۔ مگر شیخ مصحفی سید انشا کی ہجویں فقط چند بڈھوں کی زبان پر رہ گئی ہیں۔ جن کی نظمِ حیات عنقریب نثر ہوا چاہتی ہے۔ علاوہ براں اس صورت حال کا حال دکھانا بھی واجب ہے کہ وہ کیا موقع ہوتے تھے۔ جو انھیں ایسی حرکات ناروا پر مجبور کرتے تھے۔ یہ روایتیں بھی مختلف ہیں اور مختلف زبانوں پر پریشان ہیں۔ لیکن افسوس یہ ہے کہ انھوں نے ان ہجوؤں میں فحش اور گالیوں سے انتہائے درجہ کی کثافتیں بھری ہیں۔ خیر ہمیں چاہئے کہ تھوڑی دیر کے لئے شہد کی مکھی بن جائیں۔ جہاں رسیلا پھول دیکھیں جا بیٹھیں۔ جالے اور میلے میلے پتوں سے بچیں۔ اور جب رس لے چکیں تو فوراً اُڑ جائیں۔

شعرائے اردو کی ہجوؤں سے بھی فائدہ اُٹھا سکتے ہیں

ان کے اور سید انشا کے معرکے

اب اُن کے اور سید انشا کے معرکوں کا تماشا دیکھو۔ واضح ہو کہ اول تو مرزا سلیمان شکوہ کی غزل کو شیخ مصحفی بنایا کرتے تھے۔ جب سید انشا پہنچے تو ان کے کلام کے سامنے ان کے شعر کب مزا دیتے تھے۔ غزل سید موصوف کے پاس آنے لگی۔ چند روز کے بعد شیخ صاحب کی تنخواہ میں تخفیف ہوئی۔ اُس وقت اُنھوں نے کہا ؎

چالیس برس کا ہی ہے چالیس کے لایق | تھا مردِ معمر کہیں دس بیس کے لایق
اے وائے کہ پچیس سے اب پانچ ہیں اپنے | ہم بھی تھے کبھی روزوں میں پچیس کے لایق
استاد کا کرتے ہیں امیر اب کے مقرر | ہوتا ہے جو درماہہ کہ سائیس کے لایق
چارہ کے لگانے سے ہوا دو کا اضافہ | پھر وہ نہ چلے جی میں کہ ہو تیس کے لایق

پھر بھی آمد و رفت جاری تھی۔ اکثر غزلوں میں دونوں باکمال طبع آزمائی کرتے تھے۔ اور کچھ جھیڑ چھاڑ ہوتی رہتی تھی۔ مگر اس طرح کہ کوئی سمجھے کوئی نہ سمجھے۔ ایک دن شیخ مصحفی نے مرزا سلیمان شکوہ کے جلسہ میں یہ غزل پڑھی:۔

زہرہ کی جو آئی کفِ ہاروت میں اُنگلی | کی رشک نے جا دیدۂ ماروت میں اُنگلی
بن دودھ انگوٹھے کی طرح چوسے ہے کودک | رکھتی ہے تصرف عجب اک قوت میں اُنگلی
غرقہ کے ترے حال پہ از بہر تاسف | ہر موج سے تھی کل دہنِ حوت میں اُنگلی
مہندی کے یہ چھلے نہیں پوروں پہ بنائے | ہے اس کی ہر اک حلقۂ یاقوت میں اُنگلی
× × × × × × × | ناچی ہے تری عالم لاہوت میں اُنگلی
شہتوت ہے یا صانعِ عالم نے لگا دی | شیریں کی یہ شاخِ شجرِ توت میں اُنگلی
× × × × × × | حائک کی گرفتار ہو جوں سوت میں اُنگلی
تھا مصحفی یہ مائل گریہ کہ پس از مرگ | تھی اُس کی دھری چشم پہ تابوت میں اُنگلی

اسی طرح سید انشا کی غزل کا مطلع تھا:۔

دیکھ اُس کی پڑی خاتم یاقوت میں اُنگلی | ہاروت نے کی دیدۂ ماروت میں اُنگلی

اور بعض اور شخصوں کی بھی غزلیں تھیں۔ چنانچہ جب مصحفی چلے گئے تو یاروں میں ان کے

بعض اشعار پر بہت چرچے ہوئے۔ اور غزل کو اُلٹ کر بڈھے بیچارے کے کلام کو خراب کیا۔ چند شعر اُس کے خیال میں ہیں جو فحش قبیح کے سبب سے خیال میں رکھنے کے قابل بھی نہیں۔ مقطع البتہ صاف ہے اس سئے لکھتا ہوں :۔

تھا مصحفی کا نا جو چھپانے کو پس لاز مرگ — رکھے ہوئے تھا آنکھ پہ تابوت میں اُنگلی

یہیں سے فساد کی بنیاد قائم ہوئی۔ اور طرفین سے ہجو بن ہو کر وہ خاک اُڑا کہ شایستگی نے کبھی آنکھیں بند کر لیں اور کبھی کانوں میں اُنگلیاں دے لیں +

غرض اس غزل کی خبر شیخ مصحفی کو پہنچی۔ وہ پُرانا مشاق۔ لکھنؤ بھر کا استاد۔ کچھ چھوٹا آدمی نہ تھا۔ باوجود بڑھاپے کے بگڑ کھڑا ہوا۔ اور یہ غزل فخریہ کہی۔ اب خواہ اُسے بڑھاپے کی سستی کہو۔ خواہ طبیعت کا امروہاپن کہو۔ خواہ آئین متانت کی پابندی سمجھو۔ غرض اپنی وضع کو ہاتھ سے نہ دیا اور اپنے انداز میں خوب کہا۔ **غزل فخریہ**

مدت سے ہوں میں سرخوشِ صہبائے شاعری — ناداں ہے جس کو مجھ سے ہے دعوٰئے شاعری

میں لکھنؤ میں زمزمہ سنجانِ شعر کو — برسوں دکھا چکا ہوں تماشائے شاعری

پھبتا نہیں ہے بزم امیرانِ دہر میں — شاعر کو میرے سامنے غوغائے شاعری

اک طرفہ خر سے کام پڑا ہے مجھے کہ ہائے — سمجھے ہے آپ کو وہ مسیحائے شاعری

ہے شاعروں کی اب کے زمانے میں یہ معاش — پھرتے ہیں بیچتے ہوئے کالائے شاعری

لیتا نہیں جو مول کوئی مفت بھی اُسے — خفت اُٹھا کے آتے ہیں گھر وائے شاعری

اے مصحفی زگوشۂ خلوت بروں خرام — خالی ست از برائے تو خود جائے شاعری

ہر سفلہ را زبان و بیانِ تو کے رسد — آرے توئی فغانی و بابائے شاعری

مجنوں منم چرا دگرے رنج می برد — در حصّۂ من آمدہ لیلائے شاعری

اس کے علاوہ اور غزلیں بھی کہیں کہ جن میں اس قسم کے اشارے کنائے ہیں۔ چونکہ سید انشا صاحب عالم کے ہاں ہر صحبت میں صدر نشین تھے۔ اُنھیں خیال ہوا کہ مصحفی میرا بھی یار ہے مبادا اُسے کچھ خیال ہو۔ خود پالکی میں سوار ہو کر پہنچے۔ اور کہا کہ جلسہ میں

اس طرح گفتگو ہوئی ہے۔ بھئی تمہیں میری طرف سے کچھ ملال نہ ہو۔ شیخ مصحفی نے نہایت بے پروائی سے کہا کہ نہیں بھئی مجھے ایسی باتوں کا خیال بھی نہیں۔ اور اگر تم کہتے تو کیا تھا۔ اخیر کا فقرہ سید انشا کو کھٹکا۔ آتنے ہی یاروں کو اور بھی چمکا دیا۔ ادھر سے انھوں نے کچھ اور کہا۔ ادھر سید انشا نے بحر طویل میں یہ شعر کہے :۔

ہجو در بحر طویل

بخداوندیٔ ذاتے کہ رحیم است و کریم است و علیم است و حکیم است و عظیم است و سلیم است و قدیم است و شریف است و لطیف است و خبیر است و بصیر است و نصیر است و کبیر است و رؤف است و غفور است و شکور است و ودود است و مراخلق نمود است و بود خالقِ آفاق۔ قسم میخورم اکنوں کہ مرا ہیچ ز ہجوِ تو سروکار نبودہ است۔ ولے از طرفت گشت شروع ایں ہمہ اقوال مزخرف۔ شنو اے مردک ناداں۔ اندر دہنت شاشۂ عالم غزل پوچ ترا مثنویٔ ہرزہ کہ مجموعۂ دشنام غلاظ است و شداد است گذشت از نظر آں لحظہ بناچار ترا ہجو نمودم کہ دلم خوں شد و جوشید و بلرزید و بہ پیچید و طپید و جگر آتش شدہ در سینۂ سوزانِ منِ خستہ دل و مضطر و حیراں۔ اندر دہنت شاشۂ عالم اگر از نطفۂ ابلیس نباشی دلِ من ہیچوں منِ سید نخراشی۔ کہ از اولادِ حسین است و نجیب الطرفین است و شریف است و نظیف است و لطیف است و فصیح است و بلیغ است و بود محسنِ برحق کہ بجز لطف و کرم بخشی و تعریف کمال و صفتت پیش کسے گاہ بیاں ہیچ نکردہ است و ترا بود ثنا خواں الخ

انہی دنوں ایک مشاعرہ میں غزل کی طرح ہوئی۔ ان صاحبوں نے غزلیں کہیں۔ مصحفی نے بھی آٹھ شعر کی غزل لکھی۔ غزل مصحفی

سر مشک کا ہے تیرا تو کافور کی گردن ۔۔۔ نے موے پری ایسے نہ یہ حُور کی گردن
مچھلی نہیں ساعد ہیں ترے بلکہ نہاں ہے ۔۔۔ وہ ہاتھ میں ماہیٔ سقنقور کی گردن

یوں مُرغِ دل اُس زلف کے پھندے میں پھنسا ہے
جوں رشتۂ صیاد میں عصفور کی گردن

دل کیوں کہ پری حُور کا پھر اُس پہ نہ پھسلے
صانع نے بنائی تری بلّور کی گردن

اک ہاتھ میں گردن ہو صراحی کی مزا ہے
اور دوسرے میں ساقئ مخمور کی گردن

ہر چند میں جُھک جُھک کے کئے سیکڑوں مجرے
پر خم نہ ہوئی اُس بُتِ مغرور کی گردن

کیا جانئے کیا حال ہوا صبح کو اُس کا
ڈھلکی ہوئی تھی شب ترے رنجور کی گردن

یوں زلف کے حلقہ میں پھنسا مصحفی لے وائے
جوں طوق میں ہو وے کسی مجبور کی گردن

سید انشا نے اس غزل پر اعتراض کئے اور ایک قطعہ بھی نظم کیا۔ ان کی غزل اور قطعہ درج ہوتا ہے:۔

سید انشا کی غزل جواب میں

توڑوں گا خُمِ بادۂ انگور کی گردن
رکھ دوں گا وہاں کاٹ کے اک حور کی گردن

خود دار کی بن شکل الفہائے انا الحق
نت چاہتے ہیں اک نئی منصور کی گردن

کیوں ساقیِ خورشید جبیں کیا ہی نشے ہوں!
سب یوں ہی چڑھا جاؤں مے نور کی گردن

اُچھلی ہوئی ورزش سے تری ڈنڈ پہ مچھلی
ہے نامِ خدا جیسے سقنقور کی گردن

تھا شخص جو گردن زدنی اُس سے یہ بولے
اب دیجئے جو دینی ہے منظور کی گردن

آئینہ کی گر سیر کرے شیخ تو دیکھے
سر خرس کا مُنہ خوک کا لنگور کی گردن

یوں پنجۂ مژگاں میں پڑا ہے یہ مرا دل
جوں چنگلِ شاہباز میں عصفور کی گردن

تب عالمِ مستی کا مزا ہے کہ پڑی ہو
گردن پہ مری اُس بُتِ مخمور کی گردن

بیٹھا ہو جہاں پاس سلیمان کے آصف
واں کیوں نہ جُھکے قیصر و فغفور کی گردن

کھینچے ہے بغل اپنی میں اس زور سے جو عشق
تو توڑنے پر ہے کسی مجبور کی گردن

اے مست یہ کیا قہر ہے خشتِ سرِ خُم سے
کیوں تو نے صراحی کی بھلا چُور کی گردن

محفل میں تری شمع بنی موم کی۔ مریم
پگھلی پڑی ہے اس کی وہ کافور کی گردن

اے دیو سفیدِ سحری کاش تو توڑے
اک جھٹکے سے خور کے شبِ دیجور کی گردن

جب کشتۂ اُلفت کو اُٹھایا تو الم سے بس ہل گئی اس قاتلِ مغرور کی گردن
بے ساختہ بولا کہ ارے ہاتھ تو ٹک دو ڈھلکے نہ مرے عاشقِ مغفور کی گردن
حاسد تو ہے کیا چیز کرے قصد جو انشا تو توڑ دے جھٹ بلعم باعور کی گردن

قطعہ ہجو مشتمل بر اعتراضات

سُن لیجے گوش دل سے مرے مُشفقا یہ عرض مانند بید غصہ سے مت تھر تھرائیے
بطور گو درست ہو۔ لیکن ضرور خواہی نخواہی اس کو غزل میں کھپائیے
دستور و نور و طور یہ ہیں قافیے بہت اس میں جو چاہئے تو قصیدہ سُنائیے
یہ تو غضب ہے کہئے غزل آٹھ بیت کی اور اُس میں روپ ایسے انوکھے دکھائیے
کیا لطف ہے کہ گردن کا نور باندھ کر مُردے کی باس زندوں کو لاکر سُنگھائیے
یوں خاطرِ شریف میں گزرا کہ بزم میں کھِلا ہوا شریفہ غزل کو بنائیے
ایسے نجس کثیف قوافی سے نظم میں دندانِ[1] ریختہ میں پھپھوندی جمائیے
بحرے ہیں آپ ہی کے یہ آئی ہے شاعری بس مُنہ ہی مُنہ میں رکھئے اسے مت سڑائیے
گردن کا دخل کیا ہے سقنقور میں بھلا سانڈے کی طرح آپ نہ گردن ہلائیے
مشفق کڑی کمان کو کڑی نہ بولئے چلّا کے مفت تیر ملامت نہ کھائیے
اُردو کی بولی ہے یہ بھلا کھائیے قسم اس بات پر اب آپ ہی مصحف اُٹھائیے
اُستاد گرچہ ٹھیرے ہیں صاحب یونہیں سہی لیکن ڈھکی ہی رکھئے بس اس کو چھپائیے
جھٹ لکھئے روپ رام کٹارا کو ایک خط بھلو کی مُہر سے سند اس کی منگائیے
اپنی کمک کے واسطے جا بھرت پور میں رنجیت سنگھ جاٹ کو ہمراہ لائیے
یا گرد و پیش کے قصباتی جو لوگ ہیں اک پلوا باندھیئے اُنھیں جلدی بلائیے
مخلص کا التماس پذیرا ہو سوچ کر کہنے سے ایسے ریختہ کے باز آئیے

[1] مصحفی مسی ملا کرتے تھے اس لئے دانت سیاہ تھے۔ وہ بھی کچھ ہلتے تھے کچھ گر پڑے تھے اور بڑھاپے نے اور بھی شکل بگاڑ دی تھی اُسے انھوں نے خراب کیا ہے۔

سرکار کی یہاں نہیں گلنے کی دال کچھ
روٹی جو کھانی ہووے تو پنجاب جائیے

ستلج۔ بیاس راوی و جہلم کی سیر کر
چناب والے لوگوں کو یہ کچھ سنائیے

خشکا گدھوں کو دیجئے لوزینہ گاؤ کو
واں جا کے بین بھینس کے آگے بجائیے

اس رمز کا یہاں شنوا کون ہے بھلا
اب بھیر دیں کا ٹپہ کوئی آپ گائیے

مصحفی نے اس کا جواب اسی غزل کی طرح میں دیا +

قطعہ جواب شیخ مصحفی کی طرف سے

اے آنکہ معارض ہو مری تیغ زباں سے
تو نے سپرِ عذر میں مستور کی گردن

ہے آدمِ خاکی کا بنا خاک کا پُتلا
گر نور کا سر ہووے تو ہو نور کی گردن

میں لفظ سقنقور مجرّد نہیں دیکھا
ایجاد ہے تیرا یہ سقنقور کی گردن

لنگور کو شاعر تو نہ باندھے گا غزل میں
کس واسطے باندھے کوئی لنگور کی گردن

گردن کی صراحی کے لئے وضع ہے ناداں
بیجا ہے خُمِ بادۂ انگور کی گردن

اس سے کبھی میں گزرا غلطی اور یہ سُنئے
باندھے ہے کوئی خوشۂ انگور کی گردن

کافور سے مطلب ہے مرا اُس کی سفیدی
ٹھنڈی تو میں باندھی نہیں کافور کی گردن

یہ لفظ مشدّد بھی درست آیا ہے تجھ سے
خم ہوتی ہے کوئی مری بلّور کی گردن

اتنی نہ تمیز آئی تجھے ربط بھی کچھ ہے
ہر قافیہ میں تو نے جو منظور کی گردن

یوں سیکڑوں گردن تو گیا باندھ تو کیا ہے
سوجھی نہ تجھے حیف کہ مزدور کی گردن

جو گردنیں میں باندھی ہیں لا تجھ کو دکھادوں
تو مجھ کو دکھادے شبِ دیجور کی گردن

گردن کے تئیں چاہئے اک شکل کشیدہ
خم کر کے سمجھ ٹک سرِ مغرور کی گردن

مضمون تو میرا ہی ہے گو اَور طرح سے
باندھے تو گماں اپنے میں رنجور کی گردن

گر قافیہ پیمائی ہی منظور تھی تجھ کو
تو باندھی نہ کس واسطے مقدور کی گردن

لاکھوں ہی معانی کو کیا قتل پر افسوس
سوجھی نہ تجھے دشنہ و ساطور کی گردن

منصف ہو تو پھر نام نہ لے دعوے کا ہرگز
یہ بوجھ اٹھا سکتی نہیں مور کی گردن

منظور ہی کی ہ ہ ہ ہ تو باللہ
باندھی نہ گراب خانۂ زنبور کی گردن

ٹوٹے ہوئے نیچے کی طرح میرے قلم سے
جاتی ہے پیچک شاعر مغرور کی گردن

انصاف تو کر دل میں کہ اک تیغ میں کیسے
میں کاٹ دی دعوی کی ترے زور کی گردن

کھڑاگ یہ گایا پہ ترے ہاتھ نہ آئی
افسوس کہ اس تان پہ طنبور کی گردن

سوجھا نہ تجھے ورنہ بناتا تو اُسی دم
ناسُور کی پٹی کو بھی ناسُور کی گردن

انصاف کیا اس کا میں اب شہ کے حوالے
جھکتی ہے جہاں مارسے بے مور کی گردن

وہ شاہ سلیماں کہ اگر تیغِ عدالت
ٹک کھینچے تو دو ہو وہیں فغفور کی گردن

جس سر پہ ٹک اپنا وہ رکھے دستِ نوازش
اُس سر کے لئے تکیہ ہو پھر حور کی گردن

اس در کا جو سجدہ اُنھیں منظور نہ ہوتا
ملتی نہ فرشتوں کو کبھی نور کی گردن

اے مصحفی خامش بسخن طول نہ کھچ جائے
یاں کوتہ ہی بہتر سرپرُشور کی گردن

اِن دونوں قطعوں کے پڑھنے سے معلوم ہوگا۔ کہ دونوں باکمال ادائے مطلب پر کس قدر قدرت رکھتے تھے۔ بیشک عام لطف بیان اور خاص طنزوں کے نشتر سید انشا کی ترجیح کے لئے سفارش کریں گے۔ مگر بڈھے دیرینہ سال نے جو اسی غزل کی زمین میں مطالب مطلوبہ کو ادا کر دیا یہ قدرت کلام شاید اسے پیچھے نہ رہنے دے۔

شیخ مصحفی کے شاگردوں میں منتظر اور گرم دو بڑے چلتے طپنچے تھے۔ وہ نواب صاحب کی سرکار میں توپ خانہ وغیرہ کی خدمت رکھتے تھے۔ انھوں نے زبان سے تدبیروں سے۔ معرکوں سے۔ اُستاد کی استادی کے مورچے باندھے۔ ایک مثنوی لکھ کر گرم طمانچہ نام رکھا۔ میر انشاء اللہ خاں نے جب مشاعرہ میں گردن کی غزل پڑھی اور اس میں یہ شعر پڑھا:۔

آئینہ کی گر سیر کرے شیخ تو دیکھے
سرخرس کا مُنہ خوک کا لنگور کی گردن

مقطع میں بلعم باعور کا اشارہ بھی ان کی کہن سالی پر چوٹ ہے۔ کیونکہ وہ حضرت موسیٰ[۲]

کے عہد میں ایک عابد بڑھاپے اور ریاضت سے اس قدر تحلیل ہو گیا تھا کہ شاگرد پوٹلی میں باندھ کر کبھی بغل میں مارے پھرتے تھے۔ کبھی کندھے پر ڈال لیتے تھے اور جہاں چاہتے تھے لے جاتے تھے۔ منتظر نے بھی اپنی غزل میں سید موصوف پر چوٹیں کیں۔ اُن میں سے ایک مصرع یاد ہے ع

باندھی دُم لنگور میں لنگور کی گردن

کیونکہ سید انشا اکثر دوپٹہ گلے میں ڈالے رہتے تھے اس طرح کہ ایک سرا آگے اور دوسرا سرا پیچھے پڑا رہتا تھا۔ چنانچہ سید انشا نے اُسی وقت ایک شعر اور کہا ؎

سفو پہ ظرافت کے ذرا شیخ کو دیکھو سر لون کا مُنہ پیاز کا اچور کی گردن

بڈھے بیچارے کا سر بھی سفید تھا۔ گوری رنگت بڑھاپے میں خون جم کر سرخ ہو گئی تھی اس کے علاوہ بہت جواب و سوال زبانی بھی طے ہوئے مگر ان کا اب پتہ لگنا ممکن نہیں۔ استاد مرحوم فرماتے تھے کہ منجملہ اور اعتراضوں کے مصحفی کی غزل میں ماہیِ سقنقور میں جو حیّ بہ تشدید پڑھی جاتی ہے۔ سید انشا نے اس پر بھی تمسخر کیا اور شیخ مصحفی نے یہ شعر سند میں دیا کہ ؎

مائیم و فقیری و سیہ روئیِ کونین رخسارِ سفیدِ امرا را نہ شنا سیم

سید انشا پر جو اعتراض کیا ہے کہ نفظ سقنقور کیوں کہا؟ شیخ مصحفی کا کہنا بیجا ہے۔ کیونکہ سقنقور ایک جانور کا نام ہے۔ اور یہ لفظ اصل میں یونانی ہے۔ مچھلی کو اس سے کچھ خصوصیت نہیں ہے ٭

سید انشا کی طبیعت کی شوخی اور زبان کی بے باکی محتاج بیان نہیں۔ چنانچہ بہت سی ژٹل اور فحش ہجویں کہیں کہ جن کا ایک ایک مصرع ہزار قمچی اور چابک کا طراقا تھا۔ بڈھا۔ بیچارا بھی اپنی شوخی کے جریب اور عصائے غرور کے سہارے سے کھڑا ہو کر جتنا کمر میں بوتا تھا مقابلہ کرتا رہا۔ جب نوبت حد سے گزر گئی تو اُس کے شاگردوں سے بھی لکھنؤ بھرا پڑا تھا۔ منتظر اور گرم سب کو لے کر اُٹھ کھڑے ہوئے

اور جو کچھ کہ ہو سکا شاگردی کا حق ادا کیا۔ ایک دن سب اکٹھے ہوئے۔ شہدوں کا سوانگ بھرا اور ایک ہجو کہہ کر اُس کے اشعار پڑھتے ہوئے سید انشا کی طرف روانہ ہوئے۔ اور مستعد تھے کہ زد و کشت سے بھی دریغ نہ ہو۔ سید انشا کو ایک دن پہلے خبر لگ گئی۔ اب ان کی طبع رنگین کی شوخی دیکھئے کہ مکان کو فرش فروش۔ جھاڑ فانوس سے سجایا۔ اور امرائے شہر اور اپنے یاروں کو بلایا۔ بہت سی شیرینی منگا کر خوان لگائے۔ کشتیوں میں گلوریاں۔ چنگیروں میں پھولوں کے ہار سب تیار رکھے۔ جب سُنا کہ حریف کا مجمع قریب آ پہنچا اُس وقت یہاں سے سب کو لے کر استقبال کو چلے۔ ساتھ خود تعریفیں کرتے۔ سبحان اللہ واہ وا سے داد دیتے اپنے مکان پر لائے۔ سب کو بٹھایا۔ اور خود دوبارہ پڑھوایا۔ آپ بھی بہت کچھ اُچھلے کودے۔ شیرینیاں کھلائیں۔ شربت پلائے۔ پان کھلائے۔ ہار پہنائے۔ ہنس بول کر عزت و احترام سے رخصت کیا۔

لیکن پھر سید انشا نے جو اُس کا جواب حاضر کیا وہ قیامت تھا یعنی ایک انبوہ کثیر برات کے سامان سے ترتیب دیا۔ اور عجیب و غریب ہجویں تیار کر کے لوگوں کو دیں۔ کچھ ڈنڈوں پر پڑھتے جاتے تھے۔ کچھ ہاتھیوں پر بیٹھے تھے۔ ایک ہاتھ میں گُڈا۔ ایک میں گڑیا۔ دونوں کو لڑاتے تھے۔ زبانی ہجو پڑھتے جاتے تھے جس کا ایک شعر یہ ہے :۔

سوانگ نیا لایا ہے دیکھنا چرخ کہن ۔۔۔ لڑتے ہوئے آئے ہیں مصحفی و مصحفن

اِن معرکوں میں مرزا سلیمان شکوہ بلکہ اکثر امرا نے سید انشا کا ساتھ دیا۔ اور حریف کے سوانگ کو کوتوال سے کہہ کر رکوا دیا۔ اس بات نے شیخ مصحفی کو بہت شکستہ خاطر کر دیا۔ چنانچہ اکثر غزلوں میں رنگ جھلکتا ہے۔ ان میں سے ایک غزل کا مقطع و مطلع لکھتا ہوں :۔

جاتا ہوں ترے در سے کہ توقیر نہیں یاں ۔۔۔ کچھ اس کے سوا اب مری تدبیر نہیں یاں

اے مصحفی بے لطف ہے اس شہر میں بہنا سچ ہے کہ کچھ انسان کی توقیر نہیں یاں

ان جھگڑوں میں بعض شعروں پر مرزا سلیمان شکوہ کو شبہہ ہوا کہ ہم پر بھی شیخ مصحفی نے چوٹ کی۔ اس کے عذر میں انھوں نے کہا :-

قصیدۂ در معذرت اتہام انشا بجناب مرشد زادہ شہزادہ مرزا سلیمان شکوہ بہادر

قسم بذات خدائے کہ ہے سمیع و بصیر
کہ مجھ سے حضرتِ شہ میں ہوئی نہیں تقصیر

سوائے اس کے کہ حال اپنا کچھ کیا تھا عرض
سو وہ بطور شکایت بھی اندکے تقریر

گر اس سے خاطر اقدس پہ کچھ ملال آیا
اور اس گنہ سے ہوا بندہ واجب التعزیر

عوض رُپوں کے ملیں مجھ کو گالیاں لاکھوں
عوض دو شالہ کے خلعت بشکل نقش حریر

سلف میں تھا کوئی شاعر نواز ایسا کب؟
جو ہے تو شاہ سلیماں شکوہ عرش سریر

مزاج میں یہ صفائی کہ کر لیا باور
کسی کے حق میں کسی نے جو کچھ کہ کی تقریر

مصاحب ایسے کہ گر کچھ کسی سے لغزش ہو
تو اُس کے رفع کی ہرگز نہ کر سکیں تدبیر

دگر کریں تو پھر ایسی کہ نار طیش و غضب
مزاج شاہ میں ہو مشتعل بصد تشویر

سو تاب ذرہ کہاں! نور آفتاب کہاں!
کہاں وہ سطوتِ شاہی! کہاں غرورِ فقیر!

مقابلہ جو برابر کا ہو تو کچھ کہئے
کہاں دبیقی و دیبا کہاں پلاس و حصیر

میں اک فقیر غریب الوطن مسافر نام
رہے ہے آٹھ پہر جس کو قُوت کی تدبیر

مرا ذہن ہے کہ مدحِ حضور اقدس ہو
اُلٹ کے پھیر بحرفِ ذمیمہ دوں تغیر

یہ افترا ہے بنایا ہوا سب انشا کا
کہ بزم و رزم میں ہے پائے تخت کا وہ مُشیر

مزاج شاہ ہوں یوں منحرف تو مجھ کو بھی
یہ چاہیئے کہ کروں شکوہ اس کا پیش وزیر

اگر وزیر بھی بولے نہ کچھ خدا لگتی
تو جاؤں پیش محمد کہ ہے بشیر و نذیر

شفیع روز جزا بادشاہ اُدُ اُدنے
نہ کردہ جرم پہ جس نے نہیں لکھی تعذیر

کہوں یہ اُس سے کہ اے جُرم بخش پُر گنہاں
تری غلامی میں آیا ہے داد خواہ فقیر

خطا ہو میری جو پہلے تو کر اسیر مجھے
دگر عدو کی۔ پنھا اس کو طوق اور زنجیر

اگرچہ بازیٔ انشائے بے حمیّت کو
رہا خموش سمجھ کر میں بازیٔ تقدیر

ولے غضب ہے بڑا یہ کہ اب وہ چاہے ہے
خیال میں بھی نہ کھینچوں میں ہجو کی تصویر

سو میں ملک نہیں ایسا۔ بشر ہوں تا کے چند
کیے ہے اُس سے کروں گا نہ ماجرا تحریر

کیا میں فرض کہ میں آپ اس سے درگزرا
پھرے گا مجھ سے کوئی گرم و منتظر کا ضمیر

اور اُن پہ بھی جو کیا میں نے تازیانہ منع
تو ہو سکے ہے کوئی اُن کی وضع کی تدبیر

ہزار شہدوں میں بیٹھیں ہزار جا پہ ملیں
پھریں ہمیشہ لئے جمع ساتھ اپنے کثیر

نہ مانیں تیغ سیاست نہ قہرِ سلطانی
نہ سمجھیں قتل کا وعدہ نہ ضربتِ شمشیر

مزاج اُن کا کٹھول اس قدر پڑا ہے کہ وہ
ہنسی سمجھتے ہیں اِس بات کو نہ جُرم کبیر

پھر اس پہ یہ بھی ہے یعنی کہ اس مقام کے بیچ
جو ہووے ملتی تو کچھ نثر میں کرے تسطیر

تکلیف جن کو خدا نے کیا ہو موزوں طبع
اور اپنے فضل سے بخشی ہو شعر میں توقیر

یہ کوئی بات ہے سو سُن کے وہ خموش رہیں
ہوا ہے مصلحتاً گو کہ تصفیہ یہ اخیر

مگر یہ بات میں مانی کہ سوانگ کا بانی
اگر میں ہوں تو مجھے دیجے بدتریں تعزیر

میں آپ فاقہ کش۔ اتنا مجھے کہاں مقدور
کہ فکر اور کروں کچھ بغیر آتش شعیر

مرے حواس پریشاں بایں پریشانی
ہو جیسے لشکر بشکستہ کی خراب بہیر

گر اس پہ صلح کی ٹھیری رہے تو صلح سہی
اگر ہو پھیر شرارت بشر ہوں میں بھی شریر

جواب ایک کے یاں دس ہیں اور دس کے سو
نگاہ کرتے تھے اول بایں قلیل و کثیر

حصول یہ ہے کہ جب کوتوال تک قضیا
کیا ہوا ازپئے تہدید شاعرانِ شریر

تو کوتوال ہی بس اُن سے اب سمجھ لے گا
یہ دمبدم کی شکایت کی ہے عبث تحریر

یہ وہ مثل ہے کہ جس طرح سارے شہر کے بیچ
بلند قامتی اپنی سے مُتہم ہو بعیر

سو متہم مجھے ناداں نے ہجو شہ سے کیا
قباحت اُس کی جو سمجھے شہ اُسکو دے تعزیر

ولے مزاج مقدس جو لاابالی ہے
نہیں خیال میں آتا خیال حرف حقیر

جو کچھ ہوا سو ہوا مصحفی بس اب چپ رہ زیادہ کر نہ صداقت کا ماجرا تحریر

خدا پہ چھوڑ دے اس بات کو وہ مالک ہے

کرے جو برا ہے۔ جو چاہا کیا بحکم قدیر

سید انشا پھرتے چلتے دلّی میں آئے تھے اور کچھ کچھ عرصہ رہے تھے۔ اور جو لوگ اِن معرکوں میں اُن کے رفیق تھے اُن میں سے اکثروں نے دلّی کی شکل بھی نہیں دیکھی تھی۔ چنانچہ ایک موقع پر مصحفی نے یہ قطعہ کہا جس کے چند شعر ساتویں دیوان میں ہیں۔ قطعہ

بعضوں کا گماں ہے یہ کہ ہم اہل زباں ہیں دلّی نہیں دیکھی ہے زباں داں یہ کہاں ہیں

پھر تس پہ ستم اور یہ دیکھو کہ عروضی کہتے ہیں سدا آپ کو اور لاف زناں ہیں

سیفی کے رسالے پہ بنا اُنکی ہے ساری سو اُس کو بھی گھر بیٹھے وہ آپ ہی نگراں ہیں

اک ڈیڑھ ورق پڑھ کے وہ جامی کا رسالہ کرتے ہیں گھمنڈ اپنا کہ قافیہ داں ہیں

نہ حرف جو وہ قافیہ کے لکھتے ہیں اُس میں دانا جو اُنھیں سنتے ہیں یہ کہتے ہیں ہاں ہیں

تعقید سے واقف نہ تنافر سے ہیں آگاہ نہ حرف یہی قافیہ کے وردِ زباں ہیں

کرتے ہیں کبھی ذکر وہ ایطائے خفی کا ایطائے جلی سے کبھی پھر حرف زناں ہیں

اوّل تو ہے کیا شعر میں ان باتوں سے حاصل بالفرض اگر ہو بھی تو یہ سب پہ عیاں ہیں

حاصل ہے زمانہ میں جنھیں نظم طبیعی نظم اُن کی کے اشعار بہ از آب رواں ہیں

پرواہ اُنھیں کب ہے ردیف اور روی کی کب قافیہ کی قید میں آتش نفساں ہیں

مجھ کو تو عروض آتی ہے نہ قافیہ چنداں اک شعر سے گرویدہ مرے پیر و جواں ہیں

اس قطعہ کے مطلع پر خیال کرو کہ دلی اُس وقت کیا شے تھی۔ چند روز وہاں رہ جانا گویا زبان دانی کا سرٹیفکٹ ہوتا تھا۔ خیر اب شیخ صاحب کے اقسام سخن سے لطف حاصل کرنا چاہیے۔ باوجودیکہ شیخ مصحفی بہت سن رسیدہ تھے مگر سید انشا کے مرنے کا اُنھیں افسوس کرنا پڑا۔ چنانچہ ایک غزل کے مقطع میں کہا ہے:۔

مصحفی کس زندگانی پر بھلا میں شاد ہوں یاد ہے مرگ قتیل و مُردنِ انشا مجھے

کیا کیا فساد کیا کیا شور و شر ہوئے۔ کیسے کیسے خاک کے اُڑے۔ انجام یہ کہ خاک ؎

شیخ مصحفی کا قصیدہ نعت میں

حنا سے ہے یہ تری سُرخ لئے نگار انگشت — کہ ہو نہ پنجہ مرجاں کی زینہار انگشت
ضعیف اتنا ہوا ہوں کہ میرے ہاتھوں میں — نہیں یہ پنجہ طاقت سے بھلہ دار انگشت
ہلال و بدر ہوں یکجا عرق فشانی کو — رکھے جبیں پہ جو تو کر کے تابدار انگشت
فراق موکراں سے میں یہ ہوا باریک — کہ ہو گئیں مری سوزن صفت ہزار انگشت
زبسکہ زشت ہے دُنیا میں ہاتھ پھیلانا — رکھے ہے سمٹی ہوئی اپنی پشت خار انگشت
وہ جب لگائے ہے تو دیکھ دیکھ مجھے — رکھے ہے مُنہ میں تاسف کی روزگار انگشت
شمار داغ سے کب اتنی مجھکو فرصت ہے — کہ رکھ سکوں بسر چشم اشکبار انگشت

چند شعر کے بعد گریز کرتے ہیں

بیاں ضرور ہے اب دستِ تیغ کا اُس کے — نکل گئی سپر مہ سے جس کی پار انگشت
محمدؐ عربی معجزوں کا جس کے کبھی — نہ کر سکے فلکِ پیر کا شمار انگشت
چمن میں اُسکی رسالت کا جب کچھ آئے ہے ذکر — علم کرے ہے شہادت کی شاخسار انگشت
وظیفہ جس کا پڑھے ہے یہ دانہ شبنم — دعا میں جبکی ہے کھولے ہوئے چنار انگشت
اگر ہو مہرہ گہوارہ سنگِ فرش اس کا — نہ چوسے اپنی کبھی طفل شیر خوار انگشت
اُٹھا دے گر کفِ افسوس ملنے کی وہ رسم — نہ ہووے پھر کبھی انگشت سے دوچار انگشت
کرے جو وصف وہ اُس تاج انبیا کی رقم — قلم کی جوں نئے نرگس ہو تاجدار انگشت

غزلیات

دن جوانی کے گئے موسمِ پیری آیا — آبرو خاک ہے اب وقتِ حقیری آیا
تاب و طاقت رہی کیا خاک کہ اعضا کے تئیں — حاکمِ ضعف سے فرمانِ تغیری آیا

سبقِ نالہ تو بلبل نے پڑھا مجھ سے ولے — نہ اُسے قاعدۂ تازہ صفیری آیا
شاعری پر کبھی اپنی جو گئی اپنی نظر — نہ ضمیر اپنے میں اُس وقت ضمیری آیا
درد پڑھنے جو اُٹھا صبح کو سب سے پہلے — مکتبِ عشق میں ہونے کو وہ میری آیا
اُس کے در پر میں گیا سوانگ بنائے تو کہا — چل بے چل دور ہو کیا لے کے فقیری آیا
پوچھ مت معرکۂ عشق کا ہنگامہ کہ واں — قیس مارا گیا وامق باسیری آیا
اے سلیماں ہو مبارک تجھے یہ شاہی و تخت — تیرا آصف بھی بسامان وزیری آیا

چشم کم سے نہ نظر مصحفی خستہ پہ کر
وہ اگر آیا تو مجلس میں نظیری آیا

غزل مذکورۂ ذیل سید انشا کی غزل پر ہے :-

پیری سے ہو گیا یوں اس دل کا داغ ٹھنڈا — جس طرح صبح ہوتے کر دیں چراغ ٹھنڈا
سرگرم سیر گلشن کیا خاک ہوں کہ اپنا — نزلہ سے ہو رہا ہے آپ ہی دماغ ٹھنڈا
بلبل کے گرم نالے جب سے سنے ہیں اس نے — دیوار گلستاں پر بولے ہے زاغ ٹھنڈا
کیا کیا خوشامدی نت پنکھا لگے ہلانے — کشتی سے جب ہوا وہ کرکے فراغ ٹھنڈا
مرمر سے کم نہیں کچھ وہ تیغ تیز جس نے — لاکھوں کا کر دیا ہے دم میں چراغ ٹھنڈا
کشمیری ٹوپے میں ہم جانتے تھے روز لیکن — جی آج ٹک ہوا ہے کرکے سُراغ ٹھنڈا
گرمی کی رُت ہے ساقی اور اشک بلبلوں نے — چھڑکاؤ سے کیا ہے سب صحنِ باغ ٹھنڈا
ایسے میں اک صراحی شورے لگی منگا کر — لبریز کرکے مجھ کو بھر دے ایاغ ٹھنڈا
کیا ہم ٹکڑ گدا ہیں جو مصحفی یہ سوچیں — ہے گرم اُس کا چولھا اُسکا اجاغ ٹھنڈا

جرأت اور سید انشا کے مستزاد بھی دیکھو کہ مشاعرہ کے معرکے میں پڑھے گئے تھے :-

غزل مستزاد

خوشبوئی سے جن کی ہو خجل عنبر سارا — ہم مشک کی نکہت
بال اُلجھے ہوئے ہیں نہ کہ ریشم کا ہے لچھا — اللہ ری نزاکت

پاؤں میں کفک اور لگے ہاتھوں میں مہندی — از خونِ محباں
چہرا وہ پری کہئے جسے نور کا بتا — رنگ آگ کی صورت

تلوار لے ابروے کجِ قتل پہ مائل — لب خون کے پیاسے
پھولوں کی چھڑی ہاتھ میں اور کان میں لا — چتون میں شرارت

مسّی کی دھڑی اک تو جمی ہونٹوں پہ کافر — اور ترشی سے پونچھے
پھر تسپہ ستم اُس کا وہ پاؤں کا لکھوٹا — جوں خون کی پو رنگت

پاؤں میں انی دار پڑی کفش زری کی — دل جس سے ہو زخمی
اور سر پہ شرارت سے بندھا بالوں کا جوڑا — سج دھج سو اک آفت

خونخوار نگہ عربدہ جو آپ سو کیفی — سرشار نشہ میں
اک ہاتھ میں ساغر تو پھر اک ہاتھ میں مینا — مستوں کی سی حالت

آیا مرے گھر دی مرے دروازے پہ دستک — میں گھر سے نکل کر
دیکھوں تو سرِ کوچہ اک آشوب ہے پیدا — آئی ہے قیامت

تب میں نے کہا اُس سے کہ اے مایۂ خوبی — کیا جی میں یہ آیا
اس وقت جو آیا تو مرے پاس اکیلا — سمجھا نہ قباحت

تو سن کے لگا کہنے کہ اے مصحفی سن بات — گھر سے مرے مجھ کو
لایا ہے ترا جاذبہ ہی کھینچ کے اس جا — تھی کس کو یہ قدرت

سرِ شام اُس نے مُنہ سے جو رُخِ نقاب اُلٹا — نہ غروب ہونے پایا وہیں آفتاب اُلٹا
جو کسی نے دیکھنے کو اُسے لا کے دی مصوّر — نہ حیا کے مارے اس نے ورق کتاب اُلٹا
میں حسابِ بوسہ جی میں کہیں اپنے کر رہا تھا — وہ لگا مجھی سے کرنے طلب اور حساب اُلٹا
مہِ چاردہ کا عالم میں دکھاؤں گا فلک کو — اگر اُس نے پردہ مُنہ سے شبِ ماہتاب اُلٹا
جو خفا ہوا میں جی میں کسی بات پر شبِ وصل — سحر اُٹھ کے میرے آگے وہی اُس نے خواب اُلٹا
بسوالِ بوسہ اُس نے مجھے رُک کے دی جو گالی — میں ادب کے مارے اُس کو نہ دیا جواب اُلٹا

کہیں چشم مہر اُس پرتو نہ پڑ گئی ہو یارب — جو نکلتے صبح گھر سے وہ بھرا شتاب اُلٹا
میں ہوا ہوں جس پہ عاشق یہ شگرف ماجرا ہے — کہ مرے عوض لگا ہے اُسے اضطراب اُلٹا
کسی مست کی لگی ہے مگر اُس کے سر کو ٹھوکر — جو پڑا ہے میکدہ میں یہ خُم شراب اُلٹا

یہ مقام آفریں ہے کہ بزور مصحفی نے
انہی قافیوں کو پھر بھی بصد آب و تاب اُلٹا

جو پھرا کے اُس نے مُنہ کو بقضا نقاب اُلٹا — ادھر آسمان اُلٹا اُدھر آفتاب اُلٹا
نہ قفس میں ایسے مجھ کو تو اسیر کیجو صیاد — کہ گھڑی گھڑی وہ ہووے دمِ اضطراب اُلٹا
مرے حال پر مُغاں نے یہ کرم کیا کہ سُن سُن — مرے پی کے سر پہ رکھا قدحِ شراب اُلٹا
ترا تشنہ لب جہاں سے جو گیا لحد پر اُسکی — پسِ مرگ بھی کسی نے نہ سبوئے آب اُلٹا
مری آہ نے جو کھولی بلبوق آہ کی برق — وہیں برق رعد لے کر علمِ سحاب اُلٹا
جو خیال میں کسو کے شبِ ہجر سو گیا ہو — نہ ہو صبح کو الٰہی کبھی اُس کا خواب اُلٹا
مرے دم اُلٹنے کی جو خبر اُس کو دی کسی نے — وہیں نیم رہ کے قاصد بصد اضطراب اُلٹا
جو علی کا حکم نافذ نہ فلک پہ تھا تو پھر کیوں؟ — بگہِ غروب آیا نکل آفتاب اُلٹا

اب اسی میں تو سہ غزلہ جو کہے تو کام بھی ہے
نہیں مصحفی مزا کیا جو دورِ کتاب اُلٹا

یہ دم اُسکے وقت رخصت بصد اضطراب اُلٹا — کہ سبوئے دل مژہ سے وہیں خونِ ناب اُلٹا
سرِ لوح اُس کی صورت کہیں لکھ گیا تھا مانی — اُسے دیکھ کر نہ میں نے ورقِ کتاب اُلٹا
میں عجب یہ رسم دیکھی۔ مجھے روزِ عید قرباں — وہی ذبح بھی کرے ہے وہی لے ثواب اُلٹا
یہ عجب ہے میری قسمت کہ جو دل کسی کو دوں میں — وہ مرے ہی سر سے مارے اُسے کر خراب اُلٹا
یہ نقاب پوش قاتل کوئی زور ہے کہ جس نے — کئے خون سیکڑوں اور نہ ذرا نقاب اُلٹا
جو بوقتِ غسل اپنا وہ پھرا لے واں سے مُنہ کو — تو پھرا تے ہی مُنہ اُسکے لگے بہنے آب اُلٹا
میں لکھا ہے خط تو قاصد یہ ہوگا مجھ پہ احساں — اُنھیں پاؤں پھر کے تو آ جو ملے جواب اُلٹا

ترے آگے مہرِ تاباں ہے زمیں پہ سر بسجدہ یہ ورق کا گنجفہ کے نہیں آفتاب اُلٹا

نہیں جائے شکوہ اس سے ہمیں مصحفی ہمیشہ
کہ زمانہ کا رہا ہے یونہی انقلاب اُلٹا

غزل ہائے مرقومۂ ذیل پر شاہ نصیر کی بھی غزل دیکھو ؎

صاف چولی سے عیاں ہے بدنِ سُرخ ترا نہیں چھپتا تہِ شبنم چمنِ سُرخ ترا
یہی عالم ہے اگر اُس کا تو دکھلادے گا بارشِ خوں کا سماں پیرہن سُرخ ترا
وائے ناکامی کہ عاشق کو ترے موت آئی قابلِ بوسہ ہوا جب دَہنِ سُرخ ترا
تا کمر خون شہیدوں کے ہے گلیوں میں جب سے پاجامہ بنا گلبدنِ سُرخ ترا
خوں سے آلودہ ہوا آتا ہے تو اے اشکِ سفید نام ہم کیوں نہ رکھیں یاسمنِ سُرخ ترا
آتشِ تیز میں ٹھیرا ہے کہیں یوں بھی سپند؟ کہہ رہا ہے یہی خالِ ذقنِ سُرخ ترا

مصحفی خوش ہو کہ مانگے گا ترے قاتل سے
خونبہا روزِ قیامت کفن سُرخ ترا

کیسہ مالی سے ہوا گل بدن سُرخ ترا طالبِ آب نہ ہو کیوں چمنِ سُرخ ترا
یہی پوشاک کا ہے رنگ تو اے گُل ہو گا تشنۂ خونِ چمن پیرہنِ سُرخ ترا
کیوں نہ ہو مُردہ ہوس زندہ بنے جب اے شوخ پان سے بیربہٹی دہنِ سُرخ ترا
مجھ سے انکارِ ستم فائدہ اے گُرگِ فلک دال ہے بچّہ خوری پر دہنِ سُرخ ترا
کاش اے کشتہ تو محشر میں اُٹھے ہو کے فقیر گیروا مٹی میں ہو دے کفنِ سُرخ ترا
لبِ پاں خوردہ کی اُس گُل کے جو سُرخی دیکھی رنگ اُڑ جائے گا اے نارونِ سُرخ ترا
سر پہ تابش میں تو رکھے تو دلِ عاشق میں آگ بھڑکائے نہ کیوں بادزنِ سُرخ ترا

مصحفی چاہیئے کیا اس کو دلیلِ قاطع
سبز ہے خود بتخلص سخنِ سُرخ ترا

اک تو تھا آتشِ سوزاں بدنِ سُرخ ترا شعلہ بر شعلہ ہوا پیرہنِ سُرخ ترا

پان کھانے کی ادا یہ ہے تو اک عالم کو خوں رُلادے گا مری جاں دہنِ سُرخ ترا
گوئے خورشید شفق رنگ کو دیتا ہے نشاں پنجۂ رشک سے سیبِ ذقنِ سُرخ ترا
شمعِ گلگوں غمِ پروانہ میں خوں افشانہ رو طشتِ آتش تو بنا ہے لگنِ سُرخ ترا
سُرخ عیار سے تو کم نہیں اے دُزدِ حنا کفِ رنگینِ بتاں ہے دہنِ سُرخ ترا
یوہیں اے کُشتہ جو آیا تو صفِ محشر میں آگ دیوے گا لگا واں کفنِ سُرخ ترا
تو اگر نافۂ آہو ہے تو اے عقدۂ زلف ہے وہ رُخسارۂ رنگیں ختنِ سُرخ ترا
اس کے موباف سے بھی شعلہ نے شب پوچھا تھا دام شبرنگ ہے کیوں اے رسنِ سُرخ ترا
ہر پری چہرہ ہے پوشیدہ لباسِ گلگوں میں تو دیوانہ ہوں اے انجمنِ سُرخ ترا

مصحفی زخم ہے تیشہ کا ترے ابرو پر
نام ہم کیوں نہ رکھیں کوہکنِ سُرخ ترا

رنگ پاں ہے جو ہو گل دہنِ سُرخ ترا مر گئی دیکھ کے بُلبل دہنِ سُرخ ترا
پان کھا کر جو مسی زیب کئے تُو نے دو لب بن گیا مزرعِ سُنبل دہنِ سُرخ ترا
سُرخ تو تھا ہی ولے اور ہوا گلناری پی کے اے گل قدحِ گُل دہنِ سُرخ ترا
تب ہو عاشق کی شبِ وصل تسلّی اے گُل مصرفِ بوسہ ہو جب گُل دہنِ سُرخ ترا
غنچہ ساں وا نہوا عالمِ مے نوشی میں سن کے شیشہ کی بھی قلقل دہنِ سُرخ ترا
شانہ کرتے جو سرِ جعد تو دانتوں میں رکھے ہو نہ خونخوارۂ کاکل کا دہنِ سُرخ ترا
تیغِ مرّیخ پہ چھُٹتی ہے ہوائی اب تک کہیں دیکھا تھا سرِ پُل دہنِ سُرخ ترا

مصحفی تو نے زبس گُل کے لئے ہیں بوسے
رشک سے دیکھے ہے بلبل دہنِ سُرخ ترا

جو گستاخانہ کچھ اُس سے میں بولا تو بس ابرو نے تیغا دامیں تولا
چنے عاشق نہ کیوں اُس کے مولے کہ چشمِ شوخ ہے اُس کی ممولا
جزاک اللہ بنایا تو نے صیاد قفس میں از پئے بلبل ہنڈولا

نہ مارے دست و پا تا اُس کا بسمل الٰہی مار جا دے اُس کو جھولا

لب اُس گُل کے ہیں جامِ بادۂ لعل مِسی نے اُن میں آ کر زہر گھولا

یہ وہ گلشن ہے جس میں غم کے مارے تبسم سے کلی نے مُنہ نہ کھولا

مری پتلی نے اشکِ خیرہ سر کو بنایا ہے ہتھیلی کا پھپھولا

کہیں ملتے ہیں ایسے مصحفی یار
نہ آوے دل کے مرنے کا ملولا

آتش کی غزل کو بھی دیکھنا۔

نگاہِ لطف کے کرتے ہی رنگ انجمن بگڑا محبت میں تری ہم سے ہر اک اہلِ وطن بگڑا

کچھ اس کی وضع بگڑی کچھ ہے وہ پیماں شکن بگڑا یہ سج دھج ہے تو دیکھو گے زمانہ کا چلن بگڑا

خدا کہتا تھا روزِ حشر میں تجھ سے سمجھ لوں گا ترے تیشہ سے گر شیریں کا نقش اے کوہکن بگڑا

میں سمجھا گریہ نے تاثیر اس دم شمعِ مجلس کی یہ موتی اشک کا جاتے ہوئے جیب تا لگن بگڑا

جو چنگِ نالہ کو ہم نے اُڑایا ہجر کی شب میں کہیں گے سب کہ تیرا کھیل اب چرخِ کہن بگڑا

جسے سب بانکے اور ٹیڑھے کریں تھے دور سے مُجرا وہی رستہ میں آخر ہم سے کر کے بانکپن بگڑا

تری مژگاں کی راوت چڑھ گئی جب اُنپہ لڑنے کو بڑی پونا کے اندر کھلبلی سارا دکن بگڑا

بُری صورت سے رہنا ننگ ہے دنیا میں انساں کو وہ گڑ جاتا ہے خود جیتا جو کوڑھی کا بدن بگڑا

ہمیشہ شعر کہنا کام تھا والا نژادوں کا سفیہوں نے دیا ہے دخل جب سے بس یہ فن بگڑا

مکانِ تنگ میں پائی نہ جا کلکِ تخیل نے بنا سبحال و خط مانی نے اُسکا بر دہن بگڑا

نہیں تقصیر کچھ درزی کی اس میں مصحفی ہرگز
ہماری نادرستی سے بدن کی پیرہن بگڑا

دعا دینے سے میرے شب وہ ترکِ تیغ زن بگڑا سپاہی زادوں کا بھی کچھ میں دیکھوں ہوں چلن بگڑا

سخن سیدھی طرح اور وضع سادی بے مسی دنداں بھلا کتنا لگے ہے مجکو اس کا سادہ پن بگڑا

کیا تاراج یوں پیری نے حُسنِ نوجوانی کو بوقتِ صبح آرائش کا ہووے جوں چمن بگڑا

سوئی جس کو لگائی زید کی معشوقہ نے اپنی
سبھی سنوری وہی مجنوں کا بس اک پیرہن بگڑا

کمالِ حُسن خالق نے دیا ہے اُس پری رُو کو
نہ چتون کج ہوئی اُسکی نہ گاتے ہیں دہن بگڑا

یہ تصویریں عجب نواب نے کوٹھی میں بنوائیں
کسی کی ہے پھری ٹھوڑی کسی کا ہے دہن بگڑا

نہ مارے حق کسی کو کرکے مفلس وائے رسوائی
جہاں کوتہ ہوا کپڑا کفن کا وہ کفن بگڑا

رواج اُس نے نہ پایا بسکہ عہدِ زلفِ مشکیں میں
دھرا نافہ میں جو برسوں رہا مشکِ ختن بگڑا

عجائب اور غرائب باتیں اب سننے میں آتی ہیں
خمِ نیلی ترا شاید کہ اے چرخِ کہن بگڑا

خلل انداز جو لکنت ہوئی اُس کی فصاحت میں
زباں پر اُس بُتِ الکن کی آیا جو سخن بگڑا

ہمیں تکلیف نظمِ شعر کی دینے سے کیا حاصل
زمانہ ہم سے اِن روزوں ہے یارانِ وطن بگڑا

بہت جس سے شکل کافرِ شیریں بنائی تھی
اسی تیشہ سے پھر آخر کو کارِ کوہ کن بگڑا

وہی اے مصحفی تاصبح اُسکی اس پہ جھنجھلاہٹ
بنانے میں جو مشاطہ سے شب خالِ ذقن بگڑا

نہ گیا کوئی عدم کو دلِ شاداں لے کر
یاں سے کیا کیا نہ گئے حسرت و ارماں لے کر

جی ہی جی بیچ بہت شاد ہوا کرتی ہیں
تیری عارض کی بلائیں تری مژگاں لے کر

کیا خطا مجھ سے ہوئی رات کہ اُس کافر کا
میں نے خود چھوڑ دیا ہاتھ میں داماں لے کر

باغ وہ دشتِ جنوں تھا کہ کبھی جس میں سے
لالہ و گل نہ گئے تابہ گریباں لے کر

طرفہ سوجھی یہ جنوں کو ترے دیوانے کی
راہ میں پھینک دئے خارِ مغیلاں لے کر

زلف و رخسار کا عالم ہے غضب ہی اُس کے
شاد ہو کیوں نہ دلِ گبر و مسلماں لے کر

پردۂ خاک میں سو سو رہے جا کر افسوس
پردہ رخسار پہ کیا کیا مہِ تاباں لے کر

ابر کی طرح سے کر دیویں گے عالم کو نہال
ہم جدھر جاویں گے یہ دیدۂ گریاں لے کر

پھر گئی سوئے اسیرانِ قفس بادِ صبا
خبرِ آمدِ ایامِ بہاراں لے کر

دوستی تھی مجھے ہر اک سے گئے تا درِ قبر
دوش پر نعش مری گبر و مسلماں لے کر

رنج پر رنج جو دینے کی ہے خو قاتل کی
ساتھ آیا ہے بہم تیغ و نمکداں لے کر

مصحفی گوشۂ عزلت کو سمجھ تختِ شہی
کیا کرے گا تو عبث ملکِ سلیماں لے کر

یار بن باغ سے ہم آتے ہیں دکھ پائے ہوئے
اشک آنکھوں میں بھرے ہاتھ میں گل کھائے ہوئے

آنکھ سیدھی نہیں کرتا کہ مقابل ہو نگاہ
آرسی ناز سے وہ دیکھے ہے شرمائے ہوئے

کس کے آنے کی خبر ہے جو چمن میں گلچیں
جوں صبا چار طرف پھرتے ہیں گھبرائے ہوئے

ہم تو ترسے ہیں صنم اک نگہِ دور کو بھی
بخت اُن کے ہیں جو ہر دم ترے ہمسائے ہوئے

حُسن خجلت زدہ کی رنگ دکھاتا ہے نئے
آرسی بھی اسے اب دیکھے ہے للچائے ہوئے

اُس کے کوچے سے جو اٹھ آتے ہیں ہم دیوانے
پھر اُنھیں پاؤں چلے جاتے ہیں بَورائے ہوئے

مصحفی کیوں کے عناں گیر ہو اُس کا جوں برق
توسنِ ناز کو جب جائے وہ چمکائے ہوئے

خامش ہیں ارسطو و فلاطوں مرے آگے
دعویٰ نہیں کرتا کوئی موزوں مرے آگے

دانش پہ گھمنڈ اپنی جو کرتا ہے بشدّت
واللہ کہ وہ شخص ہے مجنوں مرے آگے

لاتا نہیں خاطر میں سخن بیہدہ گو کا
اعجاز مسیحا بھی ہے افسوں مرے آگے

دشوار ہے رُتبہ کو پیمبر کے پہنچنا
ہے موسیِ عمران بھی ہاروں مرے آگے

باندھے ہوئے ہاتھوں کو بامید اجابت
رہتے ہیں کھڑے سیکڑوں مضموں مرے آگے

جب موج پہ آجائے ہے دریائے طبیعت
قطرے سے بھی کم ٹھیرے ہے جیحوں مرے آگے

بدبیتی پہ آؤں تو ابھی اہلِ صفا کے
ہو جاویں شبہہ سب دُرِ مکنوں مرے آگے

اُستاد ہوں میں مصحفی حکمت کے بھی فن میں
ہے کودک نو درس فلاطوں مرے آگے

ہے جامِ طرب ساغرِ پُرخوں مرے آگے
ساقی تو نہ لانا مئے گلگوں مرے آگے

ٹک لب کے ہلا دینے میں حسّانِ عجم کا
ہو جاوے ہے احوال دگرگوں مرے آگے

سمجھوں ہوں اُسے مہرۂ بازیچۂ طفلاں
کس کام کا ہے گنبدِ گردوں مرے آگے

جب آتا ہے تیزی پہ مرا توسنِ خامہ ۔ بن جاویں ہیں تب کوہ بھی ہاموں مرے آگے
میں گو نہ سمجھتا ہوں صدا اُس کی صدا کو گو بول اُٹھے آدھی کی چوں چوں مرے آگے
سب خوشہ ربا ہیں مرے خرمن کے جہاں میں کیا شعر پڑھے گا کوئی موزوں مرے آگے
قدرت ہے خدا کی کہ ہوئے آج وہ شاعر طفلی میں جو کل کرتے تھے غاں غوں مرے آگے

موسیٰ کا عصا مصحفی ہے خامہ مرا بھی
گر خصم بنے اسودِ افیوں مرے آگے

خاتمہ

اے فلک نہ یہ جلسہ برہم ہونے قابل تھا ۔ نہ آج رات کا سماں صبح ہونے قابل تھا۔ پھر ایسے لوگ کہاں ! اور ایسے زمانے کہاں ! سید انشا اور جرأت جیسے زندہ دل شوخ طبع باکمال کہاں سے آئیں گے۔ شیخ مصحفی جیسے مشاق کیونکر زندہ ہوجائینگے۔ اور آئیں تو ایسے قدردان کہاں ؟ اچھے لوگ تھے کہ اچھا زمانہ پایا اور اچھی گزار گئے۔ وہ جوش و خروش۔ وہ شوخیاں وہ چہلیں اب کہاں +

گیا حُسن خوبان دلخواہ کا ہمیشہ رہے نام اللہ کا

میرا دل خدا جانے کس مٹّی کا بنا ہے۔ کسی کی جُدائی کا نام لیا یہ پگھل گیا۔ کسی عزیز کا ذکر کیا اُس سے خون ٹپک پڑا اور سخت جانی دیکھو کہ نہ پانی ہوکر بہ جاتا ہے نہ خاک ہوکر رہ جاتا ہے۔ تماشا یہ ہے کہ کتنے کتنے صدمے اُٹھا چکا ہے پھر بھی ہر داغ نیا ہی صدمہ دیتا ہے مگر انصاف کرو وہ عزیز بھی تو دیکھو کیسے تھے ! اور کون تھے ! عالم کے عزیز تھے ۔ اور ہر دل کے عزیز تھے ۔ اپنی باتوں سے عزیز تھے ۔ آزاد ۔ بس اب رونا دھونا موقوف ۔ اب آنسو پونچھ ڈالو۔ ادب کی آنکھیں کھولو۔ اور سامنے نگاہ رکھو +

پانچواں دَور

تمہید

دیکھنا وہ لالٹینیں جگمگانے لگیں۔ اُٹھو اُٹھو استقبال کرکے لاؤ۔ اس مشاعرہ میں وہ بزرگ آتے ہیں جن کے دیدار ہماری آنکھوں کا سُرمہ ہوئے۔ اس میں دو قسم کے باکمال نظر آئیں گے۔ ایک وہ کہ جنھوں نے اپنے بزرگوں کی پیروی کو دین آئین سمجھا۔ یہ اُن کے باغوں میں پھریں گے۔ پُرانی شاخیں زرد پتّے کاٹیں چھانٹیں گے اور نئے رنگ نئے ڈھنگ کے گلدستے بناکر گلدانوں سے طاق و ایوان سجائیں گے۔ دوسرے وہ عالی دماغ جو فکر کے دُخان سے ایجاد کی ہوائیں اُڑائیں گے اور بُرج آتش بازی کی طرح اس سے رُتبہ عالی پائیں گے۔ انھوں نے اس ہوا سے بڑے بڑے کام لئے۔ مگر یہ غضب کیا کہ گرد و پیش جو وسعت بے انتہا پڑی تھی اُس میں سے کسی جانب میں نہ گئے۔ بالا خانوں میں سے بالا بالا اُڑ گئے۔ چنانچہ تم دیکھو گے کہ بعض بلند پرواز ایسے اوج پر جائیں گے جہاں آفتاب تارا ہو جائے گا۔ اور بعض ایسے اُڑیں گے کہ اُڑ ہی جائیں گے۔ وہ اپنے آئین کا نام خیال بندی۔ اور نازک خیالی رکھیں گے۔ مگر حق یہ ہے کہ شاعری اُن کی ساحری اور خود اپنے وقت کے سامری ہوں گے۔ ساتھ اُس کے صاحب اقبال ایسے ہوں گے کہ انھیں پرستش کرنے والے بھی ویسے ہی ہاتھ آئیں گے۔ ان بزرگوں کی نازک خیالی میں کچھ کلام نہیں لیکن اتنا ہے کہ اب تک مضمون کا پھول اپنے حُسن خداداد کے جوبن سے فصاحت کے چمن میں لہلہاتا تھا۔ یہ اُس کی پنکھڑیاں لیں گے۔ اور اُن پر موقلم سے ایسی نقاشی کریں گے کہ بے عینک کے نہ دکھائی دے گی۔ اس خیال بندی میں یہ صاحب کمال اُس قدرتی لطافت کی بھی پروا نہ کریں گے جسے تم حُسن خداداد سمجھتے ہو۔ کیونکہ ان کی صنعت بے اُس کے اپنا رنگ نہیں دکھا سکتی۔

پہلے بزرگ گرد و پیش کے باغوں کا پتّا پتّا کام میں لا چکے تھے۔ اب نئے پھول کہاں سے لاتے۔ آگے جانے کی سڑک نہ تھی۔ اور سڑک نکالنے کے سامان نہ تھے۔ ناچار اس طرح اُستادی کا نقارہ بجایا اور ہم عصروں میں تاجِ افتخار پایا۔ یہ آخری دَور کی مصیبت کچھ ہماری ہی زبان پر نہیں پڑی۔ فارسی کے متقدمین کو اُس کے متاخرین سے مطابق کر لو۔ شعرائے جاہلیت کو متاخرین عرب سے مقابلہ کر لو۔ انگریزی اگرچہ میں نہیں جانتا مگر اتنا جانتا ہوں کہ اس کے متاخرین بھی اِس درد سے نالاں ہیں۔ پس معلوم ہوا کہ زبان جب تک عالمِ طفولیت میں رہتی ہے۔ تب ہی تک شیر و شربت کے پیالے لنڈھاتی ہے۔ جب پختہ سال ہوتی ہے تو خوشبو عرق اُس میں ملاتی ہے۔ تکلف کے عطر ڈھونڈھ کر لاتی ہے۔ پھر سادگی اور شیریں ادائی تو خاک میں مِل جاتی ہے۔ ہاں دواؤں کے پیالے ہوتے ہیں جس کا جی چاہے پیا کرے +

اِس موقع پر یہ کہنا واجب ہے کہ ان سے پہلے جو صاحب کمال لکھنؤ میں تھے وہ دلّی کے خانہ برباد تھے۔ وہ یا ان کی اولاد اس وقت تک دلّی کو اپنا وطن سمجھتے تھے اور اہل لکھنؤ اُن کی تقلید کو فخر سمجھتے تھے نہ کہ عیب کیونکہ وہاں اب تک کوئی صاحب کمال اس درجہ کا پیدا نہ ہوا تھا۔ اب وہ زمانہ آتا ہے کہ اُنھیں خود صاحب زبانی کا دعوےٰ ہوگا۔ اور زیبا ہوگا۔ اور جب اُن کے اور دلّی کے محاورہ میں اختلاف ہوگا تو اپنے محاورے کی فصاحت اور دلّی کی عدم فصاحت پر دلائل قائم کریں گے۔ بلکہ انھیں کے بعض بعض نکتوں کو دلّی کے اہل انصاف بھی تسلیم کریں گے۔ اِن بزرگوں نے بہت قدیمی الفاظ چھوڑ دیے جن کی کچھ تفصیل ہو چکی ہے دیباچہ میں لکھی گئی ہے اور اب جو زبان دلّی اور لکھنؤ میں بولی جاتی ہے۔ وہ گویا اُنھیں کی زبان ہے۔ البتّہ شیخ ناسخ کے دیوان میں ایک جگہ زور کا لفظ بہت کے معنوں میں دیکھا گیا۔ شاید یہ ابتدا کا کلام ہوگا ؎

عابد و زاہد چلے جاتے ہیں پیتا ہے شراب　　اب تو ناسخ زور رندِ لاابالی ہوگیا

اساتذۂ دہلی کے کلام میں۔ آئے ہے۔ اور۔ جائے ہے۔ اکثر ہے۔ مگر اخیر کی

غزلوں میں انھوں نے بھی بچاؤ کیا ہے +

شاہ نصیر مرحوم سن رسیدہ شخص تھے۔ آغاز شاعری کا کنارہ جرأت اور سید انشا سے ملا ہوا تھا اور انجام کی سرحد ناسخ۔ آتش اور ذوق میں واقع ہوئی تھی۔ اس لئے ابتدائی غزلوں میں کہیں کہیں ٹک بول جاتے ہیں۔ اور جس طرح جمع مؤنث کے فعلوں کی الف دنوں کے ساتھ چوتھے طبقہ میں بے تکلف بولتے تھے۔ ان کی ابتدائی غزلوں میں کہیں کہیں ہے۔ چنانچہ میر کی غزل کا مطلع ہے ؎

جفائیں دیکھ لیاں بے وفائیاں دیکھیں ۔ بھلا ہوا کہ تری سب برائیاں دیکھیں
کبھی نہ اُس رُخِ روشن پہ چھائیاں دیکھیں ۔ گھٹائیں چاند پہ سو بار آئیاں دیکھیں

اسی طرح موصوف جمع ہو اور صفت لفظ ہندی ہو تو اب موصوف کی مطابقت کے لئے صفت کو جمع بولنا خلافِ فصاحت سمجھتے ہیں۔ مگر خواجہ صاحب فرماتے ہیں ؎

عہد طفلی میں بھی تھا بسکہ سودائی مزاج ۔ بیڑیاں منت کی بھی پہنی تو میں نے بھاریاں

تمہید شیخ امام بخش ناسخ کے حال کی

بزرگان قدیم کی عمدہ یادگار مخدومی مولوی محمد عظیم اللہ صاحب ایک صاحب فضل و عاشق کمال غازی پور زمنیہ (زمانیہ) کے رئیس ہیں۔ اگرچہ بزرگوں کا حال بتفصیل معلوم نہیں مگر اتنا جانتا ہوں کہ قاضی القضاۃ مفتی اسد اللہ صاحب کی ہمشیرہ یعنی شاہ اجمل صاحب کی نواسی سے ان کی شادی ہوئی۔ مولوی صاحب موصوف کے والد کی شیخ امام بخش ناسخ سے نہایت دوستی تھی۔ میرے دوستو! اگلے وقتوں کی دوستیاں کچھ اور ہی دوستیاں تھیں۔ آج تمھارے روشنی کے زمانہ میں ان کی کیفیت بیان کرنے کو لفظ نہیں ملتے۔ جن سے ان کے خیالوں کا دوں میں عکس جماؤں۔ ہائے استاد ذوق ؎

اب زباں پر بھی نہیں آتا کہیں اُلفت کا نام   اگلے مکتوبوں میں کچھ رسم کتابت ہو تو ہو

غرض جذب جنسیت اور اتحاد طبیعت ہمیشہ مولوی صاحب کے والد کو غازی پور سے لکھنؤ کھینچ کر لے جاتا تھا۔ مہینوں وہیں رہتے تھے۔ مولوی صاحب کا ۵ برس کا سن تھا۔ یہ بھی والد کے ساتھ ہوتے تھے۔ اس وقت سے شیخ ناسخ کی خدمت میں رہے۔ اور سالہا سال فیض حضوری سے بہرہ یاب ہوئے۔ راغبی تخلص انہی نے عنایت فرمایا جس سے ۱۲۳۵ھ سالِ تلمذ نکلتے ہیں۔ عربی فارسی کی کتب تحصیلی الہ آباد اور لکھنؤ میں حاصل کیں۔ اُردو۔ فارسی کی انشا پردازی میں کئی مجلد لکھ کر رکھ چھوڑے ہیں۔ جانتے ہیں کہ ان کی فصل اب بالکل نکل گئی ہوا مخالف ہے اس لئے نہ آپ گوشۂ عافیت سے نکلتے ہیں نہ انھیں نکالتے ہیں۔ عہد جوانی میں سرکار سے بھی باقتدار اور معزز عہدے حاصل کئے۔ اب بڑھاپے نے پنشن خوار بنا کر خانہ نشین کر دیا ہے۔ بندۂ آزاد کو اسی آب حیات کی بدولت اُن کی خدمت میں نیاز حاصل ہوا۔ اور اُنھوں نے بہت حالات شیخ موصوف کے لکھ کر گرانبار احسان فرمایا جو کہ اب طبع ثانی میں درج ہوتے ہیں۔ آزاد اُن کا صدق دل سے ممنون احسان ہے۔ ہمیشہ عنایت ناموں سے ممنون فرماتے رہتے ہیں جن کے حرف حرف سے محبت کے آب حیات ٹپکتے ہیں۔ بات یہ ہے کہ ہم لوگ اس زمانے کے بالکل اجنبی ہیں۔ نئی روشنی والے کہتے ہیں کہ روشنی نہیں۔ روشنی نہیں۔ جناب راغبی اور بندۂ آزاد کی آنکھوں سے کوئی دیکھے کہ دنیا اندھیر ہے ؎

سُراغ یک نگاہِ آشنا از کس نمی یابم   جہاں چوں نرگستاں بے تو شہر کور میباشد

اب تک زیارت نہیں ہوئی مگر یہ معلوم ہوتا ہے کہ جیسے کوئی انجان آدمی ایک نئے ملک میں جا پڑے جہاں وہ کسی کی سمجھے نہ کوئی اُس کی۔ اور وہ ہکا بکا ایک ایک کا منہ دیکھے۔ اسی طرح وہ بھی آج کل کے لوگوں کا منہ دیکھ رہے ہیں۔ کجا ناسخ و آتش کے مشاعرے اور کجا کمیٹیوں کے جلسے۔ شیخ صاحب اور خواجہ صاحب کے حالات جو

اُنھوں نے لکھ کر بھیجے ہیں۔ معلوم ہوتا ہے کہ آنکھوں کے آنسو تھے حرفوں کے رنگ میں بہہ نکلے ہیں۔ یہ درد کوئی آزاد کے دل سے پوچھے کہ جب شیخ ابراہیم ذوق کا نام آتا ہے۔ چھاتی پر سانپ لوٹ جاتا ہے ؎

بنال بلبل اگر بامنت سریاری ست　　　که مادو عاشق زاریم کار ما زاری ست

شیخ ناسخ کا حال لکھتے لکھتے کہتے ہیں "کیا کہوں کہ میرے حال پر کیسی شفقت فرماتے تھے۔ دو دیوان خود لکھ کر مجھے دئے۔ ایک مہر عقیق پر کھُدوا کر مجھے دی۔ اب تک موجود ہے۔ رغمی سلمہ اللہ نے جونپور اور غازی پور وغیرہ کے حالات بھی بھیجے ہیں جن کی بدولت دربار اکبری ہمیشہ شکر گذار رہے گا۔ خدا کرے کہ جلد وہ مرقع سج کر اہل نظر کی پیش گاہ میں جلوہ گر ہو +

شیخ امام بخش ناسخ کا حال

شیخ صاحب کی شاعری کا وطن لکھنؤ ہے۔ مگر کمال سے لاہور کو فخر کرنا چاہئے جو کہ انکے والد کا وطن تھا۔ خاندان کے باب میں فقط اس قدر کہہ سکتے ہیں کہ خدا بخش خیمہ دوز کے بیٹے[1] تھے۔ اور بعض اشخاص کہتے ہیں کہ اس دولت مند لاولد نے متبنّٰی کیا تھا۔ اصلی والد عالم غربت میں مغرب سے مشرق کو گئے۔ فیض آباد میں اُن کی قسمت سے یہ ستارہ چمکا کہ فلکِ نظم کا آفتاب ہوا ؎

خدا کی دین کا موسیٰ سے پوچھئے احوال　　　کہ آگ لینے کو جائیں پیمبری مل جائے

غریب باپ سے صاحب نصیب بیٹے کے سوا وہاں بھی نصیبہ نے رفاقت نہ کی مگر اُس دولتمند سوداگر نے کہ لاولد تھا بلند اقبال لڑکے کو فرزندی میں لے کر ایسا تعلیم و تربیت کیا کہ بڑے ہو کر شیخ امام بخش ناسخ ہو گئے۔ اور اُس مجازی باپ کی بدولت دنیا کے ضروریات سے بے نیاز رہے۔ وہ مر گیا تو اُس کے بھائیوں نے دعویٰ کیا انھوں نے کہا

[1] رغمی سلمہ اللہ فرماتے ہیں "ان کے والد لاہور سے گئے تھے۔ بنفشہ اور زعفران وغیرہ اشیائے قیمتی کابل و کشمیر کی تجارت کرتے تھے۔ شیخ مرحوم بعالم خوردسالی ہمراہ تھے۔ والد اصلی اور خدا بخش کا کچھ ذکر نہیں لکھا +

کہ مجھے مال و دولت سے کچھ غرض نہیں۔ جس طرح اُن کو باپ سمجھتا تھا آپ کو سمجھتا ہوں۔ اتنا ہے کہ جس طرح وہ میری ضروریات کی خبر گیری کرتے تھے اس طرح آپ فرمائیے۔ انھوں نے قبول کیا۔

ناسخ فسادِ خون کے سبب سے ایک موقع پر فقط بیسنی روٹی گھی میں چور کر کھایا کرتے تھے۔ بدنیت چھلنے اس میں زہر دیا۔ لوگوں نے یہ مصالح لگایا کہ ایک جن اُن کا دوست ہے اس نے آگاہ کیا (حکایت عنقریب روایت کی جاتی ہے) بہرحال کسی قرینہ سے اُنھیں معلوم ہو گیا۔ اُسی وقت چند دوستوں کو بُلا کر اُن کے سامنے ٹکڑا کتے کو دیا۔ آخر ثابت ہوا کہ فی الحقیقۃ اُس میں زہر تھا۔ چند روز کے بعد وراثت کا جھگڑا عدالت شاہی تک پہنچا۔ جس کا فیصلہ شیخ مرحوم کی جیت پر ہوا۔ اس وقت انھوں نے چند رُباعیاں کہہ کر دل خالی کیا۔ دو اُن میں سے یہ ہیں :۔

رُباعی

مشہور ہیں گرچہ افترائے اعمام — پر کرتے نہیں غور خواص اور عوام
وارث ہونا دلیل فرزندی ہے — میراث نہ پا سکا کبھی کوئی غلام

رُباعی

کہتے رہے اعمام عداوت سے غلام — میراث پدر پائی مگر میں نے تمام
اس دعویِ باطل سے ستمگاروں کو — حاصل یہ ہوا کہ کر گئے مجھ کو بدنام

غور کرو متبنّٰی ہونا کچھ عیب کی بات نہیں۔ دنیا کی غریبی امیری جاڑے اور گرمی کی طرح بدلتی رہتی ہے۔ ایک امیر الامرا کو صرف چند پُشت کے اندر دیکھو تو ممکن نہیں کہ ایک وقت اُس کے گھر میں افلاس کا گزر نہ ہوا۔ البتہ وہ بے استقلال قابل ملامت ہے۔ کہ اس عالم میں رحمت الٰہی کا انتظار نہ کر سکے اور ایسے کام کر گزرے جو نام پر داغ دے جائیں۔ غرض شیخ صاحب کے اِس معاملہ کو حریفوں نے بدرنگ لباسوں میں دکھایا ہے جس کا ذکر عنقریب آتا ہے۔ وہ فیض آباد میں تھے۔ لکھنؤ کے دار الخلافہ ہو جانے سے وہاں آئے اور وہیں عمر بسر کی۔ ٹکسال ایک محلّہ مشہور ہے اُس میں بیٹھ کر شعر کے چاندی سونے پر سکّہ لگاتے تھے اور کھوٹے کھرے مضمون کو پرکھتے تھے۔

تحصیل علمی

فارسی کی کتابیں حافظ وارث علی لکھنوی سے پڑھی تھیں اور علمائے فرنگی محل سے بھی تحصیلی کتابیں حاصل کی تھیں۔ اگرچہ عربی استعداد فاضلانہ نہ تھی مگر رواج علم اور صحبت کی برکت سے فن شاعری کی ضروریات سے پوری واقفیت تھی۔ اور نظم سخن میں ان کی نہایت پابندی کرتے تھے +

شیخ ناسخ کی تقریر شاگردی کے باب میں

شاعری میں کسی کے شاگرد نہ تھے۔ مگر ابتدا سے شعر کا عشق تھا (مولانا رنگی فرماتے ہیں) مجھ سے خود شیخ صاحب نے آغاز شاعری کا حال نقل فرمایا کہ میر تقی مرحوم ابھی زندہ تھے جو مجھے ذوق سخن نے بے اختیار کیا۔ ایک دن اغیار کی نظر بچا کر کئی غزلیں خدمت میں لے گیا اُنہوں نے اصلاح نہ دی[1]۔ میں دل شکستہ ہو کر چلا آیا اور کہا کہ میر صاحب بھی آخر آدمی ہیں۔ فرشتہ تو نہیں۔ اپنے کلام کو آپ ہی اصلاح دوں گا۔ چنانچہ کہتا تھا اور رکھ چھوڑتا تھا۔ چند روز کے بعد پھر دیکھتا۔ جو سمجھ میں آتا اصلاح کرتا۔ اور رکھ دیتا۔ کچھ عرصہ کے بعد فرصت میں نظر ثانی کرتا۔ اور بناتا۔ غرض مشق کا سلسلہ برابر جاری تھا۔ لیکن کسی کو سُناتا نہ تھا۔ جب تک خوب اطمینان نہ ہوا۔ مشاعرہ میں غزل نہ پڑھی۔ نہ کسی کو سُنائی۔ مرزا حاجی صاحب[2] کے مکان پر مشاعرہ ہوتا تھا۔ سید انشا۔ مرزا قتیل۔ جرأت۔ مصحفی وغیرہ سب شعرا جمع ہوتے تھے میں جاتا تھا۔ سب کو سُنتا تھا۔ مگر وہاں کچھ نہ کہتا تھا۔ ان لوگوں میں جو لون مزاج سید انشا اور جرأت کے کلام میں ہوتا تھا وہ کسی کی زبان میں نہ تھا۔ غرض سید انشا اور مصحفی کے معرکے بھی ہو چکے۔ جرأت اور ظہور اللہ خاں نوا کے ہنگامے بھی طے ہو گئے +

[1] ان کی طبیعت اور زبان دونوں سے میل کھا جانے والی تھیں۔ اور بے دماغی اس پر طرہ۔ افسوس میر صاحب نے جو الفاظ فرمائے ہوں گے سُننے کے قابل ہوں گے۔ مگر شیخ صاحب نے وہ کسی کو کب سنائے ہوں گے۔ [2] رقعات مرزا قتیل میں ان کا ذکر آتا ہے۔ نہایت رسا اور صاحب عقل اور باتدبیر شخص تھے۔ نواب سعادت علی خاں اور صاحب رزیڈنٹ کے درمیان میں واسطہ ہو کر اکثر مقدمات سلطنت کو رُو براہ کرتے تھے۔ لاکھوں روپے کی املاک بہم پہنچائی تھی۔ اپنے گھر میں بیٹھے ہوئے اہل عالم کو امیرانہ شان دکھاتے تھے۔ علم و فضل اور شعر و سخن کا شوق تھا۔ اس لئے اکثر اہل کمال ان کے مکان پر جمع ہوتے تھے +

جب وہ زمانہ سارے ورق اُلٹ چکا اور میدان صاف ہوگیا تو ہیں نے غزل پڑھنی شروع کی۔ اس موقع پر مرزا حاجی صاحب۔ مرزا قتیل۔ اور حاجی محمد خاں اختر[1] نے بڑی قدر دانی کی اور اُن کے دل بڑھانے سے کلام نے روز بروز رنگ پکڑنا شروع کیا۔ لوگوں کے دلوں میں یہاں تک شوق پیدا ہوا کہ جو غزل کہہ کر پڑھتا تھا۔ پھر بھی مشتاق رہ جاتے تھے۔ منتظر[2] اور گرم کو موت نے ٹھنڈا کیا۔ خواجہ حیدر علی آتش شیخ مصحفی کے ارشد تلامذہ نے محاورہ بندی میں نام نکالا۔ ایک دفعہ کئی مہینے بعد فیض آباد سے آئے۔ مشاعرہ میں جو میری غزلیں سُنیں تو سانپ کی طرح پیچ و تاب کھایا۔ اور اُسی دن سے بگاڑ شروع ہوا اُنھوں نے آتش رشک کی جلن میں اس جان کاہی اور سینہ خراشی سے غزلیں کہیں کہ سینہ سے خون آنے لگا۔

غرض شیخ صاحب کا شوق ہمیشہ مشاعرہ میں لے جاکر دل میں اُمنگ اور طبیعت میں جوش بڑھاتا تھا۔ اور آسودہ حالی اکثر شعرا۔ اہل فہم۔ اور اہل کمال کو ان کے گھر کھینچ لاتی تھی۔ ان کی صحبتوں میں طبیعت خود بخود اصلاح پاتی گئی۔ رفتہ رفتہ خود اصلاحیں دینے لگے۔ بعض سن رسیدہ اشخاص سے سُنا گیا کہ ابتدا میں شیخ مصحفی سے اصلاح لیتے تھے مگر کسی شعر پر ایسی تکرار ہوئی کہ انھوں نے ان کا آنا بند کر دیا۔ یہ بطور خود غزلیں کہتے رہے اور تنہا تخلص ایک شخص تھے۔ ان سے تنہائی میں مشورت کرتے رہے۔ جب اطمینان ہوا تو مشاعروں میں غزل پڑھنے لگے۔ لیکن مصحفی والی روایت قابل اعتبار نہیں۔ کیونکہ انھوں نے اپنے تذکرہ میں تمام شاگردوں کے نام لکھ دیے ہیں۔ ان کا نام نہیں (مولانا رغمی فرماتے ہیں)

ورزش اور ریاضت کا شوق بہت تھا۔

پہلوان سخن کو ابتدائے عمر سے ورزش کا شوق تھا۔ خود ورزش کرتے تھے۔ بلکہ احباب کے نوجوانوں میں جو حاضر خدمت ہوتے اور اُن میں کسی ہونہار کو ورزش کا

[1] اختر اپنے زمانہ کے جامع الکمالات شخص تھے اور اکثر شاعرانہ اور عالمانہ تنازع ان کے سامنے آکر فیصلہ ہونے تھے+

[2] منتظر اور گرم۔ شیخ مصحفی کے نامور شاگرد تھے +

شوق دیکھتے تو خوش ہوتے اور چوپٹ دلاتے، ۱۲۹ ڈنڑ کا معمول تھا کہ یا غفور کے عدد ہیں۔ یہ وظیفہ قضا نہ ہوتا تھا۔ البتہ موسم اور موقع پر زیادہ ہو جاتے تھے اُنھیں جیسا ریاضت کا شوق تھا ویسا ہی ڈیل ڈول بھی لائے تھے۔ بلند بالا۔ فراخ سینہ۔ منڈا ہوا سر۔ کھاروے کا لنگ باندھے بیٹھے رہتے تھے۔ جیسے شیر بیٹھا ہے۔ جاڑے میں تن زیب کا کرتا۔ بہت ہوا تو لکھنؤ کی چھینٹ کا دُہرا کرتا پہن لیا۔

خوش خوراک تھے

دن رات میں ایک دفعہ کھانا کھاتے تھے۔ ظہر کے وقت دسترخوان پر بیٹھتے تھے۔ اور کئی وقتوں کی کسر نکال لیتے تھے۔ پان سیر پختہ شاہجہانی کی خوراک تھی۔ خاص خاص میووں کی فصل ہوتی تو جس دن کسی میوہ کو جی چاہتا اُس دن کھانا موقوف مثلاً جامنوں کو جی چاہا لگن اور سینیاں بھر کر بیٹھ گئے۔ چار پانچ سیر وہی کھا ڈالیں۔ آموں کا موسم ہے تو ایک دن کئی ٹوکرے منگا کر سامنے رکھ لئے۔ ناندوں میں پانی ڈلوالیا۔ اُن میں بھرے اور خالی اُٹھ کھڑے ہوئے۔ بھٹّے کھانے بیٹھے تو گلیوں کے ڈھیر لگا دئے۔ اور یہ اکثر کھایا کرتے۔ دودھیا بھٹّے بُھنے جاتے۔ چاقو سے دانوں پر خط ڈال کر لون مرچ لگتا۔ سامنے بُھننے ہیں۔ لیموں چھڑکتے ہیں اور کھاتے جاتے ہیں۔ میوہ خوری ہر فصل میں دو تین دفعہ۔ بس۔ اور اُس میں دو چار دوست بھی شامل ہو جاتے تھے۔

کھانا اکثر تخلیہ میں کھاتے تھے۔ سب کو وقت معلوم تھا۔ جب ظہر کا وقت قریب ہوتا تو رخصت ہو جاتے تھے (رحمی سلمہ اللہ فرماتے ہیں) مجھے چند مرتبہ اُن کے ساتھ کھانے کا اتفاق ہوا۔ اُس دن نہاری اور نان تافتان بھی بازار سے منگائی تھی۔ پانچ چار پیالوں میں قورمہ۔ کباب۔ ایک میں کسی پرندہ کا قورمہ تھا۔ شلغم تھے۔ چقندر تھے۔ ارہر کی دال دھوئی ماش کی دال تھی۔ اور وہ دسترخوان کا شیر اکیلا تھا مگر سب کو فنا کر دیا۔ یہ بھی قاعدہ تھا کہ ایک پیالہ میں سے جتنا کھانا ہے خوب کھالو۔ اُسے خدمتگار اُٹھا لے گا۔ دوسرا سامنے کر دے گا۔ یہ نہ ہو سکتا تھا کہ ایک نوالہ کو دو سالنوں میں ڈال کر کھالو۔ کہا کرتے تھے کہ ملا جُلا کر کھانے میں ہر چیز کا مزا جاتا رہتا ہے۔ اخیر میں پلاؤ یا چلاؤ یا خشکہ

کھاتے تھے۔ پھر دال اور ۵۔ ۶ نوالوں کے بعد ایک نوالہ چٹنی یا اچار یا مربے کا۔ کہا کرتے تھے کہ تم جوانوں سے تو میں بڈھا ہی اچھا کھاتا ہوں۔ دسترخوان اُٹھتا تھا تو دو خوان فقط خالی باسنوں کے بھرے اُٹھتے تھے۔ قوی ہیکل بلونت جوان تھے۔ ان کی صورت دیکھ کر معلوم ہوتا تھا کہ ۴۔۵ سیر کھانا ان کے آگے کیا مال ہے +

لطیفہ۔ زمانہ کی زبان کون پکڑ سکتا ہے۔ بے ادب۔ گستاخ دُم کٹے بھینسے کی پھبتی کہا کرتے تھے۔ اسی رنگ روغن کی رعایت سے خواجہ صاحب نے چوٹ کی :۔

رو سیہ دُشمن کا یوں پاپوش سے کیجے فگار جیسے سلہٹ کی سپر پر زخم ہو شمشیر کا

شیخ صاحب نے خود بھی اس کا عذر کیا ہے اور شاگرد بھی روغن قاز مل مل کر استاد کے رنگ کو چمکاتے تھے اور حریف کے رنگ کو مٹاتے تھے۔ فقیر محمد خاں گویا نے کہا تھا :۔

گویا	ہے یقیں گل ہو جو دیکھے گیسوئے دلبر چراغ آگے کالے کے بھلا روشن رہے کیونکر چراغ
شیخ ناسخ	ہیں گو کہ حُسن سے ظاہر میں مثل ماہ نہیں ہزار شکر کہ باطن مرا سیاہ نہیں
جوابِ آتش	فروغ حُسن پہ کب زور زلف چلتا ہے یہ وہ چراغ ہے کالے کے آگے جلتا ہے

پہلوان سخن زور آزمائی کے چرچے اور ورزش کی باتوں سے بہت خوش ہوتے تھے۔ رغمی سلمہ اللہ کے والد بھی اِس میدان کے جوانمرد تھے۔ رغبتوں کے اتحاد ہمیشہ موافقت صحبت کے لئے سبب ہوتے ہیں اس لئے محبت کے ہنگامے گرم رہتے تھے+

لطیفہ۔ آغا کلب حسین خاں مرحوم انھیں اکثر بلایا کرتے تھے اور مہمان رکھتے تھے۔ ان سے بھی فقط ذوق شعر کا تعلق نہ تھا۔ وہ بھی ایک شہ زور۔ شہسوار۔ ورزشی جوان تھے۔ سامان امیرانہ اور مزاج دوستانہ رکھتے تھے۔ چنانچہ ایک موقع پر کہ آغا صاحب سورام سرحدِ نوابی پر تحصیلدار ہو کر آئے۔ شیخ صاحب کو بُلا بھیجا کہ چند روز سبزہ صحرا کی سیر سے طبیعت کو سیراب فرمائیے۔ ایک دن بعض اقسام کے کھانے خاص شیخ صاحب کی نیت سے پکوائے تھے۔ اس لئے وقت معمولی سے کچھ دیر ہو گئی۔ شیخ صاحب نے دیکھا کہ حرم سرا کی ڈیوڑھی سے نوکر اپنے اپنے کھانے لے کر نکلے۔ بُلا کر پوچھا کہ یہ کس کے

لئے ہے؟ عرض کی ہمارا کھانا ہے۔ فرمایا ادھر لاؤ۔ ان میں سے ۴-۵ کا کھانا سامنے رکھوا لیا۔ چاٹ پونچھ کر باسن حوالے کئے اور کہا کہ ہمارا کھانا آئے گا تو تم کھا لینا۔ آغا صاحب کو خبر جا پہنچی۔ اتنے میں وہ آئیں یہاں کام ختم ہو چکا تھا +

جناب مخدوم و مکرم آغا کلب[1] عابد خاں صاحب نے بھی اس حکایت کی تصدیق فرمائی۔ اور کہا کہ ان کے مزاج میں شوریدگی ضرور تھی۔ اگرچہ میں ان دنوں میں خورد سال تھا مگر ان کا بارہا آنا اور رہنا اور ان صحبتوں کی شعر خوانیاں خصوصاً مقام سورام کی کیفیتیں سب ہوبہو پیش نظر ہیں۔ انھیں بالاخانہ پر اتارا تھا۔ بعض دفعہ ایسا بھی ہوا کہ بیٹھے ہیں کھاتے کھاتے سالن کا پیالہ اُٹھایا اور کھڑکی میں پھینک مارا کہ وہ جا پڑا! سبب دیکھا تو کچھ نہ تھا +

---

[1] مرزا محمد تقی خاں اور محمد شفیع خاں دو بھائی نادرشاہ کے مصاحب تھے۔ ان میں سے محمد تقی خاں ان کے دادا تھے۔ شاہ مذکور کا قہر و غضب عالم پر روشن ہے۔ محمد شفیع خاں کو جلتی آگ میں جلوا دیا۔ یہ دل برداشتہ ہو کر ہندوستان میں آئے۔ نواب علی خاں صفدر جنگ کے بزرگوں سے اور ان کے بزرگوں سے ایران میں اتحاد تھا۔ چنانچہ اسی سلسلہ سے یہاں ملاقات ہوئی۔ نواب صاحب کمال محبت سے پیش آئے اور بادشاہ دہلی کے دربار سے کچھ خدمت دلوانی چاہی۔ جب انھوں نے منظور نہ کی تو علاقہ اودھ سے دس ہزار روپیہ کی جاگیر کر دی۔ شیخ علی حزیں بنارس میں تھے۔ ان سے اور اُن سے وطن میں بہت دوستی تھی۔ اس لئے بنارس میں جا کر رہے۔ شیخ مرحوم ابھی زندہ تھے کہ انھوں نے انتقال کیا۔ شیخ نے جو سردابہ اپنے لئے بنوایا تھا اُس کے پہلو میں دفن کیا۔ اور بہت سے اپنے شعر قبر پر لکھے کہ اب تک قائم ہیں۔ ان کے بیٹے کلب علی خاں مرحوم نے سرکار انگریزی میں بزرگوں کی عزت کو روشن کیا۔ راجہ بنارس خورد سال تھے۔ ان کے علاقہ کا کام سپرد ہوا چنانچہ چار علاقے جن کی آمدنی ۴۹ لاکھ روپیہ تھی۔ ان کے مالیہ اور فوجداری کے کل اختیارات ان کے ہاتھ میں تھے۔ ان کے بیٹے ڈپٹی کلب حسین خاں صاحب ہوئے۔ ان کے بیٹے آغا کلب عابد خاں صاحب ہیں جو فی الحال امرتسر میں درجۂ اول کے اکسٹرا اسسٹنٹ ہیں اور قابلیت اور متانت اور مروت اور وضعداری میں ایک سند یادگار بزرگان سلف کی ہیں +

تقسیم اوقات

یہ بھی معمول تھا کہ پہر رات رہے سے ورزش شروع کرتے تھے۔ صبح تک اُس سے فارغ ہوتے تھے۔ مکان مردانہ تھا۔ عیال کا جنجال رکھا ہی نہ تھا۔ اول نہائے اور پھر صحن میں کہ صفائی سے آئینہ رہتا تھا۔ مونڈھے بچھے ہیں۔ اندر ہیں تو فرش اور سامان آرائش سے آراستہ ہے۔ صبح سے احباب اور شاگرد آنے شروع ہوتے تھے دوپہر کو سب رخصت اور دروازہ بند۔ حضرت دسترخوان پر بیٹھے۔ یہ بڑا کام تھا۔ چنانچہ اِس بھاری بوجھ کو اُٹھا کر آرام فرمایا۔ عصر سے پھر آمد شروع ہوئی۔ مغرب کے وقت سب رخصت۔ دروازہ معمور۔ خدمتگار کو بھی باہر کیا۔ اور اندر سے قفل جڑ دیا۔ کوٹھے پر ایک کمرہ خلوت کا تھا۔ وہاں گئے کچھ سو رہے اور تھوڑی دیر بعد اُٹھ کر فکر سخن میں مصروف ہوئے۔ عالم خواب غفلت میں پڑا سنّاٹا تھا۔ اور وہ خواب راحت کے عوض کاغذ پر خون جگر ٹپکاتے تھے (استاد مرحوم کا ایک مطلع یاد آگیا جس کا مصرع آخر اس انگوٹھی پر نگینا ہو گیا)۔

پھر اگر یہ ترے رخسار کو چمکاتا ہے ۔۔۔ نیل اس آگ پہ تل آنکھ کا ٹپکاتا ہے

شاگرد جو غزلیں اصلاح کو دیتے تھے نوکر اُنھیں ایک کھاروے کی تھیلی میں بھر کر پہلو میں رکھ دیتا تھا۔ وہ بھی جانتے تھے۔ جب تھیلا بھرا ہوا تو کاغذ تہ ہوئے اور پھر وہی ورزش۔

حقہ کا بہت شوق تھا

حُقّہ کا بہت شوق تھا۔ عمدہ عمدہ حقّے منگاتے تھے۔ تحفوں میں آتے تھے۔ انھیں موزوں نیچوں سے سجاتے تھے۔ کلیاں۔ گڑگڑیاں۔ سٹک نیچوان۔ چوگانی۔ مدرے وغیرہ وغیرہ ایک کوٹھری بھری ہوئی تھی۔ یہ نہ تھا کہ جلسہ میں دو حقّے ہیں۔ وہی دورہ کرتے ہیں۔ ہر ایک کے موافق طبع الگ حُقّہ اُس کے سامنے آتا تھا۔ ان صحبتوں میں بھی شاگردوں کے لئے اصلاح اور افادہ ہو جاتا تھا۔

آداب محفل کا بہت خیال تھا۔ آپ تکیہ سے لگے بیٹھے رہتے تھے۔ شاگرد (جن میں امیرزادے شرفا ہوتے تھے) باادب بچھونے کے حاشیہ پر بیٹھے جاتے۔ دم مارنے کی مجال نہ تھی۔ شیخ صاحب کچھ سوچتے کچھ لکھتے۔ جب کاغذ ہاتھ سے رکھتے تو کہتے۔ ہوں!

ایک شخص غزل سُنانی شروع کرتا۔ کسی شعر میں کوئی لفظ قابل تبدیل ہوتا۔ یا پس وپیش کے تغیر سے کام نکلتا تو اصلاح فرماتے۔ نہیں تو کہہ دیتے یہ کچھ نہیں نکال ڈالو۔ یا اس کا پہلا یا دوسرا مصرع اچھا نہیں۔ اسے بدلو۔ یہ قافیہ خوب ہے مگر اچھے پہلو سے نہیں بندھا۔ طبیعت پر زور ڈال کر کہو۔ جب وہ شخص پڑھ چکتا تو دوسرا پڑھتا۔ اور کوئی بول نہ سکتا تھا +

عجیب ڈھکوسلا

لکھنؤ کے امیرزادے جنھیں کھانے کے ہضم کرنے سے زیادہ کوئی کام دشوار نہیں ہوتا۔ ان کے وقت گزارنے کے لئے مصاحبوں نے ایک عجیب چورن تیار کیا۔ اُس سے معلوم ہوتا ہے کہ شیخ صاحب سے ایک جن کو محبت تھی۔ ان کا معمول تھا ورزش کے بعد صبح کو ایک بیسنی پراٹھا گھی میں ترتراتا کھایا کرتے تھے۔ اوّل اوّل ایسا ہوتا رہا کہ جب کھانے بیٹھتے پراٹھا برابر غائب ہوتا چلا جاتا۔ یہ سوچتے مگر کوئی بات سمجھ میں نہ آتی۔ بالاخانوں میں دروازہ بند کرکے اکیلے ورزش کیا کرتے تھے۔ ایک دن مگدر ہلا رہے تھے۔ دیکھتے ہیں۔ ایک شخص اور سامنے کھڑا مگدر ہلا رہا ہے حیران ہوئے بدن میں جوانی اور پہلوانی کا بل تھا۔ لپٹ گئے۔ تھوڑی دیر زور ہوتا رہا اسی عالم میں پوچھا کہ تو کون ہے؟ اُس نے کہا تمھاری ورزش کا انداز پسند آیا ہے اس لئے کبھی کبھی اِدھر آ نکلتا ہوں۔ اکثر کھانے میں بھی شریک ہوتا ہوں۔ مگر بغیر اظہار کے محبت کا مزا نہیں آتا۔ آج ظاہر کیا۔ اُس دن سے اُن کی اِن کی راہ ہو گئی اسی نے زہر کے راز سے بھی آگاہ کیا تھا۔ بعض اشخاص کہتے ہیں۔ پُرخوری کے سبب سے لوگ کہتے تھے کہ ان کے پیٹ میں جن ہے +

کسی کی نوکری نہیں کی

کسی کی نوکری نہیں کی۔ سرمایۂ خداداد۔ جوہر شناسوں کی قدردانی سے نہایت خوشحالی کے ساتھ زندگی بسر کی۔ پہلی دفعہ الہ آباد میں آئے ہوئے تھے جو راجہ چندو لال نے ۱۲ ہزار روپے بھیج کر بُلا بھیجا۔ انھوں نے لکھا کہ اب میں نے سید کا دامن پکڑا ہے اسے چھوڑ نہیں سکتا۔ یہاں سے جاؤں گا تو لکھنؤ ہی جاؤں گا

راجہ موصوف نے پھر خط لکھا بلکہ ۱۵ ہزار روپے بھیج کر بڑے اصرار سے کہا کہ یہاں تشریف لائیے گا تو ملک الشعراء خطاب دلواؤں گا۔ حاضریٔ دربار کی قید نہ ہوگی۔ ملاقات آپ کی خوشی پر رہے گی۔ اُنھوں نے منظور نہ کیا اور روپے آغا کلب حسین خاں صاحب کے پاس رکھوا دئے۔ جب ضرورت ہوتی منگوا لیتے اور اُن پر کیا منحصر ہے۔ نواب معتمد الدولہ اور اُن کے بیٹے ہمیشہ خدمت کو حاضر تھے۔ تحفے نذرانے جابجا سے آتے رہتے تھے۔ یہ بھی کھاتے اور کھلاتے ہی رہتے تھے۔ سادات۔ اہل حج۔ اہل زیارت کو دیتے تھے اور آزادی کے عالم میں جہاں جی چاہتا وہاں جا بیٹھتے۔ جس کے ہاں جاتے وہ اپنا فخر سمجھتے تھے +

سیاحی کی مسافت فیض آباد سے لکھنؤ اور وہاں سے الہ آباد۔ بنارس۔ عظیم آباد۔ پٹنہ تک رہی۔ چاہا تھا کہ شیخ علی حزیں کی طرح بنارس میں بیٹھ جائیں۔ چنانچہ الہ آباد سے وہاں گئے مگر اپنی ملت کے لوگ نہ پائے اس لئے دل برداشتہ ہوکر عظیم آباد گئے۔ وہاں کے لوگ نہایت مروّت اور عظمت سے پیش آئے۔ مگر اُن کا جی نہ لگا۔ گھبرا کر بھاگے اور کہا کہ یہاں میری زبان خراب ہو جائے گی۔ الہ آباد میں آئے۔ پھر شاہ اجملؒ کے دائرہ میں مرکز پکڑا اور کہا

آئی کہاں سے گردشِ پرکار پاؤں میں ۔۔۔ ہر پھر کے دائرہ ہی میں رکھتا ہوں میں قدم

لکھنؤ سے کیوں نکلے

لکھنؤ سے نکلنے کا سبب یہ ہوا تھا کہ غازی الدین حیدر کے عہد میں جب ان کی تعریفوں کی آوازیں بلند ہوئیں تو اُنھوں نے نواب معتمد الدولہ آغا میر وزیر سے کہا کہ اگر شیخ ناسخ ہمارے دربار میں آئیں اور قصیدہ سنائیں تو ہم اُنھیں ملک الشعرا خطاب دیں۔ معتمد الدولہ اُن کے باخلاص شاگرد تھے۔ جب یہ پیغام پہنچا تو انھوں نے بگڑ کر جواب دیا کہ مرزا سلیمان شکوہ[1] بادشاہ ہو جائیں تو وہ خطاب دیں۔ یا

[1] مرزا سلیمان شکوہ اکبر شاہ کے بھائی تھے۔ دلّی چھوڑ کر لکھنؤ جا رہے تھے۔ سرکار لکھنؤ کی بدولت شکوہ و شان سے زندگی بسر کرتے تھے +

گورنمنٹ انگلشیہ خطاب دے۔ ان کا خطاب لے کر میں کیا کروں گا۔ نواب کے مزاج میں کچھ وحشت بھی تھی۔ حسب الحکم شیخ صاحب کو نکلنا پڑا۔ اور چند روز الہ آباد میں جاکر رہے۔ نواب مرگئے تو پھر لکھنؤ میں آئے۔ چند روز کے بعد حکیم مہدی جن کے بزرگ کشمیری تھے۔ شاہ اودھ کی سرکار میں مختار تھے۔ وہ ایک بدگمانی میں معزول ہوکر نکلے۔ چونکہ وہ آغا میر کے رقیب تھے۔ شیخ صاحب نے تاریخ کہی جس کا مادہ ہے۔ ع

کاشو برائے پختن شلغم گریختہ

مشکل یہ کہ چند روز کے بعد وہ پھر بحال ہوکر آگئے۔ شاعر نے الہ آباد کو گریز کی۔ لیکن اکثر غزلوں سے معلوم ہوتا ہے کہ جب لکھنؤ سے جدا ہوئے تڑپتے اور دن ہی گنتے رہے۔ ایک شعر میں بھی لکھا ہے ؎

دشت سے کب وطن کو پہنچوں گا   کہ چھٹا اب تو سال آ پہنچا

حکیم مہدی کو دوبارہ زوال ہوا تو انھوں نے پھر تاریخ کہی (نیا انداز ہے اس لئے لکھتا ہوں) :۔

از جائے حکیم ہشت بر گیر   سہ مرتبہ نصف نصف کم کن ۱۲۳۹ھ

اب کی دفعہ جو آئے تو ایسے گھر میں بیٹھے کہ مر کر بھی نہ اُٹھے۔ گھر ہی میں دفن ہوئے۔ میر علی اوسط رشک اُن کے شاگرد رشید نے تاریخ کہی ع

دلا شعر گوئی اُٹھی لکھنؤ سے ۱۲۵۴ھ

لوگ کہتے ہیں ۶۴-۶۵ برس کی عمر تھی۔ مگر غمی سلمہ اللہ لکھتے ہیں کہ تقریباً سو برس کی عمر ہوگی اکثر عہد سلف کے معرکے اور نواب شجاع الدولہ کی باتیں آنکھوں سے دیکھی بیان کرتے تھے +

دیوانوں کی کیفیت

دیوان ۳ ہیں مگر دو مشہور ہیں۔ ایک الہ آباد میں مرتب کیا تھا۔ بے وطنی کا عالم۔ دل پریشان۔ غزلیں خاطر خواہ سر انجام نہ ہو سکیں اس لئے **دفتر پریشان** نام رکھا۔ ان میں غزلوں۔ رباعیوں۔ اور تاریخوں کے سوا اور قسم کی نظم نہیں۔ **قصائد** کا شوق

نہ تھا۔ چنانچہ نواب لکھنؤ کی تاریخ دتہنیت میں کبھی کچھ کہا ہے تو بطور قطعہ ہے۔
ھجو کے کانٹوں سے ان کا باغ پاک ہے +

ایک مثنوی حدیث مفصل کا ترجمہ ہے۔ میر علی اوسط رشک نے اسے ترتیب دیا اور اس کا تاریخی نام نظم سراج رکھا ہے۔ اور ایک مولود شریف بھی شیخ صاحب کی تصنیف ہے۔ عموماً کلام ان کا شاعری کے ظاہری عیبوں اور لفظی سقموں سے بہت پاک ہے۔ اور اس امر میں انھیں اتنی کوشش ہے کہ اگرچہ ترکیب کی چُستی یا کلام کی گرمی میں فرق آجائے مگر اصول ہاتھ سے جانے نہیں دیتے اور یہ سلاست روی قرین مصلحت ہے۔ کیونکہ نئے تصرف اور ایجاد انسان کو اکثر ایسے اعتراضوں کے نشانوں پر لا ڈالتے ہیں جہاں سے سرکنا بھی مشکل ہو جاتا ہے +

عیوب و اغلاط سے کلام بہت پاک ہے۔

غزلوں کا انداز

غزلوں میں شوکت الفاظ اور بلند پردازی اور نازک خیالی بہت ہے اور تاثیر کم۔ صائب کی تشبیہ و تمثیل کو اپنی صنعت میں ترکیب دے کر ایسی دستکاری اور مینا نگاری فرمائی کہ بعض موقع پر بیدل اور ناصر علی کی حد میں جا پڑے۔ اور اُردو میں وہ اس سے صاحب طرز قرار پائے۔ انھیں ناسخ کہنا بجا ہے۔ کیونکہ طرز قدیم کو نسخ کیا جس کا خود بھی اُنھیں فخر تھا +

تاریخیں قصیدہ

دیوان کے اخیر میں بہت سی تاریخیں ہیں اور اکثروں میں نہایت عُمدہ اور برجستہ مادّے نکالے ہیں۔ شوکت الفاظ کہتی ہے کہ اگر وہ قصیدہ کہتے تو خوب کہتے مگر افسوس کہ اس طرف توجہ نہ کی[1] +

نظم سراج کی نظم لوگوں کی رائے میں ان کے رُتبہ عالی سے گری ہوئی ہے اور چونکہ پابندی ترجمہ حدیث کی ہے اس لئے ان پر گرفت بیجا ہے۔ چند شعر

---

[1] اُردوئے معلّیٰ میں غالب مرحوم کا ایک خط مرزا حاتم علی مہر کے نام ہے اُس میں لکھا ہے۔ ناسخ مرحوم جو تمھارے اُستاد تھے میرے دوست صادق الوداد تھے مگر یک فنی تھی صرف غزل کہتے تھے۔ قصیدہ اور مثنوی سے انھیں کچھ علاقہ نہ تھا۔ اسی کتاب میں چودھری عبد الغفور کے خط میں چند شعر منتخب اساتذہ متقدمین کے لکھ کر تحریر کیا ہے۔ ناسخ کے ہاں کمتر اور آتش کے ہاں بیشتر یہ تیز نشتر ہیں +

نمونے کے طور پر یہیں :-

کی خدا نے جو یہ زبان عطا ہے بلا شک عطیۂ عظمیٰ
اس سے ہے مختلف مزوں کی تمیز اِس سے پاتے ہیں لذتِ ہر چیز
کوئی کڑوی ہے کوئی ہے میٹھی نمکین کوئی کوئی کھٹ میٹھی
کوئی اچھی ہے کوئی زشت وزبوں مزے سب چیزوں کے ہیں گوناگوں
سب مزوں سے زبان واقف ہے نہیں اسرار کی یہ کاشف ہے
جو نہ ہو یہ تو کچھ نہ ہو معلوم نہ ہو کوئی مزا کبھی مفہوم
اور بھی ہوتے ہیں زباں سے کام ہے مدد وقت بلع آب و طعام
اس سے احکام بہر دنداں ہے قوتِ تام بہر دنداں ہے

کوئی ناواقف شخص شایقِ کلام آتا تو چند بے معنی غزلیں بنا رکھی تھیں۔ ان میں سے کوئی شعر پڑھتے یا اُسی وقت چند بے ربط الفاظ جوڑ کر موزوں کر لیتے اور سناتے اگر وہ سوچ میں جاتا اور چپ رہ جاتا تو سمجھتے تھے کہ کچھ سمجھتا ہے اسے اور سناتے تھے۔ اگر اُس نے بے تحاشا تعریف کرنی شروع کر دی تو اسی طرح کے دو ایک شعر پڑھ کر چپکے ہو رہتے تھے :-

آدمی مخمل میں دیکھے موسے بادام میں ٹوٹی دریا کی کلائی زُلف اُلجھی دام میں
تونے ناسخ وہ غزل آج لکھی ہے کہ ہوا سب کو مشکل ید بیضا میں سخنداں ہونا

بلکہ اکثر خود سُناتے بھی نہ تھے۔ جب کوئی آتا اور شعر کی فرمایش کرتا تو دیوان اُٹھا کر سامنے رکھ دیتے تھے۔ اس میں سے دیکھ لیجئے۔ دو تین خوشنویس کاتب بھی نوکر رہتے تھے۔ دیوان کی نقلیں جاری تھیں۔ جس دوست یا شاگرد کو لایق اور شایق دیکھتے تھے اُسے عنایت فرماتے تھے +

شیخ صاحب اور خواجہ صاحب کا مقابلہ

انھوں نے اور ان کے ہمعصر خواجہ حیدر علی آتش نے خوبیٔ اقبال سے ایسا زمانہ پایا جس نے اُن کے نقش و نگار کو تصاویر مانی و بہزاد کا جلوہ دیا۔ ہزاروں صاحب فہم

دونوں کے طرفدار ہو گئے اور طرفین کو چمکا چمکا کر تماشے دیکھنے لگے۔ لیکن حق پوچھو تو اُن فتنہ انگیزوں کا دونوں کو احسان مند ہونا چاہئے کیونکہ روشنیٔ طبع کو اشتعال دیتے تھے +

اِن دونوں صاحبوں کے طریقوں میں بالکل اختلاف ہے۔ شیخ صاحب کے پیرو مضمون دقیق ڈھونڈتے ہیں۔ خواجہ صاحب کے معتقد محاورہ کی صفائی۔ کلام کی سادگی کے بندے ہیں اور شعر کی تڑپ اور کلام کی تاثیر پر جان قربان کرتے ہیں۔ اِن لوگوں کو شیخ صاحب کے کلام پر چند قسم کے اعتراض ہیں۔ اگرچہ اُن میں سے بعض باتوں میں سینہ زوری اور شدّت ہے۔ لیکن مورّخ کو ہر امر کا اظہار واجب ہے۔ اِس لئے قلم انداز بھی نہیں کر سکتا +

اوّل کہتے ہیں کہ شیخ صاحب کی اکثر نازک خیالیاں ایسی ہیں کہ کوہ کندن و کاہ برآوردن۔ چنانچہ اشعار مفصلۂ ذیل نمونۂ نازک خیالی ہیں +

میری آنکھوں نے تجھے دیکھ کے وہ کچھ دیکھا	کہ زبانِ مژہ پر شکوہ ہے بینائی کا
کُھل گیا ہم پر عناصر جب ہوئے بے اعتدال	رابطہ واجب ہے ممکن دوست و دشمن میں نہیں
کی خدائی کا فردوں پر اے صنم جنّت حرام	ورنہ کس کی آنکھ پڑتی تیرے ہوتے حُور پر
کوئے جاناں میں ہوں پر محروم ہوں دیدار سے	پائے خفتہ خندہ زن ہیں دیدۂ بیدار پر
وہ آفتاب نہ ہو کس طرح سے بے سایہ	ہوا نہ سر سے کبھی سایۂ سحاب جُدا

خواجہ صاحب کے معتقد کہتے ہیں کہ جن لوگوں نے غزل کے اصول کو سمجھا ہے یعنی فارسی میں خواجہ حافظ اور شیخ سعدی سے اور اُردو میں۔ سوز۔ میر۔ اور جرأت سے سند پائی وہ اسے غزل نہ کہیں گے۔ مگر یہ بات ایسی گرفت کے قابل نہیں۔ کیونکہ فارسی میں بھی جلال اسیر۔ قاسم مشہدی۔ بیدل اور ناصر علی وغیرہ اُستاد ہو گزرے ہیں جنھوں نے اپنے نازک خیالوں کی بدولت خیال بند۔ اور معنی یاب لقب حاصل کیا ہے۔ شیخ صاحب نے ان کی طرز اختیار کی تو کیا بُرا کیا۔ یہ بھی واضح ہو کہ جن لوگوں کی طبیعت میں ایسی

خیال بندیوں کا انداز پیدا ہوا ہے۔ اس کے کئی سبب ہوئے ہیں۔ اول یہ کہ بعض طبیعتیں ابتدا ہی سے پُرزور ہوتی ہیں۔ فکر ان کے تیز اور خیالات بلند ہوتے ہیں۔ مگر استاد نہیں ہوتا جو اس ہونہار بچھیرے کو روک کر نکالے اور اصول کی باگوں پر لگائے پھر اس خودسری سو ان کی آسودہ حالی اور بے احتیاطی زیادہ قوت دیتی ہے۔ جو کسی جوہر شناس یا سخن فہم کی پرواہ نہیں رکھتی۔ وہ اپنی تصویریں آپ کھینچتے ہیں اور آپ اُن پر قربان ہوتے ہیں بلکہ شوقین داد دینے والے جو کھوٹے کھرے کے پرکھنے والے ہیں اور حقیقت میں پسند عام کے وکیل بھی وہی ہیں۔ ان نازک خیالوں کو اُن کی بھی ضرورت نہیں ہوتی۔ کیونکہ اُن کی دولت مندی اپنے گھر پر اپنا دربار الگ لگاتی ہے جس میں بعض اشخاص وقت پسندی اور باریک بینی میں اُن کے ہم مزاج ہوتے ہیں۔ بعض فقط باتوں ہی میں خوش کر دینے کا شوق رکھتے ہیں۔ بعض کو اپنی گرہ کی عقل نہیں ہوتی۔ جس طرف لوگوں کو دوڑتے دیکھا آپ بھی دوڑنے لگتے ہیں۔ غرض ایسے ایسے سبب ہوتے ہیں جو بھلے چنگے آدمی کی آنکھوں پر پٹی باندھ کر خود پسندی کے ناہموار میدانوں میں ڈھکیل دیتے ہیں ؛

غزلی فارسی کے سنگین لفظوں کا بوجھ غزل نہیں اُٹھا سکتی

دوسرا اعتراض اُن کے حریفوں کا اُن سخت اور سنگین الفاظ پر ہے جن کے بھاری وزن کا بوجھ غزل کی نزاکت و لطافت ہرگز برداشت نہیں کر سکتی - اور کلام بھدا ہو جاتا ہے۔ چنانچہ کچھ اشعار اس قبیل کے بھی لکھے جاتے ہیں :-

بے خطر یوں ہاتھ دوڑاتا ہوں زلفِ یار پر
دوڑتا تھا جس طرح ثعبانِ موسیٰ مار پر

تو وہ خورشید ہے اُلٹے جو گلستاں میں نقاب
چہرۂ گل میں تلون ہو دہی حربا کا

برنگ گل جگر ہوتا ہے ٹکڑے سیر گلشن میں
ہوا ہے تیر غم بے یار نظارہ سپر غم کا

آگے مجھ کامل کے ناقص ہے کمالِ مدعی
درمیاں ہے فرق استدراج اور اعجاز کا

مل گیا ہے عشق کا آزار قسمت سے مجھے
ہوں جو عیسیٰ بھی ارادہ ہو نہ استعلاج کا

انڈا کھٹک کے نکلی ہے باہر تو کیا ہوا
بلبل کو جسم بیضۂ فولاد ہو گیا

ناسخ تمام رجس تناسخ سے پاک ہے
وہ شمع ہو گیا تو وہ پروانہ ہو گیا

قمر ہی کیا ترے آگے محاق میں آیا	کہ آفتاب بھی تو احتراق میں آیا
سوئے کعبہ نہیں عاشق سجدہ کرتے ہیں کوئی	تیرے ابرو کی طرف قبلہ محوّل ہو گیا
باعثِ گریہ ہوئی فرقت میں مجھ کو مے کشی	ساقیا اشکوں سے مے کا استحالہ ہو گیا
بڑا اشکال ہے ناسخ غم عالم فراہم کر	ارادہ ہے اگر اے چرخ اس کی میہمانی کا
نہ باطل خشک زاہد ہے نہ عاطل رند تر دامن	خدا نے اپنی حکمت سے کیا ہے خشک و تر پیدا
کسی حالت میں مجھے ہوش سے کچھ کام نہیں	چڑھ گئے ابخرے نشہ کے جو سودا اترا
آغاز خط میں آژدرِ فرعون ہے جو زلف	افسونِ خطِ مارہی افسانہ ہو گیا
غیر کوثر کسی دریا کا میں سیاح نہیں	بیشۂ شیرِ خدا بن کہیں سیاح نہیں
ہے ہوس ہم سے لے یار کرے غیر کو ترک	مطلب اپنا ہے وہ جو قابل انجاح نہیں
ظلم طولِ شبِ فرقت کے تطاول نے کیا	داد رس کوئی بجز فالق الاصباح نہیں
روشنائی سے ہوئی روشنئ خلوتِ فکر	جز قلم اور مری بزم میں مصباح نہیں
بال توڑے تری زلفوں کے نہ بیدردی سے	حس مرے ہاتھ کی مانند ہو گر شانہ میں

خیال بند طبّاع اور مشکل پسند لوگ اپنے خیالوں میں مست رہتے ہیں مگر چونکہ فیض سخن خالی نہیں جاتا اور مشق کو بڑی تاثیر ہے۔ اس لئے مشکل کلام میں بھی ایک لطف پیدا ہو جاتا ہے جس سے اُن کے اور اُن کے طرفداروں کے دعووں کی بنیاد قائم ہو جاتی ہے۔

تہیلسمی سُے۔ ان کے حریف کہتے ہیں کہ شیخ صاحب بھی خیال بندی اور دشوار پسندی کی قباحت کو سمجھ گئے تھے۔ اور اخیر کو اس کوچہ میں آنا پسند نہ کرتے تھے۔ انہی دنوں کا ایک مطلع شیخ صاحب کا ہے۔ خواجہ صاحب کے سامنے کسی نے پڑھا اور انھوں نے لطف زبان کی تعریف کی:۔

جنوں پسند ہے مجھ کو ہوا بگولوں کی	عجب بہار ہے ان زرد زرد پھولوں کی

مگر اوّل تو طبیعت کی مناسبت۔ دوسرے عمر بھر کی وہی مشق تھی۔ اس لئے جب

صفائی کے کوچہ میں آتے ہوئے بھسپنڈے ہو جاتے ہیں۔

محاورہ کے کوچہ میں آکر صاف صاف کہنا چاہتے تھے تو پھس پھسی بندشس اور بھسپنڈے الفاظ بولنے لگتے تھے۔ چنانچہ اُس کی سند میں اکثر اشعار پیش کرتے ہیں جن میں سے چند شعر یہ ہیں:-

ناک رگڑے ہر گھڑی کیونکر نہ اُس کے سامنے — بدلے نتھنی کے سلیماں کی ہے خاتم ناک میں
رنگ لالہ میں اگر ہے تو نہیں نام کو بو — یاسمن میں ترے پنڈے سی ہے بو رنگ نہیں
ساقی بغیر مے یہ لہو تھوکتا نہیں — منہ سے شراب وصل نکلتی ہے ہجر میں
کیا ہی حاسد ہے فلک جس نے کہ نوبت پائی — دم میں مانند حباب اس نے نقارہ توڑا

تصرفات قادر الکلامی

ان کے حریفوں کو اس لفظ پر بھی اعتراض ہے کیونکہ **نقّارہ** مشدد ہے۔ تخفیف کے ساتھ نہیں آیا۔ اور جب ان سے کہا گیا کہ **نظّارہ** بھی بہ تشدید ہے مگر تخفیف کے ساتھ فارسی اور ریختہ میں آیا ہے۔ تو انھوں نے کہا کہ غیر زبان کے لفظ میں قیاس نہیں چل سکتا۔ اہل زبان کی سند دینی چاہیے۔ منصفوں کے نزدیک یہ بھی ان کی سینہ زوری ہے +

نظامی۔ بزد دن جشن نوروزی نقارہ — گلوئے خویش کردہ پارہ پارہ

مجھ سے رہتا ہے رمیدہ وہ غزال شہری — صاف سیکھا ہے چلن آہوئے صحرائی کا

غزال شہری کے لئے فارسی کی سند چاہیے کیونکہ وحشی کے مقابلہ میں اہلی بولتے ہیں شہری نہیں بولتے مگر اسے فارسی کے کوچہ میں نہیں ڈالنا چاہیے بلکہ اُردو کے قادر الکلام کا تصرف سمجھنا چاہیے +

ذبح وہ کرتا تو ہے پر چاہیے اے مرغ دل — دم پھڑک جائے تڑپنا دیکھ کر صیاد کا

یہ تعقید نہایت بے طور واقع ہوئی ہے۔ ان کے حریف اِس قسم کے اشعار اور بھی بہت پڑھتے ہیں مگر ان جزوی باتوں پر توجہ بے حاصل ہے۔ اس لئے اشعار مذکور قلم انداز کئے گئے +

تصوف کا رنگ

ان کے کلام میں تصوف بھی ہے۔ مگر اس کا رستہ کچھ اور ہے جس سے وہ واقف نہیں +

تو بھی آغوشِ تصور سے جُدا ہوتا نہیں	اے صنم جس طرح دور اک دم خدا ہوتا نہیں
بحرِ وحدت میں ہوں میں۔ گو مر گیا مثلِ حُباب	چوب کیا تلوار سے پانی جُدا ہوتا نہیں
نشۂ عرفاں نہیں جب تک دلا ہے قیل و قال	تا نہ ہو لبریز ساغر بے صدا ہوتا نہیں
اسرارِ نہاں آتے ہیں سینہ سے زباں پر	اب سدِ سکندر کر دل تعمیر گلے میں
ہے یہ وہ راہ کہ تا عرش پہنچتا ہے بشر	دل میں دروازہ ہے اس گنبدِ مینائی کا
عارفوں کو ہر در و دیوار ادب آموز ہے	مانعِ گردن کشی ہے اِنحنا محراب کا
مظہرِ وہ بت ہے نورِ خدا کے ظہور کا	نقشِ قدم سے سنگ کو رُتبہ ہے طور کا

میر قربا تو ارد — حریف یہ بھی حرف رکھتے ہیں کہ شیخ ناسخ مخلوق فارسی کو تناسخ دے کر اردو کی زندگی دیتے تھے +

مِسی مالیدہ لب پر رنگِ پاں ہے	تماشا ہے تہِ آتش دھواں ہے
بیدل — مسی آلودہ بر لب رنگِ پان است	تماشا کن تہِ آتش دخان است
شیخ صاحب — ناتوانی سے گراں سرمہ ہے چشمِ یار کو	جس طرح ہو رات بھاری مردمِ بیمار کو
ناصر علی — گویند کہ شب بر سرِ بیمار گران است	گر سرمۂ چشمِ تو گران است ازان است
سیہ بختی میں کوئی کب کسی کا ساتھ دیتا ہے	کہ تاریکی میں سایہ بھی جُدا رہتا ہے انساں سے

کسی اُستاد کا شعر فارسی میں ہے :-

بروزِ بیکسی کس نیست غیر از سایہ یارِ من	مگر آنہم ندارد طاقتِ شبہائے تارِ من
ناسخ صاحب — فرق ہے شاہ و گدا میں قولِ شاعر سے یہی	شیرِ قالیں اور ہے شیرِ نیستاں اور ہے
شیخ علی حزیں — بوریا جائے من و جائے تو نگر قالیں	شیرِ قالیں دگر و شیرِ نیستاں دگر است

میر تقی مرحوم اور بقا میں دو آبے کے مضمون پر جو دو دو لطیفے ہوئے۔ میر صاحب کے حال میں لکھے گئے۔ میں سمجھتا تھا کہ شیخ ناسخ نے الہ آباد میں بیٹھ کر اس میں سے یہ مضمون تراشا ہوگا۔ صفحہ ۲۲۲ +

ایک تربینی ہے دو آنکھیں مری	اب الہ آباد بھی پنجاب ہے

لیکن غیاث الدین بلبن بادشاہ دہلی کا بیٹا یعنی محمد سلطان جب لاہور کے باہر
راوی کے کنارے پر ترکان تاتاری کی لڑائی میں مارا گیا تو امیر خسرو نے اس کا
مرثیہ ترکیب بند میں لکھا ہے اس میں کہتے ہیں :۔

بسکہ آب چشم خلقے شد رواں در چار سو   زیج آبے دیگر اندر مولتاں آمد پدید

کہتے ہیں کہ خواجہ صاحب نے انھیں باتوں پر چوٹ کر کے کہا ہے :۔

مضموں کا چور ہوتا ہے رسوا جہان میں   چکھی خراب کرتی ہے مالِ حرام کی

اگرچہ اس طرح کے چند اشعار اور بھی سُننے جاتے ہیں مگر ایسا صاحب کمال جس کی
تصنیفات کمال نازک خیالی اور مضامین عالی کے ساتھ ایک مجلد ضخیم موجود ہے
اس پر سرقہ کا الزام لگانا انصاف کی آنکھوں میں خاک ڈالنی ہے۔ سودا اور میر کے
اشعار جن اُستادوں کے شعروں سے لڑ گئے ہیں وہ لکھے گئے۔ جو اُن کی طرف سے
جواب ہے وہی ان کی طرف سے سمجھیں۔ میری رائے میں یہ دونوں حریف اور ان کے
طرفدار کوئی قابل الزام نہیں۔ کیونکہ دونوں طرفوں میں کوئی کمال سے خالی نہیں
تھا۔ البتہ طبیعتیں مختلف ہوتی ہیں اس لئے پسند میں اختلاف ہے۔ کہنے والے
چاہیں سو کہیں +

انھی نازک خیالیوں میں جو صاف شعر بھی زبان سے نکل گیا ہے ایک تیر ہے
کہ نشانہ کے پار جا کر اُڑا ہے اٹک کر ترازو بھی نہیں ہوا +

سیکڑوں آہیں کروں پر دخل کیا آواز کا   تیر جو دیوے صدا ہے نقص تیرانداز کا

ترچھی نظروں سے نہ دیکھو عاشقِ دلگیر کو   کیسے تیرانداز ہو سیدھا تو کرلو تیر کو

اِس انداز کے شعر بھی ان کے دیوانوں میں ڈھونڈو تو بہت پاؤ گے +

شیخ صاحب کے کلام میں نمک ظرافت کا چٹخارہ بہت ہے۔ چنانچہ زاہد اور
ناصح جو شعرائے اُردو اور فارسی کے لئے ہر جگہ رونق محفل ہیں۔ یہ اُن سے بھی
ہنس کر دل نہیں بہلاتے اور اگر اتفاقاً ہے تو ایسا ہے کہ وہ ہنسنا زہر خندہ معلوم ہوتا ہے +

ہجو یا ظرافت

حرص سے زاہد یہ کہتا ہے جو گر جائیں گے دانت کیا کشادہ بہر رزق اپنا دہاں ہو جائے گا

دیکھیو ناسخ سرِ شیخ معمم کی طرف کیا کلس مسواک کا ہے گنبدِ دستار پر

سودا کی غزل ہے "جرس ہووے اگر ہووے۔ قفس ہووے اگر ہووے"۔ اس کا شعر دیکھو کہ وہ اسی بات کو کس چوچلے سے کہتا ہے :-

سودا — نہیں شایان زیب گنبد دستار کچھ زاہد مگر مسواک ہی اس پر کلس ہووے اگر ہووے

شیخ صاحب — زاہد اب کہ رمضاں میں میں پڑھوں خاک نماز سوئے قبلہ تو خنازیر کھڑے رہتے ہیں

واہ کیا پیرِ مغاں کا ہے تصرف مے کشو محتسب کا اب سخن تکیہ ہی مُل مُل ہو گیا

عابد و زاہد چلے جاتے ہیں پیتا ہے شراب اب تو ناسخ زور رندِ لاابالی ہو گیا

اہل تزویر سے اس درجہ ہے نفرت مجھ کو کہ مجھے قافیۂ زُور سے کچھ کام نہیں

اکثر مذہبی تعریضیں کر جاتے تھے — شیخ صاحب کا مذہب پہلے سنت جماعت تھا۔ پھر مذہب شیعہ اختیار کیا۔ وہ اکثر غزلوں میں مذہبی تعریضیں کرتے تھے اور یہ شاعر یا عام مصنف کے لئے نازیبا ہیں ہاں کوئی اپنے تائید مذہب میں کتاب لکھے تو اس میں دلائل و براہین کے قبیل سے جو چاہے کہے مضایقہ نہیں +

وہ بہت خوش اخلاق تھے مگر اپنے خیالات میں ایسے محو رہتے تھے کہ ناواقف شخص خشک مزاج یا بددماغ سمجھتا تھا۔ سید مہدی حسن فراغ مرحوم میاں بیتاب کے شاگرد تھے اور زبان ریختہ کے کہن سال مشاق تھے۔ نقل فرماتے تھے کہ ایک دن میں شیخ صاحب کی خدمت میں گیا۔ دیکھا کہ چوکی پر بیٹھے نہا رہے ہیں۔ آس پاس چند احباب مونڈھوں پر بیٹھے ہیں۔ میں سامنے جا کر کھڑا ہوا اور سلام کیا۔ انھوں نے ایک آواز سے کہ جو ان کے بدن سے بھی فربہ تھی فرمایا کہ کیوں صاحب کس طرح تشریف لانا ہوا؟ میں نے کہا کہ ایک فارسی کا شعر کسی استاد کا ہے اس کے معنی سمجھ میں نہیں آتے۔ فرمایا کہ ہم فارسی کا شاعر نہیں۔ اتنا کہہ کر اور شخص سے باتیں کرنے لگے۔ میں اپنے جانے پر بہت پچھتایا اور اپنے تئیں ملامت کرتا چلا آیا +

لطیفہ۔ ایک دن کوئی شخص ملاقات کو آئے۔ یہ اُس وقت چند دوستوں کو لئے انگنائی میں کرسیوں پر بیٹھے تھے۔ شخص مذکور کے ہاتھ میں چھڑی تھی۔ اور اتفاقاً پاؤں کے آگے ایک مٹی کا ڈھیلا پڑا تھا۔ وہ شغل بیکاری کے طور پر جیسے کہ اکثر اشخاص کو عادت ہوتی ہے آہستہ آہستہ لکڑی کی نوک سے ڈھیلے کو توڑنے لگے شیخ صاحب نے نوکر کو آواز دی۔ سامنے حاضر ہوا۔ فرمایا کہ میاں! ایک ٹوکری مٹی کے ڈھیلوں کی بھرکر اُن کے سامنے رکھ دو کہ دل لگا کر شوق پورا کریں +

لطیفہ۔ شاہ غلام[1] اعظم افضل اُن کے شاگرد اکثر حاضر خدمت ہوتے تھے۔ ایک دن آپ تخت پر بیٹھے تھے۔ اس پر سیتل پاٹی کا بوریا بچھا تھا۔ افضل آئے وہ بھی اُسی پر بیٹھ گئے اور سیتل پاٹی کا ایک تنکا توڑ کر چٹکی سے توڑنے اور مروڑنے لگے۔ شیخ صاحب نے آدمی کو بُلا کر کہا کہ بھائی وہ جو آج ہی جھاڑو تم بازار سے لائے ہو۔ ذرا لے آؤ۔ اُس نے حاضر کی۔ خود لے کر شاہ صاحب کے سامنے رکھ دی اور کہا کہ صاحبزادے اس سے شغل فرمائیے۔ فقیر کا بوریا آپ کے تھوڑے سے التفات میں برباد ہو جائے گا۔ اور سیتل پاٹی اس شہر میں کہاں ڈھونڈتا پھرے گا۔ وہ بیچارے شرمندہ ہو کر رہ گئے +

لطیفہ۔ آغا کلب عابد خاں صاحب فرماتے تھے کہ ایک دفعہ شیخ صاحب کے واسطے کسی شخص نے دو تین چمچے بطریق تحفہ بھیجے کہ شیشہ کے تھے۔ ان دنوں میں نیا ایجاد سمجھے جاتے تھے اور حقیقت میں بہت خوشنما تھے۔ وہ پہلو میں طاق پر رکھے تھے۔ ایک امیر صاحبزادے آئے۔ اُس طرف دیکھا اور پوچھا کہ حضرت چمچہ کہاں سے خریدے اور کس قیمت کو خریدے۔ شیخ صاحب نے حال بیان کیا۔ اُنھوں نے ہاتھ بڑھا کر ایک چمچہ اُٹھا لیا۔ دیکھ کر تعریف کی۔ پھر باتیں کرتے رہے اور چمچہ سے زمین پر کھٹکا دے کر شغل بے شغلی فرماتے رہے۔ شیشہ کی کیا بساط تھی۔ ٹھیس زیادہ لگی۔

[1] شاہ محمد اجمل کے پوتے شاہ ابوالعلائی تھے۔ ان کے بیٹے شاہ غلام اعظم افضل تخلص ہوئے۔ [2] دیکھو صفحہ ۱۸۳ ۔

جھٹ سے دو ٹکڑے۔ شیخ صاحب نے دوسرا چمچہ اُٹھاکر سامنے رکھ دیا اور کہاکہ اب اس سے شغل فرمائیے +

لطیفہ۔ ایک دن اپنے خانہ باغ کے بنگلے میں بیٹھے اور فکر مضمون میں غرق تھے۔ ایک شخص آکر بیٹھے۔ ان کی طبیعت پریشان ہوئی۔ اُٹھ کر ٹہلنے لگے کہ اُٹھ جائیں۔ ناچار پھر آبیٹھے مگر وہ نہ اُٹھے۔ کسی ضرورت کے بہانے سے پھر گئے کہ سمجھ جائیں گے وہ پھر بھی نہ سمجھے۔ اُنھوں نے چلم میں سے چنگاری اٹھاکر بنگلہ کی ٹٹی میں رکھ دی اور آپ لکھنے لگے ٹٹی جلنی شروع ہوئی۔ وہ شخص گھبراکر اُٹھے۔ اور کہاکہ شیخ صاحب آپ دیکھتے ہیں؟ کیا ہورہا ہے۔ انھوں نے ان کا ہاتھ پکڑ لیا کہ جاتے کہاں ہو اب تو مجھے اور تمھیں راکھ کا ڈھیر ہونا ہے۔ تم نے میرے مضامین کو خاک میں ملایا ہے۔ میرے دل کو جلاکر خاک کیا ہے اب کیا میں تمھیں جانے دوں گا +

لطیفہ۔ اسی طرح ایک شخص نے بیٹھ کر اُنھیں تنگ کیا نوکر کو بلاکر صندوقچہ منگایا۔ اس میں سے مکان کے قبلے نکال کر ان کے سامنے دھردئے اور نوکر سے کہا کہ بھائی مزدوروں کو بلاؤ اور اسباب اُٹھاکے لے چلو۔ ادھر وہ شخص حیران اُن کا مُنہ دیکھے۔ ادھر نوکر حیران۔ آپ نے کہا دیکھتے کیا ہو۔ مکان پر تو یہ قبضہ کرچکے ایسا نہ ہو کہ اسباب بھی ہاتھ سے جاتا رہے +

شیخ صاحب کے مزاج میں یہ صفتیں تھیں مگر بنیاد ان کی فقط نازک مزاجی پر تھی۔ نہ غرور یا بدنیتی پر جس کا انجام بدی تک پہنچے۔ نازک مقام آپہنچا تو اس طرح تحمل کرکے ٹال جاتے تھے کہ اوروں سے ہونا مشکل ہے +

نقل۔ ایک نواب صاحب کے ہاں مشاعرہ تھا وہ اُن کے معتقد تھے اُنھوں نے ارادہ کیا کہ شیخ صاحب جب غزل پڑھ چکیں تو اُنھیں سرِ مشاعرہ خلعت دیں۔ یاروں نے خواجہ صاحب کے پاس مصرع طرح نہ بھیجا۔ اُنھیں اُس وقت مصرع پہنچا جب ایک دن مشاعرہ میں باقی تھا۔ خواجہ صاحب بہت خفا ہوئے اور کہاکہ اب لکھنؤ رہنے کا مقام

نہیں۔ ہم نہ رہیں گے۔ شاگرد جمع ہوئے اور کہا کہ آپ کچھ خیال نہ فرمائیں۔ نیازمند
حاضر ہیں۔ دو دو شعر کہیں گے تو صدہا شعر ہو جائیں گے۔ وہ بہت تُندمزاج تھے۔
ان سے بھی وہی تقریریں کرتے رہے۔ شہر کے باہر چلے گئے۔ پھرتے پھرتے ایک
مسجد میں جا بیٹھے۔ وہاں سے غزل کہہ کر لائے اور مشاعرہ میں گئے تو ایک قرابین
بھی بھر کر لیتے گئے۔ بیٹھے ایسے موقع پر کہ عین مقابل شیخ صاحب کے تھے۔
اوّل تو آپ کا انداز ہی بانکے سپاہیوں کا تھا۔ اس پر قرابین بھری سامنے رکھی
تھی۔ اور معلوم ہوتا تھا کہ خود بھی بھرے بیٹھے ہیں۔ بار بار قرابین اٹھاتے تھے اور رکھ دیتے تھے
جب شمع سامنے آئی تو سنبھل کر سامنے ہو بیٹھے۔ اور شیخ صاحب کی طرف اشارہ کر کے پڑھا ؎

سُن تو سہی جہاں میں ہے تیرا فسانہ کیا کہتی ہے تجھ کو خلقِ خدا غائبانہ کیا

اِس ساری غزل میں کہیں ان کے لے پالک ہونے پر۔ کہیں ذخیرۂ دولت پر کہیں ان کے
سامان امارت پر۔ غرض کچھ نہ کچھ چوٹ ضرور ہے۔ شیخ صاحب بیچارے دم بخود بیٹھے
رہے۔ نواب صاحب ڈرے کہ خدا جانے یہ اُن پر قرابین خالی کریں یا میرے پیٹ
میں آگ بھر دیں۔ اسی وقت داروغہ کو اشارہ کیا کہ دوسرا خلعت خواجہ صاحب کے
لئے تیار کرو۔ غرض دونوں صاحبوں کو برابر خلعت دے کر رخصت کیا +

رعمی سلمہ اللہ فرماتے ہیں کہ مدتوں لکھنؤ میں رہنا ہوا میں نے کبھی چاند اور سورج
کا طلوع ایک مطلع میں سے نہ دیکھا۔ ہمیشہ مشاعرہ میں پہلو بچاتے تھے۔ خواجہ صاحب
نواب سید محمد خاں رند اور صاحب مرزا شناور کے مشاعرہ میں جایا کرتے تھے ادھر
مرزا محمد رضا برق کے ہاں مشاعرہ ہوتا تھا۔ شیخ صاحب اپنی غزل بھیج دیتے تھے۔
جب جلسہ جمتا تو برق کے شاگرد میاں طور سب سے پہلے غزل مذکور کو لے کر کہتے۔
صاحبو! ہمہ تن گوش باشید۔ یہ غزل استاد الاستاد شیخ ناسخ کی ہے۔ تمام اہل مشاعرہ
چُپ چاپ ہو کر متوجہ ہو جاتے۔ ان کی غزل کے بعد اور شعرا پڑھتے تھے +

برخلاف عادت شعراء کے ان کی طبیعت میں سلامت روی کا جوہر تھا۔ چنانچہ ایک دفعہ

سیّد محمد خاں رند کی اپنے استاد خواجہ حیدر علی آتش سے شکر رنجی ہوگئی۔ چاہا کہ ناسخ کی شاگردی سے استادِ سابق کے تعلق کو فسخ کریں۔ مرزا محمد رضا برق کے ساتھ شیخ صاحب کے پاس آئے۔ مرزا صاحب نے اظہار مطلب کیا۔ شیخ صاحب نے تامّل کے بعد کہا کہ نواب صاحب دس برس سے خواجہ صاحب سے اصلاح لیتے ہیں۔ آج اُن سے یہ حال ہے تو کل مجھے اُن سے کیا اُمید ہے۔ علاوہ براں آپ خواجہ صاحب سے کچھ سلوک بھی کرتے ہیں۔ وہ سلسلہ قطع ہو جائے گا اُس کا وبال کدھر پڑے گا۔ اور مجھے اُن سے یہ تمنّا نہیں۔ میری دانست میں بہتر ہے کہ آپ ہی ان دونوں صاحبوں کی صلح کروا دیں۔ اور اِس امر میں اس قدر تاکید کی کہ پھر آپس میں صفائی ہوگئی۔

اگرچہ ان کے کلاموں اور حکایتوں سے معلوم ہوتا ہے کہ طبیعت میں شوخی اور رنگینی نہ تھی۔ مگر شاعری کا وہ نشہ ہے کہ اپنے رنگ پر لے ہی آتا ہے۔ چنانچہ میر گھسیٹا نام ایک شخص مرگئے تو شیخ صاحب نے تاریخ فرمائی :۔

جب میر گھسیٹا مرگئے ہائے — ہر ایک نے اپنے مُنہ کو پیٹا
ناسخ نے کہی یہ سُن کے تاریخ — افسوس کہ موت نے گھسیٹا

زے طبع منصف

نقل۔ اُن کے مزاج میں منصفی اور حق شناسی کا اثر ضرور تھا۔ چنانچہ الٰہ آباد میں ایک دن مشاعرہ تھا۔ سب موزوں طبع طرحی غزلیں کہہ کر لائے۔ شیخ صاحب نے جو غزل پڑھی مطلع تھا ؎

دل اب محوِ ترسا ہوا چاہتا ہے — یہ کعبہ کلیسا ہوا چاہتا ہے

ایک لڑکے نے صف کے پیچھے سے سر نکالا۔ بھولی بھالی صورت سے معلوم ہوتا تھا کہ سحر کر میں غزل پڑھنے سے ڈرتا ہے۔ لوگوں کی دلدہی نے اُس کی ہمّت باندھی پہلا ہی مطلع تھا :۔

دل اُس بُت پہ شیدا ہوا چاہتا ہے — خدا جانے اب کیا ہوا چاہتا ہے

محفل میں دھوم مچ گئی۔ شیخ ناسخ نے بھی تعریف کر کے لڑکے کا دل بڑھایا اور کہا کہ

بھائی یہ فیضان الٰہی ہے۔ اس میں اُستادی کا زور نہیں چلتا۔ تمھارا مطلع مطلع آفتاب ہے۔ اپنا پہلا مصرع غزل میں سے نکال ڈالوں گا +

شاہ نصیر کا مطلع ہمیشہ پڑھا کرتے تھے اور کہتے تھے نصیر تخلص نہ ہوتا تو یہ مطلع نصیب نہ ہوتا۔

خیالِ زلفِ دوتا میں نصیر پیٹا کر — گیا ہے سانپ نکل اب لکیر پیٹا کر

ایک دن کسی سوداگر کی کوٹھی میں گئے۔ سوداگر بچہ کہ دولتِ حسن کا بھی سرمایہ دار تھا۔ سامنے لیٹا تھا مگر کچھ سوتا کچھ جاگتا۔ آپ نے دیکھ کر فرمایا ع

ہے چشمِ نیم باز عجب خوابِ ناز ہے

یہ مصرع تو ہو گیا مگر دوسرا مصرع جیسا جی چاہتا تھا ویسا نہ ہوتا تھا۔ گھر آئے اسی فکر میں غرق تھے کہ خواجہ وزیر آ گئے اُنھوں نے خاموشی کا سبب پوچھا۔ شیخ صاحب نے بیان فرمایا۔ اتفاق ہے کہ اُن کی طبیعت لڑ گئی ؎

ہے چشمِ نیم باز عجب خوابِ ناز ہے — فتنہ تو سو رہا ہے درِ فتنہ باز ہے

شیخ صاحب بہت خوش ہوئے +

ایک دن وزیر اپنے شاہِ سخن کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ مزاج پرسی فرما کر عنایت و محبت کی باتیں کرنے لگے اور کہا کہ آج کل کچھ فکر کیا؟ عرض کی کہ وردو وظیفہ سے فرصت نہیں ہوئی آپ نے پھر ارشاد فرمایا۔ اُنھوں نے مطلع پڑھا:۔

وہ زلف لیتی ہے تابِ دل و تواں اپنا — اندھیری رات میں لُٹتا ہے کارواں اپنا

بہت خوش ہوئے اُس وقت ایک عمدہ تسبیح عقیق البحر کی ہاتھ میں تھی وہ عنایت فرمائی خواجہ وزیر پر بڑی عنایت تھی اور قدر و منزلت فرماتے تھے۔ سب شاگردوں میں اُن کا نمبر اوّل تھا۔ پھر برق، رشک وغیرہ وغیرہ +

ناسخ۔ کلیات سے معلوم ہوتا ہے کہ آٹھ پہر اسی فکر میں غلطاں و پیچاں رہتے تھے۔ چنانچہ جن دنوں شاہ اجمل کے دائرہ میں تشریف رکھتے تھے تو وہاں تین گھرانے بابرکت

اور صاحب دستگاہ تھے۔ تینوں جگہ سے وقت معمولی پر کھانا آتا تھا۔ ایک خوان بلکہ دسترخوان شاہ ابوالمعالی کی سرکار سے آتا تھا۔ اس میں ہر قسم کے امیرانہ اور عمدہ کھانے موجود ہوتے تھے۔ ایک خوان سید علی جعفر کے ہاں سے آتا تھا کہ شاہ ابوالمعالی کی بہن اُن سے منسوب تھیں۔ ایک خوان شاہ غلام حیدر صاحب کے ہاں سے آتا تھا۔ اس پر بھی اپنا بورچی خانہ الگ گرم ہوتا تھا۔ جس چیز کو جی چاہتا تھا پکواتے تھے۔ دسترخوان پردہ بھی شامل ہو جاتا تھا۔ ایک دن بورچی سے خاگینہ کی فرمایش کی تھی۔ اس میں کوئی سنپولیا گرا ہوگا۔ چونکہ دوبارہ یہ حرکت کی تھی۔ آپ نے تاریخ کہدی۔ تاریخ

جاں بلب آمد مرا از غفلتِ طبّاخ آہ	می پزد خاگینہ با مارِ کریہ از بہر من
چوں دگر بارہ خطا بنمود سالِ عیسوی	گفت دل مارِ سیہ پُخت ایں سفیہ از بہر من

۱۸۳۱ء میں معتمد الدولہ آغا میر نے جو سوا لاکھ روپیہ قصیدہ کا صلہ دیا تھا۔ انھوں نے مرزائی صاحب کے حوالہ کر دیا تھا۔ لوگوں نے جانا اُن کے گھر ہی میں ہے۔ چور نے رات کو نقب لگائی اور ناکام گیا۔ آپ نے فرمایا۔ تاریخ

دُزد در خانۂ ناسخ چو زدہ نقب امشب	نہ زر و سیم نہ بُد مس۔ خجل آمد بیروں
بہر تاریخ مسیحی۔ چو بُریدم سرِ دُزد	دُزد از خانۂ مفلس خجل آمد بیروں

بات بات پر تاریخ کہتے تھے۔ بخار سے صحت پائی تاریخ کہی۔ رفت تپ نو بہ من ۱۲۳۵ھ غسل صحت کیا تو کہا ع شود صحت ہمایوں و مبارک۔ ۱۲۳۵ھ

ایک موقع پر قتل ہوتے ہوتے بچ گئے۔ کہا۔ کنم شکر خدا۔ ۱۲۳۵ھ

حریفوں نے نظر بند کرا دیا تو کہا۔ ع ہے ہے افسوس خانہ زنداں گردید۔ جس بزرگ کی سفارش سے چھوٹے اُس کا تاریخی شکریہ کہا ع رہانیدی مرا از دستِ گرگے کسی نے خطوط چُرا لئے تو کہا ع سیاہ ہمچو قلم باد روے حاسدِ من۔ پھر چار خط جاتے رہے۔ تاریخ کہی ع صد حیف تلف چہار نامہ ✣

لہ الہ آباد میں دائرہ کے پھاٹک میں بیٹھے تھے۔ چھت میں سے سانپ گر پڑا اُس کی تاریخ کہی ع سیہ مار از فلک بر من بیفتاد ✣

پیارے شاگرد خواجہ وزیر کا بیاہ ہوا تو فرمایا ع شد نوشہ وزیرِ من امروز۔ پھر اُن کے ہاں لڑکا پیدا ہوا تو صبح کا وقت تھا فرمایا ع صبح طالع شد برآمد آفتاب

ایک مشاعرہ میں خواجہ صاحب نے مطلع پڑھا ؎

سُرمہ منظورِ نظر ٹھیرا ہے چشمِ یار میں نیل کا گنڈا پنھایا مردمِ بیمار میں

شیخ صاحب نے کہا سبحان اللہ۔ خواجہ صاحب کیا خوب فرمایا ہے ؎

سُرمہ منظورِ نظر ٹھیرا جو چشمِ یار میں نیلگوں گنڈا پنھایا مردُمِ بیمار میں

خواجہ صاحب نے اُٹھ کر سلام کیا اور کہا "جائے اُستاد خالیست"۔ آزاد کی سمجھ میں نہیں آتا کہ بیمار میں گنڈا آنکھ کو کیونکر پنھاتے ہیں۔ گنڈا بیمار کو پنھایا کرتے ہیں۔ اور اس سے زیادہ تعجب شیخ صاحب کے مطلع کا ہے کہ فرماتے ہیں ؎

یوں نزاکت سے گراں ہے سُرمہ چشمِ یار میں جس طرح ہو رات بھاری مردمِ بیمار میں

یہاں بھی بیمار بے معنی ہے۔ پر ہو تو ٹھیک ہے یہ

لطیفہ ۔ ایک مشاعرہ میں ایسے وقت پہنچے کہ جلسہ ختم ہو چکا تھا۔ مگر خواجہ حیدر علی آتش وغیرہ چند شعرا ابھی موجود تھے۔ یہ جا کر بیٹھے۔ تعظیم رسمی اور مزاج پُرسی کے بعد کہا کہ جناب خواجہ صاحب مشاعرہ ہو چکا۔ اُنھوں نے کہا کہ سب کو آپ کا اشتیاق رہا۔ شیخ صاحب نے یہ مطلع پڑھا :۔

جو خاص ہیں وہ شریکِ گروہِ عام نہیں شمار دانۂ تسبیح میں امام نہیں

چونکہ نام بھی **امام بخش** تھا اس لئے تمام اہل جلسہ نے نہایت تعریف کی۔ خواجہ صاحب نے یہ مطلع پڑھا :۔

یہ بزم وہ ہے کہ لاخیر کا مقام نہیں ہمارے گنجفہ میں بازیٔ غلام نہیں

بعض اشخاص کی روایت ہے کہ یہ مطلع آتش کے شاگرد کا ہے۔ ناسخ کے شاگردوں کی طرف سے اُس کا جواب ہے اور حقیقت یہ ہے کہ لاجواب ہے :۔

جو خاص بندہ ہیں وہ بندہ عوام نہیں ہزار بار جو یوسف بکے غلام نہیں

عوام میں یہ روایت اس طرح مشہور ہے۔ مگر دیرینہ سال لوگ جو اُس زمانہ کی صحبتوں میں شریک تھے اُن سے یہ تحقیق ہوا کہ پہلا مطلع آتش نے حقیقت میں طالب علی خاں عیشی[1] کے حق میں کہا تھا۔ یار لوگوں نے صفت مشترک پیدا کر کے شیخ صاحب کے ذمّہ لگا دیا +

طبع اوّل کی ترویج میں اس کتاب کو دیکھ کر میرے شفیق دلی سید احمد صاحب ڈکشنیری نے کسی کی زبانی بیان کیا کہ شیخ ناسخ ایک دن نواب نصیر الدین حیدر کے حضور میں حاضر تھے۔ حقّہ سامنے تھا۔ فرمایا کہ شیخ صاحب! اس پر کچھ کہئے۔ اُنھوں نے اُسی وقت کہا:۔

حُقّہ جو ہے حضور معلّٰی کے ہاتھ میں		گویا کہ کہکشاں ہے ثریا کے ہاتھ میں
ناسخ یہ سب بجا ہے ولیکن تو عرض کر		بے جان بولتا ہے مسیحا کے ہاتھ میں

بعض احباب کہتے ہیں کہ ظاہر الفاظ میں حقّہ کہکشاں ہے اور ممدوح ثریا۔ لیکن ایسے ممدوحوں کو چاند سورج بلکہ باعتبار قدر و منزلت کے فلک تک بھی کہہ دیا ہے۔ ثریا سے آج تک کسی نے تشبیہ نہیں دی۔ شیخ ناسخ کلام کی گرمی اور شوخی اور چستی ترکیب سے دست بردار ہوئے مگر اصول فن کو جانے نہیں دیا۔ ان کی طرف یہ قطعہ منسوب کرنا چاند پر داغ لگانا ہے۔ لیکن چونکہ فی البدیہہ کہا ہے۔ اس لئے اس قدر سخت گیری بھی جائز نہیں +

ایک غزل شیخ صاحب کی ہے جس کا مطلع ہے:۔

---

[1] طالب علی خاں عیشی ولد علی بخش خاں لکھنوی ایک عالم فاضل شخص تھے۔ اور کمالات علمی کے ساتھ شعر بھی خوب کہا کرتے تھے۔ مگر شاعری پیشہ نہ تھے۔ دیوان فارسی مع قصائد و دیوان ریختہ۔ مجموعۂ نثر۔ مثنوی سرو چراغاں اور اکثر اقسام سخن اُن سے یادگار ہیں۔ سعادت علی خاں جیسے نکتہ شناس کے سامنے بیٹھ کر انھوں نے فرمایش ہائے شاعرانہ کا سرانجام کیا تھا اور مورد تحسین و آفریں ہوئے تھے۔ خان موصوف خواجہ صاحب کی شاعری کو خاطر میں نہ لاتے تھے۔ اس پر انھوں نے بگڑ کر اُن کا ذاتی دھبّا دکھایا تھا۔ اور مطلع مذکور کہا تھا +

دل لیتی ہے وہ زلفِ سیہ فام ہمارا　　بجھتا ہے چراغ آج سرِ شام ہمارا

وہی مرزائی صاحب جن کے پاس شیخ صاحب کے روپئے امانت رہے تھے۔ ایک امیر شرفائے لکھنؤ میں سے تھے اور شیخ صاحب کے بہت دوست تھے۔ انھوں نے ایک عمدہ فیروزہ پر آپ کا نام نامی کھُدوا کر انگوٹھی بنوا کر دیا۔ اکثر پہنے رہتے تھے۔ کبھی اُتار کر رکھ بھی دیتے تھے وہ کسی نے چُرا لی یا کھوئی گئی اس پہ فرمایا ؂

ہمسا کوئی گمنام زمانہ میں نہ ہوگا　　گُم ہو وہ نگیں جس پہ کھُدے نام ہمارا

اس عہد تک لکھنؤ بھی آج کا لکھنؤ نہ تھا۔ شیخ ابراہیم ذوق کا یہ مطلع جب وہاں پڑھا گیا:۔

خبر کر جنگ نوفل کی تو مجنوں اہل ہاموں کو　　کبادہ تا صبا کھچوائے شاخ بیدِ مجنوں کو

سب نے اسے بے معنی کہا۔ شیخ صاحب نے جنگ نوفل کا واقعہ اور کبادہ کھینچنے کی اصطلاح بتائی۔ پھر سب نے تسلیم کیا۔ لیکن یہ امر نہ کچھ دلّی والوں کے لئے موجب فخر ہے نہ لکھنؤ والوں کے لئے باعث رنجش۔ آخر دلّی بھی ایک دن شاہ جہاں آباد نہیں ہو گئی تھی میر تقی اور مرزا رفیع پیدا ہوتے ہی میر اور سودا نہیں ہو گئے۔ جب کلام کا سلسلہ یہاں تک پہنچا تو اس قدر کہنا واجب ہے کہ اس عہد تک شعرائے لکھنؤ اُن استادوں کے شاگرد تھے جن کا دریائے کمال دلّی کے سرچشمہ سے نکلا تھا اور فصحائے لکھنؤ بھی ہر محاورہ کے لئے دلی ہی کو فخر سمجھتے تھے۔ کیونکہ وہ اکثر اُنھیں بزرگوں کے فرزند تھے جنھیں زمانہ کی گردش نے اڑا کر وہاں پھینک دیا تھا۔ پس شیخ صاحب اور خواجہ حیدر آتش کے کمال نے لکھنؤ کو دلّی کی قید پابندی سے آزاد کر کے استقلال کی سند دی۔ اور وہی مستند ہوئی۔ اب جو چاہیں سو کہیں، ہم نہیں روک سکتے۔ چنانچہ شیخ صاحب فرماتے ہیں :۔

شہسواری کا جو اُس چاند کے ٹکڑے کو ہے شوق　　چاندنی نام ہے شبدیز کی اندھیاری کا

اے خط اُسکے گورے گالوں پر یہ تو نے کیا کیا　　چاندنی راتیں یکایک ہو گئیں اندھیاریاں

اللہ رے روشنی مرے سینے کے داغ کی　　اندھیاری رات میں نہیں حاجت چراغ کی

نام سُنتا ہوں جو میں گور کی اندھیاری کا دل دھڑکتا ہے جُدائی کی شب تار نہ ہو

اگرچہ دلّی میں بچّے سے بوڑھے تک۔ اندھیری رات کہتے ہیں۔ مگر لکھنؤ والوں کو ٹوکنے کا مُنہ نہیں۔ کیونکہ جس خاک سے ایسے ایسے صاحب کمال اُٹھیں وہاں کی زبان خود سند ہے۔ بکاؤلی میں نسیم کہتے ہیں۔ ع گھوما مانند نرد گھر گھر + دلّی والوں کی زبان سے گھومنا ممکن نہیں۔ اہل لکھنؤ ملائی کو بالائی کہتے ہیں۔ پینے کا ہو تو تماکو۔ پان میں کھانے کا ہو تو تمباکو کہتے ہیں۔ دلّی والے پینے کا ہو تمباکو۔ کھانے کا ہو تو زردہ کہتے ہیں +

یوں تو شیخ صاحب کا ایک زمانہ معتقد ہوا۔ اور سب نے اُن کی شاگردی کو فخر سمجھا۔ مگر چند شاگرد بڑے بڑے دیوانوں کے مالک ہوئے +

(۱) خواجہ وزیر کہ آتش کے شاگرد تھے پھر ناسخ کے شاگرد ہوئے اور اسی پر فخر کرتے کرتے مرگئے۔ جیسے نازک خیال تھے ویسی ہی زبان پر قدرت رکھتے تھے۔ شیخ صاحب بھی ان کی بڑی خاطر کرتے اور اوّل درجہ کی شفقت بندِ دل فرماتے تھے +

(۲) مرزا محمد رضا خاں برق بعض بعض غزلوں سے اور واجد علی شاہ بادشاہ کی مصاحبت سے مشہور عالم ہوئے اُن کا دیوان چھپا ہوا بکتا ہے +

(۳) والاجاہ میر علی اوسط رشک۔ جن کی طبیعت کی آمد ضخیم اور جسیم دیوانوں میں نہیں سماتی اور شاعری کی سرکار سے تاریخیں کہنے کا ٹھیکہ ملا +

(۴) شیخ امداد علی بحر۔ ہر چند زمانہ نے غریبی کی خاک سے سر نہیں اُٹھانے دیا۔ مگر طبیعت بڑھاپے میں جوانی کی اکڑ ٹکڑ دکھاتی رہی۔ آخر میں آکر اقبال نے رفاقت کی۔ نواب صاحب رام پور کی سرکار میں آکر چند سال آرام سے بسر ہوئے۔ حقیقت میں وہی ایک شاگرد تھے جو اُستاد کے لئے باعث فخر تھے۔ خدا مغفرت کرے +

(۵) سید اسمٰعیل حسین منیر شکوہ آبادی کہن سال مشاق تھے۔ پہلے نواب باندہ کی سرکار میں تھے۔ ۱۸۵۷ء کے مفسدہ کے بعد چند روز تکلیف اُٹھائی۔ پھر

نواب صاحب رامپور نے قدردانی فرمائی۔ چند سال عمر کے باقی تھے۔ اچھی طرح بسر کئے اور عالم آخرت کا سفر کیا ٭

(٦) آغا کلب حسین خاں نادر۔ سب سے اخیر میں ہیں۔ مگر افراط شوق اور آمد مضامین اور کثرت تصانیف اور پابندیٔ اصول میں سب سے اوّل ہیں۔ تمام عمر اُنھوں نے ڈپٹی کلکٹری کی اور حکومت کے شغلوں میں گرفتار رہے مگر فکر شعر سے کبھی غافل نہ ہوئے جس ضلع میں تبدیل ہو کر گئے مشاعرہ کو اپنے ساتھ لیتے گئے۔ شعرا کے ساتھ خواہ سرکاری نوکریوں سے خواہ اپنے پاس سے ہمیشہ سلوک کرتے رہے اور اسی عالم میں یہ بھی کہا :۔

لوگ کہتے ہیں کہ فنِّ شاعری منحوس ہے　　شعر کہتے کہتے میں ڈپٹی کلکٹر ہو گیا

ان کے کئی ضخیم دیوان۔ غزلوں اور قصیدوں۔ اور سلاموں اور مرثیوں کے ہیں۔ کئی کتابیں اور رسائل ہیں جن سے طالب زبان بہت کچھ فائدے حاصل کر سکتا ہے۔ ایک کتاب فنِّ زراعت میں لکھی۔ اس میں ہندوستان کے میوؤں اور ترکاریوں کی مفصل تحقیقات ہے۔ بسبب دیرینہ سالی کے سرکار سے پنشن لے لی تھی۔ پھر بھی شاعری کا فرض اُسی طرح ادا کئے جاتے تھے۔ خوش اعتقادی اُن کی قابل رشک تھی یعنی وصیّت کی تھی کہ بعد وفات کے میرے ایک ہاتھ میں سلاموں اور مرثیوں کا دیوان دینا۔ اور دوسرے ہاتھ میں قصاید کا دیوان رکھ دینا جو بزرگان دین کی مدح میں کہے ہیں ٭

ان لوگوں نے اور ان کے بعض ہمعصروں نے زبان کے باب میں اکثر قیدیں واجب سمجھیں کہ دلّی کے مستند لوگوں نے بھی ان میں سے بعض بعض باتوں کی رعایت اختیار کی اور بعض میں اختلاف کرتے تھے اور عام لوگ خیال بھی نہ کرتے تھے۔ مگر اصل واضع ان قوانین کے میر علی اوسط رشک تھے۔ چنانچہ کچھ الفاظ نمونہ کے طور پر لکھنے ضرور ہیں۔ مثلاً فرماتے تھے :۔

یہاں۔ وہاں۔ بروزن جاں نہ ہو۔ بلکہ بروزن جہاں ہو۔ لیکن تعجب یہ ہے کہ شیخ صاحب اور خواجہ صاحب کوئی اس کے پابند نہ تھے *

پہ	اور	پر	پر کو دوبا اختیار کیا
رکھا	اور	رکھا	میں رکھا ایضاً
ٹک	اور	تک	میں تک ایضاً
بٹھانا		بِٹھانا	میں بیٹھانا۔ پہنانا ایضاً
کبھو	اور	کبھی	میں کبھی ایضاً
ایجاد اور کلام		مذکر	بعض مؤنث کہتے ہیں
نمو۔ یعنی بڑھنا۔		مذکر	ایضاً
طرز		مؤنث	مذکر بولتے ہیں
صُلح ہوگئی			صُلح ہوگئی

اِسباب میں اِس بارہ میں۔ غدر سے پہلے دلّی میں نہ بولتے تھے۔ اب سب بولنے لگے۔ آئے ہے۔ جائے ہے کی جگہ آتا ہے۔ جاتا ہے۔ اب دلّی والے بھی یہی کہنے لگے۔ صورت ہے جیسے چودھویں کا چاند جانے چودھویں کا چاند ہے۔ فسانۂ عجائب میں ہے۔ شعلہ۔ وعدہ وغیرہ کو دریا اور صحرا کا قافیہ نہیں باندھتے *

غزلیات

پونچھتا اشک اگر گوشۂ داماں ہوتا	چاک کرتا میں جنوں میں جو گریباں ہوتا
مال ملتا جو فلک سے ضررِ جاں ہوتا	سرنہ ہوتا۔ جو میسّر مجھے ساماں ہوتا
مُنہ کو دامن سے چھپاکر جو وہ رقصاں ہوتا	شعلۂ حُسن۔ چراغِ تہِ داماں ہوتا
اُستراُمنہ پہ جو پھرنے نہیں دیتا ہے بجا	محو دیندار سے کیونکر خطِ قرآں ہوتا
اپنے ہونٹوں سے جو اک بار لگا لیتا وہ	ہے یقیں ساغرِ چشمۂ حیواں ہوتا

نازک ایسا ہے وہ کافر، وہیں ہوتا بد مست
گذر اُس کا جو کبھی زیر مغیلاں ہوتا

سنگ چقماق بھی بنتا تو مرا ضبط یہ ہے
نہ مری قبر کا پتھر شرر افشاں ہوتا

ہوں وہ وحشی کہ اگر دشت میں پھرتا شب کو
آگے مشعلچی وہی غول بیاباں ہوتا

نکہتِ کاکلِ پیچاں سے جو دیتے تشبیہ
عطر مجموعے کا ہر جزو پریشاں ہوتا

کی مکافات شبِ وصل خدا نے ورنہ
کس لئے مجھ پہ عذابِ شبِ ہجراں ہوتا

اپنی صورت کا وہ دیوانہ نہ ہوتا تو کیوں
پاؤں میں سلسلۂ گیسوئے پیچاں ہوتا

ایک دم یار کو بوسوں سے نہ ملتی فرصت
گر دہن دیدۂ عالم سے نہ پنہاں ہوتا

کس کی پریاں ہیں شہِ جنات کو بھی آٹھ پہر
ہے یہ حسرت کہ سگِ کوچۂ جاناں ہوتا

خوں رُلاتا وہیں ناسور بنا کر گردوں
زخم بھی گر مرے تن پر کبھی خنداں ہوتا

اے اجل ایک دن آخر تجھے آنا ہے ولے
آج آتی شبِ فرقت میں تو احساں ہوتا

کون ہے جو نہیں مرتا ہے ترے قامت پر
کیوں نہ ہر سرو چمن قالبِ بیجاں ہوتا

کیا قوی ہے یہ دلیل اُس کی پریزادی کی
ربط انسان سے کرتا جو وہ انساں ہوتا

اے بتو! ہوتی اگر مہر و محبت تم میں
کوئی کافر بھی نہ واللہ مسلماں ہوتا

حسرتِ دل نہیں دیتا ہے نکلنے ناسخ
ہاتھ شل ہوتے میسّر جو گریباں ہوتا

دم بلبلِ اسیر کا تن سے نکل گیا
جھونکا نسیم کا جو یاسمن سے نکل گیا

لایا وہ ساتھ غیر کو میرے جنازہ پر
شعلہ سا ایک جیب کفن سے نکل گیا

ساقی بغیر شب جو پیا آب آتشیں
شعلہ وہ بن کے میرے دہن سے نکل گیا

اب کے بہار میں یہ ہوا جوش لے جنوں
سارا لہو ہمارے بدن سے نکل گیا

اس رشکِ گل کے جاتے ہی بس آ گئی خزاں
ہر گل بھی ساتھ بو کے چمن سے نکل گیا

اہلِ زمیں نے کیا ستم نو کیا کوئی؟
نالہ جو آسمانِ کہن سے نکل گیا

سنسان مثل وادیٔ غربت ہے لکھنؤ
شاید کہ ناسخ آج وطن سے نکل گیا

واعظا مسجد سے اب جاتے ہیں میخانے کو ہم　　پھینک کر ظرفِ وضو لیتے ہیں پیمانے کو ہم

کیا گِس بیٹھے بھلا اُس شعلہ رو کے جسم پر　　اپنے داغوں سے جلا دیتے ہیں پروانے کو ہم

تیرے آگے کہتے ہیں گل کھول کر بازوے برگ　　گلشنِ عالم سے ہیں تیار اُڑ جانے کو ہم

کون کرتا ہے بتوں کے آگے سجدہ زاہدا!　　سر کو دے دے مار کر توڑینگے بتخانے کو ہم

جب غزالوں کے نظر آجاتے ہیں چشمِ سیاہ　　دشت میں کرتے ہیں یاد اپنے سیہ خانے کو ہم

بوسۂ خالِ زنخداں سے شفا ہوگی ہمیں　　کیا کرینگے اے طبیب اس تیرے بہدانے کو ہم

باندھتے ہیں اپنے دل میں زلفِ جاناں کا خیال　　اس طرح زنجیر پہناتے ہیں دیوانے کو ہم

پنجۂ وحشت سے ہوتا ہے گریباں تار تار　　دیکھتے ہیں کاکلِ جاناں میں جب شانے کو ہم

عقل کھودی تھی جو لے ناسخ جنونِ عشق نے
آشنا سمجھا کئے اک عمر بیگانے کو ہم

چوٹ دل کو جو لگے آہِ رسا پیدا ہو　　صدمہ شیشہ کو جو پہنچے تو صدا پیدا ہو

کشتۂ تیغِ جدائی ہوں یقیں ہے مجکو　　عضو سے عضو قیامت کو جدا پیدا ہو

ہم ہیں بیمارِ محبت یہ دعا مانگتے ہیں　　مثلِ اکسیر نہ دنیا میں دوا پیدا ہو

کہہ رہا ہے جرسِ قلب بآوازِ بلند　　گم ہو رہبر تو ابھی راہِ خدا پیدا ہو

کس کو پہنچا نہیں اے جان ترا فیضِ قدم　　سنگ پر کیوں نہ نشانِ کفِ پا پیدا ہو

مل گیا خاک میں پس پس کے حسینوں پر میں　　قبر پر بوئیں کوئی چیز حنا پیدا ہو

اشک تھم جائیں جو فرقت میں تو آہیں نکلیں　　خشک ہو جائے جو پانی تو ہوا پیدا ہو

یاں کچھ اسباب کے ہم بندے ہی محتاج نہیں　　نہ زباں ہو تو کہاں نامِ خدا پیدا ہو

گل تجھے دیکھ کے گلشن میں کہیں عمر دراز　　شاخ کے بدلے وہیں دستِ دعا پیدا ہو

بوسہ مانگا جو دہن کا تو وہ کیا کہنے لگے　　تو بھی مانندِ دہن اب کہیں نا پیدا ہو

نہ سرِ زلف مقابل ہے درازی تیری　　رشتۂ طولِ اَمَل کا بھی سرا پیدا ہو

کس طرح صبح ہے نہ خورشید کو رجعت ہو جائے　　تجھ سا آفاق میں جب ماہ لقا پیدا ہو

ابھی خورشید جو چھپ جائے تو ذرّات کہاں | تو ہی پنہاں ہو تو پھر کون بھلا پیدا ہو

کیا مبارک ہے مرا دشتِ جنوں اے ناسخ
بیضۂ بوم بھی ٹوٹے تو ہُما پیدا ہو

جو اُس پری سے شبِ وصل میں رُکاوٹ ہو | مجھے بھی ایک جنازہ ہو یا چھپر کھٹ ہو
محال خواب لحد سے ہے گرچہ بیداری | میں چونک اُٹھوں اگر اُسکے قدم کی آہٹ ہو
نہ میرے پاؤں ہوں زنجیر کے کبھی شاکی | جو اُس کے کاکل پیچاں کی ہاتھ میں لٹ ہو
کبود رنگ ہے مسّی کا میرے ہونٹ ہیں لال | ملیں جو دونوں تو پیدا نہ کیوں اُداہٹ ہو
مجال کیا کہ ترے گھر میں پاؤں میں رکھوں | یہ آرزو ہے مرا سر ہو تیری چوکھٹ ہو
ہجوم رکھتے ہیں جانبازیوں ترے آگے | جواریوں کا دوالی کو جیسے جمگھٹ ہو
لپٹ کے یار سے سوتا ہوں مانگتا ہوں دعا | تمام عمر بسر یارب ایک کروٹ ہو
نسیم آہ کے جھونکے سے کھول دوں دم میں | بھڑا ہوا ترے دروازے کا اگر پٹ ہو
جلاؤ مجھ کو جو غیروں سے گرمیاں کرکے | تمھارے کوچے میں تیار ایک گھٹ ہو
نہ لگ چلوں میں یہی اپنے دل میں ٹھانی ہے | تری طرف سے ہزار اے پری لگاوٹ ہو
وہ مُنہ چھپاتے ہیں جب تک حجابِ شبِ وصل | عذار صبح ہے شب کا نہ دور گھونگھٹ ہو
تری بلائیں مری طرح وہ بھی لیتا ہے | نہ کیونکر آگ میں اسپند کی یہ چٹ چٹ ہو
میں جاں بلب ہوں گلا کاٹو یا گلے سے لگو | جو اس میں آپ کو منظور ہو سو جھٹ پٹ ہو
کرے وہ ذکر خدا اے صنم بھلا کس وقت | جسے کہ آٹھ پہر تیرے نام کی رٹ ہو

جو دل کو دیتے ہو ناسخ تو کچھ سمجھ کر دو
کہیں یہ مُفت میں دیکھو نہ مال تلپٹ ہو

خاک میں مل جائیے ایسا اکھاڑا چاہیئے | لڑکے کُشتی دیو ہستی کو پچھاڑا چاہیئے
وہ سہی قد کرکے ورزش خوب زوروں پر چڑھا | کہہ رہا ہے سرو کو جڑ سے اُکھاڑا چاہیئے
کیوں نہ رو دیں پھوٹ کر ہم قصر جاناں کے لئے | دیدۂ تر اپنے دریا میں کڑاڑا چاہیئے

اور تختوں کی ہماری قبر میں حاجت ہیں خانۂ محبوب کا کوئی کواڑا چاہیئے
ہے شبِ مہتاب فرقت میں تقاضائے جنوں چادرِ محبوب کو بھی آج پھاڑا چاہیئے
انتہائے لاغری سے جب نظر آیا نہ میں ہنس کے وہ کہنے لگے بستر کو جھاڑا چاہیئے
کر چکی ہے تیری رفتار ایک عالم کو خراب شہر خاموشاں کو بھی چل کر اُجاڑا چاہیئے
مُنہ بنائے کیوں ہے قاتل پاس ہے تیغِ نگاہ باغ میں ہنستے ہیں گُل تو منہ بگاڑا چاہیئے
کوئی سیدھی بات صاحب کی نظر آتی نہیں آپ کی پوشاک کو کپڑا بھی آڑا چاہیئے
تنگ اس وحشت کدہ میں کُوں میں لے جوشِ جنوں عرش کی سقفِ محدب کو لتاڑا چاہیئے
آنسوؤں سے ہجر میں برسات رکھئے سال بھر ہم کو گرمی چاہیئے ہرگز نہ جاڑا چاہیئے
آج اُس محبوب کے دل کو مُسخر کیجئے عرشِ اعظم پر نشانِ نالہ گاڑا چاہیئے
مر گیا ہوں حسرتِ نظارۂ ابرو میں مَیں عین کعبہ میں مرے لاشہ کو گاڑا چاہیئے
مُحتسب کو ہو گیا آسیب جو توڑا ہے خُم جو تیوں سے کے کشوجن آج بھاڑا چاہیئے
جلد رنگ لے دیدۂ خوں بار اب تارِ نگاہ ہے محرّم اُس پری پیکر کو ناڑا چاہیئے

لڑنے ہیں پریوں سے کُشتی پہلوانِ عشق ہیں
ہم کو ناسخ راجہ اندر کا اکھاڑا چاہیئے

میر مُستحسن۔ خلیق

میر حسَن کے صاحبزادے حُسن اخلاق اور اوصاف کی بزرگی میں بزرگوں کے فرزند رشید تھے۔ متانت۔ سلامت روی۔ اور مسکینی اُن کی سیادت کے لئے محضر شہادت دیتے تھے۔ فیض آباد اور لکھنؤ میں تعلیم و تربیت پائی تھی۔ ۱۶ برس کی عمر سے مشقِ سخن شروع کی اور خُلقِ حسَنؒ کی مناسبت سے خلیق تخلص اختیار کیا۔ ابتدا میں غزلیں بہت کہتے تھے اور والد بزرگوار سے اصلاح لیتے تھے۔ جب شیخ مصحفی

لکھنؤ میں پہنچے تو میر حسن ان دنوں بدر منیر لکھ رہے تھے اور میر خلیق کی آمد کا یہ عالم کہ مارے غزلوں کے دم نہ لیتے تھے۔ شفیق باپ کو اپنے فکر فرصت نہ دیتے تھے۔ بیٹے کو ساتھ لے گئے اپنی کم فرصتی کا حال بیان کیا اور اصلاح کے لئے شیخ موصوف کے سپرد کر دیا۔ ہونہار جوان کی جوان طبیعت نے رنگ نکالا تھا کہ قدردانی نے اُس کا ہاتھ پکڑا اور نیشاپوری خاندان میں ۴۰ روپیہ مہینے کا نوکر رکھوا دیا۔ انہی دنوں میں مرزا تقی خاں ترقی[1] نے چاہا کہ فیض آباد میں شعر و سخن کا چرچا ہو۔ مشاعرہ قائم کیا۔ اور خواجہ حیدر علی آتش کو لکھنؤ سے بلایا۔ تجویز یہ تھی کہ انہیں وہیں رکھیں۔ پہلے ہی جلسہ میں جو میر خلیق نے غزل پڑھی اُس کا مطلع تھا:۔

رشک آئینہ ہے اُس رشک قمر کا پہلو ۔۔۔ صاف ادھر سے نظر آتا ہے ادھر کا پہلو

آتش نے اپنی غزل پھاڑ ڈالی اور کہا کہ جب ایسا شخص یہاں موجود ہے تو میری کیا ضرورت ہے +

میر خلیق نازک خیالیوں میں ذہن لڑا رہے تھے کہ باپ کی موت نے شیشہ پر پتھر مارا۔ عیال کا بوجھ پہاڑ ہو کر سر پر گرا جس نے آمد کے چشمے خاک ریز کر دئے مگر ہمت کی پیشانی پر ذرا بل نہ آیا۔ اکثر فیض آباد میں رہتے تھے۔ لکھنؤ آتے تھے تو ہیں بخاں میں ٹھیرا کرتے تھے۔ پُرگوئی کا یہ حال تھا کہ مثلاً ایک لڑکا آیا۔ اُس نے کہا میر صاحب! آٹھوں کا میلہ ہے ہم جائیں گے۔ ایک غزل کہہ دیجئے۔ اچھا بھئی کہہ دیں گے۔ میر صاحب! میلہ تو کل ہے ہم کل جائیں گے۔ ابھی کہہ دیجئے۔ اسی وقت غزل لکھ دی۔ اُس نے کہا یاد بھی کروا دیجئے۔ میر صاحب اسے یاد کروا رہے ہیں۔ ان دنوں میں غزلیں بکا کرتی تھیں۔ میاں مصحفی تک اپنا کلام بیچتے تھے۔ یہ بھی غزلیں کہہ کہ فروخت کرتے تھے +

ایک دن ایک خریدار آیا اور اپنا تخلص ڈلوا کر شیخ ناسخ کے پاس پہنچا کہ اصلاح

[1] مرزا تقی ترقی خاندان مذکور میں ایک عالی ہمت امیر تھے اور سرکار اودھ میں جاگیردار تھے +

دید بجئے۔ شیخ صاحب نے غزل کو پڑھ کر اُس کی طرف دیکھا اور بگڑ کر کہا۔ ابے تیرا منہ ہے جو یہ غزل کہے گا؟ ہم زبان پہچانتے ہیں۔ یہ وہی میر نجار اوالا ہے +

میر ظلیق صاحب دیوان تھے مگر اُسے رواج نہیں دیا۔ نقد سخن اور سرمایہ مضامین جو بزرگوں سے ورثہ پہنچا تھا۔ اُسے زاد آخرت میں صرف کیا اور ہمیشہ مرثیے کہتے رہے۔ اسی میں نام اور زمانہ کا کام چلتا رہا۔ آپ ہی کہتے تھے اور آپ ہی مجلسوں میں پڑھتے تھے۔ قدردان آنکھوں سے لگا لگا کرلے جاتے تھے +

سید انشا دریائے لطافت میں جہاں شرفائے دہلی کے رسوم درواج بیان کرتے ہیں وہاں کہتے ہیں کہ مرثیہ خوانی کے پیشہ کو لوگ کم نظر سے دیکھتے ہیں اور غور سے دیکھو تو اب بھی یہی حال ہے۔ مرثیہ گوئی کی یہ صورت رہی کہ سودا اور میر کے زمانہ میں میاں سکندر میاں گدا۔ میاں مسکین۔ افسردہ وغیرہ مرثیے ہی کہتے تھے۔ تصنیفات مذکورہ کو دیکھو تو فقط تبرک ہیں۔ کیونکہ ان بزرگوں کو نظم مذکور سے فقط گریہ و بکا اور حصول ثواب مقصود تھا اور اس میں شک نہیں کہ وہ نیک نیت لوگ حسن تاثیر سے اپنے مقصد میں کامیاب تھے۔ شاعری اور صنائع انشاپردازی سے کچھ غرض نہ تھی۔ میر ظلیق اور اُس عہد کے چند اور اشخاص تھے جنھوں نے کدورتہائے مذکورہ کو دھو کر مرثیوں کو بھی ایسا چمکا دیا کہ جس نظر سے اساتذہ شعراء کے کلام دیکھے جاتے تھے۔ اُسی نظر سے لوگ انھیں بھی دیکھنے لگے۔ اور پہلے مرثیے سوز میں پڑھے جاتے تھے۔ پھر تحت لفظ بھی پڑھنے لگے +

مرثیہ گوئی اور مرثیہ خوانی کے میدان میں جو ہوا بدلی، وہ میر ظلیق کے زمانہ سے بدلی۔ پہلے اکثر مرثیے چو مصرع ہوتے تھے۔ ہر چار مصرع کے بعد قافیہ۔ وہ انداز موقوف ہوا۔ ایک سلام غزل کے انداز ہیں۔ اور مرثیہ کے لئے مسدس کا طریقہ آئین ہو گیا۔ وہ سوز اور تحت لفظ دونوں طرح پڑھا جاتا تھا۔ اور جو کچھ غزل مستزاد کے اسلوب پر کہتے تھے وہ نوحہ کہلاتا تھا۔ اُسے سوز ہی میں پڑھتے تھے۔ اور یہی طریقہ

اب تک جاری ہے۔ میر موصوف اور اُن کے بعض ہم عہد جو سلام یا مرثیے وغیرہ کہتے تھے ان میں مصائب اور ماجرائے شہادت۔ ساتھ اُس کے فضائل اور معجزات کی روایتیں اس سلاست اور سادگی اور صفائی کے ساتھ نظم کرتے تھے کہ واقعات کی صورت سامنے تصویر ہو جاتی تھی اور دل کا درد آنکھوں سے آنسو ہو کر ٹپک پڑتا تھا +

اس زمانہ میں **میر ضمیر** ایک مرثیہ گو اور مرثیہ خواں تھے کہ طبع شعر کے ساتھ عربی فارسی وغیرہ علوم رسمی میں استعداد کامل رکھتے تھے۔ اور نہایت متقی اور پرہیزگار شخص تھے۔ تعجب یہ ہے کہ ساتھ اس کے طبیعت میں شوخی اور ظرافت بھی اتنی رکھتے تھے گویا سودا کی روح نے حلول کیا۔ انھوں نے اپنی دنیا کو آخرت کے ہاتھ بیچ ڈالا تھا اور غزل وغیرہ سے دست بردار ہو گئے تھے۔ لوگوں نے ان دونوں بزرگوں کو نقطہ مقابل کر کے تعریفیں شروع کر دیں۔ طبیعتیں ایک دوسرے کی چوٹ پر زور آزمائی کر کے نئے نئے ایجاد پیدا کرنے لگیں +

اس وقت تک مرثیہ ۳۰ سے ۴۵ حد ۵۰ بند تک ہوتا تھا۔ میر ضمیر مرحوم نے ایک مرثیہ لکھا ع کس نور کی مجلس میں مری جلوہ گری ہے + اس میں شاہزادہ علی اکبر کی شہادت کا بیان ہے۔ پہلے ایک تمہید سے مرثیہ کا چہرہ باندھا۔ پھر سراپا لکھا۔ پھر میدان جنگ کا نقشہ دکھایا۔ اور بیان شہادت پر خاتمہ کر دیا۔ چونکہ پہلا ایجاد تھا اس لئے تعریف کی آوازیں دور دور تک پہنچیں۔ تمام شہر میں شہرہ ہو گیا۔ اور اطراف سے طلب میں فرمائشیں آئیں۔ یہ ایجاد مرثیہ گوئی کے عالم میں ایک انقلاب تھا کہ پہلی روش متروک ہو گئی۔ باوجودیکہ انھوں نے مقطع میں کہہ دیا تھا ؎

دس میں کہوں سو میں کہوں یہ ورد ہے میرا   اس طرز میں جو کہوے سو شاگرد ہے میرا

پھر یہی سب اُس کی پیروی کرنے لگے۔ یہاں تک کہ پہلے امانت نے پھر اور شاعروں نے واسوخت کو سراپا میں داخل کیا +

عہد مذکور میں چار مرثیہ گو نامی تھے۔ میر ضمیر۔ میر خلیق۔ میاں دلگیر۔ میاں فصیح

میاں دلگیرؔ کی زبان میں لکنت تھی اس لئے مرثیہ خوانی نہ کرتے تھے۔ تصنیف میں بھی اُنھوں نے مرثیت کے دائرہ سے قدم نہیں بڑھایا۔ مرزا فصیحؔ حج و زیارت کو گئے اور وہیں سکونت پذیر ہوئے۔ میر ضمیرؔ اور میر خلیقؔ کے لئے میدان خالی رہا کہ جولانیاں دکھائیں۔ دنیا کے تماشائی جنھیں تیز طبیعتوں کے لڑانے میں مزا آتا ہے۔ دونوں اُستادوں کو تعریفیں کر کے لڑاتے تھے اور دل بہلاتے تھے۔ اور اس سے ان کے ذہن کو کمال کی ورزش اور اپنے دلوں کو چاشنئ ذوق کی لذت دیتے تھے ✦

اظہار کمال میں دونوں اُستادوں کی رفتار الگ الگ تھی۔ کیونکہ میر ضمیرؔ استعداد علمی اور زور طبع کے بازوؤں سے بہت بلند پرواز کرتے تھے۔ اور پورے اُترتے تھے۔ میر خلیقؔ مرثیت کے کوچہ سے اتفاقاً ہی قدم آگے بڑھاتے تھے۔ وہ مضمون آفرینی کی ہوس کم کرتے تھے۔ اور ہمیشہ محاورہ اور لُطف زبان کو خیالات درد انگیز کے ساتھ ترکیب دے کر مطلب حاصل کرتے تھے اور یہ جوہر اس آئینہ کا کافی اور خاندانی وصف تھا۔ ان کا کلام بہ نسبت سبحان اللہ۔ واہ واہ کے نالۂ و آہ و بکا کا زیادہ طلبگار تھا۔ لڑانے والے ہر وقت اپنے کام میں مصروف تھے۔ مگر دونوں صاحب اخلاق اور سلامت روی کے قانون داں تھے۔ کبھی ایک جلسہ میں جمع نہ ہوتے تھے ✦

آخر ایک شوقین نیک نیت نے روپیہ کے زور اور حکمت علمی کی مدد سے قانون کو توڑا۔ وہ بھی فقط ایک دفعہ۔ صورت یہ کہ نواب شرف الدولہ مرحوم نے اپنے مکان پر مجلس قرار دے کر سب خاص و عام کو اطلاع دی۔ اور مجلس سے ایک دن پہلے میر ضمیرؔ مرحوم کے مکان پر گئے۔ گفتگوئے معمولی کے بعد پانسو روپیہ کا توڑا سامنے رکھ دیا۔ اور کہا کہ "کل مجلس ہے مرثیہ آپ پڑھیئے گا۔" بعد اس کے میر خلیقؔ کے ہاں گئے ان سے بھی وہی مضمون ادا کیا۔ اور ایک کو دوسرے کے حال سے آگاہ نہ کیا۔ لکھنؤ شہر! روز معین پر ہزار در ہزار آدمی جمع ہوئے۔ ایک بجے کے بعد میر ضمیرؔ

ؔ میاں دلگیر شیخ ناسخ کے شاگرد تھے۔ مرزا فصیح میاں دلگیر سے اور شیخ ناسخ سے اصلاح لیتے تھے ✦

منبر پر تشریف لے گئے اور مرثیہ پڑھنا شروع کیا۔ ان کا پڑھنا۔ سبحان اللہ۔ مرثیہ نظم۔ اور اُس پر نثر کے حاشیے۔ کبھی رُلاتے تھے اور کبھی تحسین و آفرین کا غُل مچواتے تھے کہ میر خلیق بھی پہنچے اور حالت موجودہ کو دیکھ کر حیران رہ گئے۔ اور دل میں کہا کہ آج کی شرم بھی خدا کے ہاتھ ہے۔ میر ضمیر نے جب انھیں دیکھا تو زیادہ پھیلے اور مرثیہ کو اتنا طول دیا کہ آنکھوں میں آنسو اور لبوں میں تحسین بلکہ وقت میں گنجائش بھی نہ چھوڑی۔ آفتاب یوں ہی سا جھلکتا رہ گیا +

وہ ابھی منبر سے اُترے ہی تھے کہ چوبدار اُن کے پاس آیا اور کہا کہ نواب صاحب فرماتے ہیں۔ آپ بھی حاضرین کو داخل حسنات فرمائیں۔ اس وقت اُن کے طرفداروں کی بالکل صلاح نہ تھی۔ مگر یہ توکل بخدا اُٹھ کھڑے ہوئے اور منبر پر جا کر بیٹھے۔ چند ساعت توقف کیا۔ آنکھیں بند خاموش بیٹھے رہے۔ ان کی گوری رنگت جسم نحیف و ناتواں۔ نہیں معلوم ہوتا تھا کہ بدن میں لہو کی بوند ہے یا نہیں۔ جب اُنھوں نے رباعی پڑھی تو اہل مجلس کو پوری آواز بھی نہیں سنائی دی۔ چند مرثیے کے بند بھی اس حالت میں گزر گئے۔ دفعتاً باکمال نے رنگ بدلا۔ اور اُس کے ساتھ ہی محفل کا بھی رنگ بدلا۔ آہوں کا دھواں ابر کی طرح چھا گیا اور نالہ و زاری نے آنسو برسانے شروع کئے۔ ۱۵۔۲۰ بند پڑھے تھے کہ ایک کو دوسرے کا ہوش نہ رہا۔ ۲۵۔ یا ۳۰ بند پڑھ کر اُتر آئے۔ اہل مجلس اکثر ایسی حالت میں تھے کہ جب آنکھ اُٹھا کر دیکھا تو منبر خالی تھا۔ نہ معلوم ہوا کہ میر خلیق صاحب کس وقت منبر سے اُتر آئے۔ دونوں کے کمال پر صاد ہوا۔ اور طرفین کے طرفدار سرخرو گھروں کو پھرے +

روایت مندرجہ بالا میر مہدی حسن فراغ کی زبانی سنی تھی۔ لیکن میر علی حسن اشک تخلص کہ میر عماد خوشنویس کی اولاد میں ہیں۔ خود ناسخ کے شاگرد اور صاحب دیوان ہیں۔ ان کے والد حقیقی تخلص فقط مرثیہ کہتے تھے اور میاں دلگیر کے شاگرد تھے۔ میر اشک بھی حیدرآباد میں بزمرۂ منصبداران ملازم ہیں۔ ان کی زبانی مولوی شریف حسین

خاں صاحب نے بیان کیا کہ لکھنؤ میں ایک غریب خوش اعتقاد شخص بڑے شوق سے مجلس کیا کرتا تھا۔ اور اسی رعایت سے ہر ایک نامی مرثیہ خواں اور لکھنؤ کے خاص و عام اُس کے ہاں حاضر ہوتے تھے۔ یہ معرکہ اُس کے مکان پر ہوا تھا۔ اور میر ضمیر کے اشارے سے ہوا تھا۔ میر اشک فرماتے تھے کہ میر خلیق نے اپنے والد کے بعد چند روز بہت سختی سے زندگی بسر کی۔ عیال فیض آباد میں تھے۔ آصف الدولہ لکھنؤ میں رہنے لگے۔ ان کے سبب سے تمام امرا یہیں رہنے لگے۔ میر موصوف لکھنؤ میں آتے تھے۔ سال بھر میں تین چار سو روپے حاصل کر کے لے جاتے تھے۔ اور پرورش عیال میں صرف کرتے تھے۔ صورت حال یہ تھی کہ مرثیوں کا جزدان بغل میں لیا اور لکھنؤ چلے آئے۔ یہاں ایک ٹوٹی پھوٹی عمارت خالی پڑی رہتی تھی اُس میں آکر اُترتے تھے۔ ایک دفعہ وہ آئے۔ بستر رکھ کر آگ سلگائی تھی۔ آٹا گوندھ رہے تھے کہ شخص مذکور ہاتھ جوڑ کر سامنے آکھڑا ہوا اور کہا کہ حضور! مجلس تیار ہے۔ میری خوش نصیبی ہے آپ کا آنا ہوا ہے۔ چل کر مرثیہ پڑھ دیجئے۔ یہ اسی طرح اُٹھ کھڑے ہوئے۔ اور ہاتھ دھو جزدان لے اُس کے ساتھ ہوئے وہاں جاکر دیکھیں تو میر ضمیر منبر پر بیٹھے ہوئے ہیں۔ وہیں یہ معرکہ واقع ہوا۔ اُسی دن سے میر خلیق نے مرثیہ خوانی میں شہرت پائی +

میر خلیق کے کلام کا انداز اور خوبی محاورہ اور لطف زبان۔ یہی سمجھ لو جو آج میر انیس کے مرثیوں میں دیکھتے ہو۔ فرق اتنا ہے کہ ان کے ہاں مرثیت اور صورت حال کا بیان درد انگیز تھا۔ ان کے مرثیوں میں تمہیدیں اور سامان اور سخن پردازی بہت بڑھی ہوئی ہے +

ان کے ادائے کلام اور پڑھنے کی خوبی دیکھنے اور سُننے کے قابل تھی۔ اعضا کی حرکت سے بالکل کام نہ لیتے تھے۔ فقط نشست کا انداز۔ اور آنکھ کی گردش تھی اسی میں سب کچھ ختم کر دیتے تھے۔ میر انیس مرحوم کو بھی میں نے پڑھتے ہوئے دیکھا۔ کہیں

اتفاقاً ہی ہاتھ اُٹھ جاتا۔ یا گردن کی ایک جنبش۔ یا آنکھ کی گردش تھی کہ کام کر جاتی تھی ورنہ کلام ہی سارے مطالب کے حق پورے ادا کر دیتا تھا +

میر خلیق نے اپنے بڑھاپے کے سبب سے اخیر عمر میں مرثیہ پڑھنا چھوڑ دیا تھا۔ شعراء شاگردان الٰہی ہیں۔ اُن کی طبیعت میں غیرت اور جوش اَوروں سے بہت درجہ زیادہ بلند ہوتا ہے۔ میر انیس کی مرثیہ خوانی مشرق منبر سے طلوع ہونے لگی تھی۔ جب کوئی آکر تعریف کرتا کہ آج فلاں مجلس میں کیا خوب پڑھے ہیں! یا فلاں نواب کے ہاں تمام مجلس کو لٹا دیا۔ تو انہیں خوش نہ آتا تھا۔ کئی دفعہ ایسا ہوا کہ اسی عالم ناتوانی میں منبر پر جا بیٹھے اور مرثیہ پڑھا۔ اس سے مطلب یہ تھا کہ اس گئی گذری حالت میں بھی ہمیں درماندہ نہ سمجھنا +

میر خلیق صاحب نے پیرانہ سالی کی تکلیف اُٹھا کر دنیا سے انتقال کیا۔ میں ان دنوں خُرد سال تھا مگر اچھی طرح یاد ہے جب ان کا کلام دلّی میں پہنچا۔ وہ سال اخیر کی تصنیف تھا + مطلع

مجرائی طبع کند ہے۔ لطفِ بیاں گیا ۔۔۔ دنداں گئے کہ جوہرِ تیغِ زباں گیا

ایک دو شعر ضُعفِ پیری کی شکایت میں اَور بھی تھے اور مقطع تھا:۔

گذری بہار عمر خلیق اب کہیں گے سب ۔۔۔ باغِ جہاں سے بلبلِ ہندوستاں گیا

اخیر عمر میں ضعف کے سبب سے مرثیہ پڑھتے تھے لیکن قدرتی شاعری کی زبان کب رہتی ہے۔ بی بی کے مرنے نے گھر کا دروازہ بند کر دیا تھا۔ ۳ صاحبزادے تھے۔ انیس۔ مونس۔ اُنس۔ میر خلیق ہمیشہ دَورہ میں رہتے تھے۔ ۱۰۔ ۱۰۔ ۱۵۔ ۱۵ دن ہر ایک کے ہاں بسر کر دیتے تھے۔ کہیں جاتے آتے بھی نہ تھے۔ پلنگ پر بیٹھے رہتے تھے۔ اور لکھے جاتے تھے۔ کوئی شگفتہ زمین خیال میں آئی۔ اُس میں سلام کہنے لگے۔ دل لگ گیا تو پورا کیا۔ نہیں تو چند شعر کہے اور چھوڑ دئے۔ کوئی تمہید سوجھی۔ مرثیہ کا چہرہ باندھا۔ جتنا ہوا اتنا ہوا۔ جو رہ گیا۔ رہ گیا۔ کوئی روایت نظم کرنی شروع کر دی۔

گھوڑے کا مضمون خیال میں آیا وہی کہتے چلے گئے۔ کبھی طبیعت لڑ گئی تلوار کی تعریف کرنے لگے وغیرہ وغیرہ۔ یہ بھی قاعدہ تھا کہ جو کچھ جس کے گھر میں کہتے تھے وہ اسی کے گھر میں چھوڑ کر چلے آتے تھے۔ یہ سرمایہ میر انیس کے پاس سب سے زیادہ رہا کہ ان کے گھر میں زیادہ رہتے تھے کیونکہ ان کی بی بی کھانوں اور آرام آسایش کے سامانوں سے اپنے ضعیف العمر بزرگ کو اچھی طرح رکھتی تھیں +

ان کی بلکہ ان کے گھرانے کی زبان محاورہ کے لحاظ سے سب کے نزدیک سندی تھی۔ شیخ ناسخ کی منصفی اور حق پرستی پر رحمت و آفرین کے سہرے چڑھائیے اپنے شاگردوں سے کہا کرتے تھے کہ بھئی زبان سیکھنی ہے تو میر خلیق کے ہاں جایا کرو۔ اور اس کے علاوہ بھی ان کے کمال کو فروغ دیتے رہتے تھے۔ اور کہا کرتے تھے کہ تینوں بیٹے ہونہار ہیں۔ دیکھنا خوب ہوں گے۔ میر خلیق محاورہ کے اس قدر پابند تھے کہ ان کے محضر کمال پر بجائے مُہر کے بعض لوگوں نے کم علمی کا داغ لگایا۔ انھوں نے شاہزادہ علی اصغر کے حال میں ایک جگہ لکھا کہ عالم بے آبی میں پیاس کی شدّت سے غش آ گیا۔ آنکھ کھولی تو مادر مقدسہ نے ع یلاف پڑھی اور اُسے دودھ پلایا + حریف ہر وقت تاک میں تھے کسی نے یہ مصرع ناسخ کے سامنے جا کر پڑھا۔ اُنھوں نے کہا کہ نہیں یوں کہا ہوگا۔ ع پڑھ پڑھ کے لایلاف اُسے دودھ پلایا +

میر انیس مرحوم فرماتے تھے کہ والد میرے گھر میں تشریف رکھتے تھے۔ میں ایک مرثیہ میں وہ روایت نظم کر رہا تھا کہ جناب امام حسینؑ عالم طفولیت میں سواری کے لئے ضد کر رہے تھے۔ جناب آنحضرتؐ تشریف لائے اور فرط شفقت سے خود جھک گئے کہ آؤ سوار ہو جاؤ تاکہ پیارے نواسے کا دل آزردہ نہ ہو۔ اس موقع پر ٹیپ کا دوسرا مصرع کہہ لیا تھا۔ ع اچھا سوار ہو جئے ہم اونٹ بنتے ہیں۔ پہلے مصرع کے لئے الٹ پلٹ کرتا تھا۔ جیسا کہ دل چاہتا تھا ویسا برجستہ نہ بیٹھتا تھا۔ والد نے مجھے غور میں غرق دیکھ کر پوچھا۔ کیا سوچ رہے ہو؟ میں نے مضمون بیان کیا۔

جو مصرع خیال میں آئے تھے پڑھے۔ فرمایا یہ مصرع لگا دو۔ (ذرا زبان کی لطافت کو تو دیکھو)۔

جب آپ روٹھتے ہیں تو مشکل سے منتے ہیں   اچھا سوار ہوجئے ہم اونٹ بنتے ہیں

افسوس کہ ان کی پوری غزل ہاتھ نہ آئی۔ دو شعر یاد ہیں وہی لکھ دیتا ہوں ؎

اشک جو چشم خوں فشاں سے گرا   تھا ستارا کہ آسماں سے گرا

ہنس دیا یار نے جو رات خلیق   کھا کے ٹھوکر اس آستاں سے گرا

خواجہ حیدر علی آتش

آتش تخلّص خواجہ حیدر علی نام۔ باپ دلّی کے رہنے والے تھے۔ لکھنؤ میں جا کر سکونت اختیار کی۔ خواجہ زادوں کا خاندان تھا جس میں مسند فقر بھی قائم تھی۔ اور سلسلہ پیری مریدی کا بھی تھا۔ مگر شاعری اختیار کی اور خاندانی طریقہ کو سلام کر کے اُس میں سے فقط آزادی و بے پروائی کو رفاقت میں لے لیا۔ مصحفی کے شاگرد تھے اور حق یہ ہے کہ ان کی آتش بیانی نے اُستاد کے نام کو روشن کیا۔ بلکہ کلام کی گرمی اور چمک دمک نے اُستاد شاگرد کے کلام میں اندھیرے اُجالے کا امتیاز دکھایا +

استعداد علمی

خواجہ صاحب کی ابتدائی عمر تھی اور استعداد علمی تکمیل کو نہ پہنچی تھی کہ طبیعت مشاعروں میں کمال دکھانے لگی۔ اس وقت دوستوں کی تاکید سے درسی کتابیں دیکھیں باوجود اس کے عربی میں کافیہ کو کافی سمجھ کر آگے پڑھنا فضول سمجھا۔ مشق سے کلام کو قوت دیتے رہے۔ یہاں تک کہ اپنے زمانہ میں مسلّم الثبوت ہو گئے۔ اور سیکڑوں شاگرد دامن تربیت میں پرورش پا کر اُستاد کہلائے +

طرز معاشرت

چھریرا بدن۔ کشیدہ قامت۔ سیدھے سادے بھولے بھالے آدمی تھے۔ سپاہیانہ رندانہ اور آزادانہ وضع رکھتے تھے۔ اور اس لئے کہ خاندان کا تمغہ بھی قائم رہے۔ کچھ رنگ فقیری کا بھی تھا۔ ساتھ اس کے بڑھاپے تک تلوار باندھ کر سپاہیانہ بانکپن کو بھی نباہے جاتے تھے۔ سر پر ایک زلف اور کبھی حیدری جٹّا کہ یہ بھی محمد شاہی

بانکوں کا سکہ ہے۔ اسی میں ایک طرۂ سبزی کا بھی لگائے رہتے تھے اور بے تکلفانہ رہتے تھے۔ اور ایک بانکی ٹوپی بھوں پر دھرے جدھر چاہتے تھے چلے جاتے تھے۔ بالی خاں کی سرائے میں ایک پُرانا سا مکان تھا وہاں سکونت تھی۔ اس محلّے کے ایک طرف اُن کے دل بہلانے کا جنگل تھا۔ بلکہ ویرانوں اور شہر کے باہر جنگلوں میں اکثر پھرتے رہتے تھے۔ ۸۰ روپے کا مہینا بادشاہ لکھنؤ کے ہاں سے ملتا تھا۔ ۱۵ روپے گھر میں دیتے تھے۔ باقی غربا اور اہل ضرورت کو کھلا پلا کر مہینے سے پہلے ہی فیصلہ کر دیتے۔ پھر توکل پر گزارہ تھا۔ مگر شاگردوں یا امرائے شہر میں سے کوئی سلوک کرتا تھا تو اس سے انکار نہ تھا۔ باوجود اس کے ایک گھوڑا بھی ضرور بندھا رہتا تھا۔ اسی عالم میں کبھی آسودہ حال رہتے تھے کبھی ایک آدھ فاقہ بھی گزر جاتا تھا۔ جب شاگردوں کو خبر ہوتی ہر ایک کچھ نہ کچھ لے کر حاضر ہوتا۔ اور کہتا کہ آپ ہم کو اپنا نہیں سمجھتے کہ کبھی اظہار حال نہیں فرماتے۔ جواب میں کہتے کہ تم لوگوں نے کھلا کھلا کر ہمارے نفس حریص کو فربہ کر دیا ہے۔ میر دوست علی خلیل کو یہ سعادت اکثر نصیب ہوتی تھی۔ فقیر محمد خاں گویا خواجہ وزیر یعنی شیخ صاحب کے شاگرد تھے۔ مگر ۲۵ روپے مہینا دیتے تھے۔ سید محمد خاں رند کی طرف سے بھی معمولی نذرانہ پہنچتا تھا +

فقیرانہ حالت

زمانہ نے ان کی تصاویر مضمون کی قدر ہی نہیں کی بلکہ پرستش کی مگر انھوں نے اُسکی جاہ و حشمت سے ظاہر آرائی نہ چاہی۔ نہ امیروں کے درباروں میں جا کر غزلیں سنائیں۔ نہ اُن کی تعریفوں میں قصیدے کہے۔ ایک ٹوٹے پھوٹے مکان میں جس پر کچھ چھت کچھ چھپر سایہ کئے تھے۔ بوریا بچھا رہتا تھا۔ اسی پر ایک لنگ باندھے صبر و قناعت کے ساتھ بیٹھے رہے۔ اور عمر چند روزہ کو اس طرح گزار دیا جیسے کوئی بے نیاز و بے پروا فقیر تکیہ میں بیٹھا ہوتا ہے۔ کوئی متوسط الحال اشراف یا کوئی غریب آتا تو متوجہ ہو کر باتیں بھی کرتے تھے۔ امیر آتا تو دھتکار دیتے تھے۔ وہ سلام کر کے کھڑا رہا کہ آپ فرمائیں تو بیٹھے۔ یہ کہتے۔ ہوں۔ کیوں صاحب! بورئے کو دیکھتے ہو۔ کپڑے خراب

ہوجائیں گے۔ یہ تو فقیر کا تکیہ ہے یہاں مسند تکیہ کہاں! اور یہ حالت شیخ صاحب کی شان و شکوہ کے بالکل برخلاف ہے۔ نتیجہ اس کا یہ ہوا کہ عالم میں مقبول خلائق ہوئے علم والے شاعروں سے پہلو بہ پہلو رہے۔ امیر سے غریب تک اسی فقیرانہ تکیہ میں آکر سلام کر گئے ؎

اے ہما بیش فقیری سلطنت کیا مال ہے بادشا آتے ہیں پابوس گدا کے واسطے

۱۲۶۳ھ ہجری میں ایک دن بھلے چنگے بیٹھے تھے۔ یکایک ایسا موت کا جھونکا آیا کہ شعلہ کی طرح بجھ کر رہ گئے۔ آتش کے گھر میں راکھ کے ڈھیر کے سوا اور کیا ہونا تھا۔ میر دوست علی خلیل نے تجہیز و تکفین کی اور رسوم ماتم بھی بہت اچھی طرح ادا کیں۔ بی بی اور ایک لڑکا لڑکی خُرد سال تھے۔ ان کی بھی سرپرستی بھی وہی کرتے رہے۔ میر علی اوسط رشک نے تاریخ لکھی۔ ع خواجہ حیدر علی اے وا مُردند +

طرز کلام

تمام عمر کی کمائی جسے حیات جاودانی کا مول کہنا چاہئے ایک دیوان غزلوں کا ہے جو کہ ان کے سامنے رائج ہوگیا تھا۔ دوسرا تتمہ ہے کہ پیچھے مرتب ہوا۔ جو کلام اُن کا ہے حقیقت میں محاورۂ اُردو کا دستور العمل ہے۔ اور انشاپردازیٔ ہند کا اعلیٰ نمونہ۔ شرفائے لکھنؤ کی بول چال کا انداز اس سے معلوم ہوتا ہے جس طرح لوگ باتیں کرتے ہیں اُسی طرح انھوں نے شعر کہہ دئے ہیں۔ ان کے کلام نے پسند خاص اور قبول عام کی سند حاصل کی۔ اور نہ فقط اپنے شاگردوں بلکہ بے غرض اہل انصاف کے نزدیک بھی مقبول اور قابل تعریف ہوئے۔ دلیل اس کی اس سے زیادہ نہیں ہوسکتی کہ بار بار چھپتا ہے اور بک جاتا ہے۔ اہل سخن کے جلسوں میں پڑھا جاتا ہے۔ اور عاشقانہ غزلیں موسیقی کی تاثیر کو چمکا کر محفلوں کو گرماتی ہیں +

شیخ صاحب سے مقابلہ

وہ شیخ امام بخش ناسخ کے ہمعصر تھے۔ مشاعروں میں اور گھر بیٹھے روز مقابلے رہتے تھے۔ (دونوں کے معتقد کر انبوہ در انبوہ تھے۔ جلسوں کو معرکے اور معرکوں کو ہنگامے بناتے تھے۔ مگر دونوں بزرگوں پر صد رحمت ہے کہ مرزا رفیع اور سید انشا کی طرح دست و گریباں نہ ہوتے تھے۔ کبھی کبھی نوک جھونک ہوجاتی تھی کہ وہ قابل اعتبار نہیں۔ چنانچہ

خواجہ صاحب نے جب شیخ صاحب کی غزلوں پر متواتر غزلیں لکھیں تو انھوں نے کہا ؎

شیخ صاحب

ایک جاہل کہہ رہا ہے میرے دیواں کا جواب   بو مسیلم نے لکھا تھا جیسے قرآں کا جواب

خواجہ صاحب

کیوں نہ دے ہر مومن اس ملحد کے دیواں کا جواب   جس نے دیواں اپنا ٹھیرایا ہے قرآں کا جواب

حریفوں کے اعتراض

خواجہ صاحب کے کلام میں بول چال محاورے اور روزمرہ کا لطف بہت ہے جو کہ شیخ صاحب کے کلام میں اس درجہ پر نہیں۔ شیخ صاحب کے معتقد اس معاملہ کو ایک اور قالب میں ڈھال کر کہتے ہیں کہ ان کے ہاں فقط باتیں ہی باتیں ہیں۔ کلام میں ریختہ کی پختگی اور ترکیب میں متانت اور اشعار میں عالی مضامین نہیں۔ اور اس سے نتیجہ اُن کی بے استعدادی کا نکالتے ہیں۔ مگر یہ ویسا ہی ظلم ہے جیسا اُن کے معتقد اُن پر کرتے ہیں کہ شیخ صاحب کے شعروں کو اکثر بے معنی اور مہمل سمجھتے ہیں۔ میں نے خود دیوان آتش کو دیکھا۔ کلام مضامین بلند سے خالی نہیں۔ ہاں طرز بیان صاف ہے۔ سیدھی سی بات کو پیچ نہیں دیتے۔ ترکیبوں میں استعارے اور تشبیہیں فارسیت کی بھی موجود ہیں۔ مگر قریب الفہم۔ اور ساتھ اس کے اپنے محاورہ کے زیادہ پابند ہیں۔ یہ درحقیقت ایک وصف خداداد ہے کہ رقابت اُسے عیب کا لباس پہنا کر سامنے لاتی ہے۔ کلام کو رنگینی اور استعارہ و تشبیہ سے بلند کر دکھانا آسان ہے مگر زبان اور روزمرہ کے محاورہ میں صاف صاف مطلب اس طرح ادا کرنا جس سے سُننے والے کے دل پر اثر ہو۔ یہ بات بہت مشکل ہے۔ شیخ سعدی کی گلستاں کچھ چھپی ہوئی نہیں ہے نہ اُس میں نازک خیالات ہیں۔ نہ کچھ عالی مضامین ہیں۔ نہ پیچیدہ تشبیہیں ہیں۔ نہ استعارہ دار فقرے ہیں۔ چھوٹی چھوٹی کہانیاں ہیں۔ صاف صاف باتیں ہیں مینا بازار اور پنج رقعہ کے انداز میں صدہا کتابیں موجود ہیں۔ اس معاملہ میں غور کے بعد معلوم ہوا کہ جو بزرگ خیال بندی اور نازک خیالی کے چمن میں ہوا کھاتے ہیں اول اُن کا یہ مطلب ہوتا ہے کہ ایسے نئے مضمون نکالیں جو کسی نے نہ باندھے ہوں لیکن متقدمین کے اشعار سے کوئی بات بچی ہوئی نہیں دیکھتے تو ناچار نہیں کے

مضامین میں باریکیاں نکال کر موشگافیاں کرتے ہیں۔ اور ایسی ایسی لطافتیں اور نزاکتیں نکالتے ہیں کہ غور سے خیال کریں تو نہایت لطف حاصل ہوتا ہے۔ پھولوں کو پھینک کر فقط رنگ بے گل سے کام لیتے ہیں۔ آئینہ سے صفائی اُتار لیتے ہیں۔ تصویر آئینہ میں سے حیرت نکال لیتے ہیں اور آئینہ پھینک دیتے ہیں۔ نگاہ سُرمگین سے حرف بے آواز کے ساتھ گفتگو کرتے ہیں۔ فی الحقیقت ان مضامین سے کلاموں میں خیالی نزاکت۔ اور لطافت سے تازگی پیدا ہو جاتی ہے۔ اور لوگ بھی تحسین و آفریں کے لئے مستعد ہو جاتے ہیں۔ مگر مشکل یہ ہے کہ ان کے ادا کرنے کو الفاظ ایسے بہم نہیں پہنچتے کہ کہنے والا کہے اور سمجھنے والا صاف سمجھ جائے۔ اس لئے ایسے کلام پُر اثر اور ناخن بر جگر نہیں ہوتے۔ بڑا افسوس یہ ہے کہ اس انداز میں عمومی مطالب نہیں ادا ہو سکتے۔ بے شک بہت مشکل کام ہے۔ مگر اس کی مثال ایسی ہے گویا چنے کی دال پہ مصوّر نے ایک شکار گاہ کی تصویر کھینچ دی یا چاول پر خوشنویس نے قل ہو اللہ لکھ دیا۔ فائدہ دیکھو تو کچھ بھی نہیں۔ اسی واسطے جو فہمیدہ لوگ ہیں وہ ادائے مطلب اور طرزِ کلام میں صفائی پیدا کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ اُسی میں کوئی نئی بات نکل آئی تو نکل آئی۔ ایسے اونچے نہ جائیں گے کہ بالکل غائب ہو جائیں اور سُننے والے منہ دیکھتے رہ جائیں۔ البتہ کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ اِن ترکیبوں کی پیچیدگی اور لفظوں کی باریکی و تاریکی میں جواہرات معنی کا بھرم ہوتا ہے اور اندر سے دیکھتے ہیں تو سیدھی سی بات معلوم ہوتی ہے۔ جسے اُن کے حریف کوہ کندن اور کاہ برآوردن کہتے ہیں۔ مگر انصاف یہ ہے کہ دونوں لطف سے خالی نہیں ؎

گلہائے رنگ رنگ سے ہے زینتِ چمن — اے ذوقؔ اس جہاں کو ہے زیب اختلاف سے

حریفوں کو اعتراض بھی ہیں

شیخ صاحب کے معتقد خواجہ صاحب کے بعض الفاظ پر بھی گفتگو کرتے ہیں۔ چنانچہ کہتے ہیں کہ جب اُنھوں نے یہ شعر پڑھا ؎

دخترِ رز مری مونس ہے مری ہمدم ہے — میں جہانگیر ہوں وہ نور جہاں بیگم ہے

لوگوں نے کہا کہ حضور! بیگم ترکی لفظ ہے اہل زبان گاف پر پیش بولتے ہیں اور زبان فارسی کا قاعدہ بھی یہی چاہتا ہے۔ یہ اُس وقت بھنگیائے ہوئے بیٹھے تھے کہا کہ ہونھ۔ ہم ترکی نہیں بولتے۔ ترکی بولیں گے تو بیگم کہیں گے +

اسی طرح جب انھوں نے یہ مصرع کہا ع اس خوان کی نمش کفِ مار سیاہ ہے +

لوگوں نے کہا کہ قبلہ! یہ لفظ فارسی اور اصل میں نمشک ہے۔ انھوں نے کہا کہ جب فارس میں جائیں گے تو ہم بھی نمشک کہیں گے۔ یہاں سب نمش کہتے ہیں تو نمش ہی شعر میں باندھنا چاہیے +

پیشگی دل کو جو دے لے۔ وہ اسے تحصیلے ساری سرکاروں سے ہے عشق کی سرکار جدا

حریفوں نے کہا کہ پیشگی ترکیب فارسی سے ہے۔ مگر فارسی والوں کے استعمال میں نہیں۔ انھوں نے کہا کہ یہ ہمارا محاورہ ہے +

یہاں تک تو درست ہے۔ مگر بعض مواقع پر جوان کے حریف کہتے ہیں تو انہیں بھی لاجواب ہونا پڑتا ہے۔ چنانچہ دیوان میں ایک غزل ہے۔ صاف ہوا۔ معاف ہوا۔ خلاف ہوا۔ اُس میں فرماتے ہیں:۔

زہر بہ ہیز ہو گیا مجھ کو درد درماں سے المضاف ہوا

اس ٹھوکر کھانے کا سبب یہ معلوم ہوتا ہے عوام کے تلفظ میں المضاعف۔ جو المضاف بولا جاتا ہے۔ وہ اس کی اصلیت کے دھوکے میں رہے +

خواجہ صاحب شاید حلوا کو حلوہ سمجھے جو فرماتے ہیں:۔

لعل شکر بار کا بوسہ میں کیونکر نہ لوں کوئی نہیں چھوڑتا حلوۂ بے دود کو

کفارہ کو بھی عوام بے تشدید بولتے ہیں۔ چنانچہ خواجہ صاحب نے بھی کہہ دیا:۔

رنگ زرد و لب خشک و مژۂ خوں آلود کشتۂ عشق ہیں ہم۔ ہے یہ کفارہ اپنا

لکھے ہیں سرگذشتِ دل کے مضموں یکقلم اسمیں تماشا قتل گہ کا ہے مطالع میرے دیواں کا

کشاکش دم کی مارِ آستیں کا کام کرتی ہے دلِ بیتاب کو پہلو میں اک گرگِ بغل مارا

مخالف کہتے ہیں کہ بغلی گھونسا اُردو کا محاورہ ہے۔ مارِ آستیں فارسی کا محاورہ ہے۔ گرگِ بغل کے لئے فارسی کی سند چاہئے۔ بے سند صحیح نہیں +

چار ابرو میں تری حیراں ہیں سارے خوشنویس — کس قلم کا قطعہ ہے یہ کاتبِ تقدیر کا

یہاں چار ابرو بمعنی چہرہ لیا ہے۔ اور محاورہ میں چار ابرو کا لفظ بغیر صفائی کے نہیں آتا۔ جس سے مراد یہ ہے کہ ابرو اور ریش و بروت کو چٹ کردیں۔ وہ بے نواؤں اور قلندروں کے لئے خاص ہے نہ کہ معشوق کے لئے۔ سید انشا نے کیا خوب کہا ہے:۔

اک بے نوا کے لڑکے پہ مرتے ہیں شیخ جی — عاشق ہوئے ہیں واہ عجب لُنڈ مُنڈ پر (سید انشا)

بہارِ گلستاں کی ہے آمد آمد — خوشی پھرتے ہیں باغباں کیسے کیسے (آتش)

خوش پھرتے ہیں چاہئے +

لعب بازی کی بھی حسرت نہ رہی اے آتش — میرے اللہ نے بازیچۂ تن مجھ کو دیا

بھلا دیکھیں تو گو بازی میں سبقت کون کرتا ہے — ادھر ہم بھی ہیں توسن پر اُدھر تم بھی ہو توسن پر

ابروئے یار کا ہے سر میں جنوں کے سودا — رقص وہ لوگ کیا کرتے ہیں تلواروں پر

نہیں غم تیغ ابروئے صنم سے قتل ہونے کا — شہادت بھی بمنزل فتح کے ہے مردِ غازی کو

سودائی حسان کر تری چشمِ سیاہ کا — ڈھیلے لگاتے ہیں مجھے دیدہ غزال کے

اس صنعت مراعاۃ النظیر کو تکلیف زائد سمجھتے ہیں +

حریف بعض اور قسم کے جزئیات پر بھی اعتراض کرتے ہیں۔ مثلاً خواجہ صاحب فرماتے ہیں:۔

قدرتِ حق ہے صباحت سے تماشا ہے وہ رُخ — خالِ مشکیں دلِ فرعون ید بیضا ہے وہ رُخ

کا بنتا ہے آہ سے میری رقیب رُو سیاہ — اژدہا فرعون کو موسیٰ کا عصا معلوم ہے

چکھ کے یاقوتیِ لب کو تری بیخود ہوئے ہم — نشہ معجوں میں مئے ہوش رُبا کا نکلا

حالِ مستقبل نجومی اُس سے کرتے ہیں بیاں — زائچہ بھی نقل ہے پیشانی کی تحریر کا

جو کہ قسمت میں لکھا ہے جان ہو دیگا وہی — پھر عبث کا ہے کو طالع آزمائی کیجئے (لا اعلم)

آتش	رات بھر آنکھوں کو اس اُمید پر رکھتا ہوں بند	خواب میں شاید کہ دیکھوں طالعِ بیدار کو
جرأت	بند آنکھیں کئے رہتا ہوں پڑا	خواب میں آئے نظر تا کوئی
آتش	دولتِ عشق کا گنجینہ وہی سینہ ہے	داغِ دل۔ زخم جگر۔ مُہر و نشاں ہے کہ جو تھا
خواجہ حافظ	گوہرِ مخزنِ اسرار ہمان ست کہ بود	حقّهٔ مہر بداں مہر و نشان ست کہ بود
آتش	آنکھیں نہیں ہیں چہرہ پہ تیرے فقیر کے	دو ٹھیکرے ہیں بھیک کے دیدار کے لئے
میر صاحب	کاسۂ چشم لے کے جوں نرگس	ہم نے دیدار کی گدائی کی

ان کے کلام میں بھی بعض الفاظ ایسے ہیں جو دلّی اور لکھنؤ کی زبان میں پورب پچھم کا فرق دکھاتے ہیں۔ دلّی والے اندھیری کہتے ہیں۔ اور انھوں نے اندھیاری باندھا ہے۔ چنانچہ کئی شعر شیخ ناسخ کے حال[1] میں لکھے گئے +

خواجہ صاحب فرماتے ہیں :۔

بلند و پست عالم کا بیاں تحریر کرتا ہے ۔۔۔ قلم ہے شاعروں کا یا کوئی رہرو ہے بیہڑ کا

بیہڑ کا لفظ دلّی میں مستعمل نہیں۔ بل بے۔ دلّی کے شعرا باندھتے تھے۔ آج کل کے لوگ اس کو بھی متروک سمجھتے ہیں۔ مگر خواجہ صاحب فرماتے ہیں :۔

خانہ خراب نالوں کی بل بے شرارتیں ۔۔۔ بہتی ہیں پانی ہو ہو کے سنگیں عمارتیں

متاخرین لکھنؤ اور دہلی کے فارسی جمع کو بے اضافت یا صفت کے نہیں لاتے مگر یہ اکثر باندھتے ہیں۔ دیکھو اشعار مفصلہ ذیل :۔

رفتگاں کا بھی خیال اہل عالم چاہئے	عالم ارواح سے صحبت کوئی دم چاہئے
رہگذر میں دفن کرنا اے عزیزاں تم مجھے	شاید آجائے کسی کے میرا مدفن زیرِ پا
بھاگو نہ مجکو دیکھ کے بے اختیار دور	اے کودکاں ابھی تو ہے فصلِ بہار دور
کیا نفاق انگیز ہمجنساں ہوائے دہر ہے	نیند اُڑ جاتی ہے سُننے سے نفیرِ خواب کو
روز و شب رویا میں یادِ رفتگاں کی یاد میں	عمر بھر آنکھیں نہ بھولیں صورتِ احباب کو

[1] دیکھو صفحہ ۳۷۱

عہد طفلی میں تھا میں بسکہ سودائی مزاج بیڑیاں منّت کی بھی پہنیں تو میں نے بھاریاں
اے خط اُس کے گورے گالوں پر یہ تونے کیا کیا چاندنی راتیں یکایک ہوگئیں اندھیاریاں
صفت کو اس طرح موصوف کی مطابقت کے لئے جمع کرنا خلاف فصاحت سمجھتے ہیں۔ ایک دفعہ میر تقی ترقی کے ہاں مشاعرہ میں خواجہ صاحب نے غزل پڑھی کہ تکلم کے مضمون میں بوج بحر کافور۔ باندھا تھا۔ طالب علی خاں عیشی نے وہیں ٹوکا۔ انھوں نے جواب دیا میاں ابھی بہت مدت چاہئے دیکھو تو سہی جامی کیا کہتا ہے:۔

طالب علی خاں عیشی سے معرکہ

دو پستانش بہم چوں قبۂ نور حبابے خاستہ از بحرِ کافور

ساتھ ہی میر مشاعرہ سے کہا کہ۔ قبلہ اب کی دفعہ یہی طرح ہو ؎

یہ بزم وہ ہے کہ لا خیر کا مقام نہیں ہمارے گنجفہ میں بازیٔ غلام نہیں

وہ بچارے بھی کسی کے متبنّٰی تھے۔ اسی مطلع کو یار لوگوں نے شیخ ناسخ کے گلے باندھا۔ کتب تواریخ سے معلوم ہوتا ہے کہ شعراء جو شاگردان الٰہی ہیں مجازی استادوں کے ساتھ اُن کی بگڑتی ہی چلی آئی ہے۔ چنانچہ ان کا بھی اُستاد سے بگاڑ ہوا۔ خدا جانے بنیاد کن کن جزئیات پر قائم ہوئی ہوگی۔ اور ان میں حق کس کی طرف تھا۔ آج۔ اصل حقیقت دور کے بیٹھنے والوں پر کُھلنی مشکل ہے مگر جہاں سے کھلم کُھلا بگڑی اُس کی حکایت یہ سنی گئی کہ شیخ مصحفی ابھی زندہ تھے اور خواجہ صاحب کی طبیعت بھی اپنی گرمیاں دکھانے لگی تھی۔ جو مشاعرہ میں طرح ہوئی۔ دہن بگڑا۔ یاسمن بگڑا۔ اس میں سب نے غزلیں لکھیں۔ خواجہ صاحب نے غزل لکھ کر شیخ مصحفی اپنے استاد کو سنائی۔ اور جب یہ شعر سُنائے:۔

استاد سے بگڑ گئی

امانت کی طرح رکھا زمیں نے روز محشر تک نہ اک مو کم ہوا اپنا نہ اک تارِ کفن بگڑا
لگے منہ بھی چڑانے دیتے دیتے گالیاں صاحب زباں بگڑی تو بگڑی تھی خبر لیجے دہن بگڑا

نشہ کے سرور میں آکر کہا کہ اُستاد! اس ردیف قافیہ میں کوئی یہ شعر نکالے تو کلیجہ نکل پڑتا ہے۔ انھوں نے ہنس کر کہا کہ ہاں میاں سچ کہتے ہو اب تو کسی سے ایسے شعر نہیں ہو سکتے۔

بعد اس کے شاگردوں میں سے ایک نومشق لڑکے کی غزل کو توجہ سے بنایا اور اس میں انھیں دو قافیوں کو اس طرح باندھا۔

لکھا ہے خاک کوئے یار سے اے دیدۂ گریاں قیامت میں کروں گا گر کوئی حرفِ کفن بگڑا

نہ ہو محسوس جو شے کس طرح نقشہ میں ٹھیک اُترے شبیہ یار کھچوائی۔ کمر بگڑی دہن بگڑا

اگرچہ اُن شعروں میں اور اِن شعروں میں جو نسبت ہے وہ ان جواہرات کے پرکھنے والے ہی جانتے ہیں۔ لیکن مشاعرہ میں بہت تعریف ہوئی۔ پھر بھی چونکہ لڑکے کے مُنہ پر یہ شعر کھلتے نہ تھے۔ اس لئے تاڑنے والے تاڑ گئے کہ اُستاد کی اُستادی ہے۔ خواجہ صاحب اُسی وقت اُٹھ کر شیخ مصحفی کے پاس جا بیٹھے۔ اور غزل ہاتھ سے پھینک کر کہا کہ۔ یہ آپ ہمارے کلیجہ میں چھریاں مارتے ہیں۔ نہیں تو اس لونڈے کا کیا مُنہ تھا جو اِن قافیوں میں شعر نکال لیتا۔ خیر اس قسم کی باتیں اُستاد کے ساتھ بچّوں کی شوخیاں اور لڑکپن کے ناز ہیں جو کہ سُننے والوں کو اچھے معلوم ہوتے ہیں اور طبیعتوں میں جوشِ ترقی پیدا کرتے ہیں۔ لیکن سعادت مند شاگرد کو اُستاد کے مرتبہ اور اپنی حد کا اندازہ رکھنا واجب ہے تاکہ خاقانی اور ابوالعلائی گنجوی کی طرح دونوں طرف سے کثیف اور غلیظ ہجوؤں تک نوبت نہ پہنچے۔ نہیں تو قیامت تک دونوں رسوائے عالم ہوتے رہیں گے۔ چنانچہ خواجہ صاحب کی شرافت و نجابت جس نے اُنھیں اس آئین کا پابند رکھا اس معاملہ میں قابل تعریف ہے +

بعض عمدہ اشعار تھے جو کلیات میں نہیں

میر مہدی حسن فراغ سے ان کے نہایت گرم اور پسندیدہ اشعار ایسے بھی سُنے گئے جو کلیات مروجہ میں نہیں ہیں۔ سبب یہ ہوا کہ ایک صاحب اس زمانہ میں نہایت خوش مذاق اور صاحب فہم تھے۔ جو خود شاعر تھے اور اُن کے ہاں بڑی دھوم دھام سے مشاعرہ ہوتا تھا۔ خواجہ صاحب بھی جاتے تھے اور مشاعرہ میں غزل پڑھ کر وہیں

[1] بعض لوگوں کی زبانی سُنا گیا کہ شیخ مصحفی نے پنڈت دیا شنکر مصنف گلزار نسیم کو یہ شعر کہہ کر دئے جو اوّل انھیں کے شاگرد تھے مگر یہ شہرت قابل اعتبار نہیں +

دے آتے تھے۔ بعد انتقال کے جب شاگرد دیوان مرتب کرنے لگے تو بہت سی غزلیں اُنھیں پیر مشاعرہ سے حاصل ہوئیں۔ خدا جانے عمداً یا اُن کی بے اعتنائی سے بعض اشعار دیوان میں نہ آئے۔ لیکن چونکہ وہ شاگرد شیخ ناسخ کے تھے۔ اس لئے بدگمانی لوگوں کو گنہگار کرتی ہے +

جب شیخ ناسخ کا انتقال ہوا تو خواجہ صاحب نے ان کی تاریخ کہی۔ اور اُس دن سے شعر کہنا چھوڑ دیا کہ کہنے کا لطف سُننے اور سُنانے کے ساتھ ہے۔ جس شخص سے سُنانے کا لُطف تھا۔ جب وہ نہ رہا تو اَب شعر کہنا نہیں بکواس ہے +

حالات سے معلوم ہوتا ہے کہ طبیعت کی آزادی اور کلام کے کمال نے ظاہر آرائی کے ذوق شوق سے بے پروا کر دیا تھا۔ مگر مزاج میں ظرافت ایسی تھی کہ ہر قسم کا خیال لطایف وظرایف ہی میں ادا ہوتا تھا +

لطیفہ - ایک شاگرد اکثر بے روزگاری کی شکایت سے سفر کا ارادہ ظاہر کیا کرتے تھے۔ اور خواجہ صاحب اپنی آزادہ مزاجی سے کہا کرتے تھے کہ میاں کہاں جاؤ گے! دو گھڑی مل بیٹھنے کو غنیمت سمجھو۔ اور جو خدا دیتا ہے اُس پر صبر کرو۔ ایک دن وہ آئے اور کہا حضرت! رخصت کو آیا ہوں۔ فرمایا۔ خیر باشد۔ کہاں! انھوں نے کہا۔ کل بنارس کو روانہ ہوں گا۔ کچھ فرمایش ہو تو فرما دیجئے۔ آپ ہنس کر بولے اتنا کام کرنا کہ وہاں کے خدا کو ذرا ہمارا بھی سلام کہہ دینا۔ وہ حیران ہو کر بولے کہ حضرت! یہاں اور وہاں کا خدا کوئی جُدا ہے؟ فرمایا کہ شاید یہاں کا خدا بخیل ہے وہاں کا کچھ سخی ہو۔ انھوں نے کہا نعوذ اللہ آپ کے فرمانے کی یہ بات ہے؟ خواجہ صاحب نے کہا کہ بھلا سنو تو سہی جب خدا وہاں یہاں کا ایک ہے تو پھر ہمیں کیوں چھوڑتے ہو۔ جس طرح اُس سے وہاں جا کر مانگو گے اسی طرح یہاں مانگو۔ جو وہاں دے گا تو یہاں بھی دے گا۔ اس بات نے ان کے دل پر ایسا اثر کیا کہ سفر کا ارادہ موقوف کیا اور خاطر جمع سے بیٹھ گئے +

خواجہ صاحب کی سیدھی سادی طبیعت اور بھولی بھالی باتوں کے ذکر میں میر انیس مرحوم

نے فرمایا کہ ایک دن آپ کو نماز کا خیال آگیا۔ کسی شاگرد سے کہا کہ بھئی ہمیں نماز تو سکھاؤ۔ وہ اتفاقاً فرقۂ سنت جماعت سے تھا۔ اُس نے ویسی ہی نماز سکھادی اور یہ کہہ دیا کہ اُستاد! عبادت الٰہی جتنی پوشیدہ ہو اُتنی ہی اچھی ہوتی ہے۔ جب نماز کا وقت ہوتا یہ حجرہ میں جاتے یا گھر کا دروازہ بند کرکے اُسی طرح نماز پڑھا کرتے۔ میر دوست علی خلیل اُن کے شاگرد خاص اور خلوت و جلوت کے حاضر باش تھے۔ ایک دن انھوں نے بھی دیکھ لیا۔ بہت حیران ہوئے۔ یہ نماز پڑھ چکے تو انھوں نے کہا کہ استاد! آپ کا مذہب کیا ہے؟ فرمایا شیعہ۔ ہیں! یہ کیا پوچھتے ہو؟ انھوں نے کہا کہ نماز سنّیوں کی؟ فرمایا کہ بھئی میں کیا جانوں۔ فلاں شخص سے میں نے کہا تھا۔ اُس نے جو سکھادی سو پڑھتا ہوں مجھے کیا خبر کہ ایک خدا کی دو دو نمازیں ہیں۔ اُس دن سے شیعوں کی طرح نماز پڑھنے لگے جتنے شاگرد اُنھوں نے پائے کسی اُستاد کو نصیب نہیں ہوئے۔ ان میں سے سید محمد خاں رند۔ میر وزیر علی صبا۔ میر دوست علی خلیل۔ ہدایت علی جلیل۔ صاحب مرزا تشنا در۔ مرزا عنایت علی بسمل۔ اور مرزا فیض آبادی نامور شاگرد تھے کہ رتبۂ اُستادی رکھتے تھے۔

غزل

سُن تو سہی جہاں میں ہے تیرا فسانہ کیا؟ کہتی ہے تجھ کو خلقِ خدا غائبانہ کیا؟

کیا کیا اُلجھتا ہے تری زلفوں کے تار سے بخیہ طلب ہے سینۂ صد چاک شانہ کیا؟

زیرِ زمیں سے آتا ہے جو گُل سو زر بکف قاروں نے راستہ میں لُٹایا خزانہ کیا؟

اُڑتا ہے شوقِ راحتِ منزل سے اسپِ عمر مہمیز کس کو کہتے ہیں اور تازیانہ کیا؟

زینہ صبا کا ڈھونڈتی ہے اپنی مشتِ خاک بامِ بلند یار کا ہے آستانہ کیا؟

چاروں طرف سے صورتِ جاناں ہو جلوہ گر دل صاف ہو ترا تو ہے آئینہ خانہ کیا؟

صیاد! اسیرِ دامِ رگِ گُل ہے عندلیب دکھلا رہا ہے چھپ کے اُسے آب و دانہ کیا!

طبل و علم ہی پاس ہے اپنے نہ ملک و مال ہم سے خلاف ہو کے کرے گا زمانہ کیا؟

آتی ہے کس طرح سے مری قبضِ روح کو دیکھوں تو موت ڈھونڈ رہی ہے بہانہ کیا؟

ہوتا ہے زرد سُن کے جو نامرد مدعی رستم کی داستاں ہے ہمارا فسانہ کیا؛
بے یار سازوار نہ ہوگا وہ گوش کو مُطرب ہمیں سُناتا ہے اپنا ترانہ کیا؛
صیاد گلعذار دکھاتا ہے سیر باغ بلبل قفس میں یاد کرے آشیانہ کیا؛
ترچھی نظر سے طائرِ دل ہو چکا شکار جب تیر کج پڑے گا اُڑے گا نشانہ کیا؛
بیتاب ہے کمال ہمارا دلِ حزیں مہماں سرائے جسم کا ہوگا روانہ کیا؛

یاں مدعی حسد سے نہ دے داد تو نہ دے
آتش غزل یہ تونے لکھی عاشقانہ کیا[1]؛

خانہ خراب نالوں کی بل بے شرارتیں بہتی ہیں پانی ہو ہو کے سنگیں عمارتیں
سر کون سا ہے جس میں کہ سودا نہیں ترا ہوتی ہیں تیرے نقش قدم کی زیارتیں
خانہ ہے گنجفے کا ہراک قصرِ شہرِ عشق گھر گھر میں بادشاہیاں گھر گھر وزارتیں
دیدار یار برق تجلّے سے کم نہیں بند آنکھیں ہونگی۔ دینگی دعائیں بصارتیں
آنکھوں میں اپنی دولتِ بیدار ہیں وہ خواب ہوتی ہیں تیرے وصل کی جن میں بشارتیں
کہتے ہیں مادر و پدرِ مہرباں کو بد کرتے ہیں وہ جو ارض و سما کی حقارتیں
گویا زبان ہو تو کرے شکر آدمی سمجھے جو تو تو کرتے ہیں یہ گنگ اشارتیں
زیرِ زمیں بھی یاد ہیں ہفت آسماں کے ظلم بھولا نہیں میں سنگدلوں کی شرارتیں
خضر و مسیح کاٹتے ہیں رشک سے گلا تو بھی تو کر شہیدوں کی اپنی زیارتیں
عالم کو لُٹ کھایا ہے اک پیٹ کے لئے اس غار میں گئی ہیں ہزاروں ہی غارتیں
باقی رہے گا نام ہمارا نشاں کے ساتھ اپنی بھی چند بیتیں ہیں اپنی عمارتیں
اہلِ جہاں کا حال ہے کیا، ہم سے کیا کہیں؟ بدگوئیاں ہیں پیچھے تو منہ پر اشارتیں
نقش و نگارِ حُسنِ بتاں کا نہ کھا فریب مطلب سے خالی جان لے تو یہ عبارتیں

[1] غزل لاجواب ہے مگر مقطع میں جو کیا۔ کا پہلو رکھا ہے اُس کی یہ جگہ نہیں۔ انصاف اس کا میر انیس مرحوم کے خاندان کی زبان پر ہے ۔

عاشق ہیں۔ ہم کو مد نظر کوئے یار ہے | کعبہ کے حاجیوں کو مبارک زیارتیں
ایسی خلاف ہم سے ہوئی ہے ہوائے دہر | کافور کھائیے تو ہوں پیدا حرارتیں

آتش یہ شش جہت ہے مگر کوچہ یار کا
چاروں طرف سے ہوتی ہیں ہم پہ اشارتیں

باغباں انصاف پر بلبل سے آیا چاہئے | پینچنی اس کو زرِ گل کی بہنایا چاہئے
فرش گل بلبل کی نیت سے بچھایا چاہئے | شمع پروانوں کی خاطر سے جلایا چاہئے
پان بھی کھاؤ جمائی ہے جو مسّی کی دھڑی | شام تو دیکھی شفق کو بھی دکھایا چاہئے
آئینے میں خطِ نورس کا نظارہ کیجئے | آہوانِ چشم کو ریحاں چرایا چاہئے
بوسہ اس لب کا ہے قوت بخش روحِ ناتواں | ایسی یاقوتی میسر ہو تو کھایا چاہئے
عشق میں حدِ ادب سے آگے رہتا ہے قدم | شاخِ گلبن پر سے بلبل کو اُڑایا چاہئے
دیکھئے کرتا ہے کیونکر یار سے گستاخیاں! | شوق کے بھی حوصلے کو آزمایا چاہئے
ہو گیا ہے ایک مدت سے دلِ نالاں خموش | باغ میں چل کر اسے بلبل سُنایا چاہئے
فصل گل ہے چار دن ساقی تکلف ہے ضرور | پر جواہر کے بطِ مے کو لگایا چاہئے
خم میں جوشِ مے سے مجکو یہ صدا ہے آرہی | ظرف مستی ہو تو کیفیت اُٹھایا چاہئے
حالِ دل کچھ کچھ کہا میں نے تو بولا سُن کے یار | بس عبارت ہو چکی مطلب پہ آیا چاہئے
شیر سے خالی نہیں رہتا نیستاں زینہار | بوریائے فقر بچھا چھوڑ جایا چاہئے
رنگ زرد و چشم تر سے کیجئے دعوائے عشق | دو گواہِ حال اس قضیے کے لایا چاہئے
رام ہوتے ہی نہیں۔ وحشی مزاجی ہے سوا | ان سیہ چشموں کو چوپہرہ جگایا چاہئے
دیکھ کر خلوت سرائے یار کہتے ہیں فقیر | عود کی مانند یاں دھونی لگایا چاہئے

خاطرِ آتش سے کہئے چند جز شعر اور بھی
بے نشاں کا نام باقی چھوڑ جایا چاہئے

فریبِ حُسن سے گبر و مسلماں کا چلن بگڑا | خدا کی یاد بھولا شیخ۔ بُت سے برہمن بگڑا

قبائے گل کو پھاڑا جب مرا گل پیرہن بگڑا — بن آئی کچھ نہ غنچہ سے جو وہ غنچہ دہن بگڑا

نہیں بیوجہ ہنسنا اس قدر زخمِ شہیداں کا — تری تلوار کا مُنہ کچھ نہ کچھ اے تیغ زن بگڑا

تکلف کیا جو کھوئی جان شیریں پھوڑ کر سر کو — جو غیرت تھی تو پھر خسرو سے ہوتا کوہکن بگڑا

کسی چشمِ سیہ کا جب ہوا ثابت میں دیوانہ — تو مجھ سے مست ہاتھی کی طرح جنگلی ہرن بگڑا

اثر اکسیر کا یمنِ قدم سے تیرے پایا ہے — جذامی خاک رہ مَل کر بناتے ہیں بدن بگڑا

تری تقلید سے کبکِ دری نے ٹھوکریں کھائیں — چلا جب جانور انساں کی چال اس کا چلن بگڑا

زوالِ حُسن کھلواتا ہے میوے کی قسم مجھ سے — لگایا داغ خط نے آن کر سیبِ ذقن بگڑا

رُخِ سادہ نہیں اُس شوخ کا نقشِ عداوت ہے — نظر آتے ہی آپس میں ہر اہلِ انجمن بگڑا

وہ بدخو طفل اشک اے چشم تر ہیں دیکھنا اک دن — گھروندے کی طرح سے گنبدِ چرخِ کہن بگڑا

صفِ مژگاں کی جنبش کا کیا اقبال نے کشتہ — شہیدوں کے ہوئے سالار جب ہم سے تمن بگڑا

کسی کی جب کوئی تقلید کرتا ہے میں روتا ہوں — ہنسا گُل کی طرح غنچہ جہاں اُس کا دہن بگڑا

کمالِ دوستی اندیشۂ دشمن نہیں رکھتا — کسی بھونرے سے کس دن کوئی مارِ یاسمن بگڑا

رہی نفرت ہمیشہ داغِ عریانی کو پھاہے سے — ہوا جب قطع جامہ پر ہمارے پیرہن بگڑا

رگڑوائیں یہ مجھ سے ایڑیاں غربت میں وحشت نے — ہوا مسدود رستہ جادۂ راہِ وطن بگڑا

کہا بلبل نے جب توڑا گلِ سوسن کو گلچیں نے — الٰہی خیر کیجو نیلِ رُخسارِ چمن بگڑا

ارادہ میرے کھانے کا نہ اے زاغ و زغن کیجو — وہ کشتہ ہوں جسے سونگھے سے کتوں کا بدن بگڑا

امانت کی طرح رکھّا زمیں نے روزِ محشر تک — نہ اِک مو کم ہوا اپنا نہ اک تارِ کفن بگڑا

جہاں خالی نہیں رہتا کبھی ایذا دہندی سے — ہوا ناسورِ نو پیدا اگر زخمِ کہن بگڑا

تونگر تھا بنی تھی جب تک اُس محبوبِ عالم سے — میں مفلس ہو گیا جس روز سے وہ سیمتن بگڑا

لگے مُنہ بھی چڑانے دیتے دیتے گالیاں صاحب — زباں بگڑی تو بگڑی تھی خبر لیجے دہن بگڑا

بناوٹ کیفِ مَے سے کھُل گئی اُس شوخ کی آتش
لگا کر مُنہ سے پیمانہ کو وہ پیماں شکن بگڑا

شاہ نصیر

نصیر تخلص۔ نصیر الدین نام تھا۔ مگر چونکہ رنگت کے سیاہ فام تھے۔ اس لئے گھرانے کے لوگ میاں کلّو کہتے تھے۔ وطن ان کا خاص دہلی تھا۔ والد شاہ غریب ایک بزرگ تھے کہ اپنی غربت طبع اور خاکساریِ مزاج کی بدولت اسم بامسمّٰی غریب تھے۔ نیک نیتی کا ثمرہ تھا کہ نام کی غریبی کو امیری میں بسر کرتے تھے۔ شہر کے رئیس اور امیر سب ادب کرتے تھے۔ مگر وہ گوشۂ عافیت میں بیٹھے اپنے معتقد مریدوں کو ہدایت کرتے رہتے تھے۔ ان کے بزرگوں کے نام چند گاؤں دربار شاہی سے آل تمغا معاف تھے۔ ملا ماجرا اور ہرسانہ علاقہ سونی پت میں۔ سلیم پور علاقہ غازی آباد میں وزیر آباد۔ شہر دہلی کے پاس جہاں مخدوم شاہ عالم کی درگاہ ہے اور اب تک ۷۔ جمادی الاول کو وہاں عرس ہوتا ہے۔ اب فقط مولربن ایک گاؤں بلب گڈھ کے علاقہ میں سید عبد اللہ شاہ ان کے سجادہ نشیں کے نام پر واگذاشت ہے۔ غرض کہ شاہ غریب مرحوم نے اس اکلوتے بیٹے کو بڑی نازونعمت سے پالا تھا۔ اور استاد و ادیب نوکر رکھ کر تعلیم کیا تھا*

جاگیر معافی

عجیب اتفاق ہے کہ وہ کتابی علم میں کماحقہٗ کامیاب نہ ہوئے۔ البتہ نتیجہ خیز اس کا اہل علم سے بہتر حاصل تھا۔ کیونکہ جو وہ کہتے تھے اُسے عالم کان لگا کر سُنتے تھے۔ جو لکھتے تھے اُس پر فاضل سر دُھنتے تھے۔ ان کی طبیعت شعر سے ایسی مناسب واقع ہوئی تھی کہ بڑے بڑے ذی استعداد اور مشاق شاعر۔ مشاعروں میں مُنہ دیکھتے رہ جاتے تھے۔ سلسلۂ تلمذ دو واسطہ سے سوؔدا اور دردؔ تک پہنچتا ہے۔ کیونکہ یہ شاہ محمدی مائل کے شاگرد تھے۔ اور وہ قیام الدین قائم کے۔ قائم نے سوؔدا سے بھی اصلاح لی اور خواجہ میر درؔد سے بھی۔ انھوں نے انگریزی عملداری میں زندگی بسر کی۔ لیکن شاہ عالم کے زمانہ میں شاعری جوہر دکھانے لگی تھی۔ اور خاندانی عظمت نے ذاتی کمال کی

استعداد علمی

شاگردی

سفارش سے دربار تک پہنچا دیا تھا۔ دربار کے اہل کمال کو عیدوں اور جشنوں کے علاوہ ہر فصل اور موسم پر سامان مناسب انعام ہوتے تھے۔ شعراء کو دیر ہوتی تو تقاضے سے بھی وصول کر لیتے تھے۔ ایک قطعہ بطور حُسن طلب جاڑے کے موسم میں انھوں نے کہہ کر دیا تھا اور صلہ حاصل کیا تھا۔ اس کے دو شعر مجھے یاد ہیں :-

بچائے گا تو ہی اسے میرے اللہ		کہ جاڑے سے پڑا بیڈھب ہے پالا
پناہِ آفتاب اب مجھ کو بس ہے		کہ وہ مجھ کو اُڑھاوے گا دوشالا

اس میں لطف یہ ہے کہ آفتاب شاہ عالم بادشاہ کا تخلّص تھا۔

سیاحی کی دولت میں سے جو سرمایہ انھیں حاصل ہوا وہ بھی شاعری کی برکت سے تھا۔ جس کی مسافت جنوب میں حیدر آباد تک اور مشرق میں لکھنؤ تک پہنچی۔ اگرچہ دربار کے علاوہ تمام شہر میں بھی ان کی قدر اور عزت ہوتی تھی۔ مگر جن لوگوں کی عادتیں ایسے درباروں میں بگڑی ہوتی ہیں اُن کے دل تعلیم یافتہ حکومتوں میں نہیں لگتے اسی واسطے جب علداری انگریزی ہوئی تو انھیں دکن کا سفر کرنا پڑا۔

دکن کا سفر

دکن میں دیوان چندو لال کا دَور تھا۔ اگرچہ کمال کی قدر دانی اور سخاوت اُن کی عام تھی۔ مگر دلّی والوں پر نظر پرورش خاص رکھتے تھے اور بہت مروّت سے پیش آتے تھے۔ بڑی خوش نصیبی یہ تھی کہ وہ شعر و سخن کا مذاق رکھتے تھے غرض وہاں شاہ صاحب نے خاطر خواہ قیمت پائی۔ لیکن دلّی کا چٹخارا بھی ایسا نہیں کہ انسان بھول جائے۔ اس لئے انعام و اکرام سے مالا مال ہو کر پھر دلّی آئے اور تین دفعہ پھر گئے۔

دکن میں ان کے لئے دولت کے فرشتے نے ضیافت نہ کی۔ بلکہ حُسن شاعری کی زہرہ آسمان سے اُتری اور شمس ولی کے عہد کا پرتو پھر دلوں پر ڈالا۔ شعر گوئی کے شوق جو برسوں سے بجھے چراغوں کی طرح طاقوں میں پڑے تھے دل دل میں روشن ہو گئے۔ اور دماغوں کی محنتیں اُس پر تیل ٹپکانے لگیں۔ اب بھی کوئی دلّی سے دکن جائے تو شاہ صاحب کے شاگردوں کے اتنے نام سُنے گا کہ دلّی کی کثرت

تلامذہ کو بھول جائے گا +

لکھنؤ کا پہلا سفر

شاہ صاحب دو دفعہ لکھنؤ بھی گئے مگر افسوس ہے کہ آج دہلی یا لکھنؤ میں کوئی اتنی بات کا بتلانے والا نہ رہا کہ کس کس سنہ میں کہاں کہاں گئے تھے یا یہ کہ کس کس مشاعرہ میں اور کس کے مقابلہ میں کون کون سی غزل ہوئی تھی۔ اس میں شک نہیں کہ پہلی دفعہ جب گئے ہیں تو سید انشا اور مصحفی۔ اور جرأت وغیرہ سب موجود تھے۔ اور بعض غزلیں جو ان معرکوں سے منسوب مشہور ہیں وہ مصحفی کے دیوان میں بھی موجود ہیں۔ دیکھو صفحہ ۳۳۳۔ دہنِ سُرخ ترا۔ چمنِ سُرخ ترا +

لکھنؤ کا دوسرا سفر

یہ وہ زمانہ تھا کہ لکھنؤ میں بزرگان با اخلاق اور اُمرائے رُتبہ شناس موجود تھے۔ وہ جوہر کو پہچانتے تھے اور صاحب جوہر کا حق مانتے تھے۔ جو جاتا تھا عزت پاتا تھا۔ اور شکر گذار آتا تھا۔ لیکن دوسری دفعہ جو گئے تو رنگ پلٹا ہوا تھا۔ شیخ ناسخ کے زمانہ نے عہد قدیم کو نسخ کر دیا تھا۔ اور خواجہ آتش کے کمال نے دماغوں کو گرمایا ہوا تھا۔ جوانوں کی طبیعتیں زور پر تھیں۔ نئی نئی شوخیاں انداز دکھاتی تھیں۔ انوکھی تراشیں۔ پُرانے سادہ پن پر مسکراتی تھیں۔ چنانچہ جس حریف کا نشان منزلوں کے فاصلہ سے دکھائی دیتا تھا۔ جب پاس آیا تو سب گردنیں اُبھار اُبھار کر دیکھنے لگے +

یہ زبردست شاعر کہن سال مشّاق۔ جس کا بڑھاپا جوانی کے زوروں کو چُٹکیوں میں اُڑاتا تھا۔ جس دن وہاں پہنچا تو مشاعرہ میں شاید دو تین دن باقی تھے ہر اُستاد نے ایک ایک دو دو مصرع طرح کے بھیجے۔ اُدھر انہیں دردِ گردہ عارض ہوا مگر وہ درد کے ٹھیرتے ہی اُٹھ بیٹھے اور آٹھ غزلیں تیار کر کے مشاعرہ میں پہنچے۔ پھر اور مشکل مشکل طرحیں مشاعرہ کے شاعروں نے بھیجیں۔ اور یہ بھی بے تکلف غزلیں لے کے پہنچے۔ مگر وہاں کے صاحب کمال خود نہ آئے۔ جب دو تین جلسے اور اس طرح گزرے تو ایک شخص نے سر مشاعرہ مصرع طرح دیا۔ وہ مصرع شیخ صاحب کا تھا۔ اس وقت شاہ صاحب سے ضبط نہ ہو سکا۔ مصرع تو لے لیا مگر اتنا کہا کہ۔ ان سے کہنا

کہ چکس پر گلدم لڑانے کی صحیح نہیں ہے پالی میں آئیے کہ دیکھنے والوں کو بھی مزا آئے۔ افسوس ہے کہ اس موقع پر بعض جہلانے جن سے کوئی زمانہ اور کوئی جگہ خالی نہیں ہے اپنی یادہ گوئی سے اہل لکھنؤ کی عالی ہمتی اور مہمان نوازی کو داغ لگایا۔ چنانچہ ایک معرکہ کے مشاعرہ میں شاہ صاحب نے آٹھ غزلیں فرمائش کی کہہ کر پڑھی تھیں۔ ایک غزل اپنی طرح کی ہوئی بھی پڑھی جس کی ردیف و قافیہ عسل کی مکھی۔ اور محل کی مکھی تھا۔ اس پر بعض اشخاص نے طنز کی۔ کسی شعر پر کہا کہ سبحان اللہ کیا خوب مکھی میٹھی ہے۔ کسی نے کہا کہ حضور! یہ مکھی تو نہ میٹھی۔ ایک شخص نے یہ بھی کہا کہ قبلہ! غزل تو خوب ہے مگر ردیف سے جی متلانے لگا۔ شاہ صاحب نے اسی وقت کہا کہ۔ جنہیں چاشنی سخن کا مذاق ہے وہ تو لطف ہی اُٹھاتے ہیں۔ ہاں جنہیں صفرائے حسد کا زور ہے اُن کا جی متلائے گا۔

ان جلسوں میں استاد مسلم الثبوت نے علم استادی بے لاگ بلند کر دیا تھا مگر بعض لغزشوں نے قباحت کی۔ جن سے کوئی بشر خالی نہیں رہ سکتا۔ چنانچہ ایک جگہ تظلم کو بجائے ظلم باندھ دیا تھا۔ اس پر سر مشاعرہ گرفت ہوئی اور غضب یہ ہوا کہ انھوں نے سند میں یہ شعر محتشم کاشی کا پڑھا ؎

اہل نبی چو دستِ تظلم برآورند		ارکانِ عرش را بہ تزلزل درآورند

ایسی بھول چوک سے کوئی اُستاد خالی نہیں۔ اور اتنی بات اُن کے کمال میں کچھ رخنہ بھی نہیں ڈال سکتی۔ چنانچہ زور کلام نے وہیں بیسیوں اشخاص ان کے شاگرد کر لئے۔ منشی کرامت علی اظہر کہ اوّل اوّل لکھنؤ کی تمام کتب مطبوعہ پر انہی کی تاریخیں ہوتی تھیں ہمیشہ شاہ صاحب کی شاگردی کا دم بھرتے تھے +

شاہ صاحب پھر چوتھی دفعہ دکن گئے۔ مگر اس دفعہ ایسے گئے کہ پھر نہ آئے استاد مرحوم کہ شاہ صاحب کی استادی کو ہمیشہ زبان ادب سے یاد کرتے تھے۔ اکثر افسوس سے کہا کرتے تھے کہ چوتھی دفعہ اُدھر کا قصد تھا جو سر راہ مجھ سے ملاقات ہو گئی۔ میں نے کہا کہ اب آپ کا سن ایسے دور دراز سفر کے قابل نہیں۔ فرمایا کہ میاں

ابراہیم! وہ بہشت ہے بہشت! میں بہشت میں جاتا ہوں۔ چلو تم بھی چلو۔ استاد مرحوم عالمِ تاسف میں اکثر یہ بھی کہا کرتے تھے کہ انہی کا مطلع ان کے حسب حال ہوا:۔

بیاباں مرگ ہے مجنون خاک آلودہ تن کس کا سئے ہے سوزن خارِ مغیلاں تو کفن کس کا

آخر حیدرآباد میں جہان فانی سے رحلت کی۔ اور قاضی مخدوم موسیٰ کی خانقاہ میں دفن ہوئے۔ شاگرد نے چراغِ گل کے الفاظ سے سنہ تاریخ نکالی۔ دیوان اپنا مرتب نہیں کیا۔ جو غزلیں کہتے تھے۔ ایک جگہ رکھتے جاتے تھے۔ جب بہت سی جمع ہو جائیں تو تکیہ کی طرح ایک لمبے سے تھیلے میں بھرتے تھے۔ گھر میں دے دیتے تھے اور کہتے تھے احتیاط سے رکھ چھوڑو۔ متفرق غزلیں ایک دو مختصر جلدوں میں تھیں کہ وہ اور بہت سا سرمایہ دکن ہی میں رہا۔ یہاں ان کی اولاد میں زمانہ کی گردش نے کسی کو سر نہ اُٹھانے دیا جو کل کلام کی تہذیب اور ترتیب کرتا۔ شاگردوں کے پاس بہت سی متفرق غزلیں ہیں مگر کسی نے سب کو جمع نہیں کیا۔ اُن کے دیوان کی ہر شخص کو تلاش ہے۔ چنانچہ دہلی میں میر حسین تسکین ایک[1] طباع اور نازک خیال شاعر تھے ان کے بیٹے سید عبدالرحمٰن بھی صاحب مذاق اور سخن فہم شخص تھے۔ انھوں نے بڑی محنت سے ایک مجموعہ ایسا جمع کیا کہ غالباً اس سے زیادہ ایک جگہ شاہ صاحب کا کلام جمع نہ ہوگا۔ نواب صاحب رام پور نے کہ نہایت قدردان سخن ہیں۔ ایک رقم معقول دے کر وہ نسخہ منگا لیا۔ غزلیں اکثر جگہ بکثرت پائی جاتی ہیں مگر قصیدے نہیں ملتے کہ وہ بھی بہت تھے حق یہ ہے کہ غزل کا انداز بھی قصیدے کا زور دکھاتا ہے +

کلام کو اچھی طرح دیکھا گیا۔ زبان شکوہ الفاظ اور چستیٔ ترکیب میں سودا کی زبان تھی۔ اور گرمی و لذت اس میں خداداد تھی۔ انھیں اپنی نئی تشبیہوں اور استعاروں کا دعویٰ تھا اور یہ دعویٰ بجا تھا۔ نئی نئی زمینیں نہایت برجستہ اور پسندیدہ نکالتے تھے مگر ایسی سنگلاخ ہوتی تھیں جن میں بڑے بڑے شہسوار قدم نہ مارتے تھے۔ تشبیہ

[1] وہی تسکین شاگرد رشید مومن کے +

اور استعارہ کو لیا ہے اور نہایت آسانی سے برتا ہے جسے اکثر زبردست انشاپرداز ناپسند کرکے کم استعدادی کا نتیجہ نکالتے ہیں اور کہتے ہیں کہ یہ تشبیہ یا استعارہ شاعرانہ نہیں پھبتی ہے۔ مگر یہ اُن کی غلطی ہے۔ اگر وہ ایسا نہ کہتے تو کلام سریع الفہم کیونکر ہوتا۔ اور ہم ایسی سنگلاخ زمینوں میں گرم گرم شعر کیوں کر سنتے۔ پھر وہ ہزاروں شاعروں میں خاص و عام کے مُنہ سے واہ وا کیونکر لیتے۔ بعض الفاظ مثلاً ٹک۔ وا چھڑے۔ تسپر وغیرہ جو کہ سید انشا اور جرأت تک باقی تھے وہ انھوں نے ترک کئے۔ مگر آئے ہے اور جائے ہے۔ وغیرہ افعال انھوں نے بھی استعمال کئے۔ علم کے دعویدار شاعر اُن کے کلام کی دھوم دھام کو ہمیشہ کَن انکھیوں سے دیکھتے تھے۔ اور آپس میں کانا پھوسیاں بھی کرتے تھے۔ پھر بھی اُن کے زور کلام کو دبا نہ سکتے تھے۔ وجہ اُسکی یہ ہے کہ زور طبع اُن کا کسی کے بس کا نہ تھا۔ جن سنگلاخ زمینوں میں گرمی کلام سے وہ مشاعرہ کو تڑپا دیتے تھے۔ اوروں کو غزل پوری کرنی مشکل ہوتی تھی۔ اکثر بزرگ پُرانے پُرانے مشاق کہ علوم تحصیلی میں ماہر کامل تھے۔ مثل حکیم ثناء اللہ خاں فراق۔ حکیم قدرت اللہ خاں قاسم شاگرد خواجہ میر درد۔ میاں شکیبا شاگرد میر۔ مرزا عظیم بیگ۔ اور شیخ ولی اللہ محب شاگرد سودا۔ حافظ عبدالرحمٰن خاں احسان وغیرہ موجود تھے۔ سب ان کے دعوے سُنتے تھے۔ اور بعض موقع پر اپنی بزرگی سے ان کی طنزوں کو برداشت کرتے تھے۔ مگر خاموش نہ کر سکتے تھے۔

حکیم قدرت اللہ خاں قاسم سے ایک خاص معاملہ یہ درمیان آیا کہ ایک دفعہ مشاعرہ میں طرح ہوئی۔ یار شتاب اور تلوار شتاب۔ شاہ نصیر نے جو غزل کہہ کر پڑھی تو اُس میں قطعہ تھا کہ:۔

رُخِ انور کا ترے وصف لکھا جب ہم نے ۔۔۔ انوری نے دیا دیوان اُلٹ اے یار شتاب
پھر پڑھا ہم نے جو مضمون بیاضِ گردن ۔۔۔ سُن اُسے ہوگیا چپ قاسم انوار شتاب

حکیم صاحب مرحوم خاص و عام میں واجب التعظیم تھے۔ اُس کے علاوہ فضیلت علمی

کے ساتھ فن شعر کے مشاق تھے - اور فقط موزونیِ طبع اور زور کلام کو خاطر میں نہ لاتے تھے۔ چونکہ خود قاسم تخلص کرتے تھے اس لئے قاسم انوار کا لفظ ناگوار ہوا۔ چنانچہ دوسرے مشاعرہ کی غزل میں قطعہ لکھا :-

واسطے انساں کے انسانیت اوّل شرط ہے میر ہو یا میرزا ہو۔ خاں ہو یا نواب ہو
آدمی تو کیا خدا کو بھی نہ ہم سجدہ کریں گر نہ خم تعظیم کو پہلے سرِ محراب ہو

شاہ صاحب کی بدیہہ گوئی اور طبع حاضر نے خاص و عام سے تصدیق اور تسلیم کی سند لی تھی اور وہ ایک اصلی جوش تھا کہ کسی طرح فرو ہوتا نہ معلوم ہوتا تھا۔ شعر کہنے سے کبھی تھکتے نہ تھے۔ اور کلام کی چستی میں سستی نہ آتی تھی۔ اکثر مشاعروں میں اَوروں کی غزل پڑھتے پڑھتے اشعار برجستہ موزوں کر کے غزل میں داخل کر لیتے تھے۔ طبع موزوں گویا ایک درخت تھا کہ جب اُس کی ٹہنی ہلاؤ فوراً پھل جھڑ پڑیں گے۔ وہ نہایت جلد اصلاح دیتے تھے اور برجستہ اصلاح دیتے تھے۔ طبیعت میں تیزی بھی غضب تھی۔ عین مشاعرہ میں کسی کا شعر سُنتے اور وہیں بول اُٹھتے کہ یوں کہو! کہنے والا سُن کر مُنہ دیکھتا رہ جاتا۔ یہی سبب ہے کہ پُرانے پُرانے مشّاق جھپکتے رہتے تھے +

پڑھنے کا انداز بھی سب سے الگ تھا۔ اور نہایت مطبوع طبع تھا۔ اُن کے پڑھنے سے زور کلام دو چند بلکہ دہ چند ہو جاتا تھا۔ کیونکہ زبان نے بھی زور طبعی سے زور۔ اور دل کے جوش سے اثر حاصل کیا تھا۔ اُن کی آواز میں بڑھاپے تک بھی جوانی کی کڑک دمک تھی۔ جب مشاعرہ میں غزل پڑھتے تو ساری محفل پر چھا جاتے تھے۔ اور اپنا کلام اُنھیں خود بے اختیار کر دیتا تھا۔ ایک مشاعرہ میں غزل پڑھی اُس میں جب قطعہ مذکورہ ذیل پر پہنچے تو شعر پڑھتے تھے اور مارے خوشی کے کھڑے ہوئے جاتے تھے :-

یہ مجنوں ہے نہیں آہو ہے لیلےٰ پہن کر پوستیں نکلا ہے گھر سے
جسے تو سینگ سمجھے ہے یہ ہیں خار لگے ہیں پاؤں میں نکلے ہیں سر سے

حُسنِ اعتقاد

ان کا مذہب سُنّت جماعت تھا مگر اُس میں تشدّد نہ تھا۔ کئی ترجیع بند اور مناقب جناب امیرؑ کی شان میں موجود ہیں۔ ان سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ جو کچھ انھوں نے کہا ہے وہ زورِ طبع دکھانے کو یا تحسین و آفرین کے طرّے زیبِ دستار کرنے کو نہیں کہا بلکہ دلی محبت اور حُسنِ اعتقاد سے کہا ہے۔ اُن کی خوش اعتقادی کا یہ عالم تھا کہ گلی کوچہ میں راہ چلتے ہوئے اگر کسی طاق پہ تین لڑی کا سہرا یا کوئی سوکھا لپا ہوا اُس میں پانچ پھول پڑے دیکھتے تو جوتیوں سے اوپر پا برہنہ کھڑے ہو جاتے اور دونوں ہاتھ باندھ کر فاتحہ پڑھتے۔ بعض شاگرد کہ ہمیشہ چار پانچ ساتھ ہی رہتے تھے ان سے پوچھتے کہ اُستاد! کس کی درگاہ ہے؟ فرماتے کہ خدا جانے کس بزرگ کا گزر ہے! وہ کہتا کہ حضرت! آپ نے بے تحقیق کیوں فاتحہ پڑھ دی؟ فرماتے کہ بھائی! آخر کسی نے پھول چڑھائے۔ سہرا باندھا تو یوں ہی باندھ دیا؟ کچھ سمجھ کر باندھا ہوگا۔ نوبت یہاں تک پہنچی کہ بعض دفعہ کسی شاگرد کو معلوم تھا اُس نے کہا کہ اُستاد! میں جانتا ہوں یہ سامنے حلال خور کا گھر ہے اور اُس نے اپنے لال بیگ کا طاق بنا رکھا ہے۔ اس وقت خود بھی ہنس دیتے تھے۔ اور کہتے کہ خیر میں نے کلامِ خدا پڑھا ہے اس کی برکت ہوائی تو نہیں کہی جا سکتی جہاں ٹھکانا ہے وہاں پہنچے گی۔ میرا ثواب کہیں گیا نہیں +

طبعی حالات اور عادات و اطوار

شاہ صاحب نہایت نفیس طبع اور لطیف مزاج تھے۔ خوش پوشاک۔ خوش لباس رہتے تھے۔ اور اُس میں ہمیشہ ایک وضع کے پابند تھے۔ جو کہ دہلی کے قدیمی خاندانوں کا قانون ہے۔ ان کی وضع ایسی تھی کہ ہر شخص کی نظروں میں عظمت اور ادب پیدا کرتی تھی۔ وہ اگرچہ رنگت کے گورے نہ تھے۔ مگر نورِ معنی سر سے پاؤں تک چھایا ہوا تھا۔ بدن چھریرا اور کشیدہ قامت تھے۔ جس قدر ریش مبارک مختصر اور وجاہت ظاہری کم تھی اُس سے ہزار درجہ زیادہ خلعتِ کمال نے شان و شوکت بڑھائی تھی۔ بعض معرکوں یا بعض شعروں میں وہ اِس بات پر اشارہ کرتے تھے

تو ہزار حُسن قربان ہوتے تھے۔ بعض لطایف میں اس کا لطف حاصل ہوگا ✦

شاہ صاحب باوجودیکہ اس قدر صاحب کمال اور محفلوں میں اعزاز و اکرام کے صدر نشین تھے۔ اس پر نہایت خوش مزاج اور یار باش تھے۔ بڑھوں میں بوڑھے بچوں میں بچے بن جاتے تھے۔ ہر ایک میلے میں جا کر تلاش مضامین کرتے تھے۔ اور فکر سخن سے جو دل کملا جاتا ہے اُسے تر و تازہ اور شاداب کرتے تھے ✦

لطیفہ۔ استاد مرحوم فرماتے تھے کہ ایک مرتبہ بھولو شاہ کی بسنت میں شاہ صاحب آئے۔ چند شاگرد ساتھ تھے۔ انھیں لے کر تیس ہزاری باغ کی دیوار پر بیٹھے اور تماشا دیکھنے لگے۔ کسی رنڈی نے بہت سا روپیہ لگا کر نہایت زرق برق کے ساتھ ایک کارچوبی رتھ بنوائی تھی۔ شہر میں جا بجا اس کا چرچا ہو رہا تھا۔ رنڈی رتھ میں بیٹھی چھم چھم کرتی سامنے سے نکلی۔ ایک شاگرد نے کہا کہ اُستاد اس پر کوئی شعر ہو۔ اسی وقت فرمایا:۔

اس کی رتھ کا کلس سنہری دیکھ　　شب کہا ماہ سے یہ پردیں نے

بہرِ پرواز یہ نکالی ہے　　چونچ بیضہ سے مُرغِ زریں نے

لطیفہ۔ ایک ایسے ہی موقع پر کوئی رنڈی سامنے سے نکلی۔ اس کے سر پر اودی رضائی تھی اور وسمہ کی چمک عجیب لطف دکھاتی تھی۔ ایک شاگرد نے پھر فرمایش کی۔ اُنھوں نے فرمایا:۔

اودی وسمہ کی نہیں تیری رضائی سر پر　　مہ جبیں رات ہے تاروں بھری چھائی سر پر

اگرچہ شاہ صاحب کے لئے اقبال نے فارغ البالی کا میدان وسیع رکھا تھا۔ مگر اُن کی عادت تھی کہ ہر ایک شاگرد سے کچھ نہ کچھ فرمایش بھی ضرور کر دیتے تھے۔ مثلاً غزل کو اصلاح دینے لگے۔ قلمدان سے قلم اٹھاتے اور کہتے۔ میاں کشمیر کے قلمدان کیا خوب آیا کرتے تھے۔ خدا جانے کیا ہو گیا۔ اب تو آتے ہی نہیں۔ بھلا کوئی نظر چڑھ جائے تو لانا۔ اسی طرح کسی سے ایک چاقو کی فرمایش۔ کبھی کوئی آسودہ

حال شاگرد ہونا۔ اور آپ کپڑے پہننے لگتے تو کہتے کہ ڈھاکے کی ململ جو پہلے آتی تھی وہ اب دکھائی نہیں دیتی صاحب! ہمیں تو یہ انگریزی ململ نہیں بھاتی۔ میاں کوئی تھان نظر چڑھے تو دیکھنا۔

بعض دوستوں نے تعجباً پوچھا کہ یہ کیا بات ہے؟ فرمایا کہ روز واہیات بکواسیں کاغذ پر لکھتے ہیں اور آکر میری چھاتی پر سوار ہو جاتے ہیں۔ اس فرمایش کا اتنا فائدہ ہوتا ہے کہ روز کے آنے والے چوتھے دن غزل لاتے ہیں۔ اس کے علاوہ جس کام کو انسان کچھ خرچ کر کے سیکھتا ہے اُسی کی قدر بھی ہوتی ہے اور شوق بھی بجا ہوتا ہے۔ اور جو کچھ لکھتا ہے جانکاہی سے لکھتا ہے۔ اس کا تو ادھر وہ فایدہ ہوا۔ میرا یہ فائدہ ہوا۔ لے آیا تو چیز آگئی۔ نہ لایا تو میرا پیچھا چھوٹا۔ جب[1] کوئی واقعہ قابل یادگار شہرت پاتا تو اس پر بھی شاہ صاحب کچھ نہ کچھ ضرور کہا کرتے تھے۔ چنانچہ مولوی اسمٰعیل صاحب نے جب جہاد میں شکست کھائی اور دلّی میں خبر آئی تو انھوں نے اس موقع پر ایک طولانی قصیدہ کہا تین شعر اس میں سے اس وقت یاد ہیں:۔

حسب حال

کلام اللہ کی صورت ہوا دل اُن کا سیپارہ	نہ یاد آئی حدیث ان کو نہ کوئی نصِ قرآنی
ہرن کی طرح میدانِ وغا میں چوکڑی بھولے	اگرچہ تھے دُمِ شملہ سے وہ شیرِ نیستانی

مولوی صاحب کے طرفدار مجاہدوں کا دلّی میں لشکر تھا بہت سے بہادروں نے آکر شاہ صاحب کا گھر گھیر لیا۔ مرزا خاقانی کوتوال شہر تھے۔ وہ سُنتے ہی دوڑے اور آکر بچایا۔ شاہ صاحب نے اشعار مذکور قصیدہ کردیا اور کوتوال صاحب کا بہت شکریہ ادا کیا۔

[1] شاہ نظام الدین کی سترھویں میں گئے۔ میر باقر علی صاحب ایک سید خاندانی دلّی کے تھے۔ شہر سے درگاہ کو چلے راہ میں کسی نے مار ڈالا۔ درگاہ میں خبر پہنچی تو ان کی جوانی اور مرگ ناگہانی پر سب نے افسوس کیا۔ شاہ صاحب نے اُسی وقت تاریخ کہی۔ کیا بے عدیل تخرجہ ہے۔ قطعہ تاریخ

بہ شبِ عرس حضرتِ محبوب	میر باقر علی چو گشت شہید
بے شش و پنج گفتم ایں تاریخ	ہر کہ اورا بکشت بود یزید

ایک شعر اُس میں کا بھی خیال میں ہے :-

نہ ہوتے شحنۂ دہلی اگر یاں میرزا خانی نصیر الدین بیچارہ تو رستہ طوس کا لیتا

لطیفہ - ایک دفعہ کئی بادشاہی گاؤں سرکش ہو گئے۔ شاہ نظام الدین کہ شاہ جی مشہور تھے اور دربار میں مختار تھے فوج لے کر گئے اور ناکام پھرے۔ ان کی مختاری میں بادشاہی نوکروں نے تنخواہ کی تکلیف پائی تھی۔ اس پر بھی شاہ نصیر نے ایک نظم لکھی جس کا مطلع یہ تھا :-

شکر خدا کہ بارے پھر شاہ صاحب آئے کیا پوچھتے ہو یارو بیٹھے تھے زہر کھائے

لطیفہ - دلّی میں ایک منشی ہندو تھے **نجیبا** نام رنڈی پر مسلمان ہو گئے۔ شاہ صاحب نے فرمایا :-

نجیبا آہ تری چشم کا مارا نہ جیا جس طرف تو نے کیا ایک اشارہ نہ جیا

لطیفہ - عیسےٰ خاں اور موسےٰ خاں دو بھائی دلّی میں تھے۔ مال و دولت کی بابت دونوں میں کچھ جھگڑا ہوا۔ عیسےٰ خاں ناکام ہوئے۔ موسےٰ خاں نے کچھ عدالت کے زور سے کچھ حکمت عملی سے سارا مال مار لیا۔ شاہ صاحب نے بطور ظرافت چند شعر کا قطعہ کہا۔ ایک مصرع یاد ہے اور وہی قطعہ کی جان ہے ع ہوئی آفاق میں شہرت کہ عیسیٰ خاں کا گھر موسےٰ + لطف یہ کہ دونوں بھائی شاعر تھے۔ ایک کا تخلص آفاق دوسرے کا شہرت تھا۔ ان میں سے بھی کسی بے مغزے نے کچھ واہیات بکا تھا۔ شاہ صاحب کے بزرگوں کی خوبیاں بیان کر کے خود اُن کی شکایت کی تھی۔ اور چونکہ روشن پورہ میں رہتے تھے اس کا اشارہ کر کے کہا تھا ؎

خوب روشن پورہ کیا روشن بعد اُن سب کے شاہ صاحب نے[1]

مرزا مغل بیگ نے خدمت وزارت میں نوکرانِ شاہی کو ناخوش کیا۔ اس موقع پر ہر ایک شخص نے اپنے اپنے حوصلہ کے بموجب دل کا بخار نکالا۔ ایک

---

[1] ذات کے جُلاہے تھے +

صاحب نے تاریخ کہی :-

ہنس کے ہاتف نے کہا اس کو کہ واہ کیا ہی انٹی میں وزارت آگئی ؏

شاہ صاحب نے بھی ایک قطعہ کہا اس کے دو شعر یاد ہیں :-

تانے بانے پر نہ کر دُنیا کے ہرگز اعتبار غور کر چشمِ حقیقت سے کہ سر پر کوتح ہے
توڑ کر تو اس طرف سے اُس طرف کو جوڑ لے تو تو مومن ہے دگر نہ مومنوں کی پوتح ہے

شاہ نصیر مرحوم اور شیخ ابراہیم ذوق سے بھی معرکے ہوئے ہیں۔ دیکھو اُنکے حال میں ؛

لطیفہ ۔ دکن کی سرکار میں دستور تھا کہ دن رات برابر کار و بار جاری رہتے تھے۔ مختلف کاموں کے وقت مقرر تھے۔ جس صیغہ کا دربار ہو چکا اُس کے متعلق لوگ رخصت ہوئے دوسرے صیغہ کے آن حاضر ہوئے۔ اسی میں صاحب دربار نے اُٹھ کر ذرا آرام لے لیا۔ ضروریات سے فارغ ہوئے اور پھر آن بیٹھے۔ چنانچہ مشاعرہ اور مناظرہ کا دربار رات کے پچھلے پہر ہوتا تھا۔ ایک موقع پر کہ نہایت دھوم دھام کا جلسہ تھا۔ باکمال اہل دکن اور اکثر اہل ایران موجود تھے۔ سب کی طبیعتوں نے اپنے اپنے جوہر دکھائے۔ خصوصاً چند شعرائے ایران نے ایسے ایسے قصائد سُنائے کہ لب دہن پر حرف آفریں نہ چھوڑا۔ شاہ نصیر کی حُسن رسائی اور اخلاق نے دربار کے چھوٹے بڑے سب کو تسخیر کر لیا تھا۔ چنانچہ جب شمع قریب پہنچی تو ایک خواص نے کہ سونے کا عصا ہاتھ میں - ہزار بارہ سو روپیہ کا دوشالہ کندھے پر ڈالے کھڑا تھا۔ کان میں جھک کر کہا کہ آج آپ غزل نہ پڑھیں تو بہتر ہے۔ آپ وہیں بگڑ کر بولے کہ کیوں ؟ اُس نے کہا کہ ہوا تیز ہو گئی (یعنی کلام کا سرسبز ہونا مشکل ہے)۔ یہ خفگی سے تھوڑی پر ہاتھ پھیر کر بولے کہ ایسا تو میں خوبصورت بھی نہیں کہ کوئی صورت دیکھنے کو نوکر رکھے گا۔ یہ نہیں تو پھر میں ہوں کس کام کا۔ اس قیل و قال میں شمع بھی سامنے آگئی۔ پھر جو غزل سُنائی تو سب کو لُٹا دیا ؛

لطیفہ۔ قطع نظر اس سے کہ شعر کے باب میں طبع حاضر رکھتے تھے۔ حاضر جوابی میں برق تھے۔ چنانچہ ایک دن سلطان جی کی سترہویں میں گئے اور باؤلی میں جا کر ایک طاق میں بیٹھ گئے۔ حقہ پی رہے تھے کہ اتفاقاً ایک نواب صاحب آ نکلے۔ شاہ صاحب سے صاحب سلامت ہوئی۔ وہیں بہت سی ارباب نشاط بھی حاضر تھیں اور ناچ ہو رہا تھا۔ اِس عالم زرق برق پہ اشارہ کر کے نواب صاحب نے فرمایا کہ اُستاد! آج آپ بھی بالائے طاق ہیں۔ بولے۔ جی ہاں جفت ہونے کو بیٹھا ہوں۔ آئیے تشریف لائیے۔

لطیفہ۔ ایک دفعہ دکن کو چلے۔ نواب جھجر مدت سے بلاتے تھے۔ اب چونکہ مقام مذکور سرِ راہ تھا اور گرمی شدت سے پڑتی تھی۔ برابر سفر بھی مشکل تھا اس لئے وہاں گئے اور کئی دن مقام کیا۔ جب چلنے لگے تو رخصت کی ملاقات کو گئے۔ نواب نے کہا کہ گرمی کے دن ہیں دکن کا سفر دور دراز کا سفر ہے۔ خدا پھر خیر و عافیت سے لائے۔ مگر وعدہ فرمائیے کہ اب جھجر میں کب آئیے گا ہنس کر بولے کہ جھجر کی جائے تو وہی گرمی میں۔

شاہ صاحب کا ایک مشہور شعر ہے:۔

چرائی چادرِ مہتاب شب میکش نے جیحوں پر کٹورا صبح دوڑانے لگا خورشید گردوں پر

اعتراض رنگین

نواب سعادت یار خاں رنگین مجالس رنگین میں فرماتے ہیں کہ ایک جلسہ میں اس شعر کی بڑی تعریف ہو رہی تھی میں نے اُس میں اصلاح دی کہ ع چرائی چادرِ مہتاب شب بادل نے جیحوں پر۔ ہو تو اچھا ہو۔ سبب یہ کہ جب بادل چاند پر آتا ہے۔ تو چادرِ مہتاب نہیں رہتی۔ گویا چوری جاتی ہے۔ یہاں چور تو زمین پر ہے۔ اور مضمون عالم بالا پر۔ قصہ زمین بر سرِ زمین ہوتا ہے۔ عالم بالا کے لئے چور بھی آسمانی ہی چاہئے۔ کسی شخص نے شاہ صاحب سے بھی جا کر کہا۔ وہ بہت خفا ہوئے۔ اور کہا کہ نواب زادہ ہونا اور بات ہے اور شاعری اور بات ہے۔ خاں صاحب یہ خبر

سُن کر شاہ صاحب کے پاس گئے اور بہت معذرت کی ۔

مگر میرے نزدیک شاہ صاحب نے کچھ نامناسب نہیں کہا۔ چاند آسمان پر ہوتا ہے۔ چاندنی زمین پر ہوتی ہے۔ اور چاندنی کا لطف میکش اُڑاتا ہے بادل کیا اُڑائے گا اور میکش نہ ہوگا تو شعر غزلیت کے رتبہ سے گر جائے گا۔

لطیفہ ۔ دیہات جاگیر کے تعلق سے ایک دفعہ تحصیلدار سونی پت کے پاس ملاقات کو گئے اور کچھ رنگترے دلّی سے بطور سوغات لے گئے۔ تحصیلدار نے کہا کہ جناب شاہ صاحب! رنگتروں کی تکلیف کیا ضرور تھی۔ آپ کی طرف سے بڑا تحفہ آپ کا کلام ہے۔ ان رنگتروں کی حُسن تشبیہ میں کوئی شعر ارشاد فرمایئے۔ اُسی وقت رُباعی کہی اور سُنائی :-

اے نیّرِ بُرج آسمانِ اقبال ان رنگتروں پر غور سے کیجیئگا خیال
یہ نذرِ حقیر ہو قبولِ خاطر ہر ردہ میں شفق کے ہیں گرہ بند ہلال

غزلیں

زیب تن گرچہ ہے گُل پیرہنِ سُرخ ترا لیکن انجام یہ ہوگا کفنِ سُرخ ترا
مجکو کہتا ہے وہ نکلا ہے شفق میں یہ ہلال یا نمودار ہے زخم کہنِ سُرخ ترا
دسترس پاؤں تک اُس شوخ کے تجکو ہے یہاں کیونکہ رُتبہ نہ ہوا ئے گلِ حنِ سُرخ ترا
ہے مری آہ یہاں نخل گلستانِ خلیل رُخِ گلنار وہاں ہے چمنِ سُرخ ترا
شیشۂ بادۂ گلرنگ بہک دے ساقی جامۂ سبز میں دیکھے جو تنِ سُرخ ترا
آستیں سے یہ لگا کہنے وہ تلوار کو پونچھ بن گیا موجِ یم خوں شکنِ سُرخ ترا
رشک نیلم ہی نہیں رنگ مسی کی یہ نمود لب بھی ہے غیرتِ لعلِ یمن سُرخ ترا
سچ بتا تو مجھے سوفار خدنگِ قاتل لہو کس کس کا پئے گا دہنِ سُرخ ترا
خاک باہم ہو شرارت سے ہم آغوش نصیر صاف ہے شعلۂ آتش بدنِ سُرخ ترا

خالِ پشتِ لبِ شیریں ہے عسل کی مکھی / روحِ فرہاد لپٹ بن کے جبل کی مکھی

سنگ وخشتِ درِ دیوار قتادہ کو دیکھ / ہاتھ ملتی ہے پہ تھور لے کے محل کی مکھی

بن گیا ہوں میں خیال کمر یار میں مور / نہ ترے زور کی طاقت ہے نہ بل کی مکھی

تیرہ بختانِ ازل کا کبھی دیکھا نہ فروغ / شب کو جگنو کی طرح اُڑ کے نہ جھلکی مکھی

بیٹھنے سے ترے ہم سمجھے لبِ یار کو قند / بات مشکل تھی مگر تونے یہ حل کی مکھی

ان کو کیا کام توکل سے جو بن جاتے ہیں / قاب بریانی پہ ہر اہلِ دوَل کی مکھی

ہو گیا ہے یہ تری چشم کا بیمار نحیف / نہ اُڑا سکتا ہے مُنہ کی نہ بغل کی مکھی

ریس پروانۂ جاں سوز کی کرتی تو ہے ۔ پر / نگہِ شمع میں ہو جائے گی ہلکی مکھی

صنعتِ نعتِ جبیں دیکھ دلا جا کے تو / دیکھنی گر تجھے منظور ہے کل کی مکھی

دلربا قہر فسوں ساز ہیں بنگالہ کے / آدمی کو وہ بناتے ہیں عمل کی مکھی

سخن اپنا جو شکر ریز معانی ہے **نصیر**
ہے ردیف اس لئے اس شعر و غزل کی مکھی

سدا ہے اس آہ و چشم تر سے فلک پہ بجلی زمیں پہ باراں / نکل کے دیکھو ٹک اپنے گھر سے فلک پہ بجلی زمیں پہ باراں

وہ شعلہ رو ہے سوار توسن اُدر اُسکا توسن عرق فشاں ہے / عجب ہے اک سیر دوپہر سے فلک پہ بجلی زمیں پہ باراں

ہنسے ہے کوٹھے پہ یوسف اپنا میں زیر دیوار رو رہا ہوں / عزیزو دیکھو مری نظر سے فلک پہ بجلی زمیں پہ باراں

پتنگ کیونکر نہ ہووے حیراں کہ شمع سب کو دکھا رہی ہے / بچشم گریاں و تاج زر سے فلک پہ بجلی زمیں پہ باراں

نہائے افشاں چنو جبیں پر نچوڑو زلفوں کو بعد اس کے / دکھاؤ عاشق کو اس ہنر سے فلک پہ بجلی زمیں پہ باراں

کہاں ہے جوں شعلہ شاخ پر گل ۔ کدھر ہے فصلِ بہار شبنم / بنا ہے اعجاز طرفہ تر سے فلک پہ بجلی زمیں پہ باراں

کمر بہ دریا پہ میکشی تم ادھر کو آؤ تو میں دکھاؤں / سرشک ہر نالۂ جگر سے فلک پہ بجلی زمیں پہ باراں

ادھر کو جاؤں نکل کے یارب کہ گرم و سرد زمانہ مجھکو / دکھائے ہے شام تک سحر سے فلک پہ بجلی زمین پہ باراں

وہ تیغ کھینچے ہے سر پہ میں سر جھکائے ہوں اشک ریز نالاں / دکھاؤں اے دل تجھے کدھر سے فلک پہ بجلی زمیں پہ باراں

غضب ہے چین جبیں وہ کیا ہے بدن سے ٹپکے بھی ہے پسینا / عیاں ہے یارو نئے ہنر سے فلک پہ بجلی زمیں پہ باراں

نصیر لکھی ہے کیا غزل کہ دل تڑپتا ہے سن کے جس کو
بندھے ہے کب یوں کسی بشر سے فلک پہ بجلی زمیں پہ باراں

نہاں ہے کب چشم ہر بشر سے فلک پہ بجلی زمیں پہ باراں ہے اس نگہ سے اس اشکِ تر سے فلک پہ بجلی زمیں پہ باراں
دکھائے تم شہ نشیں پہ جلوہ جو دیکھو فوارہ کا تماشا تو یہ صدا آئے بام و در سے فلک پہ بجلی زمیں پہ باراں
وہ مہر وش پشتِ فیل پر ہے اور اُسکی خرطوم آب افشاں عجب ہے تشبیہ جلوہ گر سے فلک پہ بجلی زمیں پہ باراں
وہ طفل ترسا جبیں پہ قشقہ جو کھینچ گنگ کو دیوے پانی تو کیوں نہ دل دیکھنے کو ترسے فلک پہ بجلی زمیں پہ باراں
دوپٹہ سر پر ہے بادلے کا گلاب پاش اُسکے ہاتھ میں ہے نہ کیونکہ چمکے نہ کیونکہ برسے فلک پہ بجلی زمیں پہ باراں
تو اپنی پگڑی پہ رکھکے طرّہ جو کھیلے پچکاریوں سے ہولی عیاں ہو نیرنگیٔ دگر سے فلک پہ بجلی زمیں پہ باراں
وہاں وہ غرفہ میں تابِ رُخ ہے یہاں ابرِ مژہ پہ نم ہے یہ حُسن اُلفت کے ہے ثمر سے فلک پہ بجلی زمیں پہ باراں
عجب ہے کچھ ماجرا یہ ساقی کہ غل مچا ہے میکشوں نے مدام یاں دیکھ ابرِ تر سے فلک پہ بجلی زمیں پہ باراں
وہ شوخ جھرنے کی سیر کرکے پھسلنے پتھر پہ جاکے بیٹھا پکاری خلقت اِدھر اُدھر سے فلک پہ بجلی زمیں پہ باراں

نصیر صد آفریں ہے تجھکو کہ اہلِ معنی پکارتے ہیں
عجب ہے مضمون تازہ تر سے فلک پہ بجلی زمیں پہ باراں

لَو لگ رہی ہے جس سے وہ شمع رُو نہ آیا بل بے تری شرارت یاں تک کبھو نہ آیا
ہوا اس دہن سے روکش سیلی صبا کی کھائی غنچہ کے آہ منہ سے کس دن لہو نہ آیا
دنداں دکھا کے مت ہنس اے بخیۂ گریباں چاکِ جگر کا ہم کو طرزِ رفو نہ آیا
کیا جانے یہ گیا تھا کس منہ سے رُوکشی کو آئینہ واں سے لے کر خاک آبرو نہ آیا
برگشتہ بخت ہم وہ اِس دَور میں ہیں ساقی لب تک کبھو ہمارے جام و سبو نہ آیا
موجِ سرِ شام سے ہے رونق قبائے تن کی کیونکر کہوں کہ اُس کو کارِ اتو نہ آیا
آخر کو کہکشاں ہی بجسر وہ مانگ نکلی اس بات میں ہماری فرقِ ایک مُو نہ آیا
کشتیِ دل تو دائم موجِ خطر میں ڈوبی چیں بر جبیں ہو کس دن وہ روبرو نہ آیا
کیونکر یہ ہاتھ اپنا پہنچے گا تا گریباں دستِ خیال جس کے دامن کو چھو نہ آیا

اپنی بھی بعد مجنوں یارو ہوا بندھی ہے
لے گرد باد خیمہ کب کو بہ بکو نہ آیا

نامحرموں سے تم نے کھلوائے بند محرم
میں تو بھی آہ لے کر کچھ آرزو نہ آیا

ہردم نصیر رہ تو اُمیدوار رحمت
تیری زباں پہ کس دن لَاتَقْنَطُوْا نہ آیا

[1]اے اشک رواں ساتھ لے آہِ جگری کو
عاشق کہیں بے فوج علم اُٹھ نہیں سکتا

سقفِ فلکِ کہنہ میں کیا خاک لگاؤں
اے ضعفِ دل اس آہ کا تھم اُٹھ نہیں سکتا

ہر معرکۂ عشق میں آساں نہیں دینا
گاڑے ہے جہاں شمع قدم اُٹھ نہیں سکتا

ہے جنبش مژگاں کا کسی کی جو تصوّر
دل سے خلشِ خارِ اَلم اُٹھ نہیں سکتا

دل پر ہے مرے خیمۂ ہر آبلہ اِستاد
کیا کیجے یہ لشکرِ غم اُٹھ نہیں سکتا

ہر جا تجلّی ہے وہی - پردۂ غفلت
اے مُعتکفِ دیر و حرم اُٹھ نہیں سکتا

یوں اشک زمیں پر ہیں کہ منزل کو پہنچ کر
جوں قافلۂ ملکِ عدم اُٹھ نہیں سکتا

شب کو کیونکر تجکو ہے پھبتا سر پہ طرّہ ہار گلے میں
جوں پروین و ہالۂ مہ تھا سر پہ طرّہ ہار گلے میں

رونق سر پاں داغ جنوں ہے اشک مسلسل زیب گلو ہے
چاہئے تجکو غیرتِ لیلےٰ سر پہ طرّہ ہار گلے میں

شعلہ کہاں آنسو ہیں گلے ہر شب شمع رکھی تھی محفل میں
تاج زر اور موتیوں کا سا سر پہ طرّہ ہار گلے میں

بال پریشاں ہیں کاکل کے پیچ گلے میں ہیں پگڑی کے
یوں رکھتا ہے وہ متوالا سر پہ طرّہ ہار گلے میں

حق میں ہے میرے طائرِ دل کے باز کا جنگل دام کا حلقا
اے بُتِ کافر مجھ کو نہ دکھلا سر پہ طرّہ ہار گلے میں

شملے اور تسبیح کے بدلے شیخ جی صاحب رکھنے لگے ہیں
کیونکہ نہ دیکھیں رند تماشا سر پہ طرّہ ہار گلے میں

رشکِ چمن تو سیر کرے گا جب کہ کنارِ حوض و لبِ جو
فوّارہ اور پھول رکھے گا سر پہ طرّہ ہار گلے میں

عکسِ شعاعِ مہر نہیں یہ بیل پہ چنبیلی لپٹی ہے
سروِ چمن نے کیا ہے پیدا سر پہ طرّہ ہار گلے میں

کیفیت کیا ہو بن ساقی سوئے چمن طاؤس اور قمری
ابر و ہوا میں رکھے ہیں تنہا سر پہ طرّہ ہار گلے میں

---

[1] اس غزل کے جہاں شعر دیکھے وہی شعر دیکھے۔ اس پر شیخ ابراہیم ذوق کی غزل بھی دیکھو ❊

ہے یہ تمنا میرے جی میں یوں تجھے دیکھوں بادہ کشی میں ہاتھ میں ساغر بر میں مینا سر پہ طرہ ہار گلے میں

اور بدل کے ردیف و قوافی لکھئے غزل اس بحر میں جلدی
تم نے نصیر اب خوب پنھایا سر پہ طرہ ہار گلے میں

وقت نماز ہے ان کا قامت گاہ خدنگ گاہ کماں بن جاتے ہیں اہل عبادت گاہ خدنگ گاہ کماں

مرد جوانی میں ہے سیدھا پیری میں جھک جاتا ہے قوت و ضعف کی ہے یہ علامت گاہ خدنگ گاہ کماں

بادہ کشی کے سکھلاتے ہیں کیا ہی قرینے ساون بھادوں کیفیت کے ہم نے جو دیکھا دو ہیں مہینے ساون بھادوں

چھوٹتے ہیں فوارۂ مژگاں روز و شب ان آنکھوں سے یوں نہ برستے دیکھے ہوں گے مل کے کسی نے ساون بھادوں

ٹانکنے کو بھرتی ہے بجلی اس میں گوٹ تمامی کی دامن ابر کے ٹکڑوں کو جب لگتے ہیں سینے ساون بھادوں

بھولے دم کی آمد و شد ہم یاد کر اُس جھولے کی پینگیں سوجھے ہے بے یار نہ دیں گے آہ یہ جینے ساون بھادوں

کیونکہ نہ یہ ڈرہائے تگرگ اے بادہ پرستو برسائیں کان گہر جھٹ زر کے رکھتے ہیں گنجینے ساون بھادوں

کان جواہر کیونکر نہ سمجھے کھیت کو دہقاں اولوں سے برساتے ہیں موتیوں میں ہیرے کے نگینے ساون بھادوں

ابر سیہ میں دیکھی تھی بگلوں کی قطار اس شکل سے ہم نے
یاد دلائے پھر کے ترے دنداں مسی نے ساون بھادوں

———
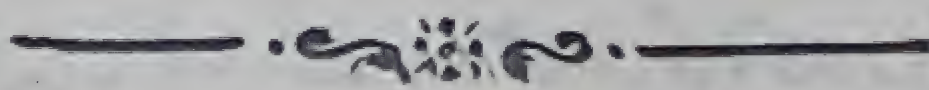
مومن خاں صاحب مومنؔ

تمہید

پہلی دفعہ اس نسخہ میں مومن خاں صاحب کا حال نہ لکھا گیا۔ وجہ یہ تھی کہ دورِ پنجم جس سے ان کا تعلق ہے بلکہ دور سوم و چہارم کو بھی اہل نظر دیکھیں کہ جو اہل کمال اس میں بیٹھے ہیں۔ کس لباس و سامان کے ساتھ ہیں۔ کسی مجلس میں بیٹھا ہوا انسان جبھی زیب دیتا ہے کہ اسی سامان و شان اور وضع ولباس کے ساتھ ہو۔ جو اہل محفل کے لئے حاصل ہے۔ نہ ہو تو ناموزوں معلوم ہوتا ہے۔ خانِ موصوف کے کمال سے مجھے انکار نہیں۔ اپنے وطن کے اہل کمال کا شمار بڑھا کر۔ اور ان کے کمالات دکھا کر ضرور چہرۂ فخر کا رنگ چمکاتا۔ لیکن میں نے ترتیب کتاب کے دنوں میں اکثر اہل وطن کو خطوط لکھے اور لکھوائے۔ وہاں سے جواب صاف آیا۔ وہ خط بھی موجود ہیں۔ مجبوراً اُن کا حال قلم انداز کیا۔ دنیا کے لوگوں نے اپنے حوصلہ کے بموجب جو چاہا سو کہا۔ آزاد نے سب کی عنایتوں کو شکریہ کا دامن پھیلا کر لے لیا۔ ذوقؔ

دو گالیاں کہ بوسہ خوشی پر ہے آپ کی　　رکھتے فقیر کام نہیں رد و کد سے ہیں

البتہ افسوس اس بات کا ہے کہ بعض اشخاص جنھوں نے میرے حال پر عنایت کر کے حالات مذکورہ کی طلب و تلاش میں خطوط لکھے۔ اور سعی ان کی ناکام رہی۔ اُنھوں نے بھی کتاب مذکور پر ریویو لکھا۔ مگر اصل حال نہ لکھا۔ کچھ کا کچھ اَور ہی لکھ دیا۔ میں نے اسی وقت دہلی اور اطراف دہلی میں اُن اشخاص کو خطوط لکھنے شروع کر دئے تھے جو خان موصوف کے خیالات سے دل گلزار رکھتے ہیں۔ اب طبع ثانی سے چند مہینے پہلے تاکید و التجا کے نیاز ناموں کو جولانی دی۔ انہی میں سے ایک صاحب کے الطاف و کرم کا شکر گزار ہوں کہ جنھوں نے باتفاق احباب اور صلاح ہمدگر جزئیات احوال فراہم کر کے چند

ورق مرتب کئے اور عین حالتِ طبع میں کہ کتاب مذکور قریب الاختتام ہے مع ایک مراسلہ کے عنایت فرمائے بلکہ اُس میں کم و بیش کی بھی اجازت دی۔ میں نے فقط بعض فقرے کم کئے۔ جن سے طول کلام کے سوا کچھ فائدہ نہ تھا۔ اور بعض عبارتیں اور بہت سی روایتیں مختصر کر دیں یا چھوڑ دیں جن سے اُن کے نفس شاعری کو تعلق نہ تھا۔ باقی اصل حال کو بجنسہٖ لکھ دیا آپ ہرگز دخل و تصرف نہیں کیا۔ ہاں کچھ کہنا ہوا تو حاشیہ پر یا خط وحدانی میں لکھ دیا۔ جو احباب پہلے شاکی تھے۔ امید ہے کہ اب اس فروگزاشت کو معاف فرما دیں گے*

مومن خاں صاحب کا حال۔ ان کے والد حکیم غلام نبی خاں ولد حکیم نامدار خاں اور حکیم کامدار خاں دو بھائی سلطنت مغلیہ کے آخری دور میں آکر بادشاہی طبیبوں میں داخل ہوئے۔ شاہ عالم کے زمانہ میں موضع بلاہہ وغیرہ پرگنہ نارنول میں میں جاگیر پائی۔ جب سرکار انگریزی نے جھجر کی ریاست نواب فیض طلب خاں کو عطا فرمائی تو پرگنہ نارنول بھی اس میں شامل تھا۔ رئیس مذکور نے اُس کی جاگیر ضبط کر کے ہزار روپیہ سالانہ پنشن ورثۂ حکیم نامدار خاں کے نام مقرر کر دی۔ پنشن مذکور میں سے حکیم غلام نبی خاں صاحب نے اپنا حصہ لیا۔ اور اس میں سے حکیم مومن خاں صاحب نے اپنا حق پایا۔ اس کے علاوہ ان کے خاندان کے چار طبیبوں کے نام پر سو روپیہ ماہوار پنشن سرکار انگریزی سے بھی ملتی تھی۔ اس میں سے ایک چوتھائی اُن کے والد کو۔ اور اُن کے بعد اس میں سے ان کا حصہ اُن کو ملتا رہا*

ان کی ولادت ۱۲۱۵ھ ہجری میں واقع ہوئی۔ بزرگ جب دلّی میں آئے تو چیلوں کے کوچہ میں رہتے تھے۔ وہیں خاندان کی سکونت رہی۔ شاہ عبدالعزیزؒ صاحب کا مدرسہ وہاں سے بہت قریب تھا۔ ان کے والد کو شاہ صاحب سے کمال عقیدت تھی جب یہ پیدا ہوئے تو حضرت ہی نے آکر کان میں اذان دی۔ اور مومن خاں نام رکھا گھر والوں نے اس نام کو ناپسند کیا۔ اور حبیب اللہ نام رکھنا چاہا۔ لیکن شاہ صاحب

ہی کے نام سے نام پایا +

بچپن کی معمولی تعلیم کے بعد جب ذرا ہوش سنبھالا تو والد نے شاہ عبدالقادر صاحب کی خدمت میں پہنچایا۔ اُن سے عربی کی ابتدائی کتابیں پڑھتے رہے۔ حافظہ کا یہ حال تھا کہ جو بات شاہ صاحب سے سُنتے تھے فوراً یاد کر لیتے تھے۔ اکثر شاہ عبدالعزیز صاحب کا وعظ ایک دفعہ سُن کر بعینہٖ اُسی طرح ادا کر دیتے تھے۔ جب عربی میں کسی قدر استعداد ہو گئی تو والد اور چچا حکیم غلام حیدر خاں اور غلام حسن خاں سے طب کی کتابیں پڑھیں۔ اور اُنہی کے مطب میں نسخہ نویسی کرتے رہے +

تیز طبیعت کا خاصّہ ہے کہ ایک فن پر دل نہیں جمتا۔ اس نے بزرگوں کے علم یعنی طبابت پر ٹھہرنے نہ دیا۔ دل میں طرح طرح کے شوق پیدا کئے۔ شاعری کے علاوہ نجوم کا خیال آیا اور اُس کو اہل کمال سے حاصل کیا۔ اور مہارت بہم پہنچائی۔ اُن کو نجوم سے قدرتی مناسبت تھی۔ ایسا ملکہ بہم پہنچایا تھا کہ احکام سُن کر بڑے بڑے منجم حیران رہ جاتے تھے۔ سال بھر میں ایک بار تقویم دیکھتے تھے۔ پھر برس دن تک تمام ستاروں کے مقام اور ان کی حرکات کی کیفیت ذہن میں رہتی تھی۔ جب کوئی سوال پیش کرتا۔ نہ زائچہ کھینچتے نہ تقویم دیکھتے۔ پوچھنے والے سے کہتے کہ تم خاموش رہو۔ جو میں کہتا ہوں اُسکا جواب دیتے جاؤ۔ پھر مختلف باتیں پوچھتے تھے اور سائل اکثر تسلیم کرتا جاتا تھا +

ایک دن ایک غریب ہندو نہایت بے قرار اور پریشان آیا۔ ان کے بیس برس کے رفیق قدیم شیخ عبدالکریم اُس وقت موجود تھے۔ خاں صاحب نے اُسے دیکھ کر کہا کہ تمھارا کچھ مال جاتا رہا ہے؟ اُس نے کہا صاحب میں لٹ گیا۔ کہا خاموش رہو۔ جو میں کہوں اُسے سنتے جاؤ۔ جو غلط بات ہو اُس کا انکار کر دینا۔ پھر پوچھا کیا زیور کی قسم سے تھا؟ صاحب ہاں وہی عمر بھر کی کمائی تھی۔ کہا تم نے لیا ہے یا تمھاری بیوی نے۔ کوئی غیر چرانے نہیں آیا۔ اس نے کہا میرا مال تھا اور بیوی کے پہننے کا زیور تھا۔ ہم کیوں چُراتے۔ ہنس کر فرمایا کہیں رکھ کر بھول گئے ہو گے۔ مال کہیں باہر

نہیں گیا۔ اس نے کہا۔ صاحب سارا گھر ڈھونڈ مارا۔ کوئی جگہ باقی نہیں۔ فرمایا پھر دیکھو۔ گیا اور سارے گھر میں اچھی طرح دیکھا۔ پھر آکر کہا۔ صاحب میرا چھوٹا سا گھر ہے۔ ایک ایک کونا دیکھ لیا۔ کہیں پتا نہیں لگتا۔ خاں صاحب نے کہا اسی گھر میں ہے۔ تم غلط کہتے ہو۔ کہا۔ آپ چل کر تلاشی لے لیجیے۔ میں تو ڈھونڈ چکا۔ فرمایا میں یہیں سے بتاتا ہوں۔ یہ کہہ کر سارے گھر کا نقشہ بیان کرنا شروع کیا۔ وہ سب باتوں کو تسلیم کرتا جاتا تھا۔ پھر کہا۔ اس گھر کے جنوب کے رُخ ایک کوٹھری ہے۔ اور اُس میں شمال کی جانب ایک لکڑی کا مچان ہے۔ اُس کے اوپر مال موجود ہے۔ جاکر لے لو۔ اس نے کہا مچان کو تو تین دفعہ چھان مارا۔ وہاں نہیں ملا۔ فرمایا اُسی کے ایک کونے میں پڑا ہے۔ غرض وہ گیا اور جب روشنی کر کے دیکھا تو ڈبا اور اُس میں سارا زیور جوں کا توں وہیں سے مل گیا +

ایک صاحب کا مراسلہ اسی تحریر کے ساتھ مسلسل پہنچا ہے جس میں یہ اور اس قسم کے کئی اسرار نجومی ستاروں کی طرح چمک رہے ہیں اور ان کے شاگردوں کی تفصیل بھی لکھی ہے۔ آزاد اُن کے درج کرنے میں قاصر ہے۔ معاف فرمائیں۔ زمانہ ایک طرح کا نہیں ہے۔ لوگ کہیں گے کہ تذکرہ شعراء لکھنے بیٹھا اور نجومیوں کا تذکرہ لکھنے لگا +

خاں صاحب نے اپنی نجوم دانی کو ایک غزل کے شعر میں نہایت خوبی سے ظاہر کیا ہے :۔

ان نصیبوں پر کیا اختر شناس — آسماں بھی ہے ستم ایجاد کیا

شطرنج سے بھی اُن کو کمال مناسبت تھی۔ جب کھیلنے بیٹھتے تھے تو دنیا و ما فیہا کی خبر نہ رہتی تھی۔ اور گھر کے نہایت ضروری کام بھی بھول جاتے تھے۔ دلّی کے مشہور شاطر کرامت علی خاں سے قرابت قریبہ رکھتے تھے۔ اور شہر کے ایک دو مشہور شاطروں کے سوا کسی سے کم نہ تھے +

شعر و سخن سے اُنھیں طبعی مناسبت تھی اور عاشق مزاجی نے اُسے اور بھی چمکا دیا تھا۔ اُنھوں نے ابتدا میں شاہ نصیر مرحوم کو اپنا کلام دکھایا۔ گر چند روز کے بعد اُن سے

اصلاح لینی چھوڑ دی۔ اور پھر کسی کو استاد نہیں بنایا۔

ان کے نامی شاگرد نواب مصطفےٰ خاں شیفتہ صاحب تذکرۂ گلشن بیخار خلف نواب اعظم الدولہ سرفراز الملک مرتضےٰ خاں مظفر جنگ بہادر رئیس پلول اور ان کے چھوٹے بھائی نواب اکبر خاں کہ چار برس ہوئے راولپنڈی میں دنیا سے انتقال کیا۔ میر حسین تسکین کہ نہایت ذکی الطبع شاعر تھے۔ سید غلام علی خاں وحشت۔ غلام ضامن کرم نواب اصغر علی خاں کہ پہلے اصغر تخلص کرتے تھے۔ پھر نسیم تخلص اختیار کیا۔ اور مرزا خدا بخش قیصر شہزادے وغیرہ۔

وضع و لباس

رنگین طبع۔ رنگین مزاج۔ خوش وضع۔ خوش لباس۔ کشیدہ قامت۔ سبزہ رنگ۔ سر پر لمبے لمبے گھونگھر والے بال اور ہر وقت انگلیوں سے اُن میں کنگھی کرتے رہتے تھے۔ ململ کا انگرکھا ڈھیلے ڈھیلے پائچے۔ اس میں لال نیفہ بھی ہوتا تھا۔ میں نے انھیں نواب اصغر علی خاں اور مرزا خدا بخش قیصر کے مشاعروں میں غزل پڑھتے ہوئے سُنا تھا۔ ایسی دردناک آواز سے دلپذیر ترنّم کے ساتھ پڑھتے تھے کہ مشاعرہ وجد کرتا تھا۔ اللہ اللہ اب تک وہ عالم آنکھوں کے سامنے ہے۔ باتیں کہانیاں ہو گئیں۔ باوجود اس کے نیک خیالوں سے بھی اُن کا دل خالی نہ تھا۔ نوجوانی میں مولانا سید احمد صاحب بریلوی کے مرید ہوئے کہ مولوی اسمٰعیل صاحب کے پیر تھے۔ خاں صاحب انہی کے عقاید کے بھی قایل رہے۔

پڑھنے کا انداز

ارباب دنیا کی تعریف میں کچھ نہیں کہا

اُنھوں نے کسی کی تعریف میں قصیدہ نہیں کہا۔ ہاں راجہ اجیت سنگھ برادر راجہ کرم سنگھ۔ رئیس پٹیالہ جو دہلی میں رہتے تھے۔ اور اُن کی سخاوتیں شہر میں مشہور تھیں۔ وہ ایک دن مصاحبوں کے ساتھ ہمراہ اپنے کوٹھے پر بیٹھے تھے۔ خاں صاحب کا اُدھر سے گزر ہوا۔ لوگوں نے کہا مومن خاں شاعر یہی ہیں۔ راجہ صاحب نے آدمی بھیج کر بلوایا۔ عزّت و تعظیم سے بٹھایا۔ (کچھ نجوم کچھ شعر و سخن کی باتیں کیں) اور حکم دیا کہ ہتھنی کس کر لاؤ۔ ہتھنی حاضر ہوئی۔ وہ خاں صاحب کو عنایت کی۔ انھوں نے کہا کہ مہاراج میں غریب

آدمی ہوں اسے کہاں سے کھلاؤں گا۔ اور کیونکر رکھوں گا۔ کہا کہ سو روپیہ اور دو۔ خاں صاحب اُسی پر سوار ہو کر گھر آئے۔ اور پہلے اس سے کہ بہتی روپے کھائے۔ اُسے بیچ کر فیصلہ کیا (اسی موقع پر راجہ نے کہا تھا۔ دیکھو صفحہ ۵۱۶) پھر خاں صاحب نے ایک قصیدہ مدحیہ شکریہ میں کہہ کر راجہ صاحب کو دیا۔ جس کا مطلع ہے :۔

صبح ہوئی تو کیا ہوا ہے وہی تیرہ اختری　　　کثرتِ دود سے سیاہ شعلۂ شمع خاوری

سوا اس قصیدہ کے اور کوئی مدح کسی دنیادار کے صلہ و انعام کی توقع پر نہیں لکھی۔ وہ اس قدر غیور تھے کہ کسی عزیز یا دوست کا ادنیٰ احسان بھی گوارا نہ کرتے تھے +

راجہ کپور تھلہ نے اُنھیں ساڑھے تین سو روپیہ مہینا کر کے بُلایا اور ہزار روپیہ خرچ سفر بھیجا۔ وہ بھی تیار ہوئے۔ مگر معلوم ہوا کہ وہاں ایک گویّے کی بھی یہی تنخواہ ہے۔ کہا کہ جہاں میری اور ایک گویّے کی برابر تنخواہ ہو میں نہیں جاتا +

جس طرح شاعری کے ذریعے سے اُنھوں نے روپیہ نہیں پیدا کیا اسی طرح نجوم، رمل اور طبابت کو بھی معاش کا ذریعہ نہیں کیا۔ جس طرح شطرنج ان کی ایک دل لگی کی چیز تھی۔ اسی طرح نجوم۔ رمل اور شاعری کو بھی ایک بہلاوا دل کا سمجھتے تھے +

خاں صاحب پانچ چار دفعہ دلّی سے باہر گئے۔ اول رام پور اور وہاں جا کر کہا:

دلّی سے رامپور میں لایا جنونِ عشق　　　ویرانہ چھوڑ آئے ہیں ویرانہ تر میں ہم

دوسری دفعہ سہسوان گئے۔ وہاں فرماتے ہیں :۔

چھوڑ دلّی کو سہسواں آیا　　　ہرزہ گردی میں مبتلا ہوں میں

۳۔ جہانگیر آباد میں نواب مصطفیٰ خاں کے ساتھ کئی دفعہ گئے +

۴۔ ایک دفعہ نواب شائستہ خاں کے ساتھ سہارنپور گئے۔ اس سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ دلّی میں جو میسّر تھا اُسی پر قانع تھے۔ درست ہے۔ تصدیق اس کی دیکھو۔ غالبؔ مرحوم کے حال میں + (صفحہ ۵۰۸)

اُن کی تیزیٔ ذہن اور ذکاوتِ طبع کی تعریف نہیں ہو سکتی۔ وہ خود بھی ذہانت

میں دو شخصوں کے سوا کسی ہمعصر کو تسلیم نہ کرتے تھے۔ ایک مولوی اسمٰعیل صاحب۔ دوسرے خواجہ محمد نصیر صاحب کہ ان کے پیر اور خواجہ میر درد صاحب کے نواسے تھے +

اسی سلسلہ میں نواب مصطفےٰ خاں کی ایک وسیع تقریر ہے جس کا خلاصہ یہ ہے کہ ایسا ذکی الطبع آج تک نہیں دیکھا۔ ان کے ذہن میں بجلی کی سی سرعت تھی وغیرہ وغیرہ۔ ساتھ اس کے مراسلت میں بعض اور معاملے منقول ہیں۔ مگر ان میں بھی واردات کی بنیاد نہیں لکھی۔ مثلاً یہ کہ مولا بخش قلق مولوی امام بخش صاحب صہبائی کے شاگرد رشید دیوان نظیری پڑھتے تھے۔ ایک دن خاں صاحب کے پاس آئے اور ایک شعر کے معنے پوچھے۔ انھوں نے ایسے نازک معنے اور نادر مطلب بیان فرمائے کہ قلق معتقد ہوگئے۔ اور کہا کہ مولوی صاحب نے جو معنے بتائے ہیں وہ اس سے کچھ بھی نسبت نہیں رکھتے۔ لیکن نہ وہ شعر لکھا ہے۔ نہ کسی صاحب کے معنے لکھے ہیں۔ ایسی باتوں کو آزاد نے افسوس کے ساتھ ترک کر دیا ہے۔ شفیق مکرّم معاف فرمادیں +

لطیفہ۔ ان کی عالی دماغی اور بلند خیالی شعرائے متقدمین و متاخرین میں کسی کی فصاحت یا بلاغت کو خاطر میں نہ لاتی تھی۔ یہ قول ان کا مشہور تھا کہ گلستان سعدی کی تعریف میں لوگوں کے دم چڑھے جاتے ہیں۔ اس میں ہے کیا؟ گفت۔ گفت۔ گفتہ اند۔ کہتا چلا جاتا ہے۔ اگر ان لفظوں کو کاٹ دو تو کچھ بھی نہیں رہتا۔ ایک دن مفتی صدر الدین خاں مرحوم کے مکان پر یہی تقریر کی۔ مولوی احمد الدین کرسانوالہ مولوی فضل حق صاحب کے شاگرد بیٹھے تھے انھوں نے کہا کہ قرآن شریف میں کیا فصاحت ہے۔ جابجا قال قال۔ قالوا قالوا ہے +

ان کے کسی شاگرد نے غزل میں یہ شعر لکھا تھا:۔

ہجر میں کیونکر پھروں ہر سُو نہ گھبرایا ہوا وصل کی شب کا سماں آنکھوں میں ہے چھایا ہوا

خاں صاحب نے پہلے مصرع کو یوں بدل دیا ع اس طرف کو دیکھتا بھی ہے تو شرمایا ہوا

اہل مذاق جانتے ہیں کہ اب شعر کہاں سے کہاں پہنچ گیا ہے +

ایک اور شخص نے الٰہی بخش کا سجع لکھا تھا ع مجھ گنہگار کو الٰہی بخش + خاں صاحب
نے فرمایا۔ ع میں گنہگار ہوں الٰہی بخش +

تاریخیں[1] ۔ تاریخ میں ہمیشہ تعمیہ اور تخرجہ معیوب سمجھا جاتا ہے۔ مگر ان کی طبع رسا نے
اسے محسنات تاریخ میں داخل کر دیا۔ چنانچہ اپنے والد کی تاریخ وفات کہی ؎

بہ من الہام گشت سال وفات ۔۔۔۔ کہ غلام نبی بحق پیوست

غلام نبی کے اعداد کے ساتھ حق ملائیں تو پورے سنہ وفات نکل آتے ہیں +
اپنی صغیر سن بیٹی کی تاریخ وفات کہی :-

خاک بر فرقِ دولتِ دُنیا ۔۔۔۔ من فشاندم خزانہ بر سرِ خاک

خزانہ کے اعداد۔ سرِ خاک۔ یعنی خ کے ساتھ ملانے سے سنہ ۱۲۶۳ھ ہوتے ہیں +
تاریخ چاؤ ع آب لذت فزا بہ جام بگیر + آب لذت فزا کے اعداد۔ جام کے اعداد میں
ڈالو تو سنہ ۱۲۶۵ھ حاصل ہوئے +

ایک شخص زین خاں نام حج کو گیا۔ رستہ میں سے پھر آیا۔ خاں صاحب نے کہا
ع چوں بیاید ہنوز خر باشد + سنہ ۱۲۵۶ھ +

شاہ محمد اسحاق صاحب نے دلّی سے ہجرت کی۔ خاں صاحب نے کہا ؎

گفتیم وحید عصر اسحاق ۔۔۔۔ برحکم شہنشہِ دو عالم
بگذاشتہ دارحرب امسال ۔۔۔۔ جا کردہ بمکۂ معظم

وحید عصر اسحاق کے اعداد مکۂ معظم کے اعداد کے ساتھ ملاؤ اور دارحرب کے اعداد اس میں سے
تفریق کرو تو سنہ ۱۲۶۰ھ تاریخ ہجرت نکلتی ہے +

ایک شخص قلعۂ دلّی سے نکالا گیا۔ اُنھوں نے تاریخ کہی ع
از باغ خلد بیروں شیطان بے حیا شد + باغ خلد کے اعداد میں سے شیطان بے حیا کے عدد

[1] ان تاریخوں کے لطف و نزاکت میں کلام نہیں۔ لیکن اصول فن کے بموجب ۹ سے زیادہ کمی بیشی جائز
نہیں۔ اس انداز کے ایجاد داخل معنے ہیں +

نکال ڈالیں تو ۱۲۳۶ھ ہجر رہتے ہیں +

سادی تاریخیں بھی عمدہ ہیں۔ چنانچہ خلیل خاں کے ختنہ کی تاریخ کہی:۔ سنتِ خلیل اللہ +

اپنی عمہ کے مرنے کی تاریخ کہی:۔ لھا اجرٌ عظیمٌ

اپنے والد کے وفات کی تاریخ کہی:۔ قد فاز فوزاً عظیماً

اپنی بیٹی کی ولادت تاریخ کہی:۔

ناں کٹنے کے ساتھ ہاتف نے — کہی تاریخ دخترِ مومن

دخترِ مومن کے اعداد میں سے ناں کے اعداد کو اخراج کیا ہے +

شاہ عبدالعزیز صاحبؒ کی وفات کی تاریخ:۔

دستِ بے دادِ اجل سے بے سر و پا ہو گئے — فقر و دیں۔ فضل و ہنر۔ لطف و کرم علم و عمل

الفاظ مصرع کے اول و آخر کے حرفوں کو گرا دو۔ بیچ کے حرفوں کے عدد لو تو ۱۲۳۹ھ رہتے ہیں +

ان کے معمے بھی متعدد ہیں۔ مگر ایک لاجواب ہے۔ ایسا نہیں سُنا گیا:۔

بنے کیونکر کہ ہے سب کار اُلٹا — ہم اُلٹے۔ بات اُلٹی۔ یار اُلٹا یعنی مہتاب رائے

پہیلیاں بھی کہیں۔ ایک یہاں لکھی جاتی ہے کہ گھڑیال پر ہے:۔

نہ بولے وہ جبتک کہ کوئی بلائے — نہ لفظ اور معنی سمجھ میں کچھ آئے

نہیں چور پر وہ لٹکتا رہے — زمانہ کا احوال بکتا رہے

شب و روز غوغا مچایا کرے — اسی طرح سے مار کھایا کرے

کوٹھے سے گرنے کے بعد اُنھوں نے حکم لگایا تھا کہ ۵ دن یا ۵ مہینے یا ۵ برس میں مرجاؤں گا۔ چنانچہ ۵ مہینے کے بعد مر گئے۔ گرنے کی تاریخ خود ہی کہی تھی:۔ دست و بازو بشکست + مرنے کی تاریخ ایک شاگرد نے کہی:۔ ماتمِ مومن +

دلی دروازہ کے باہر مہدیوں کے جانب غرب۔ زیرِ دیوار احاطہ مدفون ہوئے۔ شاہ عبدالعزیز صاحب کا خاندان بھی یہیں مدفون ہے +

روایت۔ مرنے کے بعد لوگوں نے عجیب عجیب طرح سے خواب میں دیکھا۔ ایک

خواب نہایت سچا اور حیرت انگیز ہے۔ نواب مصطفےٰ خاں نے دو برس بعد خواب میں دیکھا کہ ایک قاصد نے آکر خط دیا کہ مومن مرحوم کا خط ہے۔ انھوں نے لفافہ کھولا تو اُس کے خاتمہ پر ایک مُہر ثبت تھی جس میں مومن جنتی لکھا تھا۔ اور خط کا مضمون یہ تھا کہ آج کل میرے عیال پر مکان کی طرف سے بہت تکلیف ہے تم ان کی خبر لو۔ صبح کو نواب صاحب نے دو سو روپے اُن کے گھر بھیجے اور خواب کا مضمون بھی کہلا بھیجا۔ ان کے صاحبزادے احمد نصیر خاں سلمہ اللہ کا بیان ہے کہ فی الواقعہ ان دنوں میں ہم پر مکان کی نہایت تکلیف تھی۔ برسات کا موسم تھا اور سارا مکان ٹپکتا تھا +

اپنے شفیق مکرم کے الطاف وکرم کا شکر گزار ہوں کہ انھوں نے یہ حالات مرتب کر کے عنایت فرمائے لیکن کلام پر رائے نہ لکھی اور باوجود التجا مکرر کے انکار کیا۔ اس لئے بندہ آزاد اپنے فہم قاصر کے بموجب لکھتا ہے +

رائے انکے کلام پر

غزلوں میں ان کے خیالات نہایت نازک اور مضامین عالی ہیں اور استعارہ اور تشبیہ کے زور نے اور بھی اعلیٰ درجہ پر پہنچایا ہے۔ ان میں معاملات عاشقانہ عجیب مزے سے ادا کئے ہیں۔ اسی وجہ سے جو شعر صاف ہوتا ہے اُس کا انداز جرأت سے ملتا ہے اور اس پر وہ خود بھی نازاں تھے۔ اشعار مذکورہ میں فارسی کی عمدہ ترکیبیں اور دل کش تراشیں ہیں کہ اُردو کی سلاست میں اشکال پیدا کرتی ہیں۔ ان کی زبان میں چند وصف خاص ہیں جن کا جتلانا لطف سے خالی نہیں۔ وہ اکثر اشعار میں ایک شے کو کسی صفت خاص کے لحاظ سے ذات شے کی طرف نسبت کرتے ہیں۔ اور اس ہیر پھیر میں شعر[1] میں عجیب لطف لطیف بلکہ معانی پنہانی پیدا کراتے ہیں۔ مثلاً :۔

[1] بعض اشعار پر لوگوں کے اعتراض ہیں۔ ان کی تفصیل وتحریر ایک معمولی بات ہے مثلاً شمر بالتسکین ہے اُسے شمر بفتحتین باندھا ہے سہ دل ایسے شوخ کو مومن نے دیدیا کہ جو ہے محب حسین کا اور دل رکھے شمر کا سا یا نوحہ مومن کی نئی ترکیبات دیکھو صفحہ ۴۳۰۔ اور ایسے ایجاد ان کے کلام میں اکثر ہیں +

موئے نہ عشق میں جبتک وہ مہرباں نہ ہوا بلائے جان ہے وہ دل جو بلائے جاں نہ ہوا
محو مجھ سا دمِ نظارۂ جاناں ہوگا آئنہ آئنہ دیکھے گا تو حیراں ہوگا
کیا رام نہ کروگے اگر ابرام نہ ہوگا الزام سے حاصل بجز الزام نہ ہوگا
روزِ جزا جو قاتلِ دل جو خطاب تھا میرا سوال ہی مرے خوں کا جواب تھا
پسِ شکستنِ دل خُمِ زجر محتسب معقول گناہگار نے سمجھا گناہگار مجھے
نقدِ جاں تھا نہ سزائے دیتِ عاشق حیف خونِ فرہاد سرِ گردنِ فرہاد رہا

اکثر عمدہ ترکیبیں اور نادر تراشیں فارسی کی۔ اور استعارے واضافتیں اُردو میں استعمال کرکے کلام کو نمکین کرتے ہیں۔ مثلاً:۔

گرد ہاں ہے یہ خموشی اثر افغاں ہوگا حشر میں کون مرے حال کو پرساں ہوگا
یعنی فغانے کہ اثرش خموشی است
بیمار اجل چارہ کو گر حضرتِ عیسےٰ اچھا نہ کریں گے تو کچھ اچھا نہ کریں گے
یعنی بیمارے کہ چارہ اش اجل است

وفائے غیرتِ شکرِ جفا نے کام کیا کہ اب ہوس سے بھی اعدائے بوالہوس گزرے
ستم اے شور بختی میری ہڈی کیوں ہما کھاتا سگِ لیلیٰ ادا کو گر نہ ظالم بدمزہ لگتی

اکثر اہل اُردو یہ طرز پسند نہیں کرتے۔ لیکن اپنا اپنا مذاق ہے۔ ناسخ اور آتش کے حال میں اس تقریر کو بہت طول دے چکا ہوں دوبارہ لکھنا فضول ہے +

قصائد۔ اپنے درجہ میں عالی رُتبہ رکھتے ہیں۔ اور زبان کا انداز وہی ہے +
مثنویاں۔ نہایت دردانگیز ہیں کیونکہ دردخیز دل سے نکلی ہیں۔ زبان کے لحاظ سے جو غزلوں کا حال ہے وہی ان کا ہے +

غزلیں

غیروں پہ کُھل نہ جائے کہیں راز دیکھنا میری طرف بھی غمزۂ غماز دیکھنا
اُڑتے ہی رنگ رخ مرا نظروں سے تھا نہاں اس مرغ پر شکستہ کی پرواز دیکھنا

دشنامِ یار طبعِ حزیں پر گراں نہیں — اے ہمنفس نزاکتِ آواز دیکھنا

دیکھ اپنا حالِ زار منجم ہوا رقیب — تھا سازگار طالعِ ناساز دیکھنا

بدکام کا مآل بُرا ہے جزا کے دن — حالِ سپہر تفرقہ انداز دیکھنا

مت رکھیو گردِ تارکِ عشاق پر قدم — پامال ہو نہ جائے سرافراز دیکھنا

کشتہ ہوں اُسکے چشمِ فسونگر کا اے مسیح — کرنا سمجھ کے دعوئے اعجاز دیکھنا

میری نگاہ خیرہ دکھاتے ہیں غیر کو — بے طاقتی پہ سرزنشِ ناز دیکھنا

ترکِ صنم بھی کم نہیں سوزِ جحیم سے
مومن غمِ مآل کا آغاز دیکھنا

اشک دارو نہ اثر باعثِ صد جوش ہوا — ہچکیوں سے میں یہ سمجھا کہ فراموش ہوا

جلوہ افزائے رُخ کے لئے مے نوش ہوا — میں کبھی آپ میں آیا تو وہ بیہوش ہوا

کیا یہ پیغامبرِ غیر ہے اے مرغِ چمن — خندہ زن بادِ بہاری سے وہ گلگوش ہوا

ہے یہ غم گور میں رنجِ شبِ اول سے فزوں — کہ وہ مہرو مرے ماتم میں سیہ پوش ہوا

مجھ پہ شمشیرِ نگہ خود بخود آ پڑتی ہے — عاجزِ احوالِ زبوں سے وہ ستم کوش ہوا

آخریں دل میں رہی خنجرِ دشمن کے سبب — اپنے قاتل سے خفا تھا کہ میں خاموش ہوا

دردِ شانہ سے ترا محوِ نزاکت خوش ہے — کہ میں ہمدوش ہوں گو غیر بھی ہمدوش ہوا

وہ ہے خالی تو یہ خالی یہ بھری تو وہ بھری — کاسۂ عمرِ عدو حلقۂ آغوش ہوا

تو نے جو قہرِ خدا یاد دلایا مومن
شکوۂ جورِ بتاں دل سے فراموش ہوا

گئے وہ خواب سے اُٹھ غیر کے گھر آخرِ شب — اپنے نالے نے جگایا یہ اثر آخرِ شب

صبحدم وصل کا وعدہ تھا یہ حسرت دیکھو — مر گئے ہم دمِ آغازِ سحر آخرِ شب

شعلۂ آہِ فلک رتبہ کا اعجاز تو دیکھ — اوّلِ ماہ میں چاند آئے نظر آخرِ شب

سوزِ دل سے گئی جاں بخت چمکنے کے قریب — کرتے ہیں موسمِ گرما میں سفر آخرِ شب

ملے ہی غیر سے بے پردہ تم انکار کے بعد — جلوہ خورشید کا سا تھا کچھ ادھر آخرِ شب

صبحدم آنے کو وہ تھا کہ گواہی دے ہے — رجعتِ قہقری چرخ و قمر آخرِ شب

غیر نکلا ترے گھر سے گئی اُس وہم میں جاں — غُل ہوئے چور کے اس کوچے میں گر آخرِ شب

دی تسلی تو وہ ایسی کہ تسلی نہ ہوئی — خواب میں تو مرے آئے وہ مگر آخرِ شب

مو سفیدی کے قریب اور ہے غفلت مومن

نیند آتی ہے بہ آرام دگر آخرِ شب

آنکھوں سے حیا ٹپکے ہے انداز تو دیکھو — ہے بوالہوسوں پر بھی ستم ناز تو دیکھو

اس بت کے لئے میں ہوسِ حور سے گزرا — اس عشقِ خوش انجام کا آغاز تو دیکھو

چشمک مری وحشت پہ ہے کیا حضرتِ ناصح — طرزِ نگہِ چشمِ فسوں ساز تو دیکھو

اربابِ ہوس ہار کے بھی جان پہ کھیلے — کم طالعئ عاشقِ جاں باز تو دیکھو

مجلس میں مرے ذکر کے آتے ہی اُٹھے وہ — بدنامئ عشاق کا اعزاز تو دیکھو

محفل میں تم اغیار کو دزدیدہ نظر سے — منظور ہے پنہاں نہ رہے راز تو دیکھو

اس غیرتِ ناہید کی ہر تان ہے دیپک — شعلہ سا چمک جائے ہے آواز تو دیکھو

دیں پاکئ دامن کی گواہی مرے آنسو — اس یوسفِ بے درد کا اعجاز تو دیکھو

جنت میں بھی مومن نہ ملا ہائے بتوں سے

جورِ اجلِ تفرقہ پرداز تو دیکھو

دفن جب خاک میں ہم سوختہ ساماں ہونگے — فلس ماہی کے گُلِ شمع شبستاں ہونگے

ناوک انداز جدھر دیدۂ جاناں ہونگے — نیم بسمل کئی ہونگے کئی بے جاں ہونگے

تابِ نظارہ نہیں آئینہ کیا دیکھنے دوں — اور بن جائینگے تصویر جو حیراں ہونگے

تو کہاں جائے گی کچھ اپنا ٹھکانا کر لے — ہم تو کل خوابِ عدم میں شبِ ہجراں ہونگے

ناصحا دل میں تو اتنا تو سمجھ اپنے کہ ہم — لاکھ ناداں ہوئے کیا تجھ سے بھی ناداں ہونگے

کر کے زخمی مجھے نادم ہوں یہ ممکن ہی نہیں — گر وہ ہونگے بھی تو بے وقت پشیماں ہونگے

ایک ہم ہیں کہ ہوئے ایسے پشیمان کہ بس ۔۔۔ ایک وہ ہیں کہ جنھیں چاہ کے ارماں ہونگے
ہم نکالیں گے سن اے موجِ صبا بل تیرا ۔۔۔ اس کی زلفوں کے اگر بال پریشاں ہونگے
صبر یارب مری وحشت کا پڑے گا کہ نہیں ۔۔۔ چارہ فرما بھی کبھی قیدیٔ زنداں ہونگے
منتِ حضرتِ عیسیٰ نہ اٹھائیں گے کبھی ۔۔۔ زندگی کے لئے شرمندۂ احساں ہونگے
تیرے دل تفتہ کی تربت پہ عدو جھوٹا ہے ۔۔۔ گل نہ ہوں گے شررِ آتشِ سوزاں ہونگے
غور سے دیکھتے ہیں طوف کو آہوئے حرم ۔۔۔ کیا کہیں اس کے سگِ کوچہ قرباں ہونگے
داغِ دل نکلیں گے تربت سے مری جوں لالہ ۔۔۔ یہ وہ اخگر نہیں جو خاک میں پنہاں ہونگے
چاک پردے سے یہ غمزے ہیں تو اے پردہ نشیں ۔۔۔ ایک ہیں کیا کہ سبھی چاک گریباں ہونگے
پھر بہار آئی وہی دشت نوردی ہوگی ۔۔۔ پھر وہی پاؤں وہی خارِ مغیلاں ہونگے
سنگ اور ہاتھ وہی وہ ہی سر و داغِ جنوں ۔۔۔ وہی ہم ہوں گے وہی دشت و بیاباں ہونگے

عمر تو ساری کٹی عشقِ بتاں میں مومن
آخری وقت میں کیا خاک مسلماں ہونگے

خوشی نہ ہو مجھے کیونکر قضا کے آنے کی ۔۔۔ خبر ہے لاش پہ اس بے وفا کے آنے کی
ہے ایک خلق کا خوں سر پہ اشک خوں کے مرے ۔۔۔ سکھائی طرز اسے دامن اٹھا کے آنے کی
سمجھ کے اور ہی کچھ مر چلا میں اے ناصح ۔۔۔ کہا جو تو نے نہیں جان جا کے آنے کی
امید سرمہ میں تکتے ہیں راہ دیدۂ زخم ۔۔۔ شمیم سلسلۂ مشکسا کے آنے کی
چلی ہے جان نہیں تو کوئی نکالو راہ ۔۔۔ تم اپنے پاس تک اس مبتلا کے آنے کی
نہ جائے کیوں دلِ مرغِ چمن کہ سیکھ گئی ۔۔۔ بہار وضع ترے مسکرا کے آنے کی
مشامِ غیر میں پہنچی ہے نکہتِ گلِ داغ ۔۔۔ یہ بے سبب نہیں بندی ہوا کے آنے کی
جو بے حجاب نہ ہوگی تو جان جائے گی ۔۔۔ کہ راہ دیکھی ہے اس نے حیا کے آنے کی
پھر ابکے لا ترے قربان جاؤں جذبۂ دل ۔۔۔ گئے ہیں یاں سے وہ سوگند کھا کے آنے کی
خیالِ زلف میں خود رفتگی نے قہر کیا ۔۔۔ امید تھی مجھے کیا کیا بلا کے آنے کی

کروں میں وعدہ خلافی کا شکوہ کس کس سے — اجل بھی رہ گئی ظالم سُنا کے آنے کی

کہاں ہے ناقہ ترے کان بجتے ہیں مجنوں — قسم ہے مجھ کو صدائے درا کے آنے کی

مرے جنازہ پہ آنے کا ہے ارادہ تو آ — کہ دیر اٹھانے میں کیا ہے صبا کے آنے کی

مجھے یہ ڈر ہے کہ مومن کہیں نہ کہتا ہو
مری تسلی کو روزِ جزا کے آنے کی

ازبس جنوں جُدائیِ گُل پیرہن سے ہے — دل چاک چاک نغمۂ مُرغِ چمن سے ہے

سرگرم مدحِ غیر دمِ شعلہ زن سے ہے — دوزخ کو کیا جلن مرے دل کی جلن سے ہے

روزِ جزا نہ دے جو مرے قتل کا جواب — وہم سخن رقیب کو اس کم سخن سے ہے

یاد آگیا زبس کوئی مہروئے مہروش — امید داغ تازہ سپہرِ کہن سے ہے

کچھ بھی کیا نہ یار کی سنگیں دلی کا پاس — سب کاوشِ رقیب دلا کوہکن سے ہے

ان کو گمان ہے گلۂ چینِ زلف کا — خوشبو دہانِ زخم جو مشکِ ختن سے ہے

میں کیا کہ مرگِ غیر پہ دامان تر نہ ہو — وہ اشک ریز خندۂ چاکِ کفن سے ہے

کیونکر نجات آتشِ ہجراں سے ہو کہ مرگ — آئی تو دور ہی تب و تابِ بدن سے ہے

خود رفتگی میں چین وہ پایا کہ کیا کہوں — غربت جو مجھ سے پوچھو تو بہتر وطن سے ہے

رشکِ پری کہے سے عدو کے یہ وحشتیں — نفرت بلا تمھیں مرے دیوانہ پن سے ہے

داغِ جنوں کو دیتے ہیں گُل سے زبس مثال — میں کیا کہ عندلیب کو وحشت چمن سے ہے

کیوں یار نوحہ زن ہیں کہاں مرگ مجھکو تو — لب بستگی تصورِ بوسِ دہن سے ہے

کیا کیا جواب شکوہ میں باتیں بنا گیا — لو اب بھی دل درست اُسی دل شکن سے ہے

اپنا شریک بھی نہ گوارا کرے بتو
مومن کو ضد یہ کیسی بدِ برہمن سے ہے

دُعا بلا تھی شبِ غم سکونِ جاں کے لئے — سخن بہانہ ہوا مرگِ ناگہاں کے لئے

نہ پائے یار کے بوسے نہ آستاں کے لئے — عبث میں خاک ہوا میل آسماں کے لئے

خلافِ وعدۂ فردا کی ہم کو تاب کہاں
امید یکشبہ ہے پاس جاوداں کے لئے

سُنیں نہ آپ تو ہم بوالہوس سے حال کہیں
کہ سخت چاہئے دل اپنے رازداں کے لئے

حجاب چرخ بلا ہے ہوا کرے بیتاب
فغاں اثر کے لئے اور اثر فغاں کے لئے

ہے اعتماد مرے بختِ خفتہ پر کیا کیا
وگرنہ خواب کہاں چشمِ پاسباں کے لئے

مزہ یہ شکوہ میں آیا کہ بے مزہ ہوئے وہ
میں تلخ کام رہا لذّتِ زباں کے لئے

لیا ہے دل کے عوض جان دے رقیب تو دوں
میں اور آپ کی سوداگری زیاں کے لئے

وہ لعل روح فزا دے کہاں تلک بوسے
کہ جو ہے کم ہے یہاں شوق جانفشاں کے لئے

ملے رقیب سے وہ جب سُنا وصال ہوا
دریغ جان گئی ایسے بدگماں کے لئے

کہاں وہ عیش اسیری کہاں وہ امنِ قفس
ہے بیم برقِ بلا روز آشیاں کے لئے

جنونِ عشقِ ازل کیوں نہ خاک اُڑائیں کہ ہم
جہاں میں آئے ہیں ویرانیٔ زباں کے لئے

بھلا ہوا کہ وفا آزما ستم سے ہوئے
رہیں بھی دینی تھی جاں اُس کے امتحاں کے لئے

رواں فزائیِ سحرِ حلال مومن سے
رہا نہ معجزہ باقی لبِ بتاں کے لئے

ملک الشّعراء خاقانیٔ ہند شیخ ابراہیم ذوقؔ

جب وہ صاحب کمال عالمِ ارواح سے کشورِ اجسام کی طرف چلا تو فصاحت کے فرشتوں نے باغ قدس کے پھولوں کا تاج سجایا۔ جن کی خوشبو شہرت عام بن کر جہان میں پھیلی۔ اور رنگ نے بقائے دوام سے آنکھوں کو طراوت بخشی۔ وہ تاج سر پہ رکھا گیا تو آبِ حیات اُس پر شبنم ہو کر برسا کہ شادابی کو کُملاہٹ کا اثر نہ پہنچے۔ ملک الشعرائی کا سکّہ اُس کے نام سے موزوں ہوا اور اُس کے طغرائے شاہی میں یہ نقش ہوا کہ اُس پر نظمِ اُردو کا خاتمہ کیا گیا۔ چنانچہ اب ہرگز اُمید نہیں کہ ایسا قادر الکلام پھر ہندوستان میں پیدا ہو۔ سبب اس کا یہ ہے کہ جس باغ کا بلبل تھا وہ باغ برباد ہو گیا۔ نہ ہمصفیر رہے

نہ ہمداستان رہے۔ نہ اُس بولی کے سمجھنے والے رہے۔ جو خراب آباد اس زبان کے لئے ٹکسال تھا۔ وہاں بھانت بھانت کا جانور بولتا ہے۔ شہر چھاؤنی سے بدتر ہو گیا۔ امرا کے گھرانے تباہ ہو گئے۔ گھرانوں کے وارث علم و کمال کے ساتھ روٹی سے محروم ہو کر حواس کھو بیٹھے۔ وہ جادو کار طبیعتیں کہاں سے آئیں۔ جو بات بات میں دلپسند انداز اور عمدہ تراشیں نکالتی تھیں۔ آج جن لوگوں کو زمانہ کی فارغ البالی نے اس قسم کی ایجاد و اختراع کی فرصتیں دی ہیں وہ اَور اَور اصل کی شاخیں ہیں۔ انھوں نے اَور پانی سے نشو و نما پائی ہے۔ وہ اَور ہی ہواؤں میں اُڑ رہے ہیں۔ پھر اِس زبان کی ترقی کا کیا بھروسہ۔ کیسا مبارک زمانہ ہوگا جب کہ شیخ مرحوم اور میرے والد مغفور ہم عمر ہوں گے۔ تحصیل علمی ان کی عمروں کی طرح حالتِ طفولیت میں ہو گی۔ صرف و نحو کی کتابیں ہاتھوں میں ہوں گی۔ اور ایک استاد کے دامن شفقت میں تعلیم پاتے ہوں گے۔ ان نیک لوگوں کی ہر ایک بات استقلال کی بنیاد پر قائم ہوتی تھی۔ وہ رابطہ ان کا عمروں کے ساتھ ساتھ بڑھتا گیا۔ اور اخیر وقت تک ایسا بنھ گیا کہ قرابت سے بھی زیادہ تھا۔ ان کے تحریر حالات میں بعض باتوں کے لکھنے کو لوگ فضول سمجھیں گے مگر کیا کروں۔ جی یہی چاہتا ہے کہ کوئی حرف گراں بہا داستان کا نہ چھوڑوں۔ یہ شاید اس سبب سے ہو کہ اپنے پیارے اور پیار کرنے والے بزرگ کی ہر بات پیاری ہوتی ہے لیکن نہیں! اس شعر کے پُتلے کا ایک رونگٹا بھی بیکار نہ تھا۔ ایک صنعت کاری کی کل میں کون سے پُرزے کو کہہ سکتے ہیں کہ نکال ڈالو۔ یہ کام کا نہیں۔ اور کون سی حرکت اُس کی ہے جس سے کچھ حکمت انگیز فائدہ نہیں پہنچتا ہے۔ اسی واسطے میں لکھوں گا اور سب کچھ لکھوں گا۔ جو بات اُن کے سلسلۂ حالات میں مسلسل ہو سکے گی ایک حرف نہ چھوڑوں گا۔ شیخ مرحوم کے والد شیخ محمد رمضان ایک غریب سپاہی تھے۔ مگر زمانہ کے تجربہ اور بزرگوں کی صحبت نے انھیں حالات زمانہ سے ایسا باخبر کیا تھا کہ ان کی زبانی باتیں کتب تاریخ کے قیمتی سرمائے تھے۔ وہ دلّی میں کابلی دروازہ کے پاس رہتے تھے اور نواب لطف علی خاں نے انھیں معتبر اور بالیاقت شخص سمجھ کر اپنی حرم سرا کے کاروبار سپرد کر رکھے تھے شیخ علیہ الرحمہ

راقم سے اور ان سے کیا تعلق تھا

خاندان

سنہ ۱۲۰۴ھ میں پیدا ہوئے

ان کے اکلوتے بیٹے تھے۔ کہ سنہ ۱۲۰۴ھ میں پیدا ہوئے۔ اُس وقت کسے خبر ہو گی کہ رمضان سے وہ چاند نکلے گا جو آسمان سخن پر عید کا چاند ہو کر چمکے گا۔ جب پڑھنے کے قابل ہوئے تو حافظ غلام رسول نام ایک شخص بادشاہی حافظ ان کے گھر کے پاس رہتے تھے۔ محلے کے اکثر لڑکے اُنہی کے پاس پڑھتے تھے۔ انہیں بھی وہیں بٹھادیا+

تعلیم و تربیت

حافظ غلام رسول شاعر بھی تھے۔ شوق تخلص کرتے تھے[۱]۔ اگلے وقتوں کے لوگ جیسے شعر کہتے ہیں ویسے شعر کہتے تھے۔ محلے کے شوقین نوجوان دلوں کی اُمنگ میں ان سے کچھ کچھ کہلوا لیا کرتے تھے۔ اکثر اصلاح بھی لیا کرتے تھے۔ غرض ہر وقت ان کے ہاں یہی چرچہ رہتا تھا۔ شیخ مرحوم خود فرماتے تھے کہ وہاں سُنتے سُنتے مجھے بہت شعر یاد ہو گئے۔ نظم کے پڑھنے اور سُننے میں دل کو ایک روحانی لذت حاصل ہوتی تھی اور ہمیشہ اشعار پڑھتا پھرا کرتا تھا۔ دل میں شوق تھا اور خدا سے دعائیں مانگتا تھا کہ الٰہی مجھے شعر کہنا آجائے۔ ایک دن خوشی میں آکر خود بخود میری زبان سے دو شعر نکلے۔ اور یہ

---

(۱) نمونہ کلام کا یہ ہے :-

مزا انگور کا ہے رنگترے میں — عسل زنبور کا ہے رنگترے میں
ہیں اثمار ہلالی اُس کی پھانکیں — یہ مضموں دور کا ہے رنگترے میں
نہیں ہے اُس کی پھانکوں میں یہ زیرا — یہ لشکر مور کا ہے رنگترے میں
ہے گلگونِ مجسّم یا بھرا خوں — کسی مہجور کا ہے رنگترے میں
مزاج اب جس کا صفراوی ہے اے شوق — دل اُس رنجور کا ہے رنگترے میں

لکھا ہوا تھا یہ اُس مہ جبیں کے پردے پر — نہیں ہے ایسا کوئی اب زمیں کے پردے پر

کوئی کہ مژگاں چشم ستمگر آکے جگر میں گھوپ چلی — آہ کی ہمدم ساتھ ادھر جنگ کو اپنے دھوپ چلی
وعدہ کیا تھا شام کا مجھ سے شوق جنھوں نے کل دن کا — آج وہ آئے پاس مرے جب ڈیڑھ پہر کی توپ چلی
ناقے مست عدو سے بدا ایسا ہی چھٹی کا رجلاہے — نانی جس کی آئی چھٹی میں دھوم سے لیکر گھی کھچڑی
شیخ بگھارے شیخی اپنی مفت کے لقمے کھاتا ہے — دود ملیدا کھاتے ہیں یا مست قلندر گھی کھچڑی

فقط حُسن اتفاق تھا کہ ایک حمد میں تھا ایک نعت میں۔ اس عمر میں مجھے اتنا ہوش تو کہاں تھا کہ اس مبارک مہم کو خود اس طرح سمجھ کر شروع کرتا کہ پہلا حمد میں ہو دوسرا نعت میں ہو۔ جب یہ بھی خیال نہ تھا کہ اس قدرتی اتفاق کو مبارک فال سمجھوں۔ مگر ان دو شعروں کے موزوں ہو جانے سے جو خوشی دل کو ہوئی۔ اس کا مزہ اب تک نہیں بھولتا۔ انہیں کہیں اپنی کتاب میں کہیں جا بجا کاغذوں پر رنگ برنگ کی روشنائیوں سے لکھتا تھا۔ ایک ایک کو سُناتا تھا اور خوشی کے مارے پھولوں نہ سماتا تھا۔ غرض کہ اسی عالم میں کچھ کچھ کہتے رہے۔ اور حافظ جی سے اصلاح لیتے رہے +

ابتدائی مشق

اسی محلہ میں میر کاظم حسین نام ایک اُن کے ہم سن ہم سبق تھے کہ نواب سید رضی خاں مرحوم کے بھانجے تھے۔ بیقرار تخلص کرتے تھے۔ اور حافظ غلام رسول ہی سے اصلاح لیتے تھے مگر ذہن کی جودت اور طبیعت کی براقی کا یہ عالم تھا کہ کبھی برق تھے اور کبھی باد و باراں۔ انہیں اپنے بزرگوں کی صحبت میں تحصیل کمال کے لئے اچھے اچھے موقعے ملتے تھے۔ شیخ مرحوم اور وہ اتحاد طبعی کے سبب سے اکثر ساتھ رہتے تھے۔ اور مشق کے میدان میں ساتھ ہی گھوڑے دوڑاتے تھے۔ انہیں دنوں کا شیخ مرحوم کا ایک مطلع ہے کہ نمونہ تیزیٔ طبع کا دکھاتا ہے:۔

ماتھے پہ ترے جھمکے ہے جھومر کا پڑا چاند لا بوسہ۔ چڑھے چاند کا وعدہ تھا چڑھا چاند

شاہ نصیر مرحوم کی شاگردی

ایک دن میر کاظم حسین نے غزل لاکر سُنائی۔ شیخ مرحوم نے پوچھا۔ غزل کب کہی؟ خوب گرم شعر نکالے ہیں۔ انھوں نے کہا ہم تو شاہ نصیر کے شاگرد ہو گئے۔ انہیں سے یہ اصلاح لی ہے۔ شیخ مرحوم کو بھی شوق پیدا ہوا اور ان کے ساتھ جاکر شاگرد ہو گئے +

سلسلۂ اصلاح جاری تھا۔ مشاعروں میں غزلیں پڑھی جاتی تھیں۔ لوگوں کی واہ وا طبیعتوں کو بلند پروازیوں کے پَر لگاتی تھی۔ کہ رشک جو تلامیذ الرحمٰن کے آئینوں کا جوہر ہے اُستاد شاگردوں کو چمکانے لگا۔ بعض موقع پر ایسا ہوا کہ شاہ صاحب نے اُن کی غزل کو دیکھ کر بے اصلاح پھیر دیا۔ اور کہا کہ طبیعت پر زور ڈال کر کہو۔ کبھی

کہہ دیا کہ یہ کچھ نہیں۔ پھر سوچ کر کہو۔ بعض غزلوں کو جو اصلاح دی تو اُس سے بے ادائی پائی گئی۔ ادھر انھیں کچھ تو یاروں نے چمکا دیا۔ کچھ اپنی غریب حالت نے یہ آزردگی پیدا کی کہ شاہ صاحب اصلاح میں بے توجہی یا پہلو تہی کرتے ہیں۔ چنانچہ اس طرح کئی دفعہ غزلیں پھیریں بہت سے شعر کٹ گئے۔ زیادہ تر قباحت یہ ہوئی کہ شاہ صاحب کے صاحب زادے شاہ وجیہ الدین مُنیر تھے جو بَرّاقیِ طبع میں اپنے والد کے خلف الرشید تھے۔ ان کی غزلوں میں توارد سے یا خدا جانے کس اتفاق سے وہی مضمون پائے گئے۔ اس لئے اُنھیں زیادہ رنج ہوا۔

منیر مرحوم کو جس قدر دعوے تھے اس سے زیادہ طبیعت میں نوجوانی کے زور بھرے ہوئے تھے وہ کسی شاعر کو خاطر میں نہ لاتے تھے۔ اور کہتے تھے کہ جس غزل پر ہم قلم اُٹھائیں اُس زمین میں کون قدم رکھ سکتا ہے۔ مشکل طرحیں کرتے تھے اور کہتے تھے کون پہلوان ہے جو اِس نال کو اٹھا سکے۔ غرض کہ ان سے اور شیخ مرحوم سے بمقتضائے سن اکثر تکرار ہو جاتی تھی اور مباحثے ہوتے تھے۔ ایک دفعہ یہاں تک نوبت پہنچی کہ شیخ علیہ الرحمہ نے فرمایا کہ گھر کے کہے ہوئے شعر صحیح نہیں۔ شاید آپ اُستاد سے کہلوا لاتے ہوں گے۔ ہاں ایک جلسہ میں بیٹھ کر میں اور آپ غزل کہیں۔ چنانچہ اس معرکہ کی منیر مرحوم کی غزل نہیں ملی۔ شیخ علیہ الرحمہ کی غزل کا مطلع مجھے یاد ہے :-

یہاں کے آنے کا مقرر قاصد وہ دن کرے　　　جو تو مانگے گا وہی دوں گا خدا وہ دن کرے

اگرچہ ان کی طبیعت حاضر، فکر رسا اور بندش چُست اس پر کلام میں زور سب کچھ تھا مگر چونکہ ایک غریب سپاہی کے بیٹے تھے نہ دنیا کے معاملات کا تجربہ تھا نہ کوئی ان کا دوست ہمدرد تھا اس لئے رنج اور دل تنگی حد سے زیادہ ہوتی تھی۔ اسی قیل و قال میں ایک دن سودا کی غزل پر غزل کہی۔ دوش نقش پا۔ آغوش نقش پا۔ شاہ صاحب کے پاس لے گئے اُنھوں نے خفا ہو کر غزل پھینک دی کہ استاد کی غزل پر غزل کہتا ہے؟ اب تو مرزا رفیع سے

اب بگاڑ شروع ہوتا ہے

بھی اُڑنے لگا۔ ان دنوں میں ایک جگہ مشاعرہ ہوتا تھا۔ اشتیاق نے بیقرار کر کے گھر سے نکالا۔ مگر غزل بے اصلاح تھی۔ دل کے ہراس نے روک لیا کہ ابتدائے کار ہے احتیاط شرط ہے۔ قریب شام افسردگی اور مایوسی کے عالم میں جامع مسجد تک آ نکلے۔ آثار شریف میں فاتحہ پڑھی حوض پر آئے وہاں میر کلّو حقیر بیٹھے تھے۔ چونکہ مشاعرہ کی گرم غزلوں نے روشناس کر دیا تھا۔ اور سن رسیدہ اشخاص شفقت کرنے لگے تھے۔ میر صاحب نے اُنھیں پاس بٹھایا۔ اور کہا کہ کیوں میاں ابراہیم؟ آج کچھ مکدر معلوم ہوتے ہو۔ خیر ہے؟ جو کچھ ملال دل پر تھا انھوں نے بیان کیا۔ میر صاحب نے کہا کہ بھلا وہ غزلیں ہمیں تو سناؤ۔ انھوں نے غزل سُنائی۔ میر صاحب کو ان کے معاملہ پر درد آیا۔ کہا کہ جاؤ بے تامل غزل پڑھ دو۔ کوئی اعتراض کرے گا تو جواب ہمارا ذمہ ہے۔ اور ہاتھ اٹھا کر دیر تک ان کے لئے دعا کرتے رہے۔ اگرچہ میر صاحب کا قدیمانہ انداز تھا مگر وہ ایک کہن سال شخص تھے۔ بڑے بڑے باکمال شاعروں کو دیکھا تھا۔ اور مکتب پڑھایا کرتے تھے۔ اس لئے شیخ مرحوم کی خاطر جمع ہوئی اور مشاعرہ میں جاکر غزل پڑھی۔ وہاں بہت تعریف ہوئی۔ چنانچہ غزل مذکور یہ ہے:

رکھتا ہر قدم ہے وہ یہ ہوش نقشِ پا ہو خاکِ عاشقاں نہ ہم آغوش نقشِ پا

اُفتادگاں کو بے سر و ساماں نہ جانیو داماں خاک ہوتا ہے روپوش نقشِ پا

اعجاز پا سے تیری عجب کیا کہ راہ میں بول اُٹھے مُنہ سے ہر لبِ خاموش نقشِ پا

اس رہگذر میں کس کو ہوئی فرصتِ مقام بیٹھے ہے نقشِ پا بہ سرِ دوشِ نقشِ پا

جسمِ نزار خاک نشیناں کو سے عشق یوں ہے زمیں پہ جیسے تن و توش نقشِ پا

فیضِ برہنہ پائیِ مجنوں سے دشت میں ہر آبلہ بنے ہے دُرِ گوشِ نقشِ پا

پا بوس در کنار کہ اپنی تو خاک بھی
پہنچی نہ ذوقؔ اُس کے بہ آغوشِ نقشِ پا

اُس دن سے جرأت زیادہ ہوئی اور بے اصلاح مشاعرہ میں غزل پڑھنے لگے۔ اب کلام کا چرچا زیادہ تر ہوا۔ طبیعت کی شوخی اور شعر کی گرمی سننے والوں کے دلوں میں اثر برقی کی

کی طرح دوڑنے لگی۔ اس زمانہ کے لوگ منصف ہوتے تھے۔ بزرگان پاک طینت جو اساتذۂ سلف کے یادگار باقی تھے۔ مشاعرہ میں دیکھتے تو شفقت سے تعریفیں کرکے دل بڑھاتے۔ بلکہ غزل پڑھنے کے بعد آتے تو دوبارہ پڑھوا کر سُنتے۔ غزلیں ارباب نشاط کی زبانوں سے نکل کر کوچہ و بازار میں رنگ اُڑانے لگیں +

قلعہ میں کس تقریب سے پہنچے

[اکبر شاہ بادشاہ تھے۔ انھیں تو شعر سے کچھ رغبت نہ تھی مگر مرزا ابو ظفر ولیعہد کہ بادشاہ ہو کر بہادر شاہ ہوئے۔ شعر کے عاشق شیدا تھے اور ظفر تخلص سے ملک شہرت کو تسخیر کیا تھا۔ اس لئے دربار شاہی میں جو جو کہنہ مشق شاعر تھے۔ مثلاً حکیم ثناء اللہ خاں فراقؔ۔ مرزا غالب علی خاں سید۔ عبدالرحمٰن خاں احسان۔ برہان الدین خاں راز۔ حکیم قدرت اللہ خاں قاسم۔ ان کے صاحبزادے حکیم عزت اللہ خاں عشق۔ میاں شکیبا شاگرد میر تقی مرحوم۔ مرزا عظیم بیگ شاگرد سودا۔ میر قمرالدین منت۔ ان کے صاحبزادے میر نظام الدین ممنون وغیرہ سب شاعر وہیں آکر جمع ہوتے تھے۔ اپنے اپنے کلام سناتے تھے مطلع اور مصرع جلسہ میں ڈالتے تھے۔ ہر شخص مطلع پر مطلع کہتا تھا۔ مصرع پر مصرع لگا کر طبع آزمائی کرتا تھا۔ میر کاظم حسین بیقرار کہ ولیعہد موصوف کے ملازم خاص تھے اکثر ان صحبتوں میں شامل ہوتے تھے۔ شیخ مرحوم کو خیال ہوا کہ اس جلسہ میں طبع آزمائی ہوا کرے تو قوت فکر کو خوب بلند پروازی ہو۔ لیکن اُس عہد میں کسی امیر کی ضمانت کے بعد بادشاہی اجازت ہوا کرتی تھی۔ جب کوئی قلعہ میں جانے پاتا تھا۔ چنانچہ میر کاظم حسین کی وساطت سے یہ قلعہ میں پہنچے۔ اور اکثر دربار ولیعہدی میں جانے تھے +

شاہ نصیر مرحوم کہ ولیعہد کی غزل کو اصلاح دیا کرتے تھے دکن چلے گئے۔ میر کاظم حسین ان کی غزل بنانے لگے۔ انہیں دنوں جان الفنسٹن صاحب شکارپور سندھ وغیرہ سرحدات سے لے کر کابل تک عہد نامے کرنے کو چلے۔ انھیں ایک میر منشی کی ضرورت ہوئی کہ قابلیت و علمیت کے ساتھ امارت خاندانی کا جوہر بھی رکھتا ہو۔ میر کاظم حسین نے اُس عہدہ پر سفارش کے لئے ولیعہد سے شقہ چاہا۔ مرزا مغل بیگ ان دنوں میں ان کے مختار کل تھے

قدرتی سامان

اور وہ ہمیشہ اس تاک میں رہتے تھے کہ جس پر ولیعہد کی زیادہ نظر عنایت ہو اُسے کسی طرح سے سامنے سے سرکاتے رہیں۔ اس قدرتی پیچ سے میر کاظم حسین کو شقّہ سفارش بآسانی حاصل ہو گیا اور وہ چلے گئے +

ولیعہد شاگرد ہوتے ہیں

چند روز کے بعد ایک دن شیخ مرحوم جو ولیعہد کے ہاں گئے تو دیکھا کہ تیر اندازی کی مشق کر رہے ہیں۔ اُنھیں دیکھتے ہی شکایت کرنے لگے کہ میاں ابراہیم! اُستاد تو دکن گئے۔ میر کاظم حسین ادھر چلے گئے۔ تم نے بھی ہمیں چھوڑ دیا؟ غرض اسی وقت ایک غزل جیب سے نکال کر دی کہ ذرا اسے تو بنا دو! یہ وہیں بیٹھ گئے اور غزل بنا کر سنائی۔ ولیعہد بہادر بہت خوش ہوئے اور کہا کہ بھی کبھی کبھی تم آ کر غزل بنا جایا کرو۔ یہ زمانہ وہ تھا کہ ممتاز محل کی خاطر اکبر شاہ کبھی مرزا سلیم کبھی مرزا جہانگیر وغیرہ شاہزادوں کی ولیعہدی کے لئے کوششیں کرتے تھے اور کہتے تھے کہ مرزا ابوظفر میرے بیٹے ہی نہیں۔ مقدمہ اس کا گورنمنٹ میں دائر تھا۔ اور ولیعہد کو بجائے ۵ ہزار روپیہ کے فقط ۵ سو روپے مہینا ملتا تھا۔ غرض چند روز اصلاح جاری رہی اور آخر کو سرکار ولیعہدی سے للعہ ر مہینا بھی ہو گیا۔ اُس وقت لوگوں کے دلوں میں بادشاہ کا رعب و داب کچھ اور تھا۔ چنانچہ کچھ ولیعہدی کے مقدمہ پر خیال کر کے کچھ تنخواہ کی کمی پر نظر کر کے باپ نے اکلوتے بیٹے کو اس نوکری سے روکا۔ لیکن ادھر تو شاعروں کے جمگھٹ کی دل لگی نے ادھر کھینچا۔ اُدھر قسمت نے آواز دی کہ للعہ ر نہ سمجھنا یہ ایوان ملک الشعرائی کے چار ستون قائم ہوتے ہیں۔ موقع کو ہاتھ سے نہ جانے دیا۔ چنانچہ شیخ مرحوم ولیعہد کے استاد ہو گئے +

نواب الٰہی بخش خاں اصلاح لیتے تھے

دلّی میں نواب[1] الٰہی بخش خاں معروف ایک عالی خاندان امیر تھے۔ علوم ضروری سے

[1] بخارا میں خواجہ عبدالرحمٰن یسوی ایک رئیس عالی خاندان۔ خواجہ احمد یسوی کی اولاد میں تھے۔ اتفاق زمانہ سے وطن چھوڑ کر بلخ میں آئے۔ اور یہیں خانہ دار ہوئے۔ خدا نے تین فرزند عطا کیے۔ قاسم جان۔ عالم جان۔ عارف جان جوانوں کی ہمت مردانہ نے گھر میں بیٹھنا گوارا نہ کیا۔ ایک جمعیت سوار و پیادہ ترکان ازبک وغیرہ کی لے کر ہندوستان میں آئے۔ پنجاب میں معین الملک عرف میر منّو خلف نواب قمر الدین خاں وزیر محمد شاہی حاکم تھے۔ ان رئیس زادوں کو اپنی رفاقت میں لیا۔ خاک پنجاب میں سکھوں کی قوم سبزۂ خودرو کی طرح جوش مار رہی تھی۔ ان کے زمانے میں ان کی ترک تازی نے ہمت کے گھوڑے دوڑا کر نام پیدا کیا۔ چند روز میں میر منّو مر گئے۔ بادشاہی زور کو سکھوں نے دبانا شروع کیا۔ انھوں نے اُمرائے بادشاہی کی نااہلی اور بے لیاقتی سے دل شکستہ ہو کر (باقی بر صفحہ ۴۴۳)

باخبر تھے۔ اور شاعری کے کہنہ مشاق ۔ مگر اس فن سے ایسا عشق رکھتے تھے کہ فنافی الشعر کا مرتبہ اسی کو کہتے ہیں۔ چونکہ لطف کلام کے عاشق تھے اس لئے جہاں متاع نیک دیکھتے

دربار کا رُخ کیا۔ وقت وہ تھا کہ شاہ عالم بادشاہ تھے اور میرن کے بنگالہ میں فوج لئے پڑے تھے۔ یہ بھی وہیں پہنچے اور دلاوری کے ساتھ ایسی جانفشانی دکھائی کہ نواب قاسم جان کو ہفت ہزاری منصب اور شرف الدولہ سہراب جنگ خطاب عطا ہوا۔ جب بادشاہ وہاں سے پھرے تو تینوں بھائی دلّی میں آئے اور یہیں سکونت اختیار کی۔ لڑائیوں میں ہمیشہ اپنی ہمت کے ساتھ ذوالفقار الدولہ نواب نجف خاں سپہ سالار کے لئے قوت بازو رہے۔ نواب عارف جان دیہات جاگیر وغیرہ کا انتظام کرتے تھے۔ انھوں نے وفات میں بھی اپنے برادر احمند نواب قاسم جان کا ساتھ دیا اور چار بیٹے چھوڑے۔ نبی بخش خاں۔ احمد بخش خاں۔ محمد علی خاں۔ الٰہی بخش خاں۔ نواب احمد بخش خاں۔ راؤ راجہ بختاور سنگھ والیٔ ریاست الور کی طرف سے معتمد اور وکیل ہو کر لارڈ لیک صاحب بہادر کے ساتھ ہندوستان کی مہمات میں شامل رہے۔ اور اپنی ذات سے بھی رسالہ رکھ کر خدمات گورنمنٹ بجالاتے رہے۔ اسکے صلہ میں فیروزپور جھرکہ وغیرہ جاگیر سرکار سے عنایت ہوئی۔ اور دربار شاہی سے خطاب فخر الدولہ دلاور الملک رستم جنگ بوسیلہ رزیڈنٹ دہلی عطا ہوا۔ ان کے بڑے بیٹے نواب شمس الدین خاں جانشین ہوئے۔ مگر زمانہ نے اِس کا ورق اس طرح اُلٹا کہ نام ونشان تک نہ رہا۔ فخر الدولہ مرحوم نواب امین الدین خاں و نواب ضیاء الدین خاں کو جُدا جاگیر دے گئے تھے کہ لوہارو مشہور ہے۔ نواب امین الدین خاں مسند نشین ریاست رہے۔ ان کے بعد ان کے بیٹے نواب علاؤ الدین خاں مسند نشین ہوئے کہ علوم مشرقی کے ساتھ زبان انگریزی میں مہارت کامل رکھتے ہیں۔ علائیؔ تخلص کرتے ہیں اور غالب مرحوم کے شاگرد ہیں۔ نواب ضیاء الدین خاں بہادر کو علوم ضروری سے فارغ ہو کر فن شعر اور مطالعہ کتاب کا ایسا شوق ہوا کہ دنیا کی کوئی دولت اور لذت نظر میں نہ آئی۔ اب تک اسی میں محو ہیں۔ غالب مرحوم کے شاگرد ہیں۔ نیرؔ تخلص کرتے ہیں۔ احباب کی فرمایش سے کبھی اُردو میں بھی کہہ دیتے ہیں اور اُس میں رخشاںؔ تخلص کرتے ہیں۔ فقیر آزاد کے حال پر شفقت بزرگانہ فرماتے ہیں۔ خدا دونوں کے دامن کمال کا سایہ اہل دہلی کے سر برقرار رکھے۔ ان ہی لوگوں سے دلّی۔ دلّی ہے۔ ورنہ اینٹ پتھر میں کیا دھرا ہے ؎

ہم تبرک ہیں بس اب کرلے زیارت مجنوں　　　سر پہ پھرتا ہے لئے آبلۂ پا ہم کو ؎

تھے نہ چھوڑتے تھے۔ زمانہ کی درازی نے سات شاعروں کی نظر سے ان کا کلام گزارنا تھا۔ چنانچہ ابتدا میں شاہ نصیر مرحوم سے اصلاح لیتے رہے اور سید علی غمگین وغیرہ وغیرہ استادوں سے بھی مشورہ ہوتا رہا۔ جب شیخ مرحوم کا شہرہ ہوا تو انھیں بھی اشتیاق ہوا۔ یہ موقع وہ تھا کہ نواب موصوف نے اہل فقر کی برکت صحبت سے ترک دنیا کرکے گھر سے نکلنا بھی چھوڑ دیا تھا۔ چنانچہ استاد مرحوم فرماتے تھے کہ میری ۱۹۔۲۰ برس کی عمر تھی۔ گھر کے قریب ایک قدیمی مسجد تھی۔ ظہر کے بعد وہاں بیٹھ کر میں وظیفہ پڑھ رہا تھا۔ ایک چوبدار آیا اُس نے سلام کیا اور کچھ چیز رومال میں لپٹی ہوئی میرے سامنے رکھ کر الگ بیٹھ گیا۔ وظیفہ سے فارغ ہو کر اسے دیکھا تو اُس میں ایک خوشہ انگور تھا۔ ساتھ ہی چوبدار نے کہا کہ نواب صاحب نے دُعا فرمائی ہے۔ یہ تبرک بھیجا ہے اور فرمایا ہے کہ آپ کا کلام تو پہنچا ہے مگر آپ کی زبان سے سُننے کو جی چاہتا ہے۔ شیخ مرحوم نے وعدہ کیا اور تیسرے دن تشریف لے گئے۔ وہ بہت اخلاق سے ملے اور بعد گفتگوئے معمولی کے شعر کی فرمایش کی۔ انھوں نے ایک غزل کہنی شروع کی تھی اُس کا مطلع پڑھا ؎

نگہ کا وار تھا دل پر پھڑکنے جان لگی چلی تھی برچھی کسی پر کسی کے آن لگی

سُن کر بہت خوش ہوئے اور کہا کہ خیر حال تو پہلے ہی معلوم ہو گیا تھا۔ مگر تمھاری زبان سے سُن کر اور لطف حاصل ہوا۔ ادھر اُدھر کی باتیں ہونے لگیں۔ عجیب اتفاق یہ کہ حافظ غلام رسول شوق یعنی اُستاد مرحوم کے قدیمی اُستاد اُسی وقت آ نکلے۔ نواب انھیں دیکھ کر مسکرائے اور شیخ مرحوم نے اسی طرح سلام کیا کہ جو سعادت مند شاگردوں کا فرض ہے۔ وہ اُن سے خفا رہتے تھے کہ شاگرد میرا اور مجھے غزل نہیں دکھاتا اور مشاعروں میں میرے ساتھ نہیں چلتا۔ غرض انھوں نے اپنے شعر پڑھنے شروع کر دئے۔ شیخ مرحوم نے وہاں ٹھیرنا مناسب نہ سمجھا اور رخصت چاہی۔ چونکہ نواب مرحوم کے برابر بیٹھے ہوئے تھے۔ نواب نے چپکے سے کہا۔ کان بدمزہ ہو گئے۔ کوئی شعر اپنا سُناتے جاؤ۔ استاد مرحوم نے انھیں دنوں میں ایک غزل کہی تھی۔ دو مطلعے اُس کے پڑھے:۔

اُستاد کا ادب

جینا نظر اپنا ہمیں اصلا نہیں آتا   گر آج بھی وہ رشک مسیحا نہیں آتا
مذکور ترے بزم میں کس کا نہیں آتا   پر ذکر ہمارا نہیں آتا نہیں آتا

اس دن سے معمول ہو گیا کہ ہفتہ میں دو دن جایا کرتے اور غزل بنا آیا کرتے تھے چنانچہ جو دیوانِ معروف کہ اب رائج ہے وہ تمام و کمال انہی کا اصلاح کیا ہوا ہے۔ نواب مرحوم اگرچہ ضعف پیری کے سبب سے خود کاوش کر کے مضمون کو لفظوں میں بٹھا نہیں سکتے تھے مگر اُس کے حقایق و دقایق کو ایسا پہنچتے تھے کہ جو حق ہے۔ اس عالم میں اُستاد مرحوم کی جوان طبیعت اور ذہن کی کاوش ان کی فرمایش کے نکتے نکتے کا حق ادا کرتی تھی۔ شیخ مرحوم کہا کرتے تھے کہ اگرچہ بڑی بڑی کاہشیں اُٹھانی پڑیں مگر ان کی غزل بنانے میں ہم آپ بن گئے +

نواب الٰہی بخش خاں معروف فن شعر کے ماہر کامل تھے

فرماتے تھے کہ اپنی مدت شوق میں وہ بھی کبھی جرأت کبھی سودا کبھی میر کے انداز میں غزلیں لکھتے رہے مگر اخیر میں کچھ بمقتضائے سن۔ کچھ اس سبب سے کہ صاحب دل اور صاحب نسبت تھے۔ خواجہ میر درد کی طرز میں آ گئے تھے۔ یہ بھی آپ ہی کہتے تھے کہ اُن دنوں میں ہمارا عالم ہی اَور تھا۔ جوانی دوانی۔ ہم کبھی جرأت کے رنگ میں کبھی سودا کے انداز میں اور وہ رد کہتے تھے۔ آج الٰہی بخش خاں مرحوم ہوتے تو ہم کہہ کر دکھاتے۔ اب ان کا دیوان ویسا ہی بنا دیتے جیسا ان کا جی چاہتا تھا۔ ان کی باتیں کرتے اور بار بار افسوس کرتے اور کہتے۔ ہائے الٰہی بخش خاں۔ ان کا نام ادب سے لیتے تھے۔ اور اس طرح ذکر کرتے تھے جیسے کوئی با اعتقاد اپنے مرشد کا ذکر کرتا ہے۔ ان کی سینکڑوں باتیں بیان کیا کرتے تھے جو دین دنیا کے کاموں کا دستور العمل ہیں +

الٰہی بخش خاں مرحوم کی سخاوت

یہ بھی فرماتے تھے کہ ایسا سخی میں نے آج تک نہیں دیکھا۔ جو آتا تھا۔ امیر۔ فقیر۔ بچہ۔ بوڑھا اُسے بغیر دیئے نہ رہتے تھے' اور دینا بھی وہی کہ جو اس کے مناسب حال ہو۔ کوئی سوداگر نہ تھا کہ آئے اور خالی پھر جائے۔ انھیں اس بات کی بڑی خوشی تھی

کہ ہماری غزل ہمارے پاس بیٹھ کر بناتے جاؤ۔ سناتے جاؤ۔ میں نے اس باب میں پہلو بچایا تھا مگر ان کی خوشی اسی میں دیکھی تو مجبور ہوا اور یہی خوب ہوا۔ ایک دن میں ان کی غزل بنا رہا تھا۔ اُس کا مقطع تھا ؎

اک غزل پُر درد سی معروف لکھ اس طرح میں   ذوق ہے دل کو نہایت درد کے اشعار سے
کون روتا ہے یہ لگ کر باغ کی دیوار سے   جانور گرنے لگے جائے ثمر اشجار سے

تلوار کی قدردانی

سوداگر آیا اور اپنی چیزیں دکھانے لگا۔ ان میں ایک اصفہانی تلوار بھی تھی۔ وہ پسند آئی۔ خم دم۔ آبداری اور جوہر دیکھ کر تعریف کی اور میری طرف دیکھ کر کہا

اس ضعیفی میں یہاں تک شوق ہے تلوار سے

میں نے اسی وقت دوسرا مصرع لگا کر داخل غزل کیا بہت خوش ہوئے :۔

سر لگا دیں ابروئے خمدار کی قیمت میں آج   اس ضعیفی میں یہاں تک شوق ہے تلوار سے

خیر اور چیزوں کے ساتھ وہ تلوار بھی لے لی۔ میں حیران ہوا کہ یہ تو ان کے معاملات و حالات سے کچھ بھی تعلق نہیں رکھتی۔ اسے کیا کریں گے۔ خدا کی قدرت ۲-۳ ہی دن کے بعد بڑے صاحب (فریزر صاحب رزیڈنٹ دہلی) ایک اور صاحب کو اپنے ساتھ لے کر نواب احمد بخش خاں مرحوم کی ملاقات کو آئے۔ وہاں سے ان کے پاس آئے۔ بیٹھے باتیں چیتیں ہوئیں۔ جو صاحب ساتھ تھے اُن سے ملاقات کروائی۔ جب چلنے لگے تو انھوں نے وہی تلوار منگا کر صاحب ہمراہی کی کمر سے بندھوائی اور کہا ؎

برگ سبز است تحفۂ درویش   چہ کند بے نوا ہمی دارد

ان کے ساتھ میم صاحب بھی تھیں۔ ایک ارگن باجا نہایت عمدہ کسی رومی سوداگر سے لیا تھا وہ اُنھیں دیا۔

تسبیح زمرد

اُن کے اشعار کا ایک سلسلہ ہے جس میں ردیف وار ۱۰۱ مطلع ہے اور کوئی سبزی کے مضمون سے خالی نہیں۔ اسی رعایت سے اُس کا نام تسبیح زمرد رکھا تھا۔ یہ تسبیح بھی استاد مرحوم نے پرو دی تھی۔ اور آخر ایک تاریخ فارسی زبان میں اپنے نام سے

کہہ کر لگائی تھی۔ جن دنوں اُس کے دانے پروتے تھے تو نواب صاحب مرحوم کی سب پر فرمایش تھی کہ کوئی مثل۔ کوئی محاورہ سبزی کا بتاؤ۔ ان کے بذل و کرم اور حسن اخلاق اور علوِ رتبہ کے سبب سے اکثر شرفا خصوصًا شعرا آکر جمع ہوتے تھے۔ اور اشعار سُنتے سُناتے تھے۔ ان دنوں میں ان کے شوق سے اوروں پر بھی سبز رنگ چھایا ہوا تھا۔ بھورے خاں آشفتہ ایک پرانے شاعر شاہ محمدی مائل کے شاگرد اور ان کے مرید تھے۔ صہ ر وظیفہ بھی پاتے تھے۔ ان کے شعر میں ہری چُگ کا لفظ آیا۔ کہ ان کے ہاں ابھی تک نہ بندھا تھا۔ ان سے وہ شعر لے لیا اور اپنے انداز سے سجایا ؎

آج یہاں کل وہاں۔ گزرے یوں ہیں جُگ ہمیں کہتے ہیں سب سبزہ رنگ اس سے ہری[1] چگ ہمیں

سو روپیہ کو ایک محاورہ لیا

انھیں سو روپے ایک رومال میں باندھ کر دیدئے کہ تمھاری کاوش کیوں خالی جائے۔ افسوس کہ اخیر میں کم بخت بھورے خاں نے روسیاہی کمائی اور سب تعلقات پر خاک ڈال کر ان کی ہجو کہی۔ لطف یہ کہ دریا دل نواب۔ طبیعت پر اصلا میل نہ لائے۔ لیکن اس نااہل کو ان کا آزردہ ہی کرنا منظور تھا۔ جب دیکھا کہ انھیں کچھ رنج نہیں تو نواب حسام الدین حیدر خاں نامی کی ہجو کہی۔ نامی مرحوم سے اُنھیں ایسی محبت تھی کہ وہ خود بھی کہتے تھے اور لوگ بھی کہتے تھے۔ کہ ان بزرگوں میں محبت نہیں عشق ہے (اگلے زمانے کے لوگوں کی دوستیاں ایسی ہی ہوتی تھیں) ان کی تعریف میں غزلیں کہہ کر داخل دیوان کی تھیں۔ ایک مطلع یاد ہے ؎

جو آؤ تم مرے یہاں حسام الدین حیدر خاں کروں دل نذر جاں قرباں حسام الدین حیدر خاں

جب اُن کی ہجو کہی تو انھیں سخت رنج ہوا۔ اس پر بھی اتنا کیا کہ کہا ہمارے سامنے نہ آیا کرو۔ وہ بھی سمجھ گیا۔ عذر میں کہا کہ لوگ ناحق بدنام کرتے ہیں۔ میں نے تو نہیں کہی کہا کہ بس اب آگے نہ بولو۔ اتنی مدت ہم نے زمین سخن کی خاک اُڑائی کیا تمھاری

[1] ہری چُگ بے وفا ہرجائی کو کہتے ہیں۔ گویا وہ ایک جانور ہے کہ جہاں ہری گھاس پاتا ہے۔ چرتا ہے جب وہ نہ رہے تو جہاں اور ہری گھاس دیکھتا ہے وہاں جا موجود ہوتا ہے +

زبان بھی نہیں پہچانتے؟ میں تو اس سے بدتر ہوں جو کچھ کہ تم نے کہا۔ مگر میرے
لئے تم میرے دوستوں کو کیوں خراب کرنے لگے۔ بھئی مجھ سے نہیں دیکھا جاتا۔
پھر جیتے جی بھورے خاں کی صورت نہ دیکھی۔ اُستاد مرحوم فرماتے تھے کہ دالان
میں ایک طرف جانماز بچھی رہتی تھی۔ جب میں رخصت ہوتا تو آٹھویں دسویں دن

سخاوت کا انداز تو دیکھو

فرماتے۔ بھئی میاں ابراہیم! ذرا ہماری جانماز کے نیچے دیکھنا۔ پہلے دن تو میں دیکھ کر حیران
ہوا کہ ایک پُڑیا میں کچھ روپے دھرے تھے۔ آپ نے سامنے سے مسکرا کر فرمایا ع

خدا دیوے تو بندہ کیوں نہ لیوے

اس میں لطیفہ یہ تھا کہ ہم کس قابل ہیں۔ جو کچھ دیں۔ جس سے ہم مانگتے ہیں یہ
وہی تمھیں دیتا ہے +

ایک دفعہ اُستاد بیمار ہوئے۔ اور کچھ عرصہ کے بعد گئے۔ ضعف تھا۔ اور کچھ کچھ

حقہ اس طرح پلواتے ہیں

شکایتیں باقی تھیں۔ فرمایا کہ حقہ پیا کرو۔ عرض کی کہ بہت خوب۔ اب وہ حقہ پلوائیں
تو خالی حقہ کیا پلوائیں۔ ایک چاندی کی گڑگڑی۔ چلم اور چنبل۔ مغرق نیچہ۔ مرصع مُہنال
تیار کروا کر سامنے رکھوا دیا +

بچہ بھی خالی نہ جائے

خلیفہ صاحب (میاں محمد اسمٰعیل) چھوٹے سے تھے۔ ایک دن اُستاد کے ساتھ
چلے گئے۔ رخصت ہوئے تو ایک چھوٹا سا ٹانگن اصطبل سے منگایا۔ زین زریں کسا ہوا۔
اُس پر سوار کر کے رخصت کیا۔ کہ یہ بچہ ہے۔ کیا جانے گا کہ میں کس کے پاس گیا تھا۔
کسی کھانے کو جی چاہتا تو آپ نہ کھاتے۔ بہت سا پکواتے۔ لوگوں کو بلاتے
آپ کھڑے رہتے۔ اُنھیں کھلواتے۔ خوش ہوتے اور کہتے کہ دل سیر ہو گیا۔ یہ ساری
سخاوتیں اُسی سعادت مند بھائی کی بدولت تھیں۔ جو دن بھر سرانجام مہام میں
جان کھپاتا تھا۔ راتوں سوزنی میں گھلتا تھا۔ اور خاندان کے نام کو زندہ کرتا تھا
اور اُن سے فقط دعا کی التجا رکھتا تھا +

اُستاد مرحوم فرماتے تھے کہ ایک دن میں بیٹھا غزل بنا رہا ہوں کہ نواب

احمد بخش خاں آئے۔ آداب معمولی کے بعد باتوں باتوں میں کہنے لگے کہ فلاں انگریز کی ضیافت کی۔ اتنا روپیہ اُس میں صرف ہوا۔ فلانی گھُڑدوڑ میں ایک چائے پانی دیا تھا۔ یہ خرچ ہو گیا۔ وہ صاحب آئے تھے۔ اصطبل کی سیر دکھائی۔ کاٹھیاواڑ کے گھوڑوں کی جوڑی کھڑی تھی۔ انھوں نے تعریف کی۔ میں نے بگھی میں جڑوائی اور اُسی پر سوار کر کے اُنھیں رخصت کیا۔ وغیرہ وغیرہ۔ کیا کروں۔ خالی ملنا۔ خالی رخصت کرنا۔ مجھ سے نہیں ہو سکتا۔ یہاں کے امیروں کو امارت کے بڑے بڑے دعوے ہیں (جس طرح بچے بزرگوں سے بگڑ بگڑ کر باتیں کرتے ہیں۔ جیں بہ جبیں ہوتے تھے اور کہتے تھے) فیل خانہ میں گیا تھا وہاں یہ بندوبست کر آیا ہوں۔ گھوڑیاں آج سب علاقہ بھجوا دیں۔ حضرت کیا کروں۔ شہر میں اس گلّہ کا گزارہ نہیں۔ یہ لوگ اس خرچ کا بوجھ اُٹھائیں تو چھاتی ترق جائے۔ الٰہی بخش خاں مرحوم بھی ادا شناسی میں کمال رکھتے تھے۔ تاڑ گئے۔ چپکے بیٹھے سُنتے تھے اور مُسکراتے تھے۔ جب اُن کی زبان سے نکلا کہ چھاتی ترق جائے۔ آپ مسکرا کر بولے ہاں تو آپ کی چھاتی میں بھی آیا ہوگا۔ شرما کر آنکھیں نیچی کر لیں۔ پھر اُنھوں نے فرمایا۔ آخر امیرزادے ہو۔ خاندان کا نام ہے۔ یہی کرتے ہیں۔ مگر اس طرح نہیں کہا کرتے۔ نواب احمد بخش خاں نے کہا حضرت پھر آپ سے بھی نہ کہوں۔ فرمایا خدا سے کہو۔ وہ بولے۔ کہ مجھے آپ دکھائی دیتے ہیں آپ ہی سے کہتا ہوں آپ خدا سے کہیے۔ فرمایا کہ اچھا ہم تم مل کر کہیں۔ تمھیں بھی کہنا چاہیے۔ نواب احمد بخش خاں بھی جانتے تھے کہ جو سخاوت ادھر ہوتی ہے عین بجا ہے۔ اور اسی کی ساری برکت ہے +

ایک دن نواب احمد بخش خاں آئے۔ لیکن افسردہ اور برآشفتہ۔ الٰہی بخش خاں مرحوم سمجھ جاتے تھے کہ کچھ نہ کچھ آج ہے جو اس طرح آئے ہیں۔ پوچھا۔ آج کچھ خفا ہو؟ کہا کہ نہیں حضرت۔ فیروزپور جھرکے جاتا ہوں۔ پوچھا کیوں؟ کہا کہ بڑے صاحب (صاحب رزیڈنٹ) نے حکم دیا ہے کہ جس کو ملنا ہو بدھ کو ملاقات کرے۔ حضرت آپ جانتے ہیں مجھے ہفتہ میں ۱۰ دفعہ کام

پڑتے ہیں جب جی چاہا گیا۔ جو ضرورت ہوئی کہہ سُن آیا۔ مجھ سے یہ پابندیاں نہیں اُٹھتیں۔ میں یہاں رہتا ہی نہیں۔ فرمایا کہ تم سے کہا ہے؟ کہا کہ مجھ سے تو نہیں کہا۔ سُنا ہے۔ بعض رؤسا گئے بھی تھے ان سے ملاقات نہ کی۔ یہی کہلا بھیجا کہ بدھ کو ملئے۔ فرمایا کہ تمھارے واسطے نہیں۔ اَوروں کے لئے ہوگا۔ احمد بخش خاں نے کہا کہ نہیں حضرت یہ اہل فرنگ ہیں۔ ان کا قانون عام ہوتا ہے۔ جو سب کے لئے ہے وہی میرے لئے ہوگا۔ فرمایا کہ بھلا تو جاؤ۔ تم ابھی جاؤ۔ دیکھو تو کیا ہوتا ہے انھوں نے کہا۔ بہت خوب جاؤں گا۔ فرمایا کہ جاؤں گا نہیں۔ اُٹھئے بس ابھی جائیے۔ نواب نے کہا کہ نہیں۔ میں نے عرض کیا ضرور جاؤں گا۔ بگڑ کر کہا عرض ورض نہیں۔ بس شرط یہ ہے کہ اسی وقت جائیے اور سیدھے وہیں جائیے گا۔ احمد بخش خاں بھی انداز دیکھ کر خاموش ہوئے اور اُٹھ کر چلے۔ انھوں نے پھر فرمایا۔ کہ وہیں جانا۔ اور مجھے پریشان تو کیا ہے ذرا پھرتے ہوئے ادھر ہی کو آنا۔ استاد کہتے تھے کہ وہ تو گئے مگر اُن کو دیکھتا ہوں کہ چُپ اور چہرہ پر اضطراب۔ کوئی دو ہی گھڑی ہوئی تھی۔ ابھی میں بیٹھا غزل بنا رہا ہوں۔ کہ دیکھتا ہوں۔ نواب سامنے سے چلے آتے ہیں۔ خوش خوش لبوں پر تبسم۔ آکر۔ سلام کیا اور بیٹھ گئے۔ اُنھوں نے دیکھتے ہی کہا کیوں صاحب؟ نواب بولے گیا تھا۔ وہ اطلاع ہوتے ہی خود نکل آئے۔ اور پوچھا ہیں نواب! اس وقت خلاف عادت؟ میں نے کہا بھئی میں نے سنا تم نے حکم دیا ہے کہ جو ہم سے ملے بدھ کو ملے۔ ابھی میں نے تقریر تمام بھی نہ کی تھی کہ وہ بولے نہیں نہیں۔ نواب صاحب! آپ کے واسطے یہ حکم نہیں۔ آپ ان لوگوں میں نہیں ہیں۔ آپ جس وقت چاہیں چلے آئیں۔ میں نے کہا۔ بھئی تم جانتے ہو۔ ریاست کے جھگڑے۔ میں خفقانی دیوانہ۔ کوئی بات کہنی ہے۔ کوئی سُننی ہے۔ بس میرے کام تو بند ہوئے۔ بھائی میں تو رخصت کو آیا تھا کہ فیروز پور چلا جاؤں گا۔ اب یہاں رہ کر کیا کروں۔ انھوں نے پھر وہی کلمات ادا کئے اور کہا۔ دن رات جب جی چاہے۔ میں نے کہا۔ خیر۔ تو خاطر جمع ہوگئی۔ اب میں جاتا ہوں۔ الٰہی بخش خاں مرحوم بھی شگفتہ ہوگئے۔ اور کہا بس اب جلئیے۔ آرام کیجئے۔

آزاد۔ جو خدا کے لئے دنیا چھوڑ بیٹھتے ہیں خدا بھی اُنھیں نہیں چھوڑتا +

جو خدا چاہتا ہے وہی ہوتا ہے

ساتھ ہی اُستاد مرحوم یہ بھی کہتے تھے اور یہ بات لکھنے کے قابل ہے کہ زبان سے الٰہی بخش خاں مرحوم نے کبھی نہیں کہا۔ مگر میں جانتا ہوں۔ اُنھیں آرزو تھی کہ علی بخش خاں (ایک ہی بیٹا تھا) بذات خود صاحب منصب اور صاحب امارت ہو۔ چچا کا اور اُس کی اولاد کا دست نگر نہ ہو۔ سازو سامان کرکے ریاستوں میں بھی بھیجا۔ صاحب لوگوں کے ہاں بھی بندوبست کئے۔ ظاہری و باطنی ساری کوششیں کیں یہی بات نصیب نہ ہوئی۔ مشیت اللہ مشیت اللہ اور وہ خود بھی آخر میں سمجھ گئے تھے۔ ایک دن اُنھیں باتوں میں اُستاد نے فرمایا کہ علی بخش خاں بھی خوبصورت اور شاندار امیرزادہ تھا۔ میں نے عرض کی کہ حضرت کئی دفعہ بعض مجلسوں میں۔ بعض درباروں میں میں نے دیکھا۔ ایسے تو نہیں۔ افسردہ ہوکر کہا۔ کیا کہتے ہو۔ ذکر جوانی در پیری اور ذکر امیری در فقیری۔ کس کو یقین آتا ہے +

لطیفہ رندانہ

لطیفہ۔ اُستاد مرحوم نے فرمایا کہ اُن دنوں مرزا خاں کوتوال تھے۔ مرزا **قتیل** کے شاگرد۔ فارسی نگاری اور انشاپردازی کے ساتھ سخن فہمی کے دعوے رکھتے تھے۔ منشی محمد حسن خاں میر منشی تھے اور فی الحقیقت نہایت خوش صحبت۔ خوش اخلاق بامروت لوگ تھے۔ ایک دن دونوں صاحب الٰہی بخش خاں مرحوم کی ملاقات کو آئے۔ اور تعارف رسمی کے بعد شعر کی فرمایش کی۔ انھیں اور لوگوں کی طرح یہ عادت نہ تھی۔ کہ خواہ مخواہ جو آئے اُسے اپنے شعر سُنانے لگیں۔ اگر کوئی فرمائش کرتا تھا تو بات کو ٹال کر پہلے اُس کا کلام سُن لیتے تھے۔ شاعر نہ ہوتا تو کہتے کسی اور اُستاد کے دو چار شعر پڑھئے جو آپ کو پسند ہوں۔ جب اُس کی طبیعت معلوم کر لیتے تو اُسی رنگ کا شعر اپنے شعروں میں سے سناتے۔ اسی بنیاد پر اُن سے کہا کہ آپ دونوں صاحب کچھ کچھ اشعار سُنائیے۔ اُنھوں نے کچھ شعر پڑھے۔ بعد اس کے الٰہی بخش خاں مرحوم نے دو تین شعر۔ وہ بھی ان کے اصرار سے پڑھے۔ اور اِدھر اُدھر کی باتوں میں

ٹال گئے۔ جب وہ چلے گئے تو مجھ سے کہنے لگے۔ میاں ابراہیم! تم نے دیکھا؟ اور اُن کے شعر بھی سُنے۔ عجیب مجہول الکیفیت ہیں۔ کچھ حال ہی نہیں کھُلتا کہ ہیں کیا؟ یہی مرزا خان اور منشی صاحب ہیں جن کی سخن پردازی اور نکتہ یابی کی اتنی دھوم ہے اور اس پر تماش بینی کے بھی دعوے ہیں! رنڈی ان کے مُنہ پر دو جوتیاں بھی نہ مارتی ہوگی۔ بھلا یہ کیا کہیں گے اور کیا سمجھیں گے؟ آزاد ملکِ سخن اور شاعری کا عالم۔ عالمِ گوناگون ہے۔ ہمہ گیر ذہن۔ اور ہر کیفیت سے لطف اُٹھانے والی طبیعت اس کے لئے لازم ہے۔ الٰہی بخش خاں مرحوم صاحب دل۔ پاکیزہ نفس۔ روشن ضمیر تھے۔ مگر ہر بات کو جانتے تھے اور جاننے والے جانتے ہیں کہ بات کا جاننا اور چیز ہے اور کرنا اور چیز ہے۔ طبیعتیں ہیں کہ نہیں کرتیں اور سب کچھ جانتی ہیں۔ اور ایسی بھی ہیں۔ کہ سب کچھ کرتی ہیں اور کچھ بھی نہیں جانتیں۔ خوشا نصیب اُن لوگوں کے جنھیں خدا اثر پذیر دل۔ اور کیفیت کے پانے والی طبیعت عنایت کرے کہ عجیب دولت ہے +

شاہ نصیر مرحوم سے معرکہ آرائی ہوتی ہے

اِدھر ولیعہد بہادر کی فرمائشیں اُدھر نواب مرحوم کی غزلوں پر طبیعت کی آزمائشیں تھیں کہ کئی برس کے بعد **شاہ نصیر** مرحوم دکن سے پھرے اور اپنا معمول مشاعرہ جاری کیا۔ شیخ علیہ الرحمہ کی مشقیں خوب زوروں پر چڑھ گئی تھیں انھوں نے بھی مشاعرہ میں جاکر غزل پڑھی۔ شاہ صاحب نے دکن میں کسی کی فرمایش سے ۹ شعر کی ایک غزل کہی تھی جس کی ردیف تھی۔ آتش و آب و خاک و باد۔ وہ غزل مشاعرہ میں سنائی اور کہا کہ اس طرح میں جو غزل لکھے اُسے میں اُستاد مانتا ہوں[1]۔ دوسرے مشاعرہ میں انھوں نے اُس پر غزل پڑھی۔ شاہ صاحب کی طرف سے بجائے خود اس پر اعتراض ہوئے۔ جشن قریب تھا۔ شیخ علیہ الرحمہ نے بادشاہ

[1] یہ طنز ہے شیخ مرحوم پر کہ ولیعہد بہادر اور نواب الٰہی بخش خاں کی غزل بناتے تھے۔ اور استاد کہلاتے تھے +

کی تعریف میں ایک قصیدہ اسی طرح میں لکھا۔ مگر پہلے مولوی شاہ عبدالعزیز صاحب کے پاس لے گئے کہ اس کے صحت و سقم سے آگاہ فرمائیں۔ اُنھوں نے سُن کر پڑھنے کی اجازت دی مگر ولی عہد بہادر نے اپنے شقہ کے ساتھ اُسے پھر شاہ صاحب کے پاس بھیجا۔ اُنھوں نے جو کچھ کہا تھا وہی جواب میں لکھ دیا۔ اور یہ شعر بھی لکھا ؎

بود بگفتۂ من حرف اعتراض چناں　　　کسے بدیدۂ بینا فرو برد انگشت

شیخ مرحوم کا دل اور بھی قوی ہو گیا۔ اور دربار شاہی میں جاکر قصیدہ سنایا۔ اس کے بڑے بڑے چرچے ہوئے اور کئی دن کے بعد سُنا کہ اُس پر اعتراض لکھے گئے ہیں ✣

شیخ مرحوم قصیدۂ مذکور کو مشاعرہ میں لے گئے کہ وہاں پڑھیں اور روبرو برسرِ معرکہ فیصلہ ہو جائے۔ چنانچہ قصیدہ پڑھا گیا۔ شاہ نصیر مرحوم نے ایک مستعد طالب علم کو کہ کتبِ تحصیلی اُسے خوب رواں تھیں۔ جلسہ میں پیش کر کے فرمایا کہ انھوں نے اس پر کچھ اعتراض لکھے ہیں۔ شیخ علیہ الرحمہ نے عرض کی کہ میں آپ کا شاگرد ہوں اور اپنے تئیں اس قابل نہیں سمجھتا کہ آپ کے اعتراضوں کے لئے قابل خطاب ہوں۔ اُنھوں نے کہا کہ مجھے کچھ تعلق نہیں۔ اُنھوں نے کچھ لکھا ہے۔ شیخ مرحوم نے کہا خیر تحریر تو اسی وقت تک ہے کہ فاصلہ دوری درمیان ہو۔ جب آمنے سامنے موجود ہیں تو تقریر فرمائیے۔ قصیدہ کا مطلع تھا:-

معرکۂ عجیب

کوہ اور آندھی میں ہوں گر آتش و آب و خاک و باد　　　آج نہ چل سکیں یہ۔ آتش و آب و خاک و باد

مُعترض نے اعتراض کیا کہ سنگ میں آتش کے چلنے کا ثبوت چاہئے۔ انھوں نے کہا کہ جب پہاڑ کو بڑھنے کے سبب سے حرکت ہے تو اُس میں آگ کو بھی حرکت ہوگی۔ معترض نے کہا کہ سنگ میں آتش کا ثبوت چاہئے۔ اُنھوں نے کہا کہ مشاہدہ! اُس نے کہا کہ کتابی سند دو۔ اُنھوں نے کہا تاریخ سے ثابت ہے۔ کہ ہوشنگ کے وقت میں

آگ نکلی۔ اُس نے کہا کہ شاعری میں شعر کی سند درکار ہے۔ تاریخ شعر میں نہیں چلتی۔ حاضرینِ مشاعرہ ان جواب و سوال کی الٹ پلٹ کے تماشے دیکھ رہے تھے۔ اور اعتراض پر حیران تھے کہ دفعتہً شیخ علیہ الرحمہ نے یہ شعر محسن تاثیر کا پڑھا۔

پیش از ظہور جلوۂ جانانہ سوختیم　　آتش بہ سنگ بود کہ ما خانہ سوختیم

سُنتے ہی مشاعرہ میں غل سے ایک ولولہ پیدا ہوا۔ اور ساتھ ہی سودا کا مصرع گذرانا۔ ع

ہر سنگ میں شرار ہے تیرے ظہور کا

اسی طرح اور اکثر اشعار پر سوال و جواب ہوئے۔ شاہ صاحب بھی بیچ میں کچھ دخل دیتے جاتے تھے۔ اخیر میں ایک شعر پر اُنھوں نے یہ اعتراض کیا۔ کہ اس میں ثبوت روانی کا نہیں۔ شیخ علیہ الرحمہ نے کہا کہ یہاں تغلیب ہے۔ اُس وقت خود شاہ صاحب نے فرمایا۔ کہ تغلیب کہیں آئی نہیں۔ انھوں نے کہا کہ تغلیب کا قاعدہ عام ہے۔ اُنھوں نے کہا کہ جب تک کسی اُستاد کے کلام میں نہ ہو۔ جائز نہیں ہو سکتی۔ شیخ علیہ الرحمہ نے کہا کہ آپ نے ۹ شعر کی غزل پڑھ کر فرمایا تھا کہ اس طرح میں کوئی غزل کہے تو ہم اُسے اُستاد جانیں۔ میں نے تو ایک غزل اور تین قصیدے لکھے اب بھی استاد نہ ہوا؟ معترض نے کہا کہ اس وقت مجھ سے اعتراضوں کا پورا سرانجام نہیں ہو سکتا۔ کل پر منحصر رکھنا چاہئے۔ اور جلسہ برخاست ہوا۔

تکمیل علوم کے قدرتی سامان

اسی دن سے انھیں تکمیل علوم اور شعر کتب کا شغل واجب ہوا۔ قدرتی سامان اس کا یہ ہوا کہ راجہ صاحب رام جو املاک شاہ اودھ کے مختار تھے۔ انھیں یہ شوق ہوا کہ اپنے بیٹے کو کتب علمی کی تحصیل تمام کروائیں۔ مولوی عبدالرزاق کہ شیخ مرحوم کے قدیمی استاد تھے۔ وہی اُن کے پڑھانے پر مقرر ہوئے۔ اتفاقاً ایک دن یہ بھی مولوی صاحب کے ساتھ گئے۔ چونکہ ان کی تیزیٔ طبع کا شہرہ ہو گیا تھا۔ راجہ صاحب نے ان سے کہا کہ میاں ابراہیم! تم ہمیشہ درس میں شریک رہو۔ چنانچہ نوبت یہ ہو گئی کہ اگر یہ کبھی شغل یا ضرورت کے سبب سے وہاں نہ جاتے تو راجہ صاحب

کا آدمی اُنھیں ڈھونڈ کر لاتا۔ اور نہیں تو ان کا سبق بھی ملتوی رہتا +

کہا کرتے تھے کہ جب بادشاہ عالم ولیعہدی میں تھے تو مرزا سلیم کے بیاہ کی تہنیت میں ایک مثنوی ہم نے لکھی۔ اس کی بحر۔ مثنوی کی معمولی بحروں سے الگ تھی۔ لوگوں نے چرچا کیا کہ یہ جائز نہیں۔ میر نجات کی گُل کشتی ہم نے دیکھی ہوئی تھی۔ مگر حکیم مرزا محمد[1] صاحب رحمہم اللہ زندہ تھے۔ اور میرے والد مرحوم زندہ تھے اُنہی کا علاج کرتے تھے۔ وسعت معلومات اور حصول تحقیقات کی نظر سے ہم نے ان سے جاکر پوچھا۔ انھوں نے فرمایا کہ رواج اتفاقی ہے جو مثنوی انہی آٹھ بحروں میں منحصر ہو گئی ہے۔ ورنہ طبع سلیم پر کون حاکم ہے جو روکے جس بحر میں چاہو لکھو۔ اُستاد کے مسوّدوں میں ایک پرچہ پر چند شعر اس کے نکلے تھے۔ ان میں ساقی کا مضمون تھا۔ دو شعر اب تک یاد ہیں :۔

ٹھلیاں تو نہیں وہ ئے عشرت کے سبو تھے　　یا قلزمِ مستی کے حبابِ لبِ جو تھے
لازم تھا کہ لکھ باندھتے یہ اُن کے گلو میں　　ہے بند کیا عیش کے دریا کو سبو میں

چند سال کے بعد انھوں نے ایک قصیدہ اکبر شاہ کے دربار میں کہہ کر سنایا۔ کہ جس کے مختلف شعروں میں انواع و اقسام کے صنائع و بدائع صرف کئے تھے۔ اس کے علاوہ ایک ایک زبان میں جو ایک ایک شعر تھا اُن کی تعداد ۱۸ تھی۔ مطلع اس کا یہ ہے :۔

جب کہ سرطان و اسد مہر کا ٹھیرا مسکن　　آب و ایلولہ ہوئے نشو و نمائے گلشن

(دربار شاہی سے خاقانی ہند خطاب ملتا ہے)

اس پر بادشاہ نے خاقانیٔ ھند کا خطاب عطا کیا۔ اس وقت شیخ مرحوم کی عمر ۱۹ برس کی تھی +

حافظ احمد[2] یار نے چند روز پہلے خواب میں دیکھا کہ ایک جنازہ رکھا ہے بہت

[1] حکیم مرزا محمد صاحب علم و فضل کے خاندان سے ایک فاضل کامل اور جامع الکمالات تھے۔ طب میں حکیم شریف خاں مرحوم کے شاگرد تھے۔ جو حکیم محمود خاں کے دادا تھے۔ حکیم مرزا محمد صاحب خود بھی شاعر تھے۔ اور ان کے والد بھی صاحب علم و فضل شاعر تھے۔ کامل تخلص کرتے تھے۔ اور میر شمس الدین فقیر مصنف حدائق البلاغت

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۲۵۶ پر)

سے لوگ گرد جمع ہیں۔ وہاں حافظ عبدالرحیم کہ حافظ احمد یار کے والد تھے۔ ایک کھیر کا پیالہ لئے کھڑے ہیں۔ اور شیخ علیہ الرحمہ کو اُس میں سے چمچے بھر بھر دیتے جاتے ہیں۔ حافظ موصوف نے ان سے پوچھا کہ یہ کیا معرکہ ہے اور جنازہ کس کا ہے۔ اُنھوں نے کہا کہ یہ مرزا رفیع کا جنازہ ہے اور میاں ابراہیم ان کے قائم مقام مقرر ہوئے ہیں۔ **خاقانیٔ ھند** کے خطاب پر لوگوں نے بڑے چرچے کئے۔ کہ بادشاہ نے یہ کیا کیا۔ کہن سال اور نامی شاعروں کے ہوتے ایک نوجوان کو ملک الشعراء بنایا۔ اور ایسا عالی درجہ کا خطاب دیا! ایک جلسہ میں یہی گفتگو ہو رہی تھی کسی نے کہا کہ جس قصیدہ پر یہ خطاب ہوا ہے اُسے بھی تو دیکھنا چاہئے۔ چنانچہ قصیدۂ مذکور لاکر پڑھا گیا۔ **میر کلو حقیر** کہ شاعر سن رسیدہ اور شعرائے قدیم کے صحبت یافتہ تھے۔ سن کر بولے کہ بھئی انصاف شرط ہے۔ کلام کو بھی تو دیکھو۔ ایسے شخص کو بادشاہ نے خاقانی ہند کے خطاب سے ملک الشعراء بنایا تو کیا بُرا کیا ہے۔ مجھے یاد ہے جب استاد مرحوم نے یہ حال بیان کیا تھا اُس وقت بھی کہا تھا اور جب میں ارباب زمانہ کی بے انصافی یا ان کی بے خبری اور بے بصری سے دق ہوکر کچھ کہتا تو فرماتے تھے کہ بے انصافوں ہی میں سے کوئی با انصاف بھی بول اُٹھتا ہے۔ بے خبروں میں باخبر بھی نکل آتا ہے۔ اپنا کام کئے جاؤ۔

لہ (بقیہ حاشیہ صفحہ ۴۵۵) کے شاگرد تھے۔ ان کا ایک مبسوط رسالہ علم قرأت میں سنے دیکھا ہوا ہے۔ انھوں نے تحفہ اثنا عشریہ کا جواب لکھا تھا۔ اخیر کے ۳ باب باقی تھے جو دُنیا سے انتقال کیا۔ اکثر علماء نے کتاب مذکور کے جواب لکھے ہیں۔ مگر جس متانت اور جامعیت اور اختصار کے ساتھ انھوں نے لکھا ہے کسی نے نہیں لکھا۔ لہ دیکھو صفحہ ۲۹۲ کہ حافظ احمد یار۔ سید انشاء کے یار ہیں۔ یہ عجب شگفتہ مزاج۔ خوش طبع۔ سخن فہم شخص تھے۔ باوجودیکہ استاد جوان تھے۔ وہ بڈھے تھے مگر یاروں کی طرح ملتے تھے۔ حافظ مرحوم انہی مولوی صاحب کے داماد تھے۔ جنھوں نے حلّت زاغ کا فتویٰ دیا تھا اور سودا نے ان کی ہجو کہی تھی۔ ترجیع بند مخمس میں ع اک مسخرا یہ کہتا ہے کوا حلال ہے

۳۶ برس کی عمر تھی جب کہ جملہ منہیات سے توبہ کی اور اُس کی تاریخ کہی ع

توبہ اور توبہ کی تاریخ

اے ذوق بگو سہ بار توبہ

مرزا ابوظفر بادشاہ ہو کر بہادر شاہ ہوئے تو انھوں نے پہلے یہ قصیدہ گزرانا۔

روکش ترے رُخ سے ہو کیا نورِ سحر رنگِ شفق   ہے ذرہ تیرا پرتوِ نورِ سحر رنگِ شفق

مبارک ہو بادشاہ شاگرد ہوا

اگرچہ مرزا ابوظفر ہمیشہ انھیں دل سے عزیز رکھتے تھے اور دلی رازوں کے لئے مخزن اعتبار سمجھتے تھے۔ مگر ولیعہدی میں مرزا مغل بیگ مختار تھے۔ جب کبھی بڑی سے بڑی ترقی یا انعام کے موقعے آئے تو استاد کے لئے یہ ہوا کہ للعہ روپے مہینے سے صہ رہو گئے۔ صہ روپے سے سعہ روپے ہو گئے۔ جب بادشاہ ہوئے اور مرزا مغل بیگ وزیر ہوئے تو وزیر شاہی کا سارا کنبہ قلعہ میں بھر گیا۔ مگر استاد شاہی کو سنت ۳۰ مہینا! پھر بھی انھوں نے حضور میں اپنی زبان سے ترقی کے لئے عرض نہیں کی۔ ان کی عادت تھی کہ فکر سخن میں ٹہلا کرتے تھے اور شعر موزوں کیا کرتے تھے۔ چنانچہ ان دنوں میں جب کوئی عالی مضمون چُستی اور درستی کے ساتھ موزوں ہوتا تو اُس کے سرور میں آسمان کی طرف دیکھتے اور کہتے پھرتے ؎

یوں پھریں اہل کمال آشفتہ حال افسوس ہے   اے کمال افسوس ہے تجھ پر کمال افسوس ہے

میاں عبدالعزیز[۱] خاں صاحب ایک مرد بزرگ صاحب نسبت فقیر تھے شیخ مرحوم بھی ان سے بہت اعتقاد رکھتے تھے۔ اس عالم میں ایک دن اُن کے پاس گئے۔ اور اُن سے کہا کہ تخت نشینی سے پہلے حضور کے بڑے بڑے وعدے تھے لیکن اب یہ عالم ہے کہ الف کے نام ب نہیں جانتے۔ زبان تک درست نہیں۔ مگر جو کچھ ہیں مرزا مغل بیگ ہیں۔ اُنھوں نے کہا کہ خدائی کے کارخانے میں اگرچہ عقل ظاہر بیں کام نہیں کرتی مگر یہ دیکھو کہ جو دولت تم کو دی ہے وہ اُس کو بھی تو نہیں دی ہے۔ جس دعوے سے تم دربار میں کھڑے ہو کر

---

[۱] فراش خانہ کی کھڑکی میں رہتے تھے +

اپنا کلام پڑھتے ہو۔ اس دعوے سے وہ اپنی وزارت کے مقام پر کب کھڑا ہو سکتا ہوگا۔ ادنیٰ ادنیٰ منشی متصدی اس کے لکھتے پڑھتے ہوں گے۔ وہ کیسا ترستا ہوگا کہ نہ اُن کے لکھے کو سمجھ سکتا ہے۔ نہ اُن کا جھوٹ سچ معلوم کر سکتا ہے شیخ مرحوم نے اُن کی ہدایت کو تسلیم کیا اور پھر کبھی شکایت نہ کی +

چند روز کے بعد مرزا مغل بیگ کی تنزکی تمام ہوگئی۔ تمام کنبہ قلعہ سے نکالا گیا۔ نواب حامد علی خاں مرحوم مختار ہو گئے۔ جب اُستاد شاہی کا سو روپیہ مہینا ہوا۔ ہمیشہ عیدوں اور نوروزوں کے جشنوں میں قصیدے مبارک باد کے پڑھتے تھے اور خلعت سے اعزاز پاتے تھے +

اواخرِ ایام میں ایک دفعہ بادشاہ بیمار ہوئے۔ جب شفا پائی اور اُنھوں نے ایک قصیدۂ غرا کہہ کر نذر گذرانا تو خلعت کے علاوہ خطاب خاں بہادر اور ایک ہاتھی معہ حوضۂ نقرئی انعام ہوا +

پھر ایک بڑے زور شور کا قصیدہ کہہ کر گذرانا جس کا مطلع ہے۔ ع

شب کو میں اپنے سرِ بسترِ خوابِ راحت

اس پر ایک گاؤں جاگیر میں عطا ہوا +

جس رات کی صبح ہوتے انتقال ہوا قریب شام میں بھی موجود تھا کہ اُنھیں پیشاب کی حاجت معلوم ہوئی۔ خلیفہ صاحب نے اٹھایا۔ چوکی پائنتی لگی ہوئی تھی۔ ہاتھ کا سہارا دیا اور اُنھوں نے کھسک کر آگے بڑھنا چاہا۔ طاقت نے یاری نہ دی۔ تو کہا۔ آہ! ناتوانی۔ خلیفہ صاحب نے فرمایا کہ شاعروں ہی کا ضعف ہوتا ہے حافظ ویراں بھی بیٹھے تھے۔ وہ بولے کہ آپ نے بھی ضعف کے بڑے بڑے مضمون باندھے ہیں۔ فرمایا کہ اب تو کچھ اس سے بھی زیادہ ہے۔ میں نے کہا سبحان اللہ اس عالم میں بھی مبالغہ قائم ہے۔ خدا اسی مبالغہ کے ساتھ توانائی دے۔ میں رخصت ہوا۔ رات اُسی حالت میں گزری۔ صبح ہوتے کہ ۲۴ صفر ۱۲۷۱ھ جمعرات

کا دن تھا۔ ۷ دن بیمار رہ کر وفات پائی۔ مرنے سے ۳ گھنٹے پہلے یہ شعر کہا تھا:۔
کہتے ہیں آج ذوق جہاں سے گذر گیا   کیا خوب آدمی تھا خدا مغفرت کرے
شعرائے ہند نے جس قدر تاریخیں اُن کی کہیں آج تک کسی بادشاہ یا صاحب کمال کو نصیب نہیں ہوئیں +

اُردو اخبار اُن دنوں دہلی میں جاری تھا۔ برس دن تک کوئی اخبار اُس کا ایسا نہ تھا۔ جس میں ہر ہفتہ کئی کئی تاریخیں نہ چھپی ہوں +

خاص حالات اور طبعی عادات

شیخ مرحوم قد و قامت میں متوسط اندام تھے۔ چنانچہ خود فرماتے ہیں:۔
آدمیت سے ہے بالا آدمی کا مرتبہ   پست ہمت یہ نہ ہووے پست قامت ہو تو ہو
رنگ سانولا۔ چیچک کے داغ بہت تھے۔ کہتے تھے کہ ۹ دفعہ چیچک نکلی تھی۔ مگر رنگت اور داغ کچھ ایسے مناسب و موزوں واقع ہوئے تھے۔ کہ چمکتے تھے اور بھلے معلوم ہوتے تھے۔ آنکھیں روشن اور نگاہیں تیز تھیں۔ چہرہ کا نقشہ کھڑا کھڑا تھا۔ اور بدن میں پھرتی پائی جاتی تھی۔ بہت جلد چلتے تھے۔ اکثر سفید کپڑے پہنتے تھے اور وہ اُن کو نہایت زیب دیتے تھے۔ آواز بلند اور خوش آیندہ۔ جب مشاعرہ میں پڑھتے تھے تو محفل گونج اُٹھتی تھی۔ اُن کے پڑھنے کی طرز اُن کے کلام کی تاثیر کو زیادہ زور دیتی تھی۔ اپنی غزل آپ ہی پڑھتے تھے۔ کسی اَور سے ہرگز نہ پڑھواتے تھے +

صنائع قدرت جنھیں صاحب کمال کرتا ہے اُنھیں اکثر صفتیں دیتا ہے۔ جن میں وہ ابنائے جنس سے صاف الگ نظر آتے ہیں۔ چنانچہ اُن کی تیزی ذہن اور برّاقی طبع کا حال تو اب بھی ان کے کلام سے ثابت ہے۔ مگر قوّت حافظہ کے باب میں ایک ماجرا عالمِ شیر خواری کا اُنھوں نے بیان کیا جسے سُن کر سب

قوّت حافظہ

تعجب کریں گے۔ کہتے تھے مجھے اب تک یاد ہے کہ اس عالم میں ایک دن مجھے بخار تھا۔ والدہ نے پلنگ پر لٹا کر لحاف اُڑھا دیا۔ اور آپ کسی کام کو چلی گئیں ایک بلی لحاف میں گھس آئی۔ مجھے اس سے اور اس کی خرخر کی آواز سے نہایت تکلیف معلوم ہونے لگی۔ لیکن نہ ہاتھ سے ہٹا سکتا تھا نہ زبان سے پکار سکتا تھا۔ گھبراتا تھا اور رہ جاتا تھا۔ تھوڑی دیر میں والدہ آ گئیں۔ اُنھوں نے اُسے ہٹا دیا تو مجھے غنیمت معلوم ہوا۔ اور وہ دونوں کیفیتیں اب تک یاد ہیں۔ چنانچہ میں جب بڑا ہوا تو میں نے والدہ سے پوچھا اُنھوں نے یاد کر کے اس واقعہ کی تصدیق کی۔ اور کہا کہ فی الحقیقت اُس وقت تیری عمر برس دن سے کچھ کم تھی +

صلاحیت طبع

صلاحیت طبع کے باب میں خدا کا شکر کیا کرتے تھے۔ اور کہتے تھے کہ ایک دن املی کے درخت میں کنکوّا اٹک گیا۔ میں اُتارنے کو اوپر چڑھ گیا۔ ایک ٹہنی کو سہارے کے قابل سمجھ کر پاؤں رکھا وہ ٹوٹ گئی۔ میں نیچے آ پڑا۔ بہت چوٹ لگی۔ مگر خدا نے ایسی توفیق دی کہ پھر نہ کنکوّا اُڑایا نہ درخت پر چڑھا +

خوفِ خدا

عمر بھر اپنے ہاتھ سے جانور ذبح نہیں کیا۔ عالم جوانی کا ذکر کرتے تھے کہ یاروں میں ایک مجرّب نسخہ قوّت باہ کا بڑی کوششوں سے ہاتھ آیا۔ شریک ہو کر اس کے بنانے کی صلاح ٹھیری۔ ایک ایک جُز کا بہم پہنچانا ایک ایک شخص کے ذمّہ ہوا۔ چنانچہ ۴۰ چڑوں کا مغز ہمارے سر ہوا۔ ہم نے گھر آ کر اُن کے پکڑنے کے سامان پھیلا دئیے اور دو تین دن چڑے پکڑ کر ایک پنجڑے میں ڈالے۔ ان کا پھڑکنا دیکھ کر خیال آیا کہ ابراہیم ایک پل کے پل مزے کے لئے ۴۰ بے گناہوں کا مارنا انسانیت ہے۔ یہ بھی تو آخر جان رکھتے ہیں۔ اور اپنی پیاری زندگی کے لئے ہر قسم کی لذّتیں رکھتے ہیں۔ اُسی وقت اُٹھا اُنھیں چھوڑ دیا۔ اور سب سامان توڑ پھوڑ کر یاروں میں جا کر کہہ دیا کہ بھئی ہم اس نسخہ میں شریک نہیں ہوتے +

خوفِ خدا

اُن کی عادت تھی کہ ٹہلتے بہت تھے۔ دروازہ کے آگے لمبی گلی تھی اکثر اُس میں پھرا

کرتے تھے۔ رات کے وقت ٹہلتے ٹہلتے آئے اور کہنے لگے کہ میاں ابھی ایک سانپ گلی میں چلا جاتا تھا۔ حافظ غلام رسول ویراں شاگرد رشید بھی بیٹھے تھے۔ اُنھوں نے کہا کہ حضرت پھر آپ نے اُسے مارا نہیں؟ کسی کو آواز دی ہوتی۔ فرمایا کہ خیال تو مجھے بھی آیا تھا۔ مگر پھر میں نے کہا کہ ابراہیم آخر یہ بھی تو جان رکھتا ہے۔ تجھے کے رکعت کا ثواب ہوگا۔ پھر یہ قطعہ پڑھا:۔

چہ خوش گفت فردوسیِ پاک زاد که رحمت براں تربتِ پاک باد
میازار مورے کہ دانہ کش است کہ جاں دارد و جانِ شیریں خوش است

ایک دفعہ برسات کا موسم تھا۔ بادشاہ قطب میں تھے۔ یہ ہمیشہ ساتھ ہوتے تھے اس وقت قصیدہ لکھ رہے تھے۔ ع شب کو میں اپنے سربسترِ خوابِ راحت۔ چڑیاں سائبان میں تنکے رکھ کر گھونسلا بنا رہی تھیں۔ اور اُن کے تنکے جو گرتے ہیں اُنکے لینے کو بار بار اُن کے آس پاس آبیٹھتی تھیں۔ یہ عالم محویت میں بیٹھے تھے۔ ایک چڑیا سر پر آن بیٹھی۔ اُنھوں نے ہاتھ سے اُڑا دیا۔ تھوڑی دیر میں پھر آن بیٹھی۔ اُنھوں نے پھر اُڑا دیا۔ جب کئی دفعہ ایسا ہوا تو ہنس کر کہا کہ اس غیبانی نے میرے سر کو کبوتروں کی چھتری بنایا ہے۔ ایک طرف میں بیٹھا تھا۔ ایک طرف حافظ ویراں بیٹھے تھے۔ وہ نابینا ہیں۔ اُنھوں نے پوچھا کہ حضرت کیا؟ میں نے حال بیان کیا۔ ویراں بولے کہ ہمارے سر پر تو نہیں بیٹھتیں۔ اُستاد نے کہا کہ بیٹھیں کیونکر؟ جانتی ہیں کہ یہ مُلّا ہے۔ عالم ہے۔ حافظ ہے۔ ابھی اُحِلَّ لَکُمُ الصَّیْدُ کی آیت پڑھ کر کُلُوْا وَاشْرَبُوْا۔ بِسْمِ اللّٰہِ اَللّٰہُ اَکْبَرُ کر دے گا۔ دیوانی ہے؟ جو تمھارے سر پر آئے۔

فرماتے تھے کہ میں نے ساڑھے تین سو دیوان اساتذۂ سلف کے دیکھے اور اُن کا خلاصہ کیا۔ خان آرزو کی تصنیفات۔ ٹیک چند بہار کی تحقیقات اور اور اس قسم کی اور کتابیں گویا اُن کی زبان پر تھیں۔ مگر مجھے اس کا تعجب نہیں۔ اگر

خوفِ خدا لطیفہ

ایسے ... کہاں ہیں

شعرائے عجم کے ہزاروں شعر انہیں از بر تھے تو مجھے حیرت نہیں۔ گفتگو کے وقت جس ترانے سے وہ شعر سند میں دیتے تھے مجھے اس کا بھی خیال نہیں۔ کیونکہ فن کو وہ لئے بیٹھے تھے۔ یہ سب اُس کے لوازمات ہیں۔ ہاں تعجب یہ ہے کہ تاریخ کا ذکر آئے تو وہ ایک صاحب نظر مورّخ تھے۔ تفسیر کا ذکر آئے تو ایسا معلوم ہوتا تھا گویا تفسیر کبیر دیکھ کر اُٹھے ہیں۔ خصوصاً تصوّف میں ایک عالم خاص تھا۔ جب تقریر کرتے تھے یہ معلوم ہوتا تھا کہ شیخ شبلی ہیں یا بایزید بسطامی بول رہے ہیں کہ وحدت وجود اور وحدت شہود میں علم اشراق کا پرتوہ دے کر کبھی ابو سعید ابوالخیر تھے کبھی محی الدین عربی۔ پھر جو کہتے تھے ایسی کانٹے کی تول کہتے تھے کہ دل پر نقش ہو جاتا تھا۔ اور جو کچھ اُن سے سُن لیا ہے آج تک دل پر نقش ہے۔ رمل و نجوم کا ذکر آئے تو وہ نجومی تھے۔ خواب کی تعبیر میں اُنہیں خدا نے ایک ملکۂ راسخہ کا دیا تھا۔ اور لطف یہ کہ احکام اکثر مطابق واقع ہوتے تھے۔ اگرچہ مجھے اس قدر وسعت نظر بہم پہنچانے کا تعجب ہے۔ مگر اس سے زیادہ تعجب یہ ہے کہ اُن کے حافظہ میں اس قدر مضامین محفوظ کیونکر رہے +

وہ کہتے تھے کہ اگرچہ شعر کا مجھے بچپن سے عشق ہے۔ مگر ابتدا میں دنیا کی شہرت اور ناموری اور تفریح طبع نے مجھے مختلف کمالوں کے رستے دکھائے۔ چند روز موسیقی کا شوق ہوا اور کچھ حاصل بھی کیا۔ مگر خاندیس سے ایک بڑا صاحب کمال گوّیا آیا۔ اُس سے ملاقات کی۔ باتوں باتوں میں اُس نے کہا کہ جو گانے کا شوق کرے اُس کے لئے ۳۰۰ برس کی عمر چاہیئے۔ ۱۰۰ برس سیکھے۔ ۱۰۰ برس سُنتا پھرے۔ اور جو سیکھا ہے اُسے مطابق کرے۔ پھر ۱۰۰ برس بیٹھ کر اوروں کو سُنائے۔ اور اُس کا لطف اُٹھائے۔ یہ سُن کر دل برداشتہ ہو گیا اور یہ بھی خیال آیا کہ ابراہیم اگر بڑا کمال پیدا کیا تو ایک ڈوم ہو گئے۔ اس پر بھی جو کلاونت ہو گا وہ ناک چڑھا کر یہی کہے گا کہ اتائی ہیں۔ سپاہی زادے سے ڈوم بننا کیا ضرور +

چند روز موسیقی کا بھی شوق رہا

بجوم و رمل

نجوم و رمل کا بھی شوق کیا۔ اُس میں دستگاہ پیدا کی نجوم کا ایک صاحب کمال مغل پورے رہتا تھا۔ اس سے نجوم کے مسائل حاصل کیا کرتے تھے۔ ایک دن کسی سوال کا نہایت درست جواب اُس نے دیا اور گفتگو ہوتے ہوتے یہ بھی کہا کہ ایک ایک ستارہ کا حال اور اُس کے خواص معلوم کرنے کے لئے ۱۲ برس چاہئے۔ سُن کر اُس سے بھی دل برداشتہ ہو گیا۔

طب

طب کو چند روز کیا۔ اُس میں خون ناحق نظر آنے لگے۔ آخر جو طبیعت خدا نے دی تھی وہی خوبیٔ قسمت کا سامان بنی۔

عجیب پیشنگوئی

لکھن لعل کے کنج میں ایک جوتشی پنڈت تلسی رام نابینا تھے۔ ایک مرد دیرینہ سال منشی درگاپرشاد کہ شیخ مرحوم کے قدیمی دوست تھے اور جوتشی صاحب کے پاس بھی جایا کرتے تھے۔ اُنھوں نے جوتشی صاحب کی بہت تعریف کی اور ایک دن قرار پاکر یہ بھی ان کے پاس گئے۔ کئی دلچسپ سلسلہ گفتگوؤں کے ہوئے۔ بعد ازاں اُنھوں نے بے اظہار نام اپنے زائچہ کی صورتِ حال بیان کی۔ جوتشی صاحب نے کہا کہ وہ شخص صاحب کمال ہو اور غالبًا کمال اُس کا کسی ایسے فن میں ہو کہ باعثِ تفریح ہو۔ اُس کا کمال رواج خوب پاوے۔ اُس کے حریف بھی بہت ہوں۔ مگر کوئی سامنے نہ ہو سکے وہ اسی قسم کی باتیں کہے جاتے تھے۔ جو شیخ مرحوم نے پوچھا کہ اُس کی عمر کیا ہو؟ انھوں نے کہا کہ ۶۷۔ ۶۸ حد ۶۹۔ یہ سُن کر شیخ مرحوم کے چہرہ پر آثار ملال ظاہر ہوئے اور خدا کی قدرت کہ ۶۸ برس کی عمر میں انتقال ہوا اگرچہ عقلاً اور نقلاً احکام نجوم پر اعتقاد نہ کرنا چاہئے۔ لیکن واقعہ پیش نظر گذرا تھا۔ اس لئے واقعہ نگاری کا حق ادا کیا

میں بھی دیکھتا تھا کہ اُنھیں آخر عمر میں مرنے کا خیال اکثر رہتا تھا۔ ایک دفعہ بادشاہ بیمار ہو کر اچھے ہوئے۔ غسل صحت کا جشن قریب تھا۔ انھوں نے مبارک باد کا قصیدہ کہا۔ میں حسب معمول خدمت میں حاضر ہوا۔ وہ اُس وقت قصیدہ ہی لکھ رہے تھے۔ چنانچہ کچھ اشعار اُس کے سُنانے لگے۔ مطلع تھا:۔

زہے نشاط کہ گر کیجئے اُسے تحریر عیاں ہو خامہ سے تحریر نغمہ جائے صریر

اس کے آگے شعر سناتے جاتے تھے۔ میں تعریف کرتا جاتا تھا۔ وہ مسکراتے جاتے تھے اور پڑھتے جاتے تھے۔ جب یہ شعر پڑھا۔

ہوا پہ دوڑتا ہے اس طرح سے ابر سیاہ　　کہ جیسے جائے کوئی فیل مست بے زنجیر

بے اختیار میری زبان سے نکلا کہ سبحان اللہ۔ رنگینی اور یہ زور۔ ظہوری کا ساقی نامہ ہوگیا۔ چپ ہوگئے اور کہا کہ اس میں زور آتا جاتا ہے۔ میں گھلا جاتا ہوں۔ اس کی جوانی ہے اور میرا بڑھاپا ہے۔ حافظ ویراں سلمہ اللہ نے بیان کیا۔ اشعار بہاریہ کے لکھنے میں دو تین دفعہ فرمایا کہ خواجہ حافظ کا شعر بھی اس میں موقع سے تضمین کریں گے۔

مے دو سالہ محبوب چار دہ سالہ　　ہمیں بس است مرا صحبتِ صغیر و کبیر

ایک دن جو میں گیا تو جو شعر پرچوں پر پریشان تھے۔ انھیں ترتیب دیا تھا۔ چنانچہ سُناتے سُناتے پھر شعر مذکور پڑھا۔ بعد اُس کے قطعہ پڑھا کہ خود کہا تھا:۔

ہوا ہے مدرسہ بھی درسگاہ عیش و نشاط　　کہ شمس بازغہ کی جا پڑھے ہیں بدر منیر

اگر پیالہ ہے صغریٰ تو ہے سبوُ کبرا　　نتیجہ یہ ہے کہ سرمست ہیں صغیر و کبیر

میری طرف دیکھ کر فرمایا۔ اب بھی! میں نے عرض کی سبحان اللہ اب اس کی کیا ضرورت رہی۔ آنکھیں بند کر کے فرمایا۔ ادھر ہی کا فیضان ہے۔

دلّی میں نواب زینت محل کا مکان لال کنویں کے پاس اب بھی موجود ہے۔ بادشاہ نے وہیں دربار کر کے یہ قصیدہ سُنا تھا۔ اس برس ایک شادی کی تقریب میں مجھے دلّی جانا ہوا۔ اُسی مکان میں برات بیٹھی تھی۔ فتح دہلی کے بعد گورنمنٹ نے وہ مکان سرکار پٹیالہ کو دے دیا ہے۔ بند پڑا رہتا ہے۔ اب اتنے ہی کام کا ہے کہ ادھر کے ضلع میں کوئی بڑی بات یا شادی کا جلسہ ہوتا ہے تو داروغہ سے اجازت لے کر وہاں آن بیٹھتے ہیں۔ واہ

کُشتوں کا تیری چشم سیہ مست کے مزار　　ہوگا خراب بھی تو خرابات ہوئے گا

کی نیکی اور عام نیک خواہی کا۔ اس میں سب سے پہلے یہ دعا تھی۔ کہ الٰہی ایمان کی سلامتی۔ بدن کی صحت۔ دنیا کی عزت و حرمت۔ پھر۔ الٰہی میرے بادشاہ کو بادولت با اقبال صحیح و سالم رکھ۔ اس کے دشمن ردّ ہوں وغیرہ وغیرہ۔ پھر میاں اسمٰعیل یعنی اپنے بیٹے کے لئے۔ پھر اپنے عیال اور خاص خاص دوستوں کے لئے۔ یا جو کسی دوست کے لئے خاص مشکل درپیش ہو۔ وغیرہ وغیرہ۔ ایک شب اس موقع پر میرے والد مرحوم اُنہی کے ہاں تھے۔ ساری دعائیں سُنا کئے۔ چنانچہ اُن کے دروازہ کے سامنے محلّہ کا حلال خور رہتا تھا۔ اُن دنوں میں اُس کا بیل بیمار تھا دُعائیں مانگتے مانگتے وہ بھی یاد آ گیا۔ کہا کہ الٰہی جمّاں حلال خور کا بیل بیمار ہے اُسے بھی شفا دے۔ بچارا بڑا غریب ہے بیل مر جائے گا تو یہ بھی مر جائے گا۔ والد نے جب یہ سُنا تو بے اختیار ہنس پڑے۔ فقرا اور بزرگان دین کے ساتھ اُنھیں ایسا دلی اعتقاد تھا کہ اُس کی کیفیت بیان نہیں ہو سکتی۔ علماء اور اساتذہ سلف کو ہمیشہ باادب یاد کرتے تھے۔ اور کبھی اُن پر طعن و تشنیع نہ کرتے تھے۔ اسی واسطے اُن کے مذہب کا حال کسی کو نہ کھُلا۔

ترتیب دیوان

اس میں کسی کو کلام نہیں کہ اُنھوں نے فکر سخن اور کثرت مشق میں فنافی الشعر کا مرتبہ حاصل کیا۔ اور انشا پردازیٔ ہند کی روح کو شگفتہ کیا۔ مگر فصاحت کا دل کملا جاتا ہوگا۔ جب اُن کے دیوان مختصر پر نگاہ کرتی ہوگی۔ اُس کے سبب کا بیان کرنا ایک سخت مصیبت کا افسانہ ہے۔ اور اُس کی مرثیہ خوانی میرا فرض ہے۔ ان کی وفات کے چند روز بعد میں نے اور خلیفہ اسمٰعیل مرحوم نے کہ وہ بھی باپ کی طرح اکلوتے بیٹے تھے۔ چاہا کہ کلام کی ترتیب دیں۔ متفرق غزلوں کے بستے اور بڑی بڑی پوٹیں تھیں۔ بہت سی تھیلیاں اور مٹکے تھے۔ کہ جو کچھ کہتے تھے گویا بڑی احتیاط سے ان میں بھرتے جاتے تھے۔ ترتیب اُس کی پسینہ کی جگہ خون بہاتی تھی۔ کیونکہ بچپن سے لے کر دمِ واپسیں تک کا کلام اُنہی میں تھا۔ بہت سی

وہ زمانہ اور آج کی حالت دیکھ کر خدا یاد آتا ہے +

گذارہ کا اندازہ

اُن کی طبیعت کو خدا تعالیٰ نے شعر سے ایسی مناسبت دی تھی کہ رات دن اس کے سوا کچھ خیال نہ تھا۔ اور اسی میں خوش تھے۔ ایک تنگ و تاریک مکان تھا جس کی انگنائی اس قدر تھی۔ کہ ایک چھوٹی سی چارپائی ایک طرف بچھتی تھی۔ دو طرف اتنا رستہ رہتا تھا کہ ایک آدمی چل سکے۔ حقّہ مُنہ سے لگا رہتا تھا۔ کُھرّی چارپائی پر بیٹھے رہتے تھے۔ لکھے جاتے تھے یا کتاب دیکھے جاتے تھے۔ گرمی۔ جاڑا۔ برسات۔ تینوں موسموں کی بہاریں وہیں بیٹھے گذر جاتی تھیں۔ انہیں کچھ خبر نہ ہوتی تھی۔ کوئی میلہ۔ کوئی عید اور کوئی موسم بلکہ دُنیا کے شادی و غم سے اُنھیں سروکار نہ تھا۔ جہاں اوّل روز بیٹھے وہیں بیٹھے اور جبھی اُٹھے کر دنیا سے اُٹھے +

پاک خیال

نماز عصر کے وقت میں ہمیشہ حاضر خدمت ہوتا تھا۔ نہا کر وضو کرتے تھے اور ایک لوٹے سے برابر کُلّیاں کئے جاتے تھے۔ ایک دن میں نے سبب پوچھا متاسفانہ طور سے بولے کہ خدا جانے کیا کیا ہزلیات زبان سے نکلتے ہیں۔ خیر یہ بھی ایک بات ہے۔ پھر ذرا تامّل کرکے۔ ایک ٹھنڈی سانس بھری اور یہ مطلع اُسی وقت کہہ کر پڑھا:۔

پاک رکھ اپنا دہاں ذکرِ خدائے پاک سے کم نہیں ہرگز زباں مُنہ میں ترے مسواک سے

اوراد و وظائف

ان کا معمول تھا کہ رات کو کھانے سے فارغ ہو کر بادشاہ کی غزل کہتے تھے۔ آدھی بجے تک اُس سے فراغت ہوتی تھی۔ پھر وضو کرتے اور وہی ایک لوٹے پانی سے کُلّیاں کرکے نماز پڑھتے۔ پھر وظیفہ شروع ہوتا۔ زیر آسمان کبھی ٹہلتے جاتے۔ کبھی قبلہ رو ٹھیر جاتے۔ اگرچہ آہستہ آہستہ پڑھتے تھے مگر اکثر اوقات اس جوش دل سے پڑھتے تھے کہ معلوم ہوتا تھا کہ گویا سینہ پھٹ جائے گا +

وظیفہ پڑھ کر دعائیں شروع ہوتی تھیں۔ یہ گویا ایک نمونہ تھا۔ اُن کی طبیعت

نہ ہو گا۔ حافظ موصوف کو خود بھی حضرت مرحوم کا کلام بہت کچھ یاد ہے۔ اور خدا نے اُن کی بصیرت کی آنکھیں ایسی روشن کی ہیں کہ بصارت کی آنکھوں کے محتاج نہیں۔ اس لئے لکھنے کی سخت مشکل ہوئی۔ غرض کہ ایک مشکل میں کئی کئی مشکلیں تھیں۔ انھوں نے اس مہم کا سرانجام کیا۔ اور اپنی یاد کے علاوہ نزدیک بلکہ دُور دُور سے بہت کچھ بہم پہنچایا۔ سب کو سمیٹ کر ۱۲۷۹ھ میں ایک مجموعہ جس میں اکثر غزلیں تمام اکثر ناتمام۔ بہت سے متفرق اشعار۔ اور چند قصیدے ہیں چھاپ کر نکالا۔ مگر دردمندی کا دل پانی پانی ہو گیا۔ اور عبرت کی آنکھوں سے لہو ٹپکا۔ کیونکہ جس شخص نے دُنیا کی لذتیں۔ عمر کے مختلف موسم۔ اور موسموں کی بہاریں۔ دن کی عیدیں۔ رات کی شب براتیں۔ بدن کے آرام۔ دل کی خوشیاں۔ طبیعت کی اُمنگیں سب چھوڑیں۔ اور ایک شعر کو لیا۔ جس کی انتہائے تمنا یہی ہو گی کہ اُس کی بدولت نام نیک باقی رہے گا۔ تبہ کار زمانہ کے ہاتھوں آج اُس کی عمر بھر کی محنت نے یہ سرمایہ دیا۔ اور جس نے ادنیٰ ادنیٰ شاگردوں کو صاحب دیوان کر دیا۔ اُس کو یہ دیوان نصیب ہوا۔ خیر ع

یوہی خدا جو چاہے تو بندہ کا کیا چلے

میرے پاس بعض قصیدے ہیں۔ اکثر غزلیں ہیں داخل ہو جائیں گی۔ یا ناتمام غزلیں پوری ہو جائیں گی۔ مگر تصنیف کے دریا میں سے پیاس بھر پانی بھی نہیں چنانچہ یہ تذکرہ چھپ لے تو اس پر توجہ کروں۔ مسبب الاسباب سرانجام کے اسباب عنایت فرمائے +

غزلوں پر رائے

جو غزلیں اپنے تخلص سے کہی تھیں اگر جمع کی جائیں تو بادشاہ کے چاروں دیوانوں کے برابر ہونیں۔ غزلوں کے دیوان کو دیکھ کر معلوم ہوتا ہے کہ عام جوہر ان کے کلام کا۔ تازگیٔ مضمون، صفائیٔ کلام۔ چستیٔ ترکیب، خوبیٔ محاورہ اور عام فہمی ہے۔ مگر حقیقت میں رنگ مختلف وقتوں میں

مختلف رہا۔ ابتدا میں مرزا رفیع کا انداز تھا۔ شاہ نصیر سے ان دنوں معرکے ہو رہے تھے۔ اُن کا ڈھنگ وہی تھا۔ اس لئے انھوں نے بھی وہی اختیار کیا۔ اس کے علاوہ مرزا کی طرز کو جلسہ کے گرمانے میں اور لوگوں کے لب و دہن سے واہ وا کے نکال لینے میں ایک عجیب جادو کا اثر ہے۔ چنانچہ وہی مشکل طرحیں۔ چُست بندشیں۔ برجستہ ترکیبیں۔ معانی کی بلندی۔ الفاظ کی شکوہیں ان کے ہاں بھی پائی جاتی ہیں۔ چند روز کے بعد الٰہی بخش خانِ معروف کی خدمت میں۔ اور ولی عہد کے دربار میں پہنچے۔ معروف ایک دیرینہ سال مشاق اور فقیر مزاج شخص تھے۔ ان کی پسند طبع کے بموجب اُنھیں بھی تصوّف اور عرفان اور درد دلی کی طرف خیالات کو مائل کرنا پڑا۔ نوجوان ولی عہد طبیعت کے بادشاہ تھے۔ ادھر یہ بھی جوان اور ان کی طبیعت بھی جوان تھی۔ وہ جرأت کے انداز کو پسند کرتے تھے اور جرأت اور سید انشا و مصحفی کے مطلع اور اشعار بھی لکھنؤ سے اکثر آتے رہتے تھے۔ اُن کی غزلیں اُنہی کے انداز میں بناتے تھے۔ نتیجہ اُس کا یہ ہوا کہ اُن کی غزل اخیر کو ایک گلدستہ گلہائے رنگا رنگ کا ہوتی تھی۔ دو تین شعر بلند خیالی کے۔ ایک دو تصوّف کے۔ دو تین معاملے کے۔ اور بیچ اس میں یہ ہوتا تھا کہ ہر قافیہ بھی ایک خاص انداز کے ساتھ خصوصیت رکھتا ہے کہ اسی میں بندھے تو لطف دے۔ نہیں تو پھیکا رہے۔ پس وہ مشاق باکمال اس بات کو پورا پورا سمجھا ہوا تھا۔ اور جس قافیہ کو جس پہلو کے مناسب دیکھتا تھا اُسی میں باندھ دیتا تھا۔ اور اس طرح باندھتا تھا کہ اور پہلو نظر نہ آتا تھا۔ ساتھ اس کے صفائی اور محاورہ کو ہرگز ہاتھ سے نہ جانے دیتے تھے۔ اور انہی اصول کے لحاظ سے میر۔ مرزا۔ درد۔ مصحفی۔ سید انشا جرأت بلکہ تمام شعرائے متقدمین کو اس ادب سے یاد کرتے تھے۔ گویا انہی کے شاگرد ہیں۔ ایک ایک چیدہ اشعار اس محبت سے پڑھتے تھے گویا

اسی دستورالعمل سے انھوں نے تہذیب پائی ہے اور فی الحقیقت سب کے انداز کو اپنے اپنے موقع پر پورا پورا کام میں لاتے تھے۔ پھر بھی جاننے والے جانتے ہیں کہ اصلی میلان اُن کی طبیعت کا سوداؔ کے انداز پر زیادہ تھا۔ نظم اُردو کی نقاشی میں مرزائے موصوف نے قصیدہ پر دستکاری کا حق ادا کردیا ہے۔ ان کے بعد شیخ مرحوم کے سوا کسی نے اس پر قلم نہیں اُٹھایا۔ اور انھوں نے مرقع کو ایسی اونچی محراب پر سجایا کہ جہاں کسی کا ہاتھ نہیں پہنچا۔ انوری ظہیر ظہوری۔ نظیری۔ عرفی۔ فارسی کے آسمان پر بجلی ہوکر چمکتے ہیں۔ لیکن ان کے قصیدوں نے اپنی کڑک دمک سے ہند کی زمین کو آسمان کر دکھایا۔ ہر جشن میں ایک قصیدہ کہتے تھے اور خاص خاص ترکیبیں جو پیش آتی تھیں وہ الگ تھیں۔ اس لئے اگر جمع ہوتے تو خاقانیِ ہند کے قصائد خاقانیِ شروانی سے دوچند ہوتے۔ جب تک اکبر شاہ زندہ تھے۔ تب تک ان کا دستور تھا کہ قصیدہ کہہ کر لے جاتے اور اپنے آقا یعنی ولیعہد بہادر کو سُناتے۔ دوسرے دن ولیعہد ممدوح اُس میں اپنی جگہ بادشاہ کا نام ڈلوا کر لے جاتے اور دربار شاہی میں سنواتے۔ افسوس یہ ہے کہ عالم جوانی کی طبع آزمائی سب برباد ہوئی۔ جو کچھ ہیں وہ چند قصیدے ہیں کہ بڑھاپے کی ہمت کی برکت ہیں ✦

رائے بر قصائد

نواب حامد علی خاں مرحوم نے نہایت شوق سے ایک عاشقانہ خط لکھنے کی اُنھیں فرمائش کی تھی۔ بادشاہ کی متواتر فرمائشیں یہاں ایسے کاموں کے لئے کب فرصت دیتی تھیں۔ مگر اتّفاق کہ اُنھیں دنوں میں رمضان آگیا۔ اور اتّفاق پر اتّفاق یہ کہ بادشاہ نے روزے رکھنے شروع کئے۔ اس لئے غزل کہنی موقوف کردی۔ خیر۔ ان کی زبان کب رہ سکتی تھی۔ اس کے علاوہ اس نئے چمن کی ہوا کھانے کو اپنا بھی جی چاہتا تھا۔ انھوں نے وہ نامہ لکھنا شروع کیا۔ اس نے ایسا طول کھینچا کہ تخمیناً ۳۰۰ شعر اس کے ہوگئے۔ اس عرصہ میں تین تختیاں اس سے سیاہ

ہوئی تھیں۔ مگر ادھر رمضان ہو چکا۔ بادشاہ کی غزلیں پھر شروع ہوگئیں۔ مثنوی وہیں رہ گئی۔ بیچ میں کبھی کبھی پھر بھی طبیعت میں اُمنگ اُٹھی۔ مگر کبھی ایک دن کبھی دو دن ۲۰۔۲۵ شعر ہوئے پھر رہ گئے۔ میں نے جب ہوش سنبھالا اور ہر وقت پاس رہنے لگا۔ تو کئی دفعہ اس کے مختلف ذکر کرتے۔ اور جابجا کے شعر پڑھا کرتے تھے۔ ایک دن وہ تختیاں اور کاغذی مسودے نکلوائے۔ بہت کم تھا جو کچھ کہ پڑھا جاتا تھا۔ آخر فرصت کے وقت نکال نکال کر اُن سے پڑھوا تا گیا۔ اور آپ لکھتا گیا۔ کُل ۵۰۰ شعر سے زیادہ ہوئے۔ اگرچہ نامہ ناتمام تھا مگر ایک ایک مصرع سونے کے پانی سے لکھنے کے لائق تھا۔ میرے صاف کئے ہوئے مسودے بھی انہی متفرق غزلوں میں تھے۔ جو میں خلیفہ صاحب کے پاس جاکر صاف کیا کرتا تھا۔ چنانچہ ان کے ساتھ وہ بھی گئے۔ اس کا نام فامۂ جانسوز تھا۔ اوّل حمد و نعت تھی۔ پھر ساقی نامہ۔ پھر القاب معشوق۔ اسی میں اس کا سراپا۔ اس کے بعد یاد ایام۔ اس میں چاروں موسموں کی بہار۔ مگر اس کے معنوں کی نزاکت لفظوں کی لطافت۔ ترکیبوں کی خوبیاں۔ اندازوں کی شوخیاں کیا کہوں! سامری کے جادو۔ اور جادو کے طلسم اُس کے آگے دھواں ہو کر اُڑے جاتے تھے +

تاریخیں

کئی مخمّس تھے۔ کئی رُباعیاں تھیں۔ صدہا تاریخیں تھیں۔ مگر تاریخوں کی کمائی بادشاہ کے حصّہ میں آئی۔ کیونکہ بہت بلکہ کُل تاریخیں اُنہی کی فرمائش سے ہوئیں۔ اور اُنہی کے نام سے ہوئیں۔

مرثیے سلام

مرثیہ سلام کہنے کا اُنھیں موقع نہیں ملا۔ بادشاہ کا قاعدہ تھا کہ شاہ عالم اور اکبر شاہ کی طرح محرّم میں کم سے کم ایک سلام ضرور کہتے تھے۔ شیخ مرحوم بھی اسی کو اپنی سعادت اور عبادت سمجھتے تھے۔ ہزاروں گیت۔ ٹپّے ٹھمریاں۔ ہولیاں کہیں۔ وہ بادشاہ کے نام سے عالم میں مشہور ہیں۔ اور ان باتوں میں وہ اپنی شہرت چاہتے بھی نہ تھے۔ میرے نزدیک اُن کے اور اُن کے دیکھنے والوں کے لئے بڑے فخر کی بات یہ ہے کہ خدا نے کمال شاعری اور ایسا

اعلیٰ درجہ قادر الکلامی کا انھیں دیا۔ اور ہزاروں آدمیوں سے انھیں ناراضی یا رنج پہنچا ہوگا۔ مگر انھوں نے تمام عمر میں ایک شعر بھی ہجو میں نہیں کہا۔ خدا ہر شخص کو اُس کی نیت کا پھل دیتا ہے۔ اُس کی شان دیکھو کہ ۶۰ برس کی عمر پائی۔ مگر خدا نے اُن کی ہجو بھی کسی کے مُنہ سے نہ نکلوائی +

اکثر نئے ایجاد و اختراع ان کے ارادے میں تھے۔ اور بعض بعض ارادے شروع ہوئے۔ مگر ناتمام رہے۔ کیونکہ بادشاہ کی فرمائشیں دم لینے کی مُہلت نہ دیتی تھیں۔ اور تماشا یہ کہ بادشاہ بھی ایجاد کا بادشاہ تھا۔ اتنا تھا کہ بات نکالتا مگر اُسے نبھا نہ سکتا تھا۔ اس کا کیا ہوا۔ اُنھیں سنبھالنا پڑتا تھا +

وہ اپنی غزل بادشاہ کو سُنانے نہ تھے۔ اگر کسی طرح اس تک پہنچ جاتی۔ تو وہ اسی غزل پر خود غزل کہتا تھا اب اگر نئی غزل کہہ کر دیں اور وہ اپنی غزل سے پست ہو تو بادشاہ بھی بچہ نہ تھا۔ ۷۰ برس کا سخن فہم تھا۔ اگر اس سے چُست کہیں تو اپنے کہے کو آپ مٹانا بھی کچھ آسان کام نہیں۔ ناچار اپنی غزل میں ان کا تخلص ڈال کر دے دیتے تھے۔ بادشاہ کو بڑا خیال رہتا تھا۔ کہ وہ اپنی کسی چیز پر زور طبع نہ خرچ کریں۔ جب اُن کے شوق طبع کو کسی طرف متوجہ دیکھتا۔ تو برابر غزلوں کا تار باندھ دیتا کہ جو کچھ جوش طبع ہو اُدھر ہی آجائے +

عموماً انداز کلام

کلام کو دیکھ کر معلوم ہوتا ہے کہ مضامین کے ستارے آسمان سے اُتارے ہیں۔ مگر اپنے لفظوں کی ترکیب سے انھیں ایسی شان و شکوہ کی کرسیوں پر بٹھایا ہے کہ پہلے سے بھی اونچے نظر آتے ہیں۔ اُنھیں قادر الکلامی کے دربار سے ملکِ سخن پر حکومت مل گئی ہے کہ ہر قسم کے خیال کو جس رنگ سے چاہتے ہیں کہہ جاتے ہیں۔ کبھی تشبیہ کے رنگ سے سجا کر استعارہ کی بُو سے بساتے ہیں۔ کبھی

بالکل سادے لباس میں جلوہ دکھاتے ہیں۔ مگر ایسا کچھ کہہ جاتے ہیں کہ دل میں نشتر سا کھٹک جاتا ہے۔ اور مُنہ سے کبھی واہ نکلتی ہے اور کبھی آہ نکلتی ہے معلوم ہوتا ہے کہ ان کے ہونٹوں میں شُستہ اور برجستہ لفظوں کے خزانے بھرے ہیں۔ اور ترکیب الفاظ کے ہزاروں رنگ ہیں۔ مگر جسے جہاں سجتا دیکھتے ہیں وہ گویا وہیں کے لئے ہوتا ہے۔ وہ طبیب کامل کی طرح ہر مضمون کی طبیعت کو پہچانتے تھے۔ کہ کون سا ہے کہ سادگی میں رنگ دے جائے گا۔ اور کون سا رنگینی میں۔ کامل مصوّر کی تیزیٔ قلم کو اس کے رنگوں کی شوخی روشن کرتی ہے۔ اسی طرح ان کے مضمون کی باریکی کو اُن کے الفاظ کی لطافت جلوہ دیتی ہے۔ انھیں اس بات کا کمال تھا کہ باریک سے باریک مطلب اور پیچیدہ سے پیچیدہ مضمون کو اس صفائی سے ادا کر جاتے تھے۔ گویا ایک شربت کا گھونٹ تھا کہ کانوں کے رستہ سے پلا دیا۔ اسی وصف نے نادانوں کو غلطی میں ڈالا ہے جو کہتے ہیں کہ ان کے ہاں عالی مضامین نہیں بلکہ سیدھی باتیں اور صاف صاف خیالات ہوتے ہیں۔ وہ نہیں جانتے کہ ان ہونٹوں میں خدا نے عجب تاثیر دی تھی۔ کہ جو لفظ ان سے ترکیب پاکر نکلے ہیں۔ خود بخود زبانوں پر ڈھلکتے آتے ہیں جیسے ریشم پر موتی۔ خدا جانے زبان نے کسی آئینہ کی صفائی اُڑائی ہے یا انھوں نے الفاظ کے نگینوں پر کیونکر جلا کی ہے۔ جس سے کلام میں یہ بات پیدا ہوگئی ہے۔ حقیقت میں اس کا سبب یہ ہے کہ قدرت کلام اُن کے ہر ایک نازک اور باریک خیال کو محاورہ اور ضرب المثل میں اس طرح ترکیب دیتی ہے جیسے آئینہ گر شیشہ کو قلعی سے ترکیب دے کر آئینہ بناتا ہے۔ اسی واسطے صاف ہر ایک شخص کی سمجھ میں آتا ہے اور دل پر اثر بھی کرتا ہے +

ان کے کلام میں یہ بھی خصوصیت ہے کہ شعر کا کوئی لفظ بھول جائے تو جب تک وہی لفظ اُس کی جگہ نہ رکھا جائے شعر مزا نہیں دیتا۔ چنانچہ لکھنؤ میں

میر انیس مرحوم کے سامنے سلسلہ تقریر میں ایک دن میں نے ان کا مطلع پڑھا ؎

کوئی آوارہ تیرے نیچے اے گردوں ٹھیریگا ولیکن تو بھی گر چاہے کہ میں ٹھیروں ٹھیرے گا

اُنھوں نے پوچھا کہ یہ شعر کس کا ہے؟ میں نے کہا کہ شیخ مرحوم کا ہے۔ دو چار باتیں کر کے انھوں نے پھر فرمایا کہ ذرا وہ شعر پھر پڑھئے گا۔ میں نے پھر پڑھا۔ اُنھوں نے دوبارہ خود اپنی زبان سے پڑھا پھر باتیں ہونے لگیں۔ چلتے ہوئے پھر کہا کہ ذرا وہ شعر پڑھتے جایئے گا۔ اور ساتھ اس کے یہ بھی کہا کہ صاحب کمال کی یہ بات ہے کہ جو لفظ جس مقام پر اُس نے بٹھا دیا ہے اُسی طرح پڑھا جاوے تو ٹھیک ہوتا ہے نہیں تو شعر رُتبہ سے گر جاتا ہے +

اُن کا مضمون جس طرح دل کو بھلا معلوم ہوتا ہے۔ اُسی طرح پڑھنے میں زبان کو مزا آتا ہے۔ ان کے لفظوں کی ترکیب میں ایک خدا داد چُستی ہے جو کلام میں زور پیدا کرتی ہے۔ وہ زور فقط ان کے دل کا جوش ہی نہیں ظاہر کرتا۔ بلکہ سُننے والے کے دل میں ایک خروش پیدا کرتا ہے۔ اور یہی قدرتی رنگ ہے جو ان کے کلام پر سودا کی تقلید کا پرتو ڈالتا ہے +

ان کے دیوان کو جب نظرِ غور سے دیکھا جاتا ہے تو اُس سے رنگا رنگ زمزمے اور بوقلموں آوازیں آتی ہیں۔ ہر رنگ کے انداز موجود ہیں۔ یہی سبب ہے کہ اُن کے دیکھنے سے دل اُکتا نہیں جاتا۔ وہ لفظ لفظ کی نبض پہچانتے تھے۔ اور مضامین کے طبیب تھے۔ جس طرح برجستہ بیٹھتا دیکھتے تھے۔ اُسی طرح باندھ دیتے تھے۔ خیال بندی ہو یا عاشقانہ یا تصوف۔ ان کے سینہ میں جو دل تھا۔ گویا ایک آدمی کا دل نہ تھا۔ ہزاروں آدمیوں کے دل تھے۔ اس واسطے کلام اُن کا مقناطیس کی طرح قبولِ عام کو کھینچتا ہے۔ دل دل سے خیالات باندھتے۔ اور اس طرح باندھتے تھے گویا اپنے ہی دل پر گُزری ہے +

اعتراض

اُن کے کلام پر لوگ اعتراض بھی کرتے رہے ہیں۔ چنانچہ ایک پُرانی غزل کا شعر ہے:۔

سر بوقتِ ذبح اپنا اُس کے زیرِ پائے ہے ۔ یہ نصیب! اللہ اکبر لوٹنے کی جائے ہے

لوگوں نے کہا کہ بے اضافی یا صنعتی ترکیب کی اس میں یٔ زیادہ کرنی جائز نہیں۔ مگر یہ اعتراض ان کی کم نظری کے سبب سے تھے +

ریختے کہ اکنوں گرفتہ است پائے ۔ بہ نیروی مردے بر آید ز جائے

اے زدہ برتر از گماں دامنِ کبریائے را ۔ دست تو کجا رسد عقل شکستہ پائے را

ایک پرانی غزل شاہ نصیر کے مشاعرہ میں طرح ہوئی تھی:۔

دانہ خرمن ہے ہمیں قطرہ ہے دریا ہم کو ۔ آئے ہے جُز میں نظر کُل کا تماشا ہم کو

اس پر اعتراض ہوا کہ اصل لفظ جزو مع واد کے ہے۔ فقط جز صحیح نہیں ہے۔ اس کا بھی وہی حال تھا۔ امیر خسرو فرماتے ہیں:۔

ہرچہ کند جُزو در کُل اثر ۔ کُلّی و جزئیش بود زاں خبر

اور میر تقی فرماتے ہیں:۔

جز مرتبہ کُل کو حاصل کرے ہے آخر ۔ ایک قطرہ نہ دیکھا جو۔ دریا نہ ہوا ہوگا

ایک دن میں ادج[1] سے ملا۔ اُستاد مرحوم کے مطلع کا ذکر آیا:۔

مقابل اُس رُخِ روشن کے شمع گر ہو جائے ۔ صبا وہ ڈھول لگائے کہ بس سحر ہو جائے

کئی دن کے بعد جو رستہ میں ملے تو دیکھتے ہی کھڑے ہو گئے اور کہا:۔

یاں جو برگِ گُلِ خورشید کا کھڑکا ہو جائے ۔ ڈھول دستار فلک پر لگے تڑکا ہو جائے

اور کہا کہ دیکھا! محاورہ یوں باندھا کرتے ہیں۔ میں سمجھ گیا کہ یہ طنز کرتے ہیں کہ سحر ہو جائے جو اُستاد نے باندھا ہے یہ جائز نہیں مگر تجاہل کر کے میں نے کہا کہ ہاں حقیقت میں پات کے کھڑکے کا آپ نے خوب ترجمہ کیا۔ اور استعارہ میں لا کر! میری طرف دیکھ کر ہنسے

---

[1] ادج کا حال دیکھو صفحہ ۵۱۴ +

اور کہا کہ بھئی واہ آخر شاگرد تھے۔ ہماری بات ہی بگاڑ دی +

دوسرے دن اُستاد مرحوم کی خدمت میں گیا اور یہ ماجرا بیان کیا۔ فرمایا کہ شمع کو صبح ہوتے ہاتھ مار کر بُجھا دیتے ہیں۔ میرا مطلب یہ ہے کہ شمع اگر مقابلہ کرے تو اس گستاخی کی سزا میں صبا اُسے ایسی دُھول مارے کہ وہ بُجھ جائے۔ اور ایسی بُجھے کہ وہی اُس کے حق میں سحر ہو جائے۔ یعنی روشنی نصیب نہ ہو۔ کبھی دوسری تیسری رات ہوئی ہوئی نہ ہوئی۔ وہ اور بات ہے۔ اب یہ ایک حُسن اتفاق ہے کہ ہماری زبان میں اس کے مقابل ایک محاورہ بھی موجود ہے۔ کہ ایسی دَھول تھی کہ تڑکا ہو گیا خیر اگر ہوا تو کچھ لطف ہی پیدا ہوا۔ بلکہ طرز بیان میں ایک وسعت کا قدم آگے بڑھا۔ قباحت کیا ہوئی۔ اور یہ بھی دیکھو۔ وہ محاورہ تھا تو کیا تھا۔ بتذل۔ عامیانہ اب ثقہ متین اور شریفانہ ہے +

آزاد۔ ایک شعر ناسخ کا بھی اسی ترکیب کا ہے:۔

جو ستمگر ہیں کبھی وہ پھولتے پھلتے نہیں ۔ سبز ہوتے کھیت دیکھا ہے کہیں شمشیر کا

محاورہ میں تلوار کا کھیت کہتے ہیں۔ شمشیر کا کھیت نہیں ہے +

اُن کی ایک غزل کا شعر ہے:۔

مُنہ اُٹھائے ہوئے جاتا ہے کہاں تو کہ تجھے ۔ ہے ترا نقش قدم چشم نمائی کرتا

نواب کلب حسین خاں نادر تلخیص معلّیٰ میں فرماتے ہیں۔ (تجھے) دوسرے مصرع کا حق ہے پہلے مصرع میں نہیں لانا چاہئے۔ اس کا جواب مجھے نہیں آتا +

طبیعت حاضر کا کمال اور جودت کمال

ایک دفعہ طبع موزوں نے نیا گُل کھلایا۔ یہ وقت وہ تھا کہ اصلاح بند ہو گئی تھی مگر آمد و رفت جاری تھی۔ شاہ صاحب کو جا کر غزل سُنائی۔ انھوں نے تعریف کی اور کہا کہ مشاعرہ میں ضرور پڑھنا۔ اتفاقاً مطلع کے سرے ہی پر بسبب حقیت کی کمی تھی۔ جب وہاں غزل پڑھی تو شاہ صاحب نے آواز دی۔ کہ بھئی میاں ابراہیم واہ مطلع تو خوب کہا۔ شیخ مرحوم فرماتے تھے کہ اسی وقت مجھے کھٹکا ہوا اور ساتھ ہی

لفظ بھی سوجھا۔ دوبارہ یوں نے پڑھا:۔

(جس) ہاتھ میں خاتم لعل کی ہے گر اُسمیں زُلف سرکش ہو   پھر زُلف بنے وہ دستِ موسیٰ جسمیں انگر آتش ہو

اس پر اس قدر حیرت ہوئی کہ انھوں نے جانا شاید پہلے عمداً یہ لفظ چھوڑ دیا تھا۔ مگر اعتراض ہوا کہ یہ بحر ناجائز ہے۔ کسی اُستاد نے اس پر غزل نہیں کہی۔ شیخ مرحوم نے جواب دیا کہ ۱۹ بحریں آسمان سے نہیں نازل ہوئیں۔ طبائع موزوں نے وقت بوقت گُل کھلائے ہیں۔ یہ تقریر مقبول نہ ہوئی۔ مگر پھر منیر مرحوم نے اس پر غزل کہی۔

ایک دفعہ شیخ مرحوم نے مشاعرہ میں غزل پڑھی۔ مطلع تھا:۔

نرگس کے پھول بھیجے ہیں بٹوے میں ڈال کر   ایما یہ ہے کہ بھیج دے آنکھیں نکال کر

شاہ صاحب نے کہا کہ میاں ابراہیم پھول بٹوے میں نہیں ہوتے۔ یہ کہو۔ ع

نرگس کے پھول بھیجے ہیں دونے میں ڈال کر

اُنھوں نے کہا دونے میں رکھنا ہوتا ہے۔ ڈالنا نہیں ہوتا۔ یوں کہئے کہ:۔

بادام دو جو بھیجے ہیں بٹوے میں ڈال کر   ایما یہ ہے کہ بھیج دے آنکھیں نکال کر

نقل۔ شاہ نصیر مرحوم کے ہاں سال بسال ایک عرس ہوا کرتا تھا۔ اس میں بعد فاتحہ کے کھچڑی کھلایا کرتے تھے۔ حسب معمول اُستاد بھی گئے۔ فاتحہ کے بعد سب کھانا کھانے بیٹھے۔ شاہ صاحب ایک ہاتھ میں چمچہ دوسرے میں ایک بادیہ لئے ہوئے آئے۔ اُس میں دہی تھا کہ خاص خاص اشخاص کے سامنے ڈالتے آتے تھے۔ ان کے سامنے آکر کھڑے ہوئے۔ اور چمچہ بھرا۔ انھیں ریزش ہو رہی تھی۔ پرہیز کے خیال سے پوچھا کہ یہ کیا ہے؟ شاہ صاحب نے کہا۔ سنکھیا ہے سنکھیا۔ دیکھو کھاؤ گے تو مرجاؤ گے۔ استاد نے ہنس دیا اور کہا کہ۔ ع

بھلا تم زہر دے دیکھو اثر ہو دے تو میں جانوں

اگرچہ یہ مصرع قدیمی میاں مجذوب[1] کا ہے۔ مگر چونکہ کھانے کا موقع تھا اس لئے

[1] دیکھو صفحہ ۱۸۰

دہلی کالج کے مشاعرے

سب کو بہت مزا دیا +

جن دنوں شاہ صاحب سے معرکے ہو رہے تھے۔ منشی فیض پارسا دہلی کالج میں مدرّس حساب تھے۔ اور اُن دنوں جوانی کے عالم میں شاعری کے جوش و خروش میں تھے۔ اُنھوں نے مدرسہ میں بڑی دھوم دھام سے مشاعرہ قائم کیا اور اُسے انشائے اُردو کی ترقی کا جزو اعظم ٹھیرا کر صاحبِ پرنسپل سے مدد لی۔ اُن دنوں مدرسہ اجمیری دروازہ کے باہر تھا۔ شہر کے دروازے ۹ بجے بند ہو جاتے تھے۔ گڈھ کپتان سے اجازت لی کہ مشاعرہ کے دن ڈیڑھ بجے تک اجمیری دروازہ کھلا رہا کرے۔ غرض مشاعرہ مذکور اِس شان و شکوہ سے جاری ہوا کہ پھر کوئی ایسا مشاعرہ دلّی میں نہیں ہوا۔ شہر کے رؤسا اور تمام نامی شاعر موجود ہوتے تھے۔ مگر سب کی نگاہیں شاہ صاحب اور شیخ صاحب کی طرف ہوتی تھیں۔ چنانچہ ایک مشاعرہ میں شاہ صاحب نے غزل قفس کی تیلیاں خس کی تیلیاں پڑھی۔ دوسرے مشاعرہ میں یہی طرح ہو گئی۔ سب غزلیں کہہ کر لائے۔ شیخ مرحوم نے دو غزلہ لکھا اور اُس پر کچھ تکرار ہوئی۔ اس پر جوش میں آکر فرمایا کہ برس دن تک جو مشاعرہ ہو اُس میں علاوہ غزل طرحی کے ایک غزل اس زمین میں ہوا کرے۔ چنانچہ دو مشاعروں میں ایسا ہوا۔ ایسے معرکوں میں عوام الناس بھی شامل ہوتے ہیں۔ تیسرے جلسہ میں جب اُنھوں نے غزل پڑھی تو بعض شخصوں نے کُچھ کُچھ چوٹیں کیں جنھیں شیخ صاحب کے طرفدار سمجھے کہ شاہ صاحب کے اشارے سے ہوئیں۔ زیادہ تر یہ کہ شاہ وجیہ الدین منیر یعنی شاہ صاحب کے صاحبزادے نے یہ شعر بھی پڑھ دیا[1] +

[1] بعض بزرگوں سے سُنا کہ لالہ گھنشام داس عاصی نے پڑھا تھا وہ بھی شاہ نصیر کے شاگرد تھے۔ اور ان دنوں میں نوجوان لڑکے تھے۔ میں نے انھیں دلّی میں حکیم سکھانند مرحوم کے مکان پر دیکھا تھا بڈھے ہو گئے تھے مگر طبیعت میں جوانوں سے زیادہ شوخی تھی اُستادوں کی باتیں اس طرح سناتے تھے جیسے کوئی کہانیاں کہتا ہے۔

گرچہ قندیل سخن کو منڈھ لیا تو کیا ہوا   ڈھانچ ہیں تو ہیں وہی اگلے برس کی تیلیاں

اس پر تکرار زیادہ ہوئی اور مشاعرہ بند کر دیا گیا۔ کہ مبادا زیادہ بے لطفی ہو جائے +

اُنہی دنوں میں ایک دفعہ میر محمد خاں اعظم الدولہ نے کہ سُرور تخلص کرتے تھے اور پُرانے شاعر تھے۔ ایک تذکرہ شعرائے اردو کا لکھا۔ اُستاد مرحوم اتفاقاً ان کے بالاخانہ کے سامنے سے گزرے۔ اُنھوں نے بلایا۔ اور مزاج پُرسی کے بعد کہا۔ کہ ہمارا تذکرہ تمام ہو گیا۔ اُس کی تاریخ تو کہہ دو۔ انھوں نے کہا کہ اچھا فکر کروں گا۔ اُنھوں نے کہا کہ فکر کی سہی نہیں۔ ابھی کہہ دو۔ فرماتے تھے کہ خدا کی قدرت اُن کے خطاب اور تخلص کے لحاظ سے خیال گزرا کہ دریائے اعظم۔ دل میں حساب کیا تو عدد برابر تھے میں نے جھٹ کہہ دیا۔ حاضرین جلسہ حیران رہ گئے +

تاریخ دریائے اعظم

شہیدی مرحوم دلّی میں آئے۔ اُمرائے شہر سے ملاقاتیں ہوئیں۔ نواب[1] عبداللہ خاں صدر الصدور شعر کے عاشق تھے۔ اُن سے ایک جلسہ میں میاں شہیدی نے کہا کہ آج ہندوستان میں تین شیخ ہیں۔ لکھنؤ میں ناسخ دلّی میں ذوق دکن میں حفیظ اُنھوں نے کہا کہ ناسخ کی اوّلیت کا سبب؟ میاں شہیدی نے چمن کی شاخ۔ یاسمن کی شاخ کی غزل پڑھی۔ خان موصوف نے استاد مرحوم سے کہا۔ اُنھوں نے اس غزل پر ایک بڑی سیر قوافی غزل کہی۔ اور یہ بھی کہا کہ اب جو کوئی اس طرح میں غزل کہے گا۔ ہر ایک قافیہ کو جس جس پہلو سے میں نے باندھ دیا ہے۔ اُس سے الگ کر کے نہ باندھ سکے گا۔ نواب عبداللہ خاں کی فرمائش سے غزل اور اُنہی کی وساطت سے یہ گفتگوئیں ہوئی تھیں۔ اُنھوں نے تجویز کی کہ مشاعرہ میں بر سرِ معرکہ غزلیں پڑھی جائیں۔ مگر شہیدی مرحوم بے اطلاع چلے گئے۔ نواب نے پیچھے آدمی دوڑایا۔ اُس نے بریلی میں جا پکڑا۔ مگر وہ تشریف نہ لائے۔ غزل مذکور انشاء اللہ شائقان سخن کے ملاحظہ سے گزرے گی۔ خدا دیوان پورا کرے +

[1] نواب اصغر علی خاں اصغر شاگرد مومن جنھوں نے پھر نسیم تخلص کیا۔ یہ ان کے والد تھے +

ایک دن حسب معمول بادشاہ کے پاس گئے۔ اُن دنوں میں مرزا شاہ رُخ ایک بیٹے بادشاہ کے تھے۔ کہ انھوں نے بہت سی خدمتیں کاروبار کی قبضہ میں کر رکھی تھیں۔ اور اکثر حاضر رہا کرتے تھے۔ وہ اس وقت موجود تھے۔ انھیں دیکھتے ہی بولے کہ لیجئے وہ بھی آ ہی پہنچے۔ معلوم ہوا کہ بادشاہ کی ایک غزل ہے۔ اسکے ہر شعر میں ایک ایک مصرع پیوند کر کے مثلّث کرنا چاہتے ہیں۔ مگر ایجاد یہ ہے کہ مصرع جو لگے بموجب رواج قدیم کے اوپر نہ لگے۔ بلکہ ہر شعر کے نیچے ایک ایک مصرع لگے۔ کہ جس سے گویا ہر بند میں ایک ایک مطلع پیدا ہوتا جائے۔ غرض بادشاہ نے غزل اُنھیں دی۔ کہ اُستاد اس پر مصرع لگا دو۔ انھوں نے قلم اُٹھا کر ایک شعر پر نظر کی۔ اور فوراً مصرع لگا دیا۔ اسی طرح دوسرے میں تیسرے میں مسلسل غزل تمام کر کے جتنی دیر میں نظر ڈالی بے تأمل ساتھ ہی مصرع لکھتے گئے۔ اور اُسی وقت پڑھ کر سُنائی۔ سب حیران ہو گئے۔ بلکہ مرزا شاہ رُخ نے کہا کہ اُستاد آپ گھر سے کہہ کر لائے تھے۔ بادشاہ بولے۔ بھلا اُنھیں کیا خبر تھی کہ یہاں کیا ہو رہا ہے۔ خصوصاً جس حال میں ایجاد بھی ایسا نیا ہو۔ دیکھو صفحہ ۴۸۸۔

نقل ۔ برسات کا موسم تھا۔ بادشاہ بموجب معمول کے قطب صاحب گئے ہوئے تھے۔ مرزا فخرو بادشاہ کے صاحبزادے (کہ اخیر کو ولیعہد بھی ہو گئے تھے) ایک دن وہاں چاندنی رات میں تلاؤ کے کنارے چاندنی کی بہار دیکھ رہے تھے۔ اُستاد مرحوم پاس کھڑے تھے۔ اُنھیں بھی شعر کا شوق تھا۔ اور استاد کے شاگرد تھے۔ اُن کی زبان سے یہ مصرع نکلا۔ ع چاندنی دیکھے اگر وہ مہ جبیں تالاب پر۔ ان سے کہا کہ اُستاد اس پر مصرع لگائیے گا۔ انھوں نے فوراً کہا۔ ع تابِ عکسِ رُخ سے پانی پھیر دے مہتاب پر۔ نواب حامد علی خاں کے خسر نواب فضل علی خاں سے اور شیخ مرحوم سے سابقہ محبت بھی تھا۔ اس لئے نواب حامد علی خاں مرحوم بھی محبت و اخلاق سے

ملا کرتے تھے۔ ایک دن دیوان خاص میں کھڑے ہوئے شعر سنتے سناتے تھے۔ نواب موصوف نے خواجہ وزیر کا مطلع پڑھا:۔

جانور جو ترے صدقہ میں رہا ہوتا ہے   اے شہِ حسن وہ چھٹتے ہی ہما ہوتا ہے

اُستاد مرحوم نے کہا کہ صدقہ میں اکثر کوّا چھڑواتے ہیں۔ اس لیے زیادہ تر مناسب ہے:۔

زاغ بھی گر ترے صدقہ میں رہا ہوتا ہے   اے شہِ حسن وہ چھٹتے ہی ہما ہوتا ہے[1]

توارُد

ایک دفعہ قلعہ میں مشاعرہ تھا۔ حکیم آغاجان عیش[2] کہ کہن سال مشاق اور نہایت زندہ دل شاعر تھے۔ اُستاد کے قریب ہی بیٹھے تھے۔ زمین غزل تھی یاد دے۔ بہار دے۔ روزگار دے۔ حکیم آغاجان عیش نے ایک شعر اپنی غزل میں پڑھا:۔

اے شمع صبح ہوتی ہے روتی ہے کس لئے   تھوڑی سی رہ گئی ہے اُسے بھی گذار دے

ان کے ہاں بھی اسی مضمون کا ایک شعر تھا۔ باوجود اس رتبہ کے لحاظ اور پاس مروت

[1] ایسی بہت اصلاحیں روز ہو جاتی تھیں۔ لکھی جائیں تو ایک کتاب بن جائے۔

[2] حکیم آغاجان صاحب عیش۔ بادشاہی اور خاندانی طبیب تھے۔ زیور علم اور لباس کمال سے آراستہ۔ صاحب اخلاق۔ خوش مزاج۔ شیریں کلام۔ شگفتہ صورت۔ جب دیکھو یہی معلوم ہوتا تھا کہ مسکرا رہے ہیں۔ ساتھ اس کے شعر کا عشق تھا۔ طبیعت ایسی ظریف و لطیف۔ اور لطیفہ سنج پائی تھی۔ کہ جسے شاعری کی جان کہتے ہیں۔ غزل صفائی کلام۔ شوخی مضامین اور حُسن محاورہ سے پھولوں کی چھڑی معلوم ہوتی تھی۔ اور زبان گویا ظرائف و لطائف کی پھلجھڑی۔ میں نے دو دفعہ اُستاد کے ساتھ مشاعرہ میں دیکھا تھا۔ ہائے افسوس اس وقت تصویر آنکھوں میں پھر گئی۔ میانہ قد۔ خوش اندام۔ سر پر ایک ایک انگل بال سفید۔ ایسی ہی ڈاڑھی۔ اس گوری سُرخ و سفید رنگت پر کیا بھلی معلوم ہوتی تھی۔ گلے میں ململ کا کرتہ جیسے چنبیلی کا ڈھیر پڑا ہنس رہا ہے۔ میں ان دنوں دہلی کالج میں پڑھتا تھا۔ اُستاد مرحوم کے بعد ذوق سخن اور ان کے کمال کی کشش نے کھینچ کر اُن کی خدمت میں پہنچایا۔ اب ان صورتوں کو آنکھیں ترستی ہیں۔ اور نہیں پاتیں۔ ۱۸۵۷ء کے غدر کے چند روز کے بعد دنیا سے انتقال کیا۔ خدا مغفرت کرے +

حد سے زیادہ تھا۔ میرے والد مرحوم پہلو میں بیٹھے تھے۔ ان سے کہنے لگے کہ مضمون لڑ گیا۔ اب میں وہ شعر نہ پڑھوں؟ اُنھوں نے کہا کیوں نہ پڑھو۔ نہ پہلے سے اُنھوں نے آپ کا مضمون سُنا تھا۔ نہ آپ نے اُن کا۔ ضرور پڑھنا چاہیئے۔ اس سے بھی طبیعتوں کا اندازہ معلوم ہوتا ہے کہ ایک منزل پر دونوں فکر پہنچے۔ مگر کس کس انداز سے پہنچے چنانچہ حکیم صاحب مرحوم کے بعد ہی اُن کے آگے شمع آئی۔ اُنھوں نے پڑھا ؎

اے شمع تیری عمر طبیعی ہے ایک رات ۔۔۔ رو کر گذار یا اُسے ہنس کر گذار دے

ایک دن معمولی دربار تھا۔ اُستاد بھی حاضر تھے۔ ایک مرشد زادے تشریف لائے۔ وہ شاید کسی اور مرشد زادی کی یا بیگمات میں سے کسی بیگم صاحب کی طرف سے کچھ عرض

(بقیہ حاشیہ) ہُدہُد الشعرا۔ ایک شخص عبدالرحمن نام پورب کی طرف سے دلی میں آئے اور حکیم صاحب کے پاس ایک مکان میں ایک مکتب تھا۔ اُس میں لڑکے پڑھانے لگے۔ حکیم صاحب کے خویش و اقارب میں سے بعض لڑکے وہاں پڑھتے تھے۔ ان میں ایک لڑکا سکندر نامہ پڑھا کرتا تھا۔ حکیم صاحب کا معمول تھا کہ آٹھویں ساتویں دن رات کو ہر ایک لڑکے کا سبق سُنا کرتے تھے۔ سکندر نامہ کا سبق جو سُنا تو عجائب و غرائب مضامین سُننے میں آئے۔ فرمایا کہ اپنے مولوی صاحب کو کسی وقت ہمارے پاس بھیجنا۔ وہ دوسرے ہی دن تشریف لائے۔ حکیم صاحب آخر حکیم تھے۔ ملاقات ہوئی تو اول قیافہ سے پھر گفتگو سے نبض دیکھی۔ معلوم ہوا کہ شُد بُد سے زیادہ مادّہ نہیں۔ مگر یہ طرفہ معجون انسان تھوڑی سی ترکیب میں رونق محفل ہو سکتا ہے۔ پوچھا کہ آپ کچھ شعر کا بھی شوق رکھتے ہیں؟ مولوی صاحب نے کہا کہ کیا مشکل بات ہے! ہو سکتا ہے۔ حکیم صاحب نے کہا کہ ایک جگہ مشاعرہ ہوتا ہے۔ ۸۔۹ دن باقی ہیں۔ یہ طرح کا مصرع ہے۔ آپ بھی غزل کہیئے تو مشاعرہ میں لے چلیں۔ وہ مشاعرہ کو بھی نہ جانتے تھے۔ اُس کی صورت بیان کی۔ مولوی صاحب نے کہا کہ اس عرصہ میں بہت کچھ ہو سکتا ہے غزل کہہ کر لائے تو سبحان اللہ اور مولوی صاحب ہی تخلص رکھا۔ حکیم صاحب کی طبع ظریف کے مشغلہ کو ایسا اُلّو خدا دے۔ بہت تعریف کی۔ غزل کو جا بجا اصلاحیں دے کر خوب نون مرچ چھڑکا۔ مولوی صاحب بہت خوش ہوئے۔ یہ دیکھ کر حکیم صاحب کو اطمینان ہوا۔ مولوی صاحب کی

لے کر آئے تھے۔ انھوں نے آہستہ آہستہ بادشاہ سے کچھ کہا اور رخصت ہوئے۔ حکیم احسن اللہ خاں بھی موجود تھے۔ انھوں نے عرض کی۔ صاحب عالم اِس قدر جلدی؟ یہ آنا کیا تھا اور تشریف لے جانا کیا تھا۔ صاحب عالم کی زبان سے اُس وقت نکلا کہ اپنی خوشی نہ آئے نہ اپنی خوشی چلے۔ بادشاہ نے اُستاد کی طرف دیکھ کر فرمایا کہ اُستاد! دیکھنا کیا صاف مصرع ہوا ہے۔ اُستاد نے بے توقف عرض کی کہ حضور ؎

لائی حیات آئے قضا لے چلی چلے ‏ ‏ ‏ اپنی خوشی نہ آئے نہ اپنی خوشی چلے

یہ اواخر عمر کی غزل ہے۔ اس کے دو تین برس بعد انتقال ہو گیا +

(بقیہ حاشیہ) بچی ڈاڑھی۔ اُس پر لمبی اور نکیلی۔ سر مُنڈا ہوا۔ اُس پر نکو عمامہ۔ فقط کھٹ بڑھی نظر آتے تھے۔ حکیم صاحب نے کہا کہ شعراء کو تخلص بھی ایسا چاہئے کہ ظریفانہ و لطیفانہ ہو۔ اور خوشنما ہو۔ اور شان و شکوہ کی عظمت سے تاجدار ہو۔ بہتر ہے کہ آپ ہُدہُد تخلص کریں۔ حضرت سلیمانؑ کا راز دار تھا۔ اور قاصد خجستہ گام تھا۔ وغیرہ وغیرہ چنیں و چناں۔ مولوی صاحب نے بہت خوشی سے منظور فرمایا +

مشاعرہ کے دن جلسے میں گئے۔ جب اُن کے سامنے شمع آئی تو حکیم صاحب نے ان کی تعریف میں چند فقرہ مناسب وقت فرمائے۔ سب متوجہ ہوئے۔ جب انھوں نے غزل پڑھی تو تمسخر نے تالیاں بجائیں۔ ظرافت نے ٹوپیاں اُچھالیں اور قہقہوں نے اتنا شور و غُل مچایا کہ کسی کی غزل پر اتنی تعریف کا جوش نہ ہوا تھا۔ مولوی صاحب بہت خوش ہوئے۔ چند روز اس طرح مشاعرہ کو اور بعض امرا کے جلسوں کو رونق دیتے رہے۔ مگر مکتب کے کام سے جاتے رہے۔ حکیم صاحب نے سوچا کہ ان کے گذارہ کے لئے کوئی نسخہ ضرور تجویز کرنا چاہیئے۔ ان سے کہا کہ بادشاہ کی تعریف میں ایک قصیدہ کہو تو تمھیں ایک دن دربار میں لے چلیں۔ دیکھو رزاق مطلق کیا سامان کرتا ہے۔ قصیدہ تیار ہوا اور حکیم صاحب نے ہُدہُد کو اُڑا کر دربار میں پہنچا دیا۔ افسوس کہ اب نہیں مل سکتا۔ ۴ شعر یاد ہیں۔ مُشتے نمونہ از خروارے تحفۂ احباب کرتا ہوں:۔

جو تیری مدح میں مَیں چونچ اپنی وا کر دوں ‏ ‏ ‏ تو رشکِ باغِ ارم اپنا گھونسلا کر دوں

(حاشیہ: ہُدہُد دربار شاہی کی طرف پرواز کرتے ہیں۔)

ایک دن دربار سے آکر بیٹھے تھے۔ جو میں پہنچا۔ افسردہ ہو کر کہنے لگے کہ آج عجیب ماجرا گذرا۔ میں جو حضور میں گیا تو محل میں تھے۔ وہیں بُلالیا اور مجھے دیکھتے ہی کہنے لگے اُستاد! آج مجھے دیر تک ایک بات کا افسوس رہا۔ میں نے حال پوچھا۔ کہا کہ وہ! جو قصیدہ تم نے ہمارے لئے کہا تھا اُس کے وہ! اشعار آج مجھے یاد آگئے۔ ان کے خیالات سے طبیعت کو عجب لطف حاصل ہوا۔ مگر ساتھ ہی خیال آیا کہ اب تم یہ قصیدے ہمارے لئے کہتے ہو۔ ہم مرجائیں گے تو جو تخت پر بیٹھے گا۔ اس کے لئے کہو گے میں نے عرض کی کہ حضور کچھ تردّد نہ فرمائیں۔ خیمہ پیچھے گرتا ہے۔ میخیں اور طنابیں پہلے ہی

(بقیہ حاشیہ) جو آکے ریز کرے تیرے آگے مو بیبقار — تو ایسے کان مروڑوں کہ بے سُرا کر دوں
جو سرکشی کرے آگے مرے ہُما آکر — تو اس کے نوچ کے پر شکل ینولا کر دوں
میں کھانے والا ہوں نعمت کا اور میرے لئے — فلک کہے ہے مقرر میں باجرا کر دوں

بادشاہوں اور امیروں کو مسخراپن بلکہ زمانہ کی طبیعت کو یہ غذا موافق ہے۔ ظفر تو خود شاعر تھے۔ خطاب عطا فرمایا۔ طائر الاراکین۔ شہپر الملک۔ ہُدہُد الشعرا۔ منقار جنگ بہادر اور (معہ) مہینا بھی کر دیا۔ کہ ان کی شاعری کی بنیاد قائم ہوگئی۔ پھر تو سر پر لمبے لمبے بال ہو گئے۔ ان میں چنبیلی کا تیل پڑنے لگا۔ اور ڈاڑھی دوشاخہ ہو کر کانوں سے باتیں کرنے لگی۔

ایک برس برسات نے ان کا مکان گرا دیا۔ گھونسلے کی تلاش میں بھٹکتے پھرے۔ مکان ہاتھ نہ آیا۔ حکیم صاحب سے شکایت کی فرمایا کہ بادشاہی مکانات شہر میں بہتیرے پڑے ہیں۔ کیا ہُدہُد کے گھونسلے کو بھی ان میں جگہ نہ ملے گی۔ دیکھو بندوبست کرتے ہیں۔ جھٹ عرضی موزوں ہوئی۔ چند متفرق شعر اُس کے یاد ہیں :-

جز ترے شاہنشہا کہہ کس کے آگے روئیے — کس سے کہنے جائیے یہ غم کو ہمارے کھوئیے
تجھ کو ہے حق نے کیا ملکِ سخن کا شہسوار — ہیں بجا کرنے سمندِ طبع کو یاں پوئیے
حیف آتا ہے کہ فنِ شعر میں کیوں کھوئی عمر — کاشکے ہم سیکھتے اس سے بنانے بوریئے
سنگ لاخ ایسی زمیں ہے سوچ لے دل کیا — فکر کیجے صرف اس میں اور پتھر ڈھوئیے
رشتۂ عمرِ شہنشاہِ جہاں ہووے دراز — یا خدا کھلتے رہیں دنیا میں جب تک سوئیے

اُکھڑ جاتی ہیں۔ ہم حضور سے پہلے ہی اُٹھ جائیں گے۔ اور حضور خیال فرمائیں کہ عرش آرامگاہ کے دربار کے لوگ حضور کے دربار میں کہاں تھے؟ فردوس منزل کے اُمراء اُن کے عہد میں کہاں تھے۔ عرش منزل کے فردوس منزل کے دربار میں کہاں تھے۔ فردوس منزل کے امیر عرش آرامگاہ کے دربار میں کہاں تھے۔ عرش آرامگاہ کے اُمراء آج حضور کے دربار میں کہاں ہیں! بس یہی خیال فرمائیے جو جس کے ہوتے ہیں

(بقیہ) دیدے اسکو بھی زمیں تھوڑی کہ بن کر گھونسلے مارتا پھرتا تھا ہُدہُد ہے ٹاپک ٹوئیے

ایک سال سرکار شاہی میں تنخواہ کو دیر لگی۔ ہُدہُد نے حکیم صاحب سے شکایت کی۔ یہاں جس طرح امراض شکم کے لئے علاج تھے۔ اسی طرح بھوک کے تدارک کا بھی نسخہ تیار تھا۔ ایک قطعہ راجہ دبی سنگھ کی مدح میں موزوں ہوا کہ انہی دنوں میں خانسامانی کی تنخواہ انھیں سپرد ہوئی تھی۔ ۴ شعر اس وقت یاد ہیں وہی لکھتا ہوں:-

جہاں میں آج دبی سنگھ تو راجوں کا راجا ہے ۔۔۔ خدا کا فضل ہے جو قلعہ میں تو آبراجا ہے
سلیماں نے ہے تیرے ہاتھ میں دی رزق کی کُنجی ۔۔۔ تو سرداروں کا سردار اور مہاراجوں کا راجا ہے
شکم اہلِ جہاں کے سب ہیں شکرانے بجا لاتے ۔۔۔ دمامہ تیرا جاکر گنبدِ گردوں پہ باجا ہے
کسی کو دے نہ دے تنخواہ تو مختار ہے اس کا ۔۔۔ مگر ہُدہُد کو دیدے۔ کیوں؟ یہی ہُدہُد کا کھاجا ہے

حکیم صاحب ہمیشہ فکر سخن میں رہتے تھے۔ اس میں جو ظرافت کے مضامین خیال میں آتے۔ اُنھیں موزوں کر کے ہُدہُد کی چونچ میں دیدیتے تھے۔ وہ اُن کے بلکہ دو چار اور جانوروں کے لئے بھی بہت ہے۔ چند شعر یاد ہیں۔ تفریح طبع کے لئے لکھتا ہوں:-

ہُدہُد کا مذاق ہے نرالا سب سے ۔۔۔ انداز ہے اک نیا نکالا سب سے
سر دفترِ لشکرِ سُلیماں ہے یہ ۔۔۔ اُڑتا بھی ہے دیکھو بالا بالا سب سے
راست آئینوں کو نفرت ہے کج آئینوں سے ۔۔۔ تیر نکلا جو کماں سے تو گریزاں نکلا
آشیاں سے جو غزل پڑھنے کو ہُدہُد آیا ۔۔۔ غُل پڑا پیشِ ردِ ملکِ سُلیماں آیا

حکیم صاحب کے اشارے پر ہُدہُد بلبلانِ سخن کو ٹھونگیں بھی مارتا تھا۔ چنانچہ بعض غزلیں سرِ مشاعرہ پڑھتا تھا جس کے الفاظ نہایت شُستہ اور رنگین۔ لیکن شعر بالکل بے معنی۔ اور کہہ دیتا تھا کہ یہ غالب کے انداز میں غزل

وہ اُسی کے ساتھ جاتے ہیں۔ نیا میر مجلس نئی ہی مجلس جماتا ہے اور اپنا سامانِ مجلس بھی اپنے ساتھ ہی لاتا ہے۔ یہ سُن کر حضور بھی آبدیدہ ہوئے۔ میں بھی آبدیدہ ہوا۔ مگر خیال مجھے یہ آیا کہ دیکھو ہم ہمیشہ نماز کے بعد حضور کی سلامتی کی دعائیں مانگتے ہیں۔ خدا شاہد ہے اپنا خیال اِس طرح آج تک کبھی نہیں آیا۔ حضور کو ہمارا خیال بھی نہیں میاں! دنیا میں کوئی کسی کا نہیں ہے +

(بقیہ) لکھی ہے۔ ایک مطلع یاد ہے:۔

مرکزِ محورِ گردوں بہ لبِ آب نہیں ناخنِ قوسِ قزح شبہۂ مضراب نہیں

غالب مرحوم تو بہتے دریا تھے۔ سُنتے تھے اور ہنستے تھے۔ مومن خاں وغیرہ نے ہُدہُد کے شکار کو ایک باز تیار کیا۔ انھوں نے اس کے بھی پر نوچے۔ مشاعرے میں خوب خوب چھپٹے ہوئے۔ مگر اس کے شعر مشہور نہیں ہوئے۔ ہُدہُد کے کئی شعر یاد ہیں۔ پہلا مطلع بھول گیا۔

جسے کہتے ہیں ہُدہُد وہ نو نرشیروں کا دادا ہے مقابل تیرے کیا ہو۔ تو تو اک جرہ کی مادہ ہے

گر اب کے بازڑی میداں میں آئی سامنے میرے تو دُم میں پر نہ چھوڑوں گا یہی میرا ارادہ ہے

مقرر باز جو اپنا تخلص ہے کیا تو نے ہوا معلوم یہ اُس سے کہ گھر تیرا کشادہ ہے

ادب اے بے ادب۔ اب تک نہیں تجھ کو خبر اس کی کہ ہُدہُد سب جہاں کے طائروں کا پیرزادہ ہے

چند روز کے بعد باز اُڑ گیا۔ یاروں نے ایک کوا تیار کیا۔ زاغ تخلص رکھا۔ انھوں نے اس کی بھی خوب خبر لی۔ وہ بھی چند روز میں آندھی کا کوا ہو کر غائب غلا ہو گیا:۔

جون آیا ہے بدل اب کے ہدد کوے کی اس کی ہے پاؤں سے تا سر وہی خو کوے کی

وہی کاں کاں وہی کیں کیں وہی ٹاں ٹاں اُسکی بات چھوڑی نہیں ہاں اک سر مو کوے کی

پہلے جانا تھا یہی سب نے کہ کوا ہوگا پھر جو معلوم کیا۔ ہے یہ بہو کوے کی

بن کے کوا جو یہ آیا ہے تو اے ہُدہُد شاہ دُم کتر دینے کو کچھ کم نہیں تو کوے کی

جو جانور ہُدہُد کے مقابل ہوتے تھے اُنھیں استقلال نہ تھا۔ چند روز میں ہوا ہو جاتے تھے۔ کیونکہ پالنے والوں کی طبیعتوں میں استقلال اور مادہ نہ تھا۔ ہمیشہ اُن کے ڈھب کی غزل کہہ کر مشغلہ جاری

حسب حال

شیخ مرحوم جسمانی ضعف کے سبب سے روزہ نہ رکھتے تھے۔ مگر اس پر بھی کسی کے سامنے کھاتے پیتے نہ تھے۔ کبھی دوا یا شربت یا پانی بھی پینا ہوتا تو یا کوٹھے پر جاکر یا گھر میں جاکر پی آتے۔ ایک دفعہ میں نے پوچھا۔ کہا۔ کہ میاں خدا کے گنہگار ہیں۔ وہ عالم نہاں و آشکار کا ہے۔ اس کی تو شرم نہیں ہو سکتی۔ بھلا بندے کی تو شرم رہے +

رمضان کا مہینہ تھا۔ گرمی کی شدت۔ عصر کا وقت۔ نوکر نے شربت نیلوفر کٹورے میں گھول کر کوٹھے پر تیار کیا۔ اور کہا کہ ذرا ادپر تشریف لے چلئے۔ چونکہ وہ اس وقت لکھوا رہے تھے۔ مصروفیت کے سبب سے نہ سمجھے اور سبب پوچھا۔ اُس نے اشارہ کیا۔ فرمایا کہ لے آ یہیں۔ یہ ہمارے یار ہیں۔ ان سے کیا چھپانا۔ جب اُس نے کٹورا لاکر دیا۔ تو یہ مطلع کہا کہ فی البدیہہ واقع ہوا تھا +

پلائے آشکارا ہم کو کس کی ساقیا چوری خدا کی جب نہیں چوری تو پھر بندے کی کیا چوری

حسب حال

محبوب علی خاں خواجہ سرا سرکار بادشاہی میں مختار تھے۔ اور کیا محل۔ کیا دربار دونوں جگہ اختیار قطعی رکھتے تھے۔ مگر بشدت جوا کھیلتے تھے۔ کسی بات پر ناخوشی ہوئی۔ میاں صاحب نے حج کا ارادہ کیا۔ ایک دن میں اُستاد مرحوم کے پاس بیٹھا تھا کہ کسی شخص نے آکر کہا میاں صاحب کعبۃ اللہ جاتے ہیں۔ آپ ذرا تامل کر کے مسکرائے اور یہ مطلع پڑھا:۔

جو دل قمارخانہ میں بُت سے لگا چُکے وہ کعبتین چھوڑ کے کعبہ کو جا چکے

والد مرحوم نے بہ نیتِ وقف امام باڑہ تعمیر کیا۔ ایک دن تشریف لائے۔ اُن سے تاریخ کے لئے کہا۔ اُسی وقت تامل کر کے کہا۔ تعزیت گاہ امام دارین۔ پوری تاریخ

(بقیہ) رکھنا اور مشاعرہ کی غزل کا حسب حال تیار کرنا کچھ آسان کام نہیں ہے۔ سب سے بڑی بات یہ تھی کہ ان کے آذوقہ کو استقلال نہ تھا۔ ان کا آذوقہ سرکار بادشاہی سے مقرر ہی تھا۔ اور اِدھر اُدھر سے جُز چُگ کر جو بُرد مار لاتے تھے۔ وہ اُن کی چاٹ تھی +

ہے۔ حکیم میر فیض علی مرحوم ان کے اُستاد بھی تھے اور اُنہی کا آپ علاج بھی کیا کرتے تھے۔ ایک دن میں بھی موجود تھا۔ نوکر نے آکر کہا کہ آج میر فیض علی کا انتقال ہوا۔ بار بار پوچھا اور ایسا اضطراب ہوا کہ اُٹھ کر ٹہلنے لگے۔ کچھ سوچ کر دفعتہً بولے کہ ہائے میر فیض علی۔ مجھ سے کہا کہ دیکھو تو یہی تاریخ ہے؟ حساب کیا تو عدد برابر تھے +

ایک شخص نے آکر کہا کہ میرے دوست کا نام غلام علی ہے اور باپ کا نام غلام محمد ہے۔ اُس نے نہایت تاکید سے فرمایش لکھی ہے کہ حضرت سے ایسا سجع کہوا دو کہ جس میں دونوں نام آجائیں۔ آپ نے سُن کر وعدہ کیا اور کہا کہ دو تین دن میں آپ آئیے گا۔ انشاء اللہ ہو جاوے گا۔ وہ رخصت ہو کر چلے۔ ڈیوڑھی کے باہر نکلے ہوں گے جو نوکر سے کہا کہ محمد بخش بلانا انھیں۔ لینا لینا۔ خوب ہوا ان کے تقاضے سے جلدی مخلصی ہو گئی۔ مجھ سے مخاطب ہو کر کہا۔ ع

پدر غلام محمد پسر غلام علی

دیوان چندو لال نے ان کا کلام سُن کر مصرع طرح بھیجا اور بُلا بھیجا۔ آپ نے غزل کہہ کر بھیجی اور مقطع میں لکھا:۔

آجکل گرچہ دکن میں ہے بڑی قدرِ سخن کون جائے ذوق پر دلّی کی گلیاں چھوڑ کر

انھوں نے خلعت اور پانسو روپے بھیجے۔ مگر یہ نہ گئے۔ ایک دن میں نے نہ جانے کا سبب پوچھا۔ فرمایا:۔

نقل۔ کوئی مسافر دلّی میں مہینہ بیس دن رہ کر چلا۔ یہاں ایک کتا ہل گیا تھا۔ وہ وفا کا مارا ساتھ ہو لیا۔ شاہدرہ پہنچ کر دلّی یاد آئی۔ اور رہ گیا۔ وہاں کے کتوں کو دیکھا گردنیں فربہ۔ بدن تیار۔ چکنی چکنی پشم۔ ایک کتّا انھیں دیکھ کر خوش ہوا۔ اور دلّی کا سمجھ کر بہت خاطر کی۔ دلہائیوں کے بازار میں لے گیا۔ حلوائیوں کی دُکان سے ایک بالوشاہی اُڑا کر سامنے رکھا۔ بھٹیارہ کی دکان سے ایک کلّہ جھپٹا۔ یہ ضیافتیں کھلاتے اور دلّی کی باتیں سُناتے رہے۔ تیسرے دن رخصت مانگی۔ اُس نے روکا۔ انھوں نے

دلّی کی سیر تماشے اور خوبیوں کے ذکر کئے۔ آخر چلے اور دوست کو بھی دلّی آنے کی تاکید کر آئے۔ اُسے بھی خیال رہا اور ایک دن دلّی کا رُخ کیا۔ پہلے ہی مرگھٹ کے کُتّے۔ مُردار خوار۔ خونی آنکھیں۔ کالے کالے مُنہ نظر آئے۔ یہ لڑتے بھڑتے نکلے۔ دریا ملا۔ دیر تک کنارہ پر پھرے۔ آخر کود پڑے۔ مرکھپ کر پار پہنچے۔ شام ہوگئی تھی۔ شہر میں گلی کوچوں کے کُتّوں سے بچ بچا کر ڈیڑھ پہر رات گئی تھی۔ جو دوست سے ملاقات ہوئی۔ یہ بیچارے اپنی حالت پر شرمائے۔ بظاہر خوش ہوئے۔ اور کہا اوہو۔ اس وقت تم کہاں؟ دل میں کہتے تھے کہ رات نے پردہ رکھا ورنہ دن کو یہاں کیا دھرا تھا۔ اُسے لے کر ادھر اُدھر پھرنے لگے یہ چاندنی چوک ہے۔ یہ دریبہ ہے۔ جامع مسجد ہے۔ مہمان نے کہا۔ یار بھوک کے مارے جان نکلی جاتی ہے سیر ہو جائیگی۔ کچھ کھلواؤ تو سہی۔ انھوں نے کہا۔ عجب وقت تم آئے ہو۔ اب کیا کروں۔ بارے جامع مسجد کی سیڑھیوں پر جاتی کبابی مرچوں کی ہانڈی بھول گئے تھے۔ انھوں نے کہا لو یار بڑے قسمت والے ہو۔ وہ دن بھر کا بھوکا تھا۔ مُنہ پھاڑ کر گرا۔ اور ساتھ ہی مُنہ سے مغز تک گویا باروت اُڑ گئی۔ چھینک کر پیچھے ہٹا اور جل کر کہا۔ واہ یہی دلّی! انھوں نے کہا اس چٹخارے ہی کے مارے تو پڑے ہیں ✣

عادت تھی کہ سات آٹھ بجے مکانِ ضرور جاتے تھے اور تین چار چلمیں حقّہ کی وہاں پیتے تھے۔ میں چھٹّی کے دن اُس وقت وہاں جایا کرتا تھا اور دن بھر وہیں رہتا تھا۔ مکانِ ضرور ڈیوڑھی میں تھا۔ پاؤں کی آہٹ پہچانتے تھے۔ پوچھتے کہ تم ہو؟ میں تسلیم عرض کرتا۔ چھوٹی سی انگنائی تھی۔ پاس ہی چارپائی۔ وہیں بیٹھ جاتا۔ فرماتے۔ اجی ہمارا وہ " اُس دن تم نے کیا پڑھا تھا؟ ایک دو لفظ اُس کے پڑھتے میں سارا شعر عرض کرتا فرماتے۔ ہاں اب اُسے یوں بنالو۔ ایک دن ہنستے ہوئے پائخانے سے نکلے۔ فرمایا لو جی ۳۳ برس کے بعد آج اصلاح دینی آئی ہے۔ حافظ ویران نے کہا۔ حضرت کیونکر؟ فرمایا ایک دن شاہ نصیر مرحوم کسی شاگرد کو اصلاح

دے رہے تھے اُس میں مصرع تھا۔ ع

کھاتی کمر ہے تین بل اک گُدگُدی کے ساتھ

ابتدائے مشق تھی۔ اتنا خیال میں آیا کہ یہاں کچھ اور ہونا چاہئے اور جب سے اکثر یہ مصرع کھٹکتا رہتا تھا۔ آج وہ نکتہ حل ہوا۔ عرض کی حضرت پھر کیا؟ فرمایا۔ ع

کھاتی ہے تین تین بل اک گُدگُدی کے ساتھ

کمر کو اوپر ڈال دو۔ عرض کی پھر وہ کیونکر۔ ۳۔۴ مصرع اُلٹ پلٹ کئے تھے۔ ایک اس وقت خیال میں ہے ؎

بل بے کمر کہ زلفِ مسلسل کے بیچ میں
کھاتی ہے تین تین بل اِک گُدگدی کے ساتھ

کابلی دروازہ پاس ہی تھا۔ شام کو باہر نکل کر گھنٹوں ٹہلتے تھے۔ میں اکثر شام کو ہوتا تھا۔ مضامین کتابی۔ خیالات علمی۔ افادہ فرماتے۔ شعر کہتے۔ ایک دن بادشاہ کی غزل کہہ رہے تھے۔ یتر ہمیشہ۔ تصویر ہمیشہ۔ سوچتے سوچتے کہنے لگے۔ تم بھی تو کچھ کہو۔ میں نے کہا۔ کیا عرض کروں۔ فرمایا۔ میاں! اسی طرح آتا ہے۔ ہوں ہاں۔ غوں غاں تو کہو۔ کوئی مصرع ہی سہی۔ میں نے کہا۔ ع

سینہ سے لگائے تری تصویر ہمیشہ

ذرا تامل کرکے کہا ہاں درست ؎

آجائے اگر ہاتھ تو کیا چین سے رہئے
سینہ سے لگائے تری تصویر ہمیشہ

اب جو کبھی دلّی جانا ہوتا ہے اور اس مقام پر گذر ہوتا ہے تو آنسو نکل پڑتے ہیں۔ ایک اس مطلع پر حضور نے کئی دفعہ جال مارے مگر یہ ٹال گئے۔ مضمون نہ آسکا۔ مطلع اُنھوں نے نہ دیا ؎

کیا کہوں اس ابروئے پیوستہ کے دل بس میں ہے
ایک طعنہ مچھلیاں دو۔ کشمکش آپس میں ہے

بادشاہ کے چار دیوان ہیں۔ پہلے میں کچھ غزلیں۔ شاہ نصیر کی اصلاحیں ہیں۔ کچھ میر کاظم حسین بیقرار کی ہیں۔ غرض پہلا دیوان نصف سے زیادہ اور باقی تین دیوان سرتاپا

حضرت مرحوم کے ہیں۔ جن سنگلاخ زمینوں میں قلم کو چلنا مشکل ہے۔ ان کا نظام و سرانجام اس خوبصورتی سے کیا ہے کہ دل شگفتہ ہوتے ہیں۔ والد مرحوم کہا کرتے تھے کہ بادشاہ تمہارا زمین کا بادشاہ ہے۔ طرحیں عجیب نکالتا ہے۔ مگر تم سرسبز کرتے ہو۔ ورنہ شورزار ہوجائے۔ مسودۂ خاص میں کوئی شعر پورا۔ کوئی ڈیڑھ مصرع۔ کوئی ایک۔ کوئی آدھا مصرع فقط بحر اور ردیف قافیہ معلوم ہوجاتا تھا۔ باقی بخیر۔ یہ اُن ہڈیوں پر گوشت پوست چڑھا کر حُسن و عشق کی پتلیاں بنا دیتے تھے۔ ایجادی فرمایشوں کی حد نہ تھی۔ چند شعر اس غزل کے لکھتا ہوں جس کے ہر شعر کے بیچ مصرع لگایا ہے:۔

یا تو افسر مرا شاہانہ بنایا ہوتا یا مرا تاج گدایانہ بنایا ہوتا

ورنہ ایسا جو بنایا نہ بنایا ہوتا

نشۂ عشق کا گر ذوق دیا تھا مجکو عمر کا تنگ نہ پیمانہ بنایا ہوتا

دل کو میرے خُم و خمخانہ بنایا ہوتا

اس خرد نے مجھے سرگشتۂ و حیران کیا کیوں خردمند بنایا نہ بنایا ہوتا

تو نے اپنا مجھے دیوانہ بنایا ہوتا

روز معمورۂ دنیا میں خرابی ہے ظفر ایسی بستی سے تو ویرانہ بنایا ہوتا

بلکہ بہتر تو یہی تھا نہ بنایا ہوتا

ایک بُڈّھا چورن مرچن کی پڑیاں بیچتا پھرتا تھا۔ اور آواز دیتا تھا:۔

ترے من چلے کا سودا ہے کھٹّا اور میٹھا

حضور نے سُنا۔ ایک دو مصرع اُس پر لگا کر اُستاد کو بھیج دئے۔ اُنھوں نے دس دوہرے لگا دئے۔ اُنھوں نے لَے رکھی۔ کئی کنچنیاں ملازم تھیں۔ اُنھیں یاد کرا دئے۔ دوسرے دن بچّہ بچّہ کی زبان پر تھے۔ دو بند یاد رہ گئے:۔

لے ترے من چلے کا سودا ہے کھٹّا اور میٹھا

کنجڑے کی سی بات ہے دنیا جنس ہے ساری اکٹھی میٹھی چلے میٹھی لے لے۔ کھٹی چاہے کھٹی
لے ترے من چلے کا ہے سودا کھٹا اور میٹھا
روپ رنگ پر بھول نہ دل میں دیکھ عقل کے بیری اوپر میٹھی نیچے کھٹی۔ انبوا کی سی کیری
لے ترے من چلے کا سودا ہے کھٹا اور میٹھا

ایک فقیر صدا کہتا تھا۔ کچھ راہ خدا دے جا۔ جا تیرا بھلا ہو گا۔ حضور کو پسند آئی۔ اُن سے کہا۔ اُنھوں نے بارہ دُوہرے اُس پر لگادیئے۔ مدتوں تک گھر گھر سے اسی کے گانے کی آواز آتی تھی۔ اور گلی گلی لوگ گاتے پھرتے تھے + (حافظ ویراں کو خدا سلامت رکھے اُنہی سے یہ شعر بھی لکھوائے ہیں) +

کچھ راہ خدا دے جا۔ جا تیرا بھلا ہو گا

محتاج خراباتی یا پاک نمازی ہے کچھ کر نہ نظر اس پر۔ واں نکتہ نوازی ہے
کچھ راہِ خدا دے جا۔ جا تیرا بھلا ہو گا
دنیا کے کیا کرتا ہے سینکڑوں تو دھندے پر کام خدا را بھی کرلے کوئی یہاں بندے
کچھ راہ خدا دے جا۔ جا تیرا بھلا ہو گا
دُنیا ہے سرا اس میں تو بیٹھا مسافر ہے اور جاتا ہے یاں سے۔ جانا تجھے آخر ہے
کچھ راہِ خدا دے جا۔ جا تیرا بھلا ہو گا
جو رب نے دیا تجھ کو تو نام پہ رب کے دے گر یاں نہ دیا تو نے۔ وہاں دیویگا کیا بندے
کچھ راہِ خدا دے جا۔ جا تیرا بھلا ہو گا
دیویگا اسی کو تو وہ جس کو ہے دلواتا ہر ہے یہ ظفر تجھ کو۔ آواز سُنا جاتا
کچھ راہِ خدا دے جا۔ جا تیرا بھلا ہو گا

اس طرح کی ہزاروں چیزیں تھیں۔ ٹپے۔ ٹھمریاں۔ پہیلیاں۔ سیٹھنیاں۔ کہاں تک لکھوں۔ ایک دن ٹہل رہے تھے۔ حافظ ویراں ساتھ تھے۔ بہ تقاضائے استنجا بیٹھ گئے۔ اور وقت معین سے زیادہ دیر ہوئی۔ انھوں نے قریب جاکر خیال کیا۔ تو

کچھ گنگنا رہے ہیں اور چٹکی سے جوتی پر کھٹ کھٹ کرتے جاتے ہیں۔ پوچھا۔ کہ ابھی آپ فارغ نہیں ہوئے؟ فرمایا کہ حضور نے چلتے ہوئے ایک ٹھمری کے دو تین انترے سُنائے تھے۔ کہ اسے پورا کر دینا۔ اس وقت اس کا خیال آگیا۔ پوچھا یہ جوتی پر آپ چٹکی کیوں مارتے تھے؟ فرمایا کہ دیکھتا تھا اُس کے لفظ تال پر ٹھیک بیٹھتے ہیں یا نہیں +

حافظ ویراں کہتے ہیں ایک دن عجیب تماشا ہوا۔ آپ بادشاہ کی غزل کہہ رہے تھے۔ مطلع ہوا کہ ؎

ابرو کی اُس کے بات ذرا چل کے تھم گئی تلوار آج ماہِ لقا چل کے تھم گئی

دو تین شعر ہوئے تھے کہ خلیفہ اسمٰعیل دربار سے پھر کر آئے اور کہا کہ اس وقت عجب معرکہ دیکھا۔ اُستاد مرحوم متوجہ ہوئے۔ انھوں نے کہا کہ جب میں بھوانی شنکر کے چھتّے کے پاس پہنچا تو کھاری باولی کے رُخ پر دیکھا کہ دو تین آدمی کھڑے ہیں اور آپس میں تکرار کر رہے ہیں۔ باتوں باتوں میں ایسی بگڑی کہ تلوار کھچ گئی۔ اور دو تین آدمی زخمی بھی ہوئے۔ یہاں چونکہ غزل کے شعر حافظ ویراں سُن رہے تھے۔ ہنس کر بولے کہ حضرت آپ کیا وہاں موجود تھے۔ آہستہ سے فرمایا کہ یہیں بیٹھے بیٹھے سب کچھ ہو جاتا ہے۔ اس سے میرا مطلب یہ نہیں کہ انہیں کرامات تھی یا وہ غیب داں تھے۔ ایک حُسنِ اتفاق تھا۔ اہلِ ذوق کے لطفِ طبع کے لئے لکھ دیا۔ اس سے بڑھ کر یہ ہے کہ ایک دن حضور میں غزل ہوئی۔ جس کا مطلع تھا ؎

آج ابرو کی ترے تصویر کھچ کر رہ گئی سُنتے ہیں بھوپال میں شمشیر کھچ کر رہ گئی

پھر معلوم ہوا کہ اُسی دن بھوپال میں تلوار چلی تھی۔ ایسے معاملے کتب تاریخوں اور تذکروں میں اکثر منقول ہیں۔ طولِ کلام کے خیال سے قلم انداز کرتا ہوں +

ایک دفعہ دوپہر کا وقت تھا۔ باتیں کرتے کرتے سو گئے۔ آنکھ کھلی تو فرمایا کہ ابھی خواب میں دیکھا کہیں آگ لگی ہے۔ اتنے میں خلیفہ صاحب آئے اور کہا کہ

پیر بخش سوداگر کی کوٹھی میں آگ لگ گئی تھی۔ بڑی خیر ہوئی کچھ نقصان نہیں ہوا +

ایک شب والد مرحوم کے پاس آکر بیٹھے۔ کہا کہ بادشاہ کی غزل کہنی ہے لاؤ۔ یہیں کہہ لیں۔ کئی فرمائشیں تھیں۔ ان میں سے یہ طرح کہنی شروع کی۔ محبت کیا ہے۔ صورت کیا ہے۔ مصیبت کیا ہے۔ میں نے کہا کہ حضرت زمین شگفتہ نہیں۔ سکوت کر کے فرمایا۔ کہنے والے شگفتہ کر ہی لیا کرتے ہیں۔ پھر یہ دو مطلع پڑھے :۔

نہیں ہے اعتبار اس کا یہ منہ دیکھے کی اُلفت ہے ؛ بھول اے آرسی گر یار کو تجھ سے محبت ہے

ہماری خاک یوں برباد ہو لے ابر رحمت ہے ؛ بگولے سے جسے آسیب اور مرصرے زحمت ہے

اتفاق۔ فرماتے تھے کہ ایک دن بادشاہ نے غزل کا مسودہ دیا اور فرمایا کہ اسے ابھی درست کر کے دے جانا۔ موسم برسات کا تھا۔ ابر آ رہا تھا۔ دریا چڑھاؤ پر تھا۔ میں دیوان خاص میں جاکر اُسی رُخ پر ایک طرف بیٹھ گیا۔ اور غزل لکھنے لگا۔ تھوڑی دیر کے بعد پاؤں کی آہٹ معلوم ہوئی۔ دیکھا تو پشت پر ایک صاحب دانائے فرنگ کھڑے ہیں۔ مجھ سے کہا آپ کیا لکھتا ہے؟ میں نے کہا غزل ہے۔ پوچھا۔ آپ کون ہے؟ میں نے کہا کہ نظم میں حضور کی دعاگوئی کیا کرتا ہوں۔ فرمایا۔ کس زبان میں؟ میں نے کہا اُردو میں۔ پوچھا آپ کیا کیا زبانیں جانتا ہے؟ میں نے کہا۔ فارسی۔ عربی بھی جانتا ہوں۔ فرمایا۔ اُن زبانوں میں بھی کہتا ہے؟ میں نے کہا۔ کوئی خاص موقع ہو تو اُس میں بھی کہنا پڑتا ہے۔ ورنہ اُردو ہی میں کہتا ہوں کہ یہ میری اپنی زبان ہے۔ جو کچھ انسان اپنی زبان میں کر سکتا ہے غیر کی زبان میں نہیں کر سکتا۔ پوچھا۔ آپ انگریزی جانتا ہے؟ میں نے کہا کہ نہیں۔ فرمایا کہ کیوں نہیں پڑھا؟ میں نے کہا کہ ہمارا لب و لہجہ اُس سے موافق نہیں۔ وہ ہمیں آتی نہیں ہے۔ صاحب نے کہا دیکھئے وَل یہ کیا بات ہے۔ ہم آپ کا زبان بولتے ہیں۔ میں نے کہا۔ پختہ سالی میں غیر زبان نہیں آسکتی۔ بہت مشکل معاملہ ہے۔ اُنھوں نے پھر کہا۔ کہ وَل ہم آپ کی تین زبان ہندوستان میں آکر سیکھا۔ آپ ہمارا ایک زبان نہیں سیکھ سکتے۔ یہ کیا بات ہے؟

اور تقریر کو طول دیا۔ میں نے کہا صاحب ہم زبان کا سیکھنا اسے کہتے ہیں کہ اس میں بات چیت۔ ہر قسم کی تحریر تقریر اس طرح کریں جس طرح خود اہل زبان کرتے ہیں۔ آپ فرماتے ہیں۔ ام آپ کا تین زبان سیکھ لیا۔ بھلا یہ کیا زبان ہے اور کیا سیکھنا ہے۔ اسے زبان کا سیکھنا اور بولنا نہیں کہتے۔ اسے تو زبان کا خراب کرنا کہتے ہیں +

غزلیں

مرے سینہ سے تیرا تیر جب اے جنگجو نکلا
دہانِ زخم سے خوں ہو کے حرفِ آرزو نکلا

مرا گھر تیرا منزل گاہ ہو ایسے کہاں طالع
خدا جانے کدھر کا چاند آج اے ماہرو نکلا

پھرا گر آسماں تو شوق میں تیرے ہے سرگرداں
اگر خورشید نکلا تیرا گرمِ جستجو نکلا

مئے عشرت طلب کرتے تھے ناحق آسماں سے ہم
کہ آخر جب اسے دیکھا فقط خالی سبو نکلا

ترے آتے ہی آتے کام آخر ہو گیا میرا
رہی حسرت کہ دم میرا نہ تیرے روبرو نکلا

کہیں تجکو نہ پایا گرچہ ہم نے اک جہاں ڈھونڈا
پھر آخر دل ہی میں دیکھا۔ بغل ہی میں سے تو نکلا

خجل اپنے گناہوں سے ہوں میں یہانتک کہ جب رویا
تو جو آنسو مری آنکھوں سے نکلا سُرخرو نکلا

گھسے سب ناخنِ تدبیر۔ اور ٹوٹی سرِ سوزن
مگر تھا دل میں جو کانٹا۔ نہ وہ ہرگز کبھو نکلا

اُسے عیار پایا یار سمجھے ذوقؔ ہم جس کو
جسے یاں دوست اپنا ہم نے جانا۔ وہ عدو نکلا

لکھئے اُسے خط میں کہ ستم اُٹھ نہیں سکتا
پر ضعف سے ہاتھوں میں قلم اُٹھ نہیں سکتا

بیمار ترا صورتِ تصویرِ نہالی
کیا اُٹھے سرِ بسترِ غم۔ اُٹھ نہیں سکتا

آتی ہے صدائے جرسِ ناقۂ لیلےٰ
پر حیف کہ مجنوں کا قدم اُٹھ نہیں سکتا

جوں دانۂ روئیدہ تہِ خاک ہمارا
سر زیرِ گرانبارِ الم۔ اُٹھ نہیں سکتا

ہر داغ معاصی مرا۔ اس دامنِ تر سے
جوں حرف سرِ کاغذ نم اُٹھ نہیں سکتا

اتنا ہوں تری تیغ کا شرمندۂ احساں سر میرا ترے سر کی قسم اُٹھ نہیں سکتا
پردہ درِ کعبہ سے اُٹھانا تو ہے آساں پر پردۂ رخسارِ صنم اُٹھ نہیں سکتا
کیوں اتنا گرانبار ہے جو رختِ سفر بھی اے راہروِ ملکِ عدم اُٹھ نہیں سکتا

دنیا کا زر و مال کیا جمع تو کیا ذوق!
کچھ فائدہ بے دستِ کرم اُٹھ نہیں سکتا

الٰہی کس بے گنہ کو مارا ہے مجھ کے قاتل نے گشتنی ہے کہ آج کوچہ میں اُسکے شورِ بایّ ذَنبٍ قُتِلَتْ ہے
زمیں پہ نورِ قمر کے گرنے میں صاف اظہارِ روشنی ہے کہ جو ہیں روشن ضمیر اُنکو فروغ اُن کی فروتنی ہے
غمِ جُدائی میں تیرے ظالم کہوں کیا تجھ پہ کیا بنی ہے جگر گدازی ہے سینہ کاوی ہے دلخراشی ہے جانکنی ہے
بشر جو اس تیرہ خاکداں میں پڑا یہ اُسکی فروتنی ہے وگرنہ قندیلِ عرش میں بھی اُسی کے جلوہ کی روشنی ہے
ہوئے ہیں اپنی سادگی سے ہم آشنا جنگ و آشتی سے اگر نہ ہو یہ تو پھر کسی سے نہ دوستی ہے نہ دشمنی ہے
کوئی ہے کافر کوئی مسلماں جُدا ہر اک کی ہے راہِ ایماں جو اسکے نزدیک رہبری ہے وہ اُسکے نزدیک رہزنی ہے
ہوئے ہیں تر گریۂ ندامت سے اسقدر آستین و دامن کہ میری تر دامنی کے آگے عرق عرق پاک دامنی ہے
نہیں ہے قانع کہ خواہشِ زر وہ مفلسی میں بھی ہے تونگر جہاں میں مانند کیمیا گر ہمیشہ محتاج و دل غنی ہے
لگا نہ اس بتکدے میں تو دل یہ ہے طلسمِ شکستِ غافل کہ کوئی کیسا ہی خوش شمائل صنم ہے آخر شکستنی ہے
تکلف منزلِ محبت نہ کر چلا چل تو بے تکلف کہ جا بجا خارزارِ وحشت سے زیرِ پا فرشِ سوزنی ہے

خدنگِ مژگاں سے ذوق اُسکے دل اپنا سینہ سپر ہے جب سے
مثالِ آئینہ سخت جانی سے سینہ دیوارِ آہنی ہے

دریائے اشکِ چشم سے جس آن بہہ گیا سُن لیجیو کہ عرش کا ایوان بہہ گیا
بل بے گدازِ عشق کہ خوں ہو کے دل کے ساتھ سینہ سے تیرے تیر کا پیکان بہہ گیا
زاہد شراب پینے سے کافر ہوا میں کیوں؟ کیا ڈیڑھ چلّو پانی سے ایمان بہہ گیا
ہے موجِ بحرِ عشق وہ طوفاں کہ الحفیظ بے چارہ مشتِ خاک تھا انسان بہہ گیا
دریائے عشق میں دمِ تحریرِ حالِ دل کشتی کی طرح میرا قلمدان بہہ گیا

یہ روئے پھوٹ پھوٹ کے پاؤں کے آبلے
نالہ سا ایک سوئے بیابان بہہ گیا

تھا تو بہا میں بیش پر اس لب کے سامنے
سب مول تیرا لعلِ بدخشان بہہ گیا

کشتی سوارِ عمر ہے بحرِ فنا میں جسم
جس دم بہا کے لے گیا طوفان بہہ گیا

پنجاب میں بھی وہ نہ رہی آب و تابِ حسن
اے ذوق اب تو پانی وہ ملتان بہہ گیا

پاک رکھ اپنا دہاں ذکرِ خدائے پاک سے
کم نہیں ہرگز زباں منہ میں ترے مسواک سے

جب بنی تیرِ حوادث کی کماں افلاک سے
خاک کا تو وہ بنا انساں کی مشتِ خاک سے

جس طرح دیکھے قفس سے باغ کو مرغِ اسیر
جھانکتا ہے یوں تجھے دل سینۂ صد چاک سے

تیرے صیدِ نیم جاں کی جاں نکلتی ہی نہیں
باند رکھا ہے اسے بھی تو نے کیا فتراک سے

مجکو دوزخ رشکِ جنت ہو اگر میرے لئے
واں بھی آتش ہو کسی کے روئے آتشناک سے

آفتابِ حشر ہے یارب کہ نکلا گرم گرم
کوئی آنسو دل جلوں کے دیدۂ نمناک سے

چشم کو بے پردہ ہو کس طرح نظارہ نصیب
جب کہ وہ پردہ نشیں پردہ کرے ادراک سے

بیت ساقی نامہ کی لکھو کوئی جائے دعا
مے پرستوں کے کفن پر چوبِ کلکِ تاک سے

عیب ذاتی کو کوئی کھوتا ہے حسنِ عارضی!
زیب بداندام کو ہو ذوق کیا پوشاک سے

جینا ہمیں اصلا نظر اپنا نہیں آتا
گر آج بھی وہ رشکِ مسیحا نہیں آتا

مذکور تری بزم میں کس کا نہیں آتا
پر ذکر ہمارا نہیں آتا نہیں آتا

دیتا دلِ مضطر کو تری کچھ تو نشانی
پر خط بھی ترے ہاتھ کا لکھا نہیں آتا

کیا جانے اسے وہم ہے کیا میری طرف سے
جو خواب میں بھی رات کو تنہا نہیں آتا

آیا ہے دم آنکھوں میں دمِ حسرتِ دیدار
پر لب پہ کبھی حرفِ تمنا نہیں آتا

کس دم نہیں ہوتا قلقِ ہجر ہے مجکو
کس وقت مرا منہ کو کلیجہ نہیں آتا

میں جاتا جہاں سے ہوں تو آتا نہیں یاں تک
کافر تجھے کچھ خوفِ خدا کا نہیں آتا

ہم رونے پہ آجائیں تو دریا ہی بہائیں — شبنم کی طرح سے ہمیں رونا نہیں آتا

ہستی سے زیادہ ہے کچھ آرام عدم میں — جو جاتا ہے یاں سے وہ دوبارہ نہیں آتا

آنا ہے تو آجا کہ کوئی دم کی ہے فرصت — پھر دیکھئے آتا بھی ہے دم یا نہیں آتا

غافل ہے بہارِ چمنِ عُمر۔ جوانی! — کر سیر کہ موسم یہ دوبارہ نہیں آتا

ساتھ اس کے ہیں ہمسایہ کی مانند ولیکن — اس پر بھی جُدا ہیں کہ لپٹنا نہیں آتا

دُنیا ہے وہ صیاد کہ سب دام میں اسکے — آجاتے ہیں لیکن کوئی دانا نہیں آتا

دل مانگنا مفت اور پھر اُس پہ تقاضا — کچھ قرض تو بندہ پہ تمھارا نہیں آتا

لے جاہے دلا اُس کے نہ آنے کی شکایت — کیا کیجے گا فرمائیے اچھا نہیں آتا

جاتی رہی زلفوں کی لٹک دل سے ہمارے — افسوس کچھ ایسا ہمیں لٹکا نہیں آتا

جو کوچۂ قاتل میں گیا پھر وہ نہ آیا — کیا جانے مزا کیا ہے کہ جینا نہیں آتا

آئے تو کہاں جائے نہ تا جی سے کوئی جائے — جب تک اسے غصہ نہیں آتا نہیں آتا

قسمت ہی سے لاچار ہوں اے **ذوق** وگرنہ
سب فن میں ہوں میں طاق مجھے کیا نہیں آتا

مزے یہ دل کے لئے تھے نہ تھے زباں کے لئے — سو ہم نے دل میں مزے سوزشِ نہاں کے لئے

نہیں ثباتِ بلندیٔ عزّ و شاں کے لئے — کہ ساتھ اوج کے پستی ہے آسماں کے لئے

ہزار لطف ہیں جو ہر ستم میں جاں کے لئے — ستم شریک ہوا کون آسماں کے لئے

فروغ عشق سے ہے روشنی جہاں کے لئے — یہی چراغ ہے اس تیرہ خاکداں کے لئے

صبا جو آئے خس و خارِ گلستاں کے لئے — قفس میں کیونکہ نہ پھڑکے دلِ آشیاں کے لئے

دمِ عروج ہے کیا فکر نردباں کے لئے — کمند آہ تو ہے بامِ آسماں کے لئے

سدا تپش بہ تپش ہے دلِ تپاں کے لئے — ہمیشہ غم پہ ہے غم جانِ ناتواں کے لئے

حجر کے چومنے ہی پر ہے حجِّ کعبہ اگر — تو بوسے ہم نے بھی اس سنگِ آستاں کے لئے

نہ چھوڑ تو کسی عالم میں راستی کہ یہ شے — عصا ہے پیر کو اور سیف ہے جواں کے لئے

جو پاس مہر و محبت کہیں یہاں بکتا ۔۔۔ تو ہم بھی لیتے کسی اپنے مہرباں کے لئے
خلش سے عشق کے ہے خار پیرہن تنِ زار ۔۔۔ ہمیشہ اس ترے مجنونِ ناتواں کے لئے
تپش سے عشق کی یہ حال ہے مرا گویا ۔۔۔ بجائے مغز ہے سیماب استخواں کے لئے
مرے مزار پہ کس وجہ سے نہ برسے نُور ۔۔۔ کہ جان دی ترے روئے عرق فشاں کے لئے
الٰہی کان میں کیا اُس صنم نے پھونک دیا ۔۔۔ کہ ہاتھ رکھتے ہیں کانوں پہ سب اذاں کے لئے
نہیں ہے خانہ بدوشوں کو حاجتِ ساماں ۔۔۔ اثاثہ چاہئے کیا خانۂ کماں کے لئے
نہ دل رہا نہ جگر دونوں جل کے خاک ہوئے ۔۔۔ رہا ہے سینہ میں کیا چشمِ خوں فشاں کے لئے
نہ لوح گور پہ مستوں کے ہو نہ ہو تعویذ ۔۔۔ جو ہو تو خشتِ خُم ہے کوئی نشاں کے لئے
اگر اُمید نہ ہمسایہ ہو تو خانۂ یاس ۔۔۔ بہشت ہے ہمیں آرام جاوداں کے لئے
وہ مول لیتے ہیں جس دم کوئی نئی تلوار ۔۔۔ لگاتے پہلے مجھی پر ہیں امتحاں کے لئے
صریح چشم سخن گو تری کہے نہ کہے ۔۔۔ جواب صاف ہے پر طاقت و تواں کے لئے
رہے ہے ہَول کہ برہم نہ ہو مزاج کہیں ۔۔۔ بجا ہے ہَول دل ان کے مزاجداں کے لئے
مثال نَے ہے مرا جب تلک کہ دم میں دم ۔۔۔ فغاں ہے میرے لئے اور میں فغاں کے لئے
بلند ہو وے اگر کوئی میرا شعلۂ آہ ۔۔۔ تو ایک اور ہو خورشید آسماں کے لئے
چلیں ہیں دَیر کو مدت میں خانقاہ سے ہم ۔۔۔ شکست توبہ لئے ارمغاں مغاں کے لئے
وبالِ دوش ہے اس ناتواں کو سر لیکن ۔۔۔ لگا رکھا ہے ترے خنجر و سناں کے لئے
بیان درد و محبت جو ہو تو کیونکر ہو ۔۔۔ زباں نہ دل کے لئے ہے نہ دل زباں کے لئے
اشارہ چشم کا تیرے یکایک اے قاتل ۔۔۔ ہوا بہانہ مری مرگِ ناگہاں کے لئے

بنایا آدمی کو **ذوق** ایک جُزوِ ضعیف
اور اس ضعیف سے کُل کام دو جہاں کے لئے

نواب اصغر علی خاں نسیم کے مشاعرہ میں غزل مذکورۂ بالا طرح ہوئی تھی۔ وہ اور مومن خاں صاحب کہ اُن کے اُستاد تھے۔ اُستاد مرحوم کی خدمت میں آئے۔

اور بڑے اصرار سے لے گئے۔ یہ پہلا مشاعرہ تھا۔ جو بندۂ آزاد نے دیدۂ شوق سے دیکھا۔ غالب مرحوم تشریف نہیں لائے مگر غزل لکھی تھی۔ ان دونوں اُستادوں کی غزلیں لکھ دی ہیں۔ اہل نظر لُطف حاصل کریں +

نجم الدولہ دبیر الملک مرزا اسد اللہ خاں غالب

مرزا صاحب کو اصلی شوق فارسی نظم و نثر کا تھا۔ اور اسی کمال کو اپنا فخر سمجھتے ہیں۔ لیکن چونکہ تصانیف اُن کی اُردو میں بھی چھپی ہیں۔ اور جس طرح اُمرائے ہند۔ و رؤسائے اکبر آباد میں علوِّ خاندان سے نامی اور میرزائے فارسی ہیں۔ اُسی طرح اُردوئے معلّٰی کے مالک ہیں۔ اس لئے واجب ہوا کہ اُن کا ذکر اس تذکرہ میں ضرور کیا جائے۔ نام اسد اللہ تھا۔ پہلے اسد تخلص کرتے تھے۔ مجھ میں کوئی فرومایہ سا شخص اسد تخلص کرتا تھا۔ ایک دن اُس کا مقطع کسی نے پڑھا:۔

تخلص

اسد تم نے بنائی یہ غزل خوب ارے او شیر رحمت ہے خدا کی

سُنتے ہی اس تخلص سے جی بیزار ہو گیا۔ کیونکہ اُن کا یہ بھی قاعدہ[1] تھا کہ عوام الناس کے ساتھ شنترک حال ہونے کو نہایت مکروہ سمجھتے تھے۔ چنانچہ ۱۲۴۵ھ و ۱۸۲۸ء میں اسد اللہ الغالب کی رعایت سے غالب تخلص اختیار کیا۔ لیکن جن غزلوں میں اسد تخلص تھا اُنھیں اُسی طرح رہنے دیا +

خاندان کا سلسلہ افراسیاب بادشاہ توران سے ملتا ہے۔ جب تورانیوں کا چراغ کیانیوں کی ہوائے اقبال سے گل ہوا۔ تو غریب خانہ برباد جنگلوں پہاڑوں میں

---

[1] دیوان فارسی میں ۲۰-۲۵ شعر کا ایک قطعہ لکھا ہے۔ بعض اشخاص کا قول ہے کہ ذوق کی طرف چشمک ہے۔ غرض اس میں کا ایک شعر ہے۔ ؎

راست می گویم من و از راست سر نتواں کشید ہر چہ در گفتار فخر تست آں ننگِ من است

چلے گئے۔ مگر جوہر کی کشش نے تلوار ہاتھ سے نہ چھوڑی۔ سپاہگری ہمت کی بدولت روٹی پیدا کرنے لگی۔ سیکڑوں برس کے بعد پھر اقبال ادھر جھکا۔ اور تلوار سے تاج نصیب ہوا۔ چنانچہ سلجوقی خاندان کی بنیاد انہی میں قائم ہو گئی۔ مگر اقبال کا جُھکنا جھوکا ہوا کا ہے۔ کئی پشتوں کے بعد اُس نے پھر رُخ پلٹا۔ اور سمرقند میں جس طرح اور شُرفا تھے اُسی طرح سلجوقی شہزادوں کو بھی گھروں میں بٹھادیا +

مرزا صاحب کے دادا گھر چھوڑ کر نکلے۔ شاہ عالم کا زمانہ تھا دہلی میں آئے۔ یہاں بھی سلطنت میں کچھ نہ رہا تھا۔ صرف پچاس گھوڑے اور نقارۂ نشان سے شاہی دربار میں عزت پائی۔ اور اپنی لیاقت اور خاندان کے نام سے پہاسو کا ایک پرگنہ سیر حاصل ذات اور رسالے کی تنخواہ میں لیا۔ شاہ عالم کے بعد طوائف الملوکی کا ہنگامہ گرم ہوا۔ وہ علاقہ بھی نہ رہا۔ ان کے والد عبداللہ بیگ خاں لکھنؤ جاکر نواب آصف الدولہ مرحوم کے دربار میں پہنچے۔ چند روز بعد حیدر آباد میں جاکر نواب نظام علی خاں بہادر کی سرکار میں ۳ سو دار کی جمعیت سے ملازم رہے کئی برس کے بعد ایک خانہ جنگی کے بکھیڑے میں یہ صورت بھی بگڑی۔ وہاں سے گھر آئے۔ اور الور میں راجہ بختاور سنگھ کی ملازمت اختیار کی۔ یہاں کسی لڑائی میں مارے گئے۔ اُس وقت مرزا کی ۵ برس کی عمر تھی۔ نصر اللہ بیگ خاں حقیقی چچا مرہٹوں کی طرف سے اکبر آباد کے صوبہ دار تھے۔ انھوں نے دُرِّ یتیم کو دامن میں لے لیا۔ ۱۸۰۶ء میں جرنیل لیک صاحب کا عمل ہوا تو صوبہ داری کمشنری ہو گئی۔ ان کے چچا کو بھرتی کا حکم ہوا۔ اور ۴ سو سوار کے افسر مقرر ہوئے ۱۷ سو روپیہ مہینا ذات کا۔ اور لاکھ ڈیڑھ لاکھ روپیہ سال کی جاگیر سونگ سونی کے پرگنہ برحین حیات مقرر ہو گئی +

مرزا چچا کے سایہ میں پرورش پاتے تھے۔ مگر اتفاق یہ کہ مرگ ناگہانی میں وہ مر گئے رسالہ برطرف ہو گیا۔ جاگیر ضبط ہو گئی۔ بزرگوں نے لاکھوں روپیہ کی جائداد

چھوڑی تھی۔ قسمت سے کس کا زور چل سکتا ہے۔ وہ امیرزادہ جو شاہانہ دل و دماغ لے کر آیا تھا۔ اُسے ملک سخن کی حکومت اور مضامین کی دولت پر قناعت کر کے غریبانہ حال سے زندگی بسر کرنی پڑی۔ بہت تدبیریں اور وسیلے درمیان آئے مگر سب کھیل بن بن کر بگڑ گئے[1]۔ چنانچہ اخیر میں کسی دوست نے انھیں لکھا تھا کہ نظام دکن کے لئے قصیدہ کہہ کر فلاں ذریعے سے بھیجو۔ اس کے جواب میں آپ فرماتے ہیں "۵ برس کا تھا کہ میرا باپ مرا۔ ۹ برس کا تھا کہ چچا مرا۔ اُس کی جاگیر کے عوض میں میرے اور میرے شرکائے حقیقی کے واسطے شامل جاگیر نواب احمد بخش خاں دس ہزار روپیہ سال مقرر ہوئے۔ اُنھوں نے نہ دئے مگر تین ہزار روپیہ سال اُن میں سے خاص میری ذات کا حصہ ساڑھے سات روپیہ سال فقط۔ میں نے سرکار انگریزی میں غبن ظاہر کیا۔ کولبرک صاحب بہادر رزیڈنٹ دہلی۔ اور اسٹرلنگ صاحب بہادر سکرتر گورنمنٹ کلکتہ متفق ہوئے۔ میرا حق دلانے پر۔ رزیڈنٹ معزول ہو گئے۔ سکرتر گورنمنٹ بمرگ ناگہاں مر گئے۔ بعد ایک زمانہ کے بادشاہ دہلی نے پچاس روپیہ مہینا مقرر کیا۔ اُن کے ولی عہد اس تقرر کے دو برس بعد مر گئے۔ واجد علی شاہ بادشاہ اودھ کی سرکار سے بہ صلۂ مدح گستری ۵۰۰ روپیہ سال مقرر ہوئے۔ وہ بھی دو برس سے

اردوئے معلی صفحہ ۱۴۲

[1] اصل حال یہ ہے کہ جب مرزا نے اپنا دعویٰ کلکتہ میں پیش کیا تو سرکار نے اس کا فیصلہ سرجان مالکم صاحب گورنر بمبئی کو سپرد کیا۔ کیونکہ جب جاگیروں کی سندیں لکھی گئی تھیں تو وہ لارڈ لیک صاحب کمانڈر انچیف ہندوستان کے سکریٹری تھے اور اُنھیں کے دستخط سے اسناد جاری ہوئے تھے۔ جب اُن کے پاس یہ مقدمہ اور اُس کے کاغذات پہنچے تو اُنھوں نے لکھا کہ مدعی غلط کہتا ہے۔ نواب احمد بخش خاں ہمارا قدیمی دوست تھا اور بڑا راستباز امیر تھا۔ اُس پر یہ اتہام ضد سے کیا گیا ہے۔ ہم نے پانچ ہزار روپیہ سالانہ لکھا تھا جس میں سے ۳ ہزار مدعی اور اُس کے متوسلین کے لئے تھے اور دو ہزار خواجہ حاجی اور اُس کے وارثوں کے نام تھے۔ پھر مرزا صاحب نے ولایت میں مرافعہ کیا وہاں بھی کچھ نہ ہوا۔ بموجب تحقیق نواب ضیاء الدین خاں بہادر دام ظلہم العالی کے تحریر ہوا +

زیادہ نہ جئے - یعنی اگرچہ اب تک جیتے ہیں - مگر سلطنت جاتی رہی اور تباہی سلطنت دو ہی برس میں ہوئی - دلّی کی سلطنت کچھ سخت جان تھی - ۷ برس مجھ کو روٹی دے کر بگڑی - ایسے طالع مربّی کُش اور مُحسن سوز کہاں پیدا ہوتے ہیں - اب جو میں والیِ دکن کی طرف رجوع کروں یاد رہے کہ متوسط یا مر جائے گا یا معزول ہو جائے گا - اور اگر یہ دونوں امر واقع نہ ہوئے تو کوشش اُس کی ضائع جائے گی - والیِ شہر مجھ کو کچھ نہ دے گا اور احیاناً اگر اُس نے سلوک کیا تو ریاست خاک میں مل جائیگی - ملک میں گدھے کے ہل پھر جائیں گے" +

مرزا کلکتہ جاتے ہیں

غرض کہ نواب احمد بخش خاں بہادر کی تقسیم سے مرزائے مرحوم نالاں ہو کر ۱۸۳۰ء میں کلکتہ گئے اور گورنر جنرل سے ملنا چاہا - وہاں دفتر دیکھا گیا - اس میں سے ایسا کچھ معلوم ہوا کہ اعزاز خاندانی کے ساتھ ملازمت ہو جائے - اور ۷ پارچہ خلعت - تین رقم جیغۂ مرصّع - مالائے مروارید - ریاست وودمانی کی رعایت سے مقرر ہوا +

غرض مرزا کلکتہ سے ناکام پھرے اور ایّام جوانی ابھی پورے نہ ہوئے تھے کہ بزرگوں کا سرمایہ تمام کر کے دلّی میں آئے - یہاں اگرچہ گزران کا طریقہ امیرانہ شان سے تھا - اور امیروں سے امیرانہ ملاقات تھی - مگر اپنے علوّ حوصلہ اور بلند نظری کے ہاتھوں سے تنگ رہتے تھے - پھر بھی طبیعت ایسی شگفتہ پائی تھی کہ اِن دقتوں کو بھی خاطر میں نہ لاتے تھے - اور ہمیشہ ہنس کھیل کر غم غلط کر دیتے تھے - کیا خوب فرمایا ہے ؎

مے سے غرض نشاط ہے کس رُو سیاہ کو یک گونہ بیخودی مجھے دن رات چاہیے

رامپور کا تعلق

جب دلّی تباہ ہوئی تو زیادہ تر مصیبت پڑی - اِدھر قلعہ کی تنخواہ جاتی رہی - اُدھر پنشن بند ہو گئی - اور اُنھیں رام پور جانا پڑا - نواب صاحب سے ۲۰ - ۲۵ برس کا تعارف تھا - یعنی ۱۸۵۵ء میں ان کے شاگرد ہوئے تھے - اور ناظم تخلص قرار پایا تھا - وہ بھی

گاہے گاہے غزل بھیج دیتے تھے۔ یہ اصلاح دے کر بھیج دیتے تھے۔ کبھی کبھی روپیہ بھی آتا تھا۔ اُس وقت قلعہ کی تنخواہ جاری سرکاری پنشن کھُلی ہوئی تھی۔ اُن کی عنایت فتوح غیبی گنی جاتی تھی۔ جب دلّی کی صورت بگڑی تو زندگانی کا مدار اس پر ہو گیا۔ نواب صاحب نے ۱۸۵۹ء سے سَو روپیہ مہینا کر دیا۔ اور اُنھیں بہت تاکید سے بُلایا۔ یہ گئے تو تعظیم خاندانی کے ساتھ دوستانہ و شاگردانہ بغلگیر ہو کر ملاقات کی۔ اور جب تک رکھا کمال عزّت کے ساتھ رکھا۔ بلکہ سو روپیہ مہینا ضیافت کا زیادہ کر دیا۔ مرزا کو دلّی کے بغیر چین کہاں؟ چند روز کے بعد رخصت ہو کر پھر وہیں چلے آئے۔ چونکہ پنشن سرکاری بھی جاری ہو گئی تھی۔ اس لئے چند سال زندگی بسر کی +

آخر عمر میں بڑھاپے نے بہت عاجز کر دیا۔ کانوں سے سُنائی نہ دیتا تھا۔ نقش تصویر کی طرح لیٹے رہتے تھے۔ کسی کو کچھ کہنا ہوتا تھا تو لکھ کر رکھ دیتا تھا۔ وہ دیکھ کر جواب دے دیتے تھے۔ خوراک دو تین برس پہلے یہ رہ گئی تھی کہ صبح کو پانچ سات بادام کا شیرہ۔ ۱۲ بجے آب گوشت۔ شام کو ۳ کباب تلے ہوئے۔ آخر ۷۳ برس کی عمر ۱۸۶۹ء ۱۲۸۵ھ میں جہان فانی سے انتقال کیا۔ اور بندۂ آثم نے تاریخ لکھی آہ غالب بمرد۔ مرنے سے چند روز پہلے یہ شعر کہا تھا۔ اور اکثر یہی پڑھتے رہتے تھے:۔

دمِ واپسیں بر سرِ راہ ہے عزیزو اب اللہ ہی اللہ ہے

مرزا صاحب کے حالات اور طبعی عادات

اس میں کچھ شک نہیں کہ مرزا اہل ہند میں فارسی کے باکمال شاعر تھے۔ مگر علوم درسی کی تحصیل طالب علمانہ طور سے نہیں کی۔ اور حق پوچھو تو یہ بڑی فخر کی بات ہے کہ ایک امیرزادہ کے سر سے بچپن میں بزرگوں کی تربیت کا ہاتھ اُٹھ جائے اور وہ فقط طبعی ذوق سے اپنے تئیں اس درجۂ کمال تک پہنچائے۔ وہ کیسی طبع خداداد

لایا ہوگا۔ جس نے اُس کے فکر میں یہ بلند پروازی۔ دماغ میں یہ معنی آفرینی۔ خیالات میں ایسا انداز۔ لفظوں میں نئی تراش۔ اور ترکیب میں انوکھی روش پیدا کی۔ جابجا خود اُن کا قول ہے۔ اور حقیقت میں لطف سے خالی نہیں کہ زبان فارسی سے مجھے مناسبت ازلی ہے۔ ایک اور جگہ فرماتے ہیں کہ میری طبیعت کو اس زبان سے ایک قدرتی لگاؤ ہے۔ مفتی میر عباس صاحب کو قاطع برہان بھیج کر خط لکھا ہے۔ اُس میں فرماتے ہیں" دیباچہ اور خاتمہ میں جو کچھ لکھ آیا ہوں سب سچ ہے۔ کلام کی حقیقت کی داد جُدا چاہتا ہوں۔ نگارش لطافت سے خالی نہ ہوگی۔ گذارش لطافت سے خالی نہ ہوگی۔ علم و ہنر سے عاری ہوں لیکن پچپن برس سے محو سخن گذاری ہوں۔ مبدء فیّاض کا مجھ پر احسان عظیم ہے۔ ماخذ میرا صحیح اور طبع میری سلیم ہے۔ فارسی کے ساتھ ایک مناسبت ازلی اور سرمدی لایا ہوں۔ مطابق اہل پارس کے منطق کا مزہ بھی ابدی لایا ہوں +

اکتساب فارسی کے قدرتی سامان

ہرمزد نام ایک پارسی ژند و پاژند کا عالم تھا۔ اس نے اسلام اختیار کیا اور عبدالصمد اپنا نام رکھا۔ ایام سیاحت میں ہندوستان کی طرف آنکلا۔ اور مرزا سے بھی ملاقات ہوئی اگرچہ اُن کی عمر اُس وقت ۱۴ برس کی تھی مگر وہی مناسبت ازلی طبیعت میں تھی۔ جس نے اُسے کھینچا اور دو برس تک گھر میں مہمان رکھ کر اکتساب کمال کیا۔ اِس روشن ضمیر کے فیضان صحبت کا اُنھیں فخر تھا۔ اور حقیقت میں یہ امر فخر کے قابل ہے +

تصویر کا ذکر

میں نے چاہا کہ مرزا صاحب کی تصویر الفاظ و معانی سے کھینچوں۔ مگر پھر یاد آیا کہ اُنھوں نے ایک جگہ اسی رنگ روغن سے اپنی تصویر آپ کھینچی ہے۔ میں اس سے زیادہ کیا کرلوں گا۔ اس کی نقل کافی ہے۔ مگر اول اتنا سُن لو کہ مرزا حاتم علی مہر تخلص ایک شخص آگرہ میں تھے۔ مرزا کے اواخر عمر میں اس ہم وطن بھائی سے خط و کتابت جاری ہوئی۔ وہ ایک وجیہ اور طرحدار جوان تھے اِن سے اُن سے دید

واادید نہ ہوئی تھی۔ لیکن کسی زمانہ کی ہموطنی۔ شعرگوئی۔ ہم مذہبی اور اتحاد خیالات کے تعلق سے شاید کسی جلسہ میں مرزا نے کہا کہ مرزا حاتم علی مہر کو سُنتا ہوں کہ طرحدار آدمی ہیں۔ دیکھنے کو جی چاہتا ہے۔ انھیں جو یہ خبر پہنچی تو مرزا کو خط لکھا اور اپنا حُلیہ بھی لکھا اب اُس کے جواب میں جو مرزا آپ اپنی تصویر کھینچتے ہیں۔ اسے دیکھنا چاہیے "بھائی تمھاری طرحداری کا ذکر میں نے مغل جان سے سُنا تھا۔ جس زمانہ میں کہ وہ حامد علی خاں کی نوکر تھی۔ اور اُس میں مجھ میں بے تکلفانہ ربط تھا۔ تو اکثر مغل سے پہروں اختلاط ہوا کرتے تھے۔ اُس نے تمھارے شعر اپنی تعریف کے بھی مجھ کو دکھائے۔ بہرحال تمھارا حلیہ دیکھ کر تمھارے کشیدہ قامت ہونے پر مجھ کو رشک نہ آیا۔ کس واسطے کہ میرا قد بھی درازی میں انگشت نما ہے۔ تمھارے گندمی رنگ پر رشک نہ آیا۔ کس واسطے کہ جب میں جیتا تھا تو میرا رنگ چنپئی تھا اور دیدہ ور لوگ اُس کی ستایش کیا کرتے تھے۔ اب جو کبھی مجھ کو وہ اپنا رنگ یاد آتا ہے تو چھاتی پر سانپ سا پھر جاتا ہے۔ ہاں مجھ کو رشک آیا اور میں نے خونِ جگر کھایا تو اس بات پر کہ (تمھاری) ڈاڑھی خوب گھُٹی ہوئی ہے۔ وہ مزے یاد آ گئے۔ کیا کہوں جی پر کیا گذری۔ بقول شیخ علی حزیں :-

تا دست رسم بود زدم چاکِ گریباں　　　شرمندگی از خرقۂ پشمینہ ندارم

(میرے) جب ڈاڑھی موچھ میں بال سفید آ گئے۔ تیسرے دن چیونٹی کے انڈے گالوں پر نظر آنے لگے۔ اس سے بڑھ کر یہ ہوا کہ آگے کے دو دانت ٹوٹ گئے۔ ناچار (میں نے) مِسّی بھی چھوڑ دی۔ اور ڈاڑھی بھی۔ مگر یہ یاد رکھئے کہ اس بھونڈے شہر میں (یعنی دلی میں) ایک وردی ہے عام۔ مُلّا۔ حافظ۔ بساطی۔ نیچہ بند۔ دھوبی۔ سقّہ۔ بھٹیارہ۔ جولاہہ۔ کنجڑہ۔ مُنہ پر ڈاڑھی۔ سر پر بال۔ میں نے جس دن ڈاڑھی رکھی۔ اُسی دن سر منڈایا۔" اس فقرے سے بھی معلوم ہوا کہ اپنا انداز سب سے الگ رکھنا چاہتے تھے۔ لباس اُن کا اکثر اہل ولایت کا ہوتا تھا۔ سر پر اگرچہ کلاہ پاپاخ نہ تھی۔ مگر

لباس

لبی ٹوپی سیاہ پوستین کی ہوتی تھی۔ اور ایسا ضرور چاہئے تھا کیونکہ وہ فارسی نویسی نہ فقط ذوق بلکہ عشق دلی کے ساتھ نباہتے تھے اور لباس و گفتار کی کچھ خصوصیت نہیں۔ وہ اپنی قدامت کی ہر بات سے محبت رکھتے تھے۔ خصوصاً خاندان کے اعزازوں کو ہمیشہ جانکاہ عرق ریزیوں کے ساتھ بچاتے رہے۔ اس اعزاز پر کہ جو اُن کے پاس باقی تھا۔ دو دفعہ آسمانی صدمہ پہنچے۔ اول جب کہ چچا کا انتقال ہوا۔ دوسرے جب ۱۸۵۷ء میں ناکردہ گناہ بغاوت کے جرم میں پنشن کے ساتھ کرسی دربار اور خلعت بند ہوا۔ اُردوئے معلّٰی میں بیسیوں دوستوں کے نام خط ہیں۔ کوئی اس کے ماتم سے خالی نہیں۔ ان کے لفظوں سے اس غم میں خون ٹپکتا ہے۔ اور دل پر جو گذرتی ہوگی وہ تو خدا ہی کو خبر ہے۔ آخر پھر اُن کی جگہ اور اپنا حق لیا۔ اور بزرگوں کے نام کو قائم رکھا۔

خاندان کی محبت

۱۸۴۲ء میں گورنمنٹ انگلشیہ کو دہلی کالج کا انتظام ازسرِنو منظور ہوا۔ ٹامسن صاحب جو کئی سال تک اضلاع شمال و مغرب کے لفٹننٹ گورنر بھی رہے۔ اُس وقت سکریٹری تھے۔ وہ مدرسین کے امتحان کے لئے دلی آئے۔ اور چاہا کہ جس طرح سو روپے مہینے کا ایک مدرس عربی ہے۔ ایسا ہی ایک فارسی کا بھی ہو۔ لوگوں نے چند کاملوں کے نام بتائے۔ اُن میں مرزا کا نام بھی آیا۔ مرزا صاحب حسب الطلب تشریف لائے۔ صاحب کو اطلاع ہوئی۔ مگر پالکی سے اُتر کر اس انتظار میں ٹھہرے کہ حسب دستور قدیم صاحب سکریٹری استقبال کو تشریف لائیں گے۔ جب کہ نہ وہ اُدھر سے آئے نہ یہ اِدھر سے گئے۔ اور دیر ہوئی تو صاحب سکریٹری نے جمعدار سے پوچھا وہ پھر باہر آیا کہ آپ کیوں نہیں چلتے۔ انہوں نے کہا کہ صاحب استقبال کو تشریف نہیں لائے۔ میں کیونکر جاتا۔ جمعدار نے جاکر پھر عرض کی۔ صاحب باہر آئے اور کہا کہ جب آپ دربار گورنری میں بہ حیثیت ریاست تشریف لائیں گے تو آپ کی وہ تعظیم ہوگی۔ لیکن اِس وقت آپ نوکری کے لئے آئے ہیں اُس تعظیم کے مستحق

نہیں۔ مرزا صاحب نے فرمایا کہ گورنمنٹ کی ملازمت باعث زیادتی اعزاز سمجھتا ہوں نہ یہ کہ بزرگوں کے اعزاز کو بھی گنوا بیٹھوں! صاحب نے فرمایا کہ ہم آئین سے مجبور ہیں۔ مرزا صاحب رخصت ہو کر چلے آئے صاحب موصوف نے مومن خاں صاحب کو بلایا۔ اُن سے کتاب پڑھوا کر سُنی۔ اور زبانی باتیں کر کے اسّی روپیہ تنخواہ قرار دی۔ انھوں نے سو روپیہ سے کم منظور نہ کئے۔ صاحب نے کہا کہ سو روپے لو تو ہمارے ساتھ چلو۔ اُن کے دل نے نہ مانا کہ دلّی کو ایسا سستا بیچ ڈالیں۔ مرزا کے کھلے ہوئے دل اور کھلے ہوئے ہاتھ نے ہمیشہ مرزا کو تنگ رکھا۔ مگر اس تنگ دستی میں بھی امارت کے تمغے قائم تھے۔ چنانچہ اُردوئے معلّٰی کے اکثر خطوط سے یہ حال آئینہ ہے۔ مرزا تفتہ[1] اپنے شاگرد رشید کو ایک خط میں لکھتے ہیں۔ "سو روپیہ کی ہُنڈی وصول کر لی۔ ۲۴ روپیہ داروغہ کی معرفت اُٹھے تھے وہ دئے۔ ۵۰ روپیہ محل میں بھیج دئے۔ ۲۶ باقی رہے وہ بکس میں رکھ لئے۔ کلیان سودا لینے بازار گیا ہے۔ جلد آ گیا تو آج ورنہ کل یہ خط ڈاک میں بھیج دوں گا۔ خدا تم کو جیتا رکھے۔ اور اجر دے۔ بھائی بری آ بنی ہے۔ انجام اچھا نظر نہیں آتا۔ قصہ مختصر یہ کہ قصہ تمام ہوا +

کیدار ناتھ آپ کا دیوان تھا۔ اسی عالم میں ماہ بماہ آ کر چٹھا بانٹ دیتا تھا۔ آپ کہیں سفر میں گئے ہیں تو اُس کے لئے خطوط میں بار بار احکام بھیجتے ہیں۔ چنانچہ ایک خط میں لکھتے ہیں۔" ہنڈوی میں ۱۲ دن کی میعاد تھی ۶ دن گذر گئے تھے ۶ دن باقی تھے۔ مجکو صبر کہاں۔ متی کاٹ کر روپے لے لئے۔ قرض متفرق سب ادا ہوا۔ بہت سبکدوش ہو گیا۔ آج میرے پاس معاللعہ کے روپے نقد بکس میں ہیں۔ اور ۴ بوتل شراب کی اور ۳ شیشے گلاب کے توشہ خانہ میں موجود ہیں۔ اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ عَلٰی اِحْسَانِہٖ" +

[1] مرزا صاحب سے بھی عمر میں بڑے معلوم ہوتے تھے۔ فارسی کے عاشق تھے۔ اس لئے باوجود ہندو ہونے کے مرزا تفتہ کے نام سے بڑے خوش ہوتے تھے۔ دیوان قصائد اور دیوان غزلیات چھپوا دیا تھا۔ فارسی ہی شعر کہتے تھے +

ایک اور جگہ اپنی بیماری کا حال کسی کو لکھتے ہیں "محل سرا اگرچہ دیوان خانہ کے بہت قریب ہے۔ پر کیا امکان کہ جو چل سکوں۔ صبح کو نو بجے کھانا یہیں آجاتا ہے۔ پلنگ پر سے کھسل پڑا۔ ہاتھ منہ دھو کر کھانا کھایا۔ پھر ہاتھ دھوئے کلی کی۔ پلنگ پر جا پڑا۔ پلنگ کے پاس حاجتی لگی رہتی ہے۔ اُٹھا اور حاجتی میں پیشاب کر لیا۔ اور پڑ رہا" +

تعلقات خانہ داری سے بہت دق ہوتے تھے۔

نواب الٰہی بخش خاں مرحوم کی صاحبزادی سے مرزا صاحب کی شادی ہوئی اور اُس وقت ۱۳ برس کی عمر تھی۔ باوجودیکہ اوضاع و اطوار آزادانہ رکھتے تھے لیکن آخر صاحب خاندان تھے۔ گھرانے کی لاج پر خیال کر کے بی بی کا پاس خاطر بہت مدنظر رکھتے تھے۔ پھر بھی اس قید سے کہ خلاف طبع تھی۔ جب بہت دق ہوتے تھے تو ہنسی میں ٹال لیتے تھے۔ چنانچہ دوستوں کی زبانی بعض نقلیں بھی سُنیں۔ اور اُن کے خطوط سے بھی اکثر جگہ پایا جاتا ہے۔ ایک قدیمی شاگرد سے ایسے معاملات میں بے تکلفی تھی۔ اس نے اُمراؤ سنگھ نام ایک اور شاگرد کی بی بی کے مرنے کا حال مرزا صاحب کو لکھا اور یہ بھی لکھا کہ ننھے ننھے بچے ہیں۔ اب اور شادی نہ کرے تو کیا کرے؟ پھر بچے کون پالے؟ اس شخص کی ایک بی بی پہلے مر چکی تھی۔ یہ دوسری بی بی مری تھی۔ اب حضرت اُس کے جواب میں تحریر فرماتے ہیں "امراؤ سنگھ کے حال پر اُس کے واسطے رحم اور اپنے واسطے رشک آتا ہے۔ اللہ اللہ ایک وہ ہیں کہ دو بار اُن کی بیڑیاں کٹ چکی ہیں۔ اور ایک ہم ہیں کہ ایک اوپر پچاس برس سے جو پھانسی کا پھندا گلے میں پڑا ہے تو نہ پھندا ہی ٹوٹتا ہے نہ دم ہی نکلتا ہے۔ اُس کو سمجھاؤ کہ بھائی تیرے بچوں کو میں پال لوں گا تو کیوں بلا میں پھنستا ہے" +

جب اُن کی پنشن کھلی تو ایک اور شخص کو لکھتے ہیں "تجھ کو میری جان کی قسم اگر میں تنہا ہوتا تو اس وجہ قلیل میں کیسا فارغ البال وخوش حال رہتا" مرزا صاحب نے فرزندان روحانی یعنی پاک خیالات اور عالی مضامین سے ایک انبوہ بے شمار

اپنی نسل میں یادگار چھوڑا۔ مگر افسوس کہ جس قدر اُدھر سے خوش نصیب ہوئے۔ اُسی قدر فرزندان ظاہری کی طرف سے بے نصیب ہوئے۔ چنانچہ ایک جگہ فرماتے ہیں "سات بچے ہوئے۔ مگر برس برس دن کے پس و پیش میں سب ملکِ عدم کو چلے گئے"۔ اُن کی بی بی کے بھانجے الٰہی بخش خاں مرحوم کے نواسے زین العابدین خاں تھے وہ بھی شعر کہا کرتے تھے۔ اور عارف تخلص کرتے تھے۔ عارف جوان مر گئے۔ اور دو ننھے ننھے بچے یادگار چھوڑے۔ بی بی اُن بچوں کو بہت چاہتی تھیں۔ اس لئے مرزا نے اُنھیں اپنے بچوں کی طرح پالا۔ بڑھاپے میں اُنھیں گلے کا ہار کئے پھرتے تھے۔ جہاں جاتے وہ پالکی میں ساتھ ہوتے تھے۔ اُن کے آرام کے لئے آپ بے آرام ہوتے تھے۔ ان کی فرمائشیں پوری کرتے تھے۔ افسوس کہ مرزا کے بعد دونوں جوان مر گئے۔ نواب احمد بخش خاں مرحوم کے رشید فرزند مرزا صاحب کی تکلیف نہ دیکھ سکتے تھے۔ کمال کی دولت اُن سے لیتے تھے۔ دُنیا کی ضرورتوں میں اُنھیں آرام دیتے تھے۔ چنانچہ نواب ضیاءُ الدین خاں صاحب شاگرد ہیں۔ نواب امین الدین صاحب مرحوم والیٔ لوہارو بھی آداب خوردانہ کے ساتھ خدمت کرتے تھے۔ نواب علاء الدین خاں والیٔ حال اُس وقت ولیعہد تھے۔ بچپن سے شاگرد ہیں۔ جناب مرزا صاحب نواب علاءُ الدین خاں صاحب کو لکھتے ہیں۔ میاں! بڑی مصیبت میں ہوں۔ محل سرا کی دیواریں گر گئی ہیں۔ پاخانہ ڈھ گیا۔ چھتیں ٹپک رہی ہیں۔ تمھاری پھوپھی[1] کہتی ہیں کہ ہائے دبی ہائے مری دیوان خانہ کا حال محلسرا سے بدتر ہے۔ میں مرنے سے نہیں ڈرتا۔ فقدان راحت سے گھبرا گیا ہوں۔ ابر دو گھنٹے برسے تو چھت چار گھنٹے برستی ہے۔ مالک اگر چاہے کہ مرمت کرے تو کیونکر کرے۔ مینہ کھلے تو سب کچھ ہو اور پھر اثنائے مرمت میں میں بیٹھا کس طرح رہوں۔ اگر تم سے ہو سکے تو برسات تک بھائی سے مجھ کو وہ حویلی جس میں میر حسن

[1] نواب الٰہی بخش خاں مرحوم کی بیٹی۔ نواب احمد بخش خاں مرحوم کی حقیقی بھتیجی ہوئیں۔ وہ ان کی بی بی تھیں +

رہتے تھے۔ اپنی پھوپھی کے رہنے کو۔ اور کوٹھی میں سے وہ بالاخانہ مع دالان زیرین جو الٰہی بخش مرحوم کا مسکن تھا۔ میرے رہنے کو دلوا دو۔ برسات گذر جائیگی۔ مرمت ہو جائے گی۔ پھر صاحب اور میم اور باباؔ لوگ اپنے قدیم مسکن میں آرہیں گے۔ تمھارے والد کے ایثار اور عطا کے جہاں مجھ پر احسان ہیں۔ ایک یہ مروّت کا احسان میرے پایان عمر میں اور بھی سہی۔ غالب"+

مرزا کثیر الاحباب تھے۔ دوستوں سے دوستی کو ایسا نباہتے تھے کہ اپنا یت سے زیادہ اُن کی دوست پرستی خوش مزاجی کے ساتھ رفیق ہوکر ہر وقت ایک دائرہ شرفا اور رئیس زادوں کا ان کے گرد دکھاتی تھی۔ اُنہی سے غم غلط ہوتا تھا۔ اور اسی میں اُن کی زندگی تھی۔ لطف یہ کہ دوستوں کے لڑکوں سے بھی وہی باتیں کرتے تھے۔ جو دوستوں سے۔ اُدھر ہونہار نوجوانوں کا مؤدب بیٹھنا۔ اِدھر سے بزرگانہ لطیفوں کا پھول برسانا۔ اُدھر سعادت مندوں کا چُپ مسکرانا۔ اور بولنا تو حدِ ادب سے قدم نہ بڑھانا۔ ادھر پھر بھی شوخی طبع سے باز نہ آنا۔ ایک عجیب کیفیت رکھتا تھا۔ بہرحال انہی لطافتوں اور ظرافتوں میں زمانے کی مصیبتوں کو ٹالا۔ اور ناگوار کو گوارا کر کے ہنستے کھیلتے چلے گئے۔ چنانچہ میر مہدی۔ میر سرفراز حسین۔ نواب یوسف مرزا وغیرہ اکثر شریف زادوں کے لئے خطوط اُردوئے معلّٰی میں ہیں۔ جو کہ ان جلسوں کے فوٹو گراف دکھلاتے ہیں+

زمانہ کی بے وفائی نے مرزا کو وہ فارغ البالی نصیب نہ کی۔ جو ان کے خاندان اور کمال کے لئے شایاں تھی۔ اور انہی دونوں باتوں کا مرزا کو بہت خیال تھا۔ لیکن اس کے لئے وہ اپنے جی کو جلا کر دلتنگ بھی نہ ہوتے تھے۔ بلکہ ہنسی میں اُڑا دیتے تھے۔ اِن دونوں باتوں کی سند میں دو خط[2] نقل کرتا ہوں۔ ایک خط میر مہدی صاحب کے نام ہے کہ ایک شریف عالی خاندان ہیں۔ اور اُن کے رشید شاگرد

[1] چونکہ کوٹھی کا مکان رہنے کو مانگا ہے۔ اس لئے اپنے تئیں صاحب اور بی بی کو میم صاحب اور بچوں کو بابا لوگ بنایا+ [2] دیکھو اُردوئے معلّٰی کے خطوط +

ہیں۔ دوسرا خط منشی ہرگوپال صاحب تفتہ تخلص کے نام ہے جن کا ذکر خیر مجملاً پہلے لکھا گیا ہے +

"میر مہدی تم میری عادت کو بھول گئے۔ ماہ مبارک رمضان میں کبھی مسجد جامع کی تراویح ناغہ ہوئی ہے؟ میں اس مہینے میں رام پور کیونکر رہتا۔ نواب صاحب مانع رہے اور بہت منع کرتے رہے۔ برسات کے آموں کا لالچ دیتے رہے۔ مگر بھائی میں ایسے انداز سے چلا کہ چاندرات کے دن یہاں آ پہنچا۔ یکشنبہ کو غرۂ ماہ معظم[1] ہوا۔ اُسی دن سے ہر صبح کو حامد علی خاں کی مسجد میں جا کر جناب مولوی جعفر علی صاحب سے قرآن سُنتا ہوں۔ شب کو مسجد جامع میں جا کر نماز تراویح پڑھتا ہوں۔ کبھی جو جی میں آتی ہے تو وقتِ صوم مہتاب باغ میں جا کر روزہ کھولتا ہوں۔ اور سرد پانی پیتا ہوں۔ واہ واہ کیا اچھی عمر بسر[1] ہوتی ہے۔ اب اصل حقیقت سُنو۔ لڑکوں کو ساتھ لے گیا تھا۔ وہاں اُنھوں نے میرا ناک میں دم کر دیا۔ تنہا بھیج دینے میں وہم آیا کہ خدا جانے اگر کوئی امر حادث ہو تو بدنامی عمر بھر رہے۔ اس سبب سے جلد چلا آیا۔ ورنہ گرمی برسات وہیں کاٹتا۔ اب بشرط حیات جریدہ بعد برسات جاؤں گا۔ اور بہت دنوں تک یہاں نہ آؤں گا۔ قرار داد یہ ہے کہ نواب صاحب جولائی ۱۸۵۹ء سے کہ جس کو یہ دسواں مہینا ہے۔ سو روپیہ مجھے ماہ بماہ بھیجتے ہیں۔ اب میں جو وہاں گیا۔ تو سو روپیہ مہینا بنام دعوت اور دیا۔ یعنی رام پور رہوں تو دو سو روپیہ مہینا پاؤں۔ اور دلّی رہوں تو سَو روپے۔ بھائی! سو دو سو میں کلام نہیں۔ کلام اس میں ہے کہ نواب صاحب دوستانہ و شاگردانہ دیتے ہیں مجھ کو نوکر نہیں سمجھتے ہیں۔ ملاقات بھی دوستانہ رہی۔ معانقہ و تعظیم جس طرح احباب میں رسم ہے۔ وہ صورت ملاقات کی ہے۔ لڑکوں سے میں نے نذر دلوائی تھی۔ پس بہرحال غنیمت ہے۔ رزق کے اچھی طرح ملنے کا شکریہ چاہیے۔ کمی

نواب صاحب رام پور دوستانہ ملاقات فرماتے تھے۔

[1] غرۂ رمضان سے لے کر یہاں تک فقط شوخی طبع ہے۔ کیونکہ جو جو باتیں ان فقروں میں ہیں مرزا اُن سے کوسوں بھاگتے تھے۔ اور یہ خط غدر کے بعد کا ہے۔ اُس وقت یہ باتیں دلّی میں خواب و خیال ہو گئی تھیں +

کا شکوہ کیا؟ انگریز کی سرکار سے دس ہزار روپیہ سال ٹھیرے اس میں سے مجھ کو ملے ساڑھے سات سو روپیہ سال۔ ایک صاحب نے نہ دئے مگر تین ہزار روپیہ سال عزت میں وہ پایا جو رئیس زادوں کے واسطے ہوتا ہے بنا رہا۔ خاں صاحب بسیار مہربان دوستان القاب۔ خلعت ہفت پارچہ اور جیغہ و سرپیچ و مالائے مروارید بادشاہ اپنے فرزندوں کے برابر پیار کرتے تھے۔ بخشی۔ ناظر۔ حکیم کسی سے توقیر کم نہیں۔ مگر فائدہ وہی قلیل۔ سو میری جان! یہاں بھی وہی نقشہ ہے۔ کوٹھری میں بیٹھا ہوں۔ ٹٹی لگی ہوئی ہے۔ ہوا آرہی ہے۔ پانی کا جھجر دھرا ہوا ہے۔ حقہ پی رہا ہوں۔ یہ خط لکھ رہا ہوں۔ تم سے باتیں کرنے کو جی چاہا۔ یہ باتیں کر لیں ÷

القاب و اسلام اور خلعت

خط بنام منشی ہرگوپال تفتہ۔ "بس اب تم اسکندر آباد میں رہے۔ کہیں اور کیوں جاؤ گے۔ بنک گھر کا روپیہ کھا چکے ہو۔ اب کہاں سے کھاؤ گے۔ میاں! نہ میرے سمجھانے کو دخل ہے نہ تمھارے سمجھنے کی جگہ ہے۔ ایک چرخ ہے کہ وہ چلا جاتا ہے جو ہونا ہے وہ ہوا جاتا ہے۔ اختیار ہو تو کچھ کیا جائے۔ کہنے کی بات ہو تو کچھ کہا جائے۔ **مرزا عبدالقادر بیدل** خوب کہتا ہے:

رغبت جاہ چہ و نفرتِ اسباب کدام   زیں ہوسہا بگزر یا نگزر۔ میگزرد

مجکو دیکھو کہ نہ آزاد ہوں نہ مقید۔ نہ رنجور ہوں نہ تندرست۔ نہ خوش ہوں نہ ناخوش۔ نہ مردہ ہوں نہ زندہ۔ جئے جاتا ہوں۔ باتیں کئے جاتا ہوں۔ روٹی روز کھاتا ہوں۔ شراب گاہ گاہ پئے جاتا ہوں۔ جب موت آئے گی مر بھی رہوں گا۔ نہ شکر ہے نہ شکایت جو تقریر ہے بہ سبیل حکایت ہے" ÷

مرزا صاحب کا مذہب کیا تھا۔

مرزا کے تمام خاندان کا اور بزرگوں کا مذہب سنت و جماعت تھا۔ مگر اہل راز اور تصنیفات سے بھی ثابت ہے کہ ان کا مذہب شیعہ تھا۔ اور لطف یہ تھا کہ ظہور اس کا جوش محبت میں تھا۔ نہ کہ تبرا و تکرار میں۔ چنانچہ اکثر لوگ انھیں نصیری کہتے تھے۔ اور وہ سُن کر خوش ہوتے تھے۔ ایک جگہ کہتے ہیں ÷

منصور فرقۂ علی اللّٰہیاں منم آوازۂ انا اسد اللہ بر افگنم

تمام اقربا اور حقیقی دوست سُنّت و جماعت تھے۔ لیکن ان کی اپنایت میں کسی طرح کی دوئی نہ معلوم ہوتی تھی۔ مولانا فخرالدین کے خاندان کے مرید بھی تھے۔ دربار اور اہل دربار میں کبھی اس معاملہ کو نہیں کھولتے تھے۔ اور یہ طریقہ دہلی کے اکثر خاندانوں کا تھا۔ **تصنیفات اُردو** میں تقریباً ۱۸۰۰ شعر کا ایک دیوان انتخابی ہے کہ ۱۸۴۹ء میں مرتب ہو کر چھپا۔ اس میں کچھ تمام اور کچھ ناتمام غزلیں ہیں۔ اور کچھ متفرق اشعار ہیں۔ غزلوں کے تخمیناً ۱۵۰۰ شعر۔ قصیدوں کے ۱۶۲ شعر۔ مثنوی ۳۳ شعر۔ متفرقات قطعوں کے ۱۱۱ شعر۔ رباعیاں ۱۶۔ ۲ تاریخیں جنکے ۴ شعر۔ جس قدر عالم میں مرزا کا نام بلند ہے اُس سے ہزاروں درجہ عالم معنی میں کلام بلند ہے۔ بلکہ اکثر شعر ایسے اعلیٰ درجۂ رفعت پر واقع ہوئے ہیں کہ ہمارے نارسا ذہن وہاں تک نہیں پہنچ سکتے۔ جب ان شکایتوں کے چرچے زیادہ ہوئے تو اُس ملک بے نیازی کے بادشاہ نے کہ اقلیم سخن کا بھی بادشاہ تھا۔ اپنی غزل کے ایک شعر سے سب کو جواب دے دیا:۔

دیوان اردو پر رائے

نہ ستایش کی تمنا نہ صلہ کی پروا نہ سہی گر مرے اشعار میں معنی نہ سہی

اور ایک رباعی بھی کہی:۔

مشکل ہے زبس کلام میرا اے دل سُن سُن کے اُسے سخنورانِ کامل
آساں کہنے کی کرتے ہیں فرمایش گویم مشکل وگرنہ گویم مشکل

ایک دن استاد مرحوم سے مرزا صاحب کے انداز نازک خیالی کا۔ اور فارسی ترکیبوں کا اور لوگوں کی مختلف طبیعتوں کا ذکر تھا۔ میں نے کہا کہ بعض شعر صاف بھی نکل جاتا ہے تو قیامت ہی کر جاتا ہے۔ فرمایا خوب! پھر کہا کہ جو مرزا کا شعر ہوتا ہے۔ اس کی لوگوں کو خبر بھی نہیں ہوتی۔ شعر اُن کے تمھیں میں سناتا ہوں۔ کئی کئی متفرق شعر پڑھے تھے۔ ایک اب تک خیال میں ہے:۔

دریائے معاصی تنک آبی سے ہوا خشک   میرا سرِ دامن بھی ابھی تر نہ ہوا تھا

اس میں کلام نہیں کہ وہ اپنے نام کی تاثیر سے مضامین و معانی کے بیشہ کے شیر تھے۔ دو باتیں ان کے انداز کے ساتھ خصوصیت رکھتی ہیں۔ اول یہ کہ معنی آفرینی اور نازک خیالی اُن کا شیوۂ خاص تھا۔ دوسرے چونکہ فارسی کی مشق زیادہ تھی اور

اوج تخلص۔ عبداللہ خاں نام ۴۰۔ ۵۰ برس کے مشاق تھے۔ ایسے بلند مضمون اور نازک خیال پیدا کرتے تھے کہ قابو میں نہ لا سکتے تھے۔ اور انھیں عمدہ الفاظ میں ایسی چُستی اور درستی سے باندھتے تھے کہ وہ مضمون سما بھی نہ سکتا تھا اس لئے کبھی تو مطلب کچھ کا کچھ ہو جاتا تھا اور کبھی کچھ بھی نہ رہتا تھا۔ سنگلاخ اور مشکل زمینوں میں غزل کہتے تھے۔ فکر مضامین اور تلاش الفاظ میں تن بدن کا ہوش نہ تھا۔ غور کے ساتھ کاوش کرتے تھے اور آپ ہی آپ منہ لیتے تھے۔ ہونٹ چباتے چباتے ایک طرف سے سفید ہو گیا تھا۔ بعض شعر پڑھ کر کہتے تھے کہ آنکھوں سے لہو ٹپک پڑا تھا جب یہ شعر کہا تھا۔ بعضے یہ کہتے تھے کہ ۶ مہینے تک برابر پڑھتا رہا۔ پڑھتے اس زور شور سے تھے کہ دیکھنے سے تعلق رکھتا تھا۔ مشاعروں میں غزل سناتے تھے تو صفِ مجلس سے گز گز بھر آگے نکل جاتے تھے۔ بعض اشخاص شہر کے اور قلعہ میں اکثر مرشد زادے اشہزادے شاگرد تھے مگر استاد سب کہتے تھے۔ شعرائے باکمال کو جا کر سُناتے تھے۔ اور واہ واہ کی چیخیں اور تعریفوں کے فغاں و فریادے کر چھوڑتے تھے۔ کیونکہ اُسے اپنا حق سمجھتے تھے۔ ذوق مرحوم باوجود کم سخنی اور عادت خاموشی کے خوب خوب بہت خوب کہتے اور مکرر پڑھواتے تھے۔ مسکراتے اور چہرہ پر سرور ظاہر کرتے گویا شعر کی کیفیت میں بیٹھے ہیں۔ اور مرزا تو ایسی دل لگی کے مصالح ڈھونڈتے رہتے تھے۔ یہ نعمت خدا دے۔ شعر سنتے اور کہتے تھے کہ یہ سب کافر ہیں جو تمھیں استاد کہتے ہیں۔ شعر کے خدا ہو۔ خدا! سجدہ کا اشارہ کرتے اور کہتے۔ سبحان اللہ سبحان اللہ۔ میں اُن دنوں میں مبتدی شوقین تھا۔ اپنا مشتاق سمجھ کر مجھ سے بہت خوش ہوتے تھے۔ اور کہتے تھے کہ بس تم ہمارے کلام کو سمجھتے ہو۔ رستہ میں مل جاتے تو دس قدم دور سے دیکھ کر کھڑے ہو جاتے اور جو نیا شعر کہا ہوتا اُسے وہیں سے اکڑ کر پڑھتے پھر شعر سنتے سُناتے چلتے۔ قلعہ کے نیچے میدان میں گھنٹوں ٹہلتے اور شعر پڑھتے رہتے۔ غریب خانہ پر بھی تشریف لاتے اور پہر بھر سے کم نہ بیٹھتے۔ ایک دن رستہ میں ملے۔ دیکھتے ہی کہنے لگے آج گیا تھا

اس سے انہیں طبعی تعلق تھا۔ اس لئے اکثر الفاظ اس طرح ترکیب دے جاتے تھے کہ بول چال میں اس طرح بولتے ہیں۔ لیکن جو شعر صاف صاف نکل گئے ہیں۔ وہ ایسے ہیں

(بقیہ حاشیہ) اُنہیں بھی سُنا آیا۔ میں نے کہا کیا؟ کڑک کر کہا:۔

ڈیڑھ تجزبر بھی تو ہے مطلع و مقطع غائب   غالبؔ آساں نہیں صاحب دیواں ہونا

پھر بیان کیا کہ ایک جلسہ میں مومن خاں بھی موجود تھے۔ مجھ سے سب نے شعر کی فرمائش کی۔ میں نے ناسخ کی غزل پر غزل کہی تھی۔ وہ سُنائی مقطع پر بہت حیران ہوئے ع کہ جس کو کہتے ہیں چرخ ہفتم ورق ہے دیوان ہفتمیں کا پوچھنے لگے کہ کیا آپ ساتواں دیوان لکھتے ہیں؟ میں نے کہا کہ ہاں اب تو آٹھواں ہے۔ چپ ہو گئے +

عومی واقعات پر اکثر شعر کہا کرتے تھے۔ مومن خاں کو کنور اجیت سنگھ نے ہتنی دی۔ دیکھو صفحہ ۴۲۳۔ آپ نے کہا:۔

جہنموں میں وہ مومن مکان لیتا ہے   نجومی بن کے جو ہتنی کا دان لیتا ہے

دلّی میں شیریں ایک بڑی نامی رنڈی تھی۔ وہ حج کو چلی۔ آپ نے کہا:۔

بجا ہے شیریں اگر چھوڑ دلّی حج کو چلی   مثل ہے نو سو چوہے کھا کے بلّی حج کو چلی

۲۰۔۳۰ برس ہو گئے۔ وہ چرچے نہ رہے۔ اکثر شعر یاد تھے۔ حافظے نے بیوفائی کی۔ شاید حروف دکا غذ وفا کریں جو یاد ہے لکھ دیتا ہوں۔ اور ان کی جاں خراشی اور بربادی کا افسوس کرتا ہوں:۔

ہیں مچھلیاں بھوؤں کی جبیں پر شکن کے اندر   اُلٹی ہے بہتی گنگا مجھی بھون کے اندر
دنیائے منقلب کا اُلٹا ہے کارخانہ   ہے مہر شمع واژوں۔ اس انجمن کے اندر
میں وہ نخل جوئے سلسبیل دریائی   مری ہے کشتی گل نارجیل دریائی
مجھے اترتی ہے گرداب آسماں سے وحی   ہے رہبر خضر جبرئیل دریائی
میں کالا پانی بڑا تا پتا ہوں شب و روز   زمیں کا گز ہے مرا کلکا میل دریائی
بنا ہے کنگرۂ خار دو۔ ملک دشت حصار   مرا ہے آبلہ برج فصیل دریائی
ہے آبشاری کی مضمون آبدار کو دھت   ہمارا خامہ ہے خرطوم فیل دریائی
جہاز ہے مرا اک تار لسگرِ دم بر   مرے عمل میں ہے جرِ ثقیل دریائی
میں اپنے کوچ کی ہوں موج میں بہا جاتا   حباب وار ہوں کوس رحیل دریائی
ہماری موج تلاطم سے آشنائی ہے   یہ آب شور ہے دیتا رفیل دریائی

ہے اوج مردمک دیدۂ۔ مردم آبی
نکال دیدۂ تر سے سبیل دریائی

کہ جواب نہیں رکھتے۔ اہل ظرافت بھی اپنی نوک جھونک سے چوکتے نہ تھے۔ چنانچہ ایک دفعہ مرزا بھی مشاعرہ میں تشریف لے گئے۔ حکیم آغا جان عیش ایک خوش طبع شگفتہ مزاج شخص تھے۔ دیکھو صفحہ ۴۸۱ غزل طرحی میں یہ مصرع پڑھا:۔

اگر اپنا کہا تم آپ ہی سمجھے تو کیا سمجھے! 　　 مزا کہنے کا جب ہے اک کہے اور دوسرا سمجھے
کلام میر سمجھے اور زبانِ میرزا سمجھے 　　 مگر اُن کا کہا یہ آپ سمجھیں یا خدا سمجھے

اسی واسطے اواخر عمر میں نازک خیالی کے طریقہ کو بالکل ترک کر دیا تھا۔ چنانچہ دیکھو اخیر کی غزلیں صاف صاف ہیں۔ دونوں کی کیفیت جو کچھ ہے معلوم ہو جائے گی۔

سن رسیدہ اور معتبر لوگوں سے معلوم ہوا کہ حقیقت میں اُن کا دیوان بہت بڑا تھا۔ یہ منتخب ہے۔ مولوی فضل حق صاحب کہ فاضل بے عدیل تھے۔ ایک زمانہ میں دہلی کی عدالت ضلع میں سررشتہ دار تھے۔ اسی عہد میں مرزا خاں عرف مرزا خانی صاحب کوتوال شہر تھے۔ وہ مرزا قتیل صاحب کے شاگرد تھے۔ نظم، نثر فارسی اچھی لکھتے تھے۔ غرض کہ یہ دونوں باکمال مرزا صاحب کے دلی دوست تھے۔ ہمیشہ باہم دوستانہ جلسے اور شعر و سخن کے چرچے رہتے تھے۔ اُنھوں نے اکثر غزلوں کو سنا اور دیوان کو دیکھا تو مرزا صاحب کو سمجھایا کہ یہ اشعار عام لوگوں کی سمجھ میں نہ آئیں گے۔ مرزا نے کہا اتنا کچھ کہہ چکا۔ اب تدارک کیا ہو سکتا ہے اُنھوں نے کہا کہ خیر ہوا سو ہوا۔ انتخاب کرو اور مشکل شعر نکال ڈالو۔ مرزا صاحب نے دیوان حوالہ کر دیا۔ دونوں صاحبوں نے دیکھ کر انتخاب کیا۔ وہ یہی دیوان ہے کہ آج ہم

بقیہ ص ۵۱۶

وحشت مجھے زنجیر پہناتی ہی تھی اکثر 　　 طفلی میں بھی ہنسلی مری جاتی ہی تھی اکثر
جب تھا زرِ گل کیسۂ غنچہ کی گرہ میں 　　 بلبل پڑی گُل چہرے اُڑاتی ہی تھی اکثر
دم کا جو دمدمہ یہ باندھے خیال اپنا 　　 بے پل صراط اُتریں یہ ہے کمال اپنا
طفلی ہی سے ہے مجکو وحشت سرائے اُلفت 　　 سُم میں گڑا ہوا ہے آہو کے نال اپنا
کسب شہادت اپنا ہے یاد کس کو قاتل 　　 سائے میں تیغ کے لیتے ہیں ڈھال اپنا
بھاتا ہے جوش عشقِ شیریں دشوں میں رونا 　　 ہے آب شور گریہ آبِ زلال اپنا
ہے چیک کے آبلوں کی ہیں باگ موڑتا ہوں 　　 - - - - - - -

عینک کی طرح آنکھوں سے لگائے پھرتے ہیں +

عودِ ہندی۔ کچھ تقریظیں کچھ اور نثریں اور خطوط ہیں۔ اکثر خطوں میں اُن لوگوں کے جواب ہیں۔ جنھوں نے کسی مشکل شعر کے معنی پوچھے یا کوئی امر تحقیق طلب فارسی یا اُردو کا دریافت کیا +

اُردوئے معلّےٰ۔ ۱۲۸۵ھ ۱۸۶۹ء چند شاگردوں اور دوستوں نے جس قدر اُردو کے خطوط اُن کے ہاتھ آئے ایک جگہ ترتیب دئے۔ اور اُس مجموعہ کا نام مرزا نے خود اُردوئے معلّےٰ رکھا۔ ان خطوط کی عبارت ایسی ہے گویا آپ سامنے بیٹھے گُل افشانی کر رہے ہیں۔ مگر کیا کریں کہ اُن کی باتیں بھی خاص فارسی کی خوش نما تراشوں اور عمدہ ترکیبوں سے مرصّع ہوتی تھیں۔ بعض فقرے کم استعداد ہندوستانیوں کے کانوں کو نئے معلوم ہوں تو وہ جانیں۔ یہ علم کی کم رواجی کا سبب ہے۔ چنانچہ فرماتے ہیں۔ " کیا جگر خوں کُن اتفاق ہے۔ اب درنگ ورزی کی تقصیر معاف کیجئے۔ پس چاہئے کوئل کی آرامش کا ترک کرنا۔ اور خواہی نخواہی بابو صاحب کے ہمراہ رہنا۔ یہ رُتبہ میری ارزش کے فوق ہے۔ سرمایۂ نازش قلمرو ہندوستان ہو۔ بعض جگہ خاص محاورۂ فارسی کا ترجمہ کیا ہے۔ میر اور سودا وغیرہ اُستادوں کے کلام میں لکھا گیا ہے۔ چنانچہ انہی خطوں میں فرماتے ہیں" اس قدر عذر چاہئے ہو"۔ یہ لفظ اُن کے قلم سے اس واسطے نکلا کہ عذر خواستن جو فارسی کا محاورہ ہے وہ اِس باکمال کی زبان پر چڑھا ہوا ہے۔ ہندوستانی عذر کرنا یا عذر معذرت کرنی بولتے ہیں۔ نظر اس دستور پر اگر دیکھو تو مجھے اُس شخص سے خس برابر علاقہ عزّہ داری کا نہیں۔ یہ بھی ترجمہ۔ نظر بریں ضابطہ کا ہے۔ منشی نبی بخش تمھارے خط نہ لکھنے کا گلہ رکھتے ہیں۔ گلہ ہا دارند شکوہ ہا دارند۔ فارسی کا محاورہ ہے۔ کیوں مہاراج کو دل میں آنا! منشی نبی بخش کے ساتھ غزل خوانی کرنی! اور ہم کو یاد نہ دلانا! یاد آوردن خاص ایران کا سکہ ہے۔ ہندوستانی یاد کرنا بولتے ہیں۔ جو آپ پر معلوم ہے۔ وہ مجھ پر مجہول نہ رہے۔ ہرچہ بر شما منکشف است بر من مخفی نماند +

اِن خطوں کی طرزِ عبارت بھی ایک خاص قسم کی ہے کہ ظرافت کے چُٹکلے اور لطافت کی شوخیاں اس میں خوب ادا ہو سکتی ہیں - یہ انہی کا ایجاد تھا کہ آپ مزا لے لیا اور اَوروں کو لُطف دے گئے - دوسرے کا کام نہیں - اگر کوئی چاہے کہ ایک تاریخی حال یا اخلاقی خیال - یا علمی مطالب - یا دنیا کے معاملات خاص میں مراسلے لکھے تو اس انداز میں ممکن نہیں - اس کتاب میں چونکہ اصلی خط لکھے ہیں اسلئے وہ اُن کی ظاہر و باطن کی حالت کا آئینہ ہے - اس سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ دنیا کے غم و الم ہمیشہ اُنھیں ستاتے تھے - اور وہ علوِ حوصلہ سے ہنسی ہی میں اُڑاتے تھے - پورا لطف ان تحریروں کا اُس شخص کو آتا ہے جو خود اُن کے حال سے اور مکتوب الیہوں کی چال ڈھال سے اور طرفین کے ذاتی معاملات سے بخوبی واقف ہو - غیر آدمی کی سمجھ میں نہیں آتیں - اس لئے اگر ناواقف اور بے خبر لوگوں کو اُس میں مزا نہ آئے تو کچھ تعجب نہیں +

اس کتاب میں قلم - التماس - کو مؤنث - بینش - بیداد - بارک کو مذکّر فرمایا ہے - ایک جگہ فرماتے ہیں "میرا اُردو بہ نسبت اوروں کے فصیح ہوگا" +

لطائف غیبی - اس رسالہ میں منشی سعادت علی کی طرف روئے سخن ہے - اگرچہ اُس کے دیباچہ میں سیف الحق کا نام لکھا ہے - مگر اندازِ عبارت اور عبارت کے چُٹکلے صاف کہتے ہیں کہ مرزا ہیں - وہ درحقیقت وہی میاں داد خاں ہیں - جن کے نام چند رقعے مرزا صاحب کے اُردوئے مُعلّٰی میں ہیں - چنانچہ ایک رقعہ میں اُنھیں فرماتے ہیں کہ صاحب میں نے تم کو سیف الحق کا خطاب دیا - تم میری فوج کے سپہ سالار ہو +

تیغ تیز - مولوی احمد علی پروفیسر مدرسۂ ہُگلی نے قاطع بُرہان کے جواب میں مؤید البرہان لکھی تھی - اُس کے بعض مراتب کا جواب مرزا صاحب نے تحریر فرما کر تیغ تیز نام رکھا +

ساطع برہان کے اخیر میں چند ورق سید عبداللہ کے نام سے ہیں۔ وہ بھی مرزا صاحب کے ہیں +

تصنیفات فارسی

فارسی کی تصنیفات کی حقیقت حال کا لکھنا اور اُن پر رائے لکھنی اُردو کے تذکرہ نویس کا کام نہیں ہے۔ اس لئے فقط فہرست لکھتا ہوں:۔

قصائد۔ حمد و نعت میں ائمۂ معصومین کی مدح میں بادشاہ دہلی۔ شاہ اودھ گورنروں اور بعض صاحبان عالی شان کی تعریف میں ہیں +

غزلوں کا دیوان۔ مع دیوان قصائد کے ۱۸۴۵ء میں مرتب ہو کر نقلوں کے ذریعہ سے اہل ذوق میں پھیلا اور اب تک کئی دفعہ چھپ چکا ہے +

پنج آہنگ۔ اس میں پانچ آہنگ کے پانچ باب۔ فارسی کے انشا پردازوں کے لئے جو کہ اُن کے انداز میں لکھنا چاہیں۔ ایک عمدہ تصنیف ہے +

۱۸۶۲ء میں قاطع برہان چھپی۔ بعد کچھ کچھ تبدیلی کے اسی کو پھر چھپوایا۔ اور درفش کاویانی نام رکھا۔ برہان قاطع کی غلطیاں نکالی ہیں۔ مگر اُس پر فارسی کے دعویداروں نے سخت حملوں کے ساتھ مخالفت کی +

نامۂ غالب۔ قاطع برہان کے کئی شخصوں نے جواب لکھے۔ چنانچہ میرٹھ میں حافظ عبدالرحیم نام ایک معلم نابینا تھے۔ انھوں نے اس کا جواب ساطع برہان لکھا۔ مرزا صاحب نے خط کے عنوان میں حافظ صاحب موصوف کو بطور جواب کے چند ورق لکھے اور ان کا نام نامۂ غالب رکھا +

مہر نیمروز۔ حکیم احسن اللہ خاں طبیب خاص بادشاہ کے تھے۔ اُنھیں تاریخ کا

شوق تھا۔ اور اہل کمال کے ساتھ عموماً تعلق خاطر رکھتے تھے۔ مرزا نے ان کے ایما سے اوّل کتاب مذکور کا ایک حصّہ لکھا۔ اسی کے ذریعہ سے ۱۸۵۰ء میں باریاب حضور ہو کر خدمت تاریخ نویسی پر مامور ہوئے۔ اور نجم الدولہ دبیر الملک مرزا اسداللہ خاں غالب بہادر نظام جنگ خطاب ہوا۔ چنانچہ پہلی جلد میں امیر تیمور یہ سے ہمایوں تک کا حال بیان کرکے مہر نیم روز نام رکھا۔ ارادہ تھا کہ اکبر سے لے کر بہادر شاہ تک کا حال دوسری جلد میں لکھیں اور ماہ نیم ماہ نام رکھیں کہ غدر ہو گیا۔

دستنبو۔ ۱۱ مئی ۱۸۵۷ء سے یکم جولائی ۱۸۵۸ء تک حال بغاوت۔ رو داد تباہی شہر۔ اپنی سرگزشت۔ غرض کل ۱۵ مہینے کا حال لکھا ہے۔

سبد چین۔ دو تین قصیدے۔ چند قطعے۔ چند خطوط فارسی کے اس میں ہیں کہ دیوان میں درج نہ ہوئے تھے۔

اواخر عمر میں اپنا کلام اپنے پاس نہ رکھتے تھے۔ اُردو کی تصنیفات نواب حسین مرزا صاحب کے پاس رہتی تھیں۔ اور وہ ترتیب کرتے جاتے تھے۔ فارسی نواب ضیاء الدین احمد خاں صاحب کو بھیج دیتے تھے کہ اُنھیں نیر رخشاں تخلص کرکے اپنا رشید شاگرد اور خلیفۂ اوّل قرار دیا تھا۔ خلیفۂ دوم نواب علاؤ الدین خاں صاحب تھے۔

اُن کے خطوں سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ اپنی انشا پردازی کے شوق کو بڑی کاوش اور عرق ریزی سے نباہتے تھے۔ اسی واسطے مرنے سے ۱۰۔۱۵ برس پہلے اُن کی تحریریں اُردو میں ہوتی تھیں۔ چنانچہ ایک دوست کے خط میں خود فرماتے ہیں :۔

بندہ نواز! زبان فارسی میں خطوں کا لکھنا پہلے سے متروک ہے۔ پیرانہ سری اور ضعف کے صدموں سے محنت پژوہی اور جگر کاوی کی قوت مجھ میں نہیں رہی۔ حرارت غریزی کو زوال ہے اور یہ حال ہے کہ :۔

مضمحل ہو گئے قوائے غالب		وہ عناصر میں اعتدال کہاں

کچھ آپ ہی کی تخصیص نہیں۔ سب دوستوں کو جن سے کتابت رہتی ہے اُردو ہی میں نیاز نامے لکھا کرتا ہوں۔ جن جن صاحبوں کی خدمت میں آگے میں نے فارسی زبان میں خطوط لکھے اور بھیجے تھے اُن میں سے جو صاحب الی الآن موجود ہیں۔ اُن سے بھی عندالضرورت اسی زبان مروّج میں مکاتیب مراسلت کا اتفاق ہوا ہے +

اُردوئے معلّٰی میں مرزا حاتم علی بیگ مہر کو تحریر فرماتے ہیں: "میرا ایک قطعہ ہے کہ وہ میں نے کلکتہ میں کہا تھا۔ تقریب یہ کہ مولوی کرم حسین ایک میرے دوست تھے اُنھوں نے ایک مجلس میں چکنی ڈلی بہت پاکیزہ اور بے ریشہ اپنے کفِ دست پر رکھ کر مجھ سے کہا کہ اس کی تشبیہات نظم کیجئے۔ میں نے وہاں بیٹھے بیٹھے نو دس شعر کا قطعہ لکھ کر اُن کو دیا۔ اور صلہ میں وہ ڈلی اُن سے لی :۔

قطعہ

ہے جو صاحب کے کفِ دست پہ یہ چکنی ڈلی ۔۔۔ زیب دیتا ہے اسے جس قدر اچھا کہئے
خامہ انگشت بدنداں کہ اسے کیا لکھئے ۔۔۔ ناطقہ سر بگریباں کہ اسے کیا کہئے
اخترِ سوختہ قیس سے نسبت دیجے ۔۔۔ خالِ مشکین رُخِ دلکشِ لیلا کہئے
حجر الاسودِ دیوار حرم کیجئے فرض ۔۔۔ نافہ آہوئے بیابان ختن کا کہئے
صومعہ میں اُسے ٹھیرائیے گر مُہرِ نماز ۔۔۔ میکدہ میں اُسے خشتِ خُمِ صہبا کہئے
مسّی آلودہ سرِ انگشتِ حسیناں لکھئے ۔۔۔ سرِ پستانِ پری زاد سے مانا کہئے
اپنے حضرت کے کفِ دست کو دل کیجئے فرض ۔۔۔ اور اِس چکنی سپاری کو سویدا کہئے

معرکۂ اتفاقی

غرضکہ بیس بائیس پھبتیاں ہیں۔ اشعار سب کب یاد آتے ہیں۔ بھول گیا[1]۔ نواب زینت محل کو بادشاہ کے مزاج میں بہت دخل تھا۔ مرزا جواں بخت اُن کے بیٹے

[1] دیکھو خط اُردوئے معلّٰی میں +

تھے اور باوجودیکہ بہت مرشد زادوں سے چھوٹے تھے۔ مگر بادشاہ اُنہی کی ولیعہدی کے لئے کوشش کر رہے تھے۔ جب اُن کی شادی کا موقع آیا تو بڑی دھوم کے سامان ہوئے۔ مرزا نے یہ سہرا کہہ کر حضور میں گذرانا:۔

سہرا

خوش ہو اے بخت کہ ہے آج ترے سر سہرا
باندھ شہزادہ جواں بخت کے سر پر سہرا

کیا ہی اس چاند سے مکھڑے پہ بھلا لگتا ہے
ہے ترے حُسن دل افروز کا زیور سہرا

سر پہ چڑھنا تجھے پھبتا ہے پر اے طرف کلاہ
مجکو ڈر ہے کہ نہ چھینے ترا لمبر سہرا

ناؤ بھر کر ہی پروئے گئے ہوں گے موتی
ورنہ کیوں لائے ہیں کشتی میں لگا کر سہرا

سات دریا کے فراہم کئے ہوں گے موتی
تب بنا ہوگا اس انداز کا گز بھر سہرا

رُخ پہ دولھا کے جو گرمی سے پسینہ ٹپکا
ہے رگِ ابر گہر بار سراسر سہرا

یہ بھی اک بے ادبی تھی کہ قبا سے بڑھ جائے
رہ گیا آن کے دامن کے برابر سہرا

جی میں اترائیں نہ موتی کہ ہمیں ہیں اک چیز
چاہئے پھولوں کا بھی ایک مقرر سہرا

جبکہ اپنے میں سماویں نہ خوشی کے مارے
گوندھے پھولوں کا بھلا پھر کوئی کیونکر سہرا

رُخِ روشن کی دمک گوہرِ غلطاں کی چمک
کیوں نہ دکھلائے فروغِ مہ و اختر سہرا

تار ریشم کا نہیں ہے یہ رگِ ابر بہار
لائے گا تاب گرانباریٔ گوہر سہرا

ہم سخن فہم ہیں غالب کے طرفدار نہیں
دیکھیں اس سہرے سے کہدے کوئی بہتر سہرا

مقطع کو سُن کر حضور کو خیال ہوا کہ اس میں ہم پر چشمک ہے۔ گویا اس کے معنی یہ ہوئے کہ اس سہرے کے برابر کوئی سہرا کہنے والا نہیں۔ ہم نے جو شیخ ابراہیم ذوق کو اُستاد اور ملک الشعرا بنایا ہے یہ سخن فہمی سے بعید ہے۔ بلکہ طرفداری ہے۔ چنانچہ اُسی دن اُستاد مرحوم جو حسبِ معمول حضور میں گئے۔ تو بادشاہ نے وہ سہرا دیا۔ کہ اُستاد اسے دیکھئے۔ اُنھوں نے پڑھا اور بموجب عادت کے عرض کی پیر و مرشد

درست۔ بادشاہ نے کہا اُستاد! تم بھی ایک سہرا کہہ دو۔ عرض کی بہت خوب۔ پھر فرمایا کہ ابھی لکھ دو۔ اور ذرا مقطع پر بھی نظر رکھنا۔ اُستاد مرحوم وہیں بیٹھ گئے اور عرض کیا۔

سہرا

اے جواں بخت مبارک تجھے سر پر سہرا
آج ہے یمن و سعادت کا ترے سر سہرا

آج وہ دن ہے کہ لائے دُرِ انجم سے فلک
کشتیٔ زر میں مہِ نَو کی لگا کر سہرا

تابشِ حُسن سے مانند شعاعِ خورشید
رُخِ پُر نور پہ ہے تیرے منور سہرا

وہ کہے صلِّ علیٰ یہ کہے سُبحان اللہ
دیکھے مکھڑے پہ جو تیرے مہ و اختر سہرا

تا ہی اور بنے میں رہے اخلاص بہم
گوندھے سورۂ اخلاص کو پڑھ کر سہرا

دھوم ہے گلشنِ آفاق میں اس سہرے کی
گائیں مرغان نوا سنج نہ کیونکر سہرا

روئے فرخ پہ جو ہیں تیرے برستے انوار
تار بارش سے بنا ایک سراسر سہرا

ایک کو ایک پہ تزئیں ہے دمِ آرائش
سر پہ دستار ہے دستار کے اوپر سہرا

اک گُہر بھی نہیں صد کانِ گُہر میں چھوڑا
تیرا بنوایا ہے لے لے کے جو گوہر سہرا

پھرتی خوشبو سے ہے اترائی ہوئی بادِ بہار
اللہ اللہ رے پھولوں کا معطر سہرا

سر پہ طرہ ہے مزین تو گلے میں بدّھی
کنگنا ہاتھ میں زیبا ہے تو مُنہ پر سہرا

رونمائی میں تجھے دے مہ و خورشید فلک
کھول دے مُنہ کو جو تو مُنہ سے اُٹھا کر سہرا

کثرتِ تارِ نظر سے ہے تماشائیوں کے
دمِ نظّارہ ترے روئے نکو پر سہرا

دُرِ خوش آب مضامیں سے بنا کر لایا
واسطے تیرے ترا ذوق ثنا گر سہرا

جس کو دعویٰ ہے سخن کا یہ سُنا دے اُس کو
دیکھ اس طرح سے کہتے ہیں سخنور سہرا

اربابِ نشاط حضور میں ملازم تھیں۔ اُسی وقت اُنھیں ملا۔ شام تک شہر کی گلی گلی کوچہ کوچہ میں پھیل گیا۔ دوسرے ہی دن اخباروں میں مشتہر ہو گیا۔ مرزا بھی بڑے

اداشناس اور سخن فہم تھے۔ سمجھے کہ تھا کچھ اور ہو گیا کچھ اور یہ قطعہ حضور میں گزرانا:۔

قطعہ در معذرت

منظور ہے گزارشِ احوالِ واقعی — اپنا بیانِ حُسنِ طبیعت نہیں مجھے
سَو پُشت سے ہے پیشۂ آبا سپہ گری — کچھ شاعری ذریعۂ عزّت نہیں مجھے
آزادہ رَو ہوں اور مرا مسلک ہے صُلحِ کُل — ہرگز کبھی کسی سے عداوت نہیں مجھے
کیا کم ہے یہ شرف کہ ظفر کا غلام ہوں — مانا کہ جاہ و منصب و ثروت نہیں مجھے
اُستادِ شہ سے ہو مجھے پرخاش کا خیال — یہ تاب یہ مجال یہ طاقت نہیں مجھے
جامِ جہاں نما ہے شہنشاہ کا ضمیر — سوگند اور گواہ کی حاجت نہیں مجھے
میں کون اور ریختہ ہاں اس سے مدعا — جُز انبساطِ خاطرِ حضرت نہیں مجھے
سہرا لکھا گیا زرہِ امتثالِ امر — دیکھا کہ چارہ غیرِ اطاعت نہیں مجھے
مقطع میں آپڑی ہے سخن گسترانہ بات — مقصود اس سے قطعِ محبّت نہیں مجھے
روئے سخن کسی کی طرف ہو تو رُوسیاہ — سودا نہیں جنوں نہیں وحشت نہیں مجھے
قسمت بُری سہی پہ طبیعت بُری نہیں — ہے شکر کی جگہ کہ شکایت نہیں مجھے

صادق ہوں اپنے قول کا غالبؔ خدا گواہ
کہتا ہوں سچ کہ جھوٹ کی عادت نہیں مجھے

کلکتہ کا معرکہ

کلکتہ میں بہت سے اہلِ ایران اور بڑے بڑے علماء و فضلا موجود تھے۔ مگر افسوس ہے کہ وہاں مرزا کے کمال کے لئے ایسی عظمت نہ ہوئی جیسی کہ ان کی شان کے لئے شایاں تھی۔ حقیقت میں اُن کی عظمت ہونی چاہیئے تھی اور ضرور ہوتی۔ مگر ایک اتفاقی تریچ پڑ گیا۔ اُس کی داستان یہ ہے کہ مرزا نے کسی جلسہ میں ایک فارسی کی غزل پڑھی۔ اُس میں ایک لفظ پر بعض اشخاص نے اعتراض کیا۔ اور اعتراض بموجب اُس قاعدہ کے تھا جو مرزا قتیل نے ایک اپنے رسالہ میں لکھا ہے۔ مرزا نے

سُن کر کہا کہ قتیل کون ہوتا ہے؟ اور مجھے قتیل سے کیا کام؟ ایک فرید آباد کا کھتری تھا۔ میں اہل زبان کے سوا کسی کو نہیں سمجھتا۔ وہ لوگ اکثر مرزا قتیل کے شاگرد تھے۔ اس لئے آئین مہمان نوازی سے آنکھیں بند کرلیں اور جوش و خروش خاص و عام میں پیدا ہو۔ مرزا کو تعجّب ہوا اور اس خیال سے کہ یہ فتنہ کسی طرح فرو ہو جائے۔ سلامت روی کا طریقہ اختیار کرکے ایک مثنوی لکھی اور اس میں کچھ شک نہیں کہ داد سخنوری کی دی ہے معرکہ کا سارا ماجرا نہایت خوبی کے ساتھ نظم میں ادا کیا۔ اعتراض کو سند سے دفع کیا۔ اپنی طرف سے انکسار مناسب کے ساتھ معذرت کا حق پورا ادا کیا۔ لیکن زیادہ تر افسوس یہ ہے کہ جب مثنوی حریفوں کے جلسہ میں پڑھی گئی تو بجائے اسکے کہ کمال کو تسلیم کرتے یا مہمان سے اپنی زیادتیوں کا عذر کرتے۔ ایک نے عمداً کہا کہ اس مثنوی کا نام کیا ہے؟ معلوم ہوا کہ **باد مخالف**۔ دوسرے نے گلستاں کا فقرہ پڑھا۔ یکے از صلحا را باد مخالف در شکم پیچید۔ اور سب نے ہنس دیا +

لطیفہ۔ دلّی میں مشاعرہ تھا۔ مرزا نے اپنی فارسی غزل پڑھی۔ مفتی صدرالدین خاں صاحب اور مولوی امام بخش صاحب صہبائی جلسہ میں موجود تھے۔ مرزا صاحب نے جس وقت یہ مصرع پڑھا ع بوادیٔ کہ دراں خضر را عصا خفت است۔ مولوی صہبائی کی تحریک سے مفتی صاحب نے فرمایا کہ عصا خفت است میں کلام ہے۔ مرزا نے کہا کہ حضرت! میں ہندی نژاد ہوں۔ میرا عصا پکڑ لیا۔ اُس شیرازی کا عصا نہ پکڑا گیا ع دلے بحلۂ اوّل عصائے شیخ بخفت + اُنھوں نے کہا کہ اصل محاورہ میں کلام نہیں۔ کلام اس میں ہے کہ مناسب مقام ہے یا نہیں +

لطیفہ۔ ایک دفعہ مرزا بہت قرضدار ہو گئے۔ قرض خواہوں نے نالش کردی۔ جواب دہی میں طلب ہوئے۔ مفتی صاحب کی عدالت تھی۔ جس وقت پیشی میں گئے یہ شعر پڑھا:۔

قرض کی پیتے تھے مے لیکن سمجھتے تھے کہ ہاں
رنگ لائے گی ہماری فاقہ مستی ایک دن

مرزا صاحب کو ایک آفت ناگہانی کے سبب سے چند روز جیل خانہ میں اس طرح رہنا پڑا کہ جیسے حضرتِ یوسف کو زندانِ مصر میں۔ کپڑے میلے ہوگئے۔ جوئیں پڑ گئیں تھیں۔ ایک دن بیٹھے اُن میں سے جوئیں چُن رہے تھے۔ ایک رئیس وہیں عیادت کو پہنچے۔ پوچھا کیا حال ہے۔ آپ نے یہ شعر پڑھا:۔

ہم غم زدہ جس دن سے گرفتار بلا ہیں		کپڑوں میں جوئیں بخیوں کے ٹانکوں سے سوا ہیں

جس دن وہاں سے نکلنے لگے اور لباس تبدیل کرنے کا موقع آیا تو وہاں کا کُرتہ وہیں پھینکا اور یہ شعر پڑھا:۔

ہائے اُس چارگرہ کپڑے کی قسمت غالب		جس کی قسمت میں ہو عاشق کا گریباں ہونا

بدیہہ

حسین علی خاں چھوٹا لڑکا ایک دن کھیلتا کھیلتا آیا کہ دادا جان مٹھائی منگا دو۔ آپ نے فرمایا کہ پیسے نہیں۔ وہ صندوقچہ کھول کر اِدھر اُدھر پیسے ٹٹولنے لگا۔ آپ نے فرمایا:۔

درم و دام اپنے پاس کہاں		چیل کے گھونسلے میں ماس کہاں

تقسیم ششماہی میں لطیفہ

پنشن سرکار سے ماہ بماہ ملتی تھی۔ بغاوت دہلی کے بعد حکم ہوا کہ ششماہی ملا کرے۔ اس موقع پر ایک دوست کو لکھتے ہیں:۔

رسم ہے مردہ کی چھ ماہی ایک		خلق کا ہے اسی چلن پہ مدار
مجکو دیکھو کہ ہوں بقید حیات		اور چھ ماہی ہو سال میں دو بار

مگر یہ دو شعر حقیقت میں ایک قصیدے کے ہیں۔ جس کی بدولت بادشاہ دہلی کے دربار سے ششماہی تنخواہ کے لئے ماہواری کا حکم حاصل کیا تھا۔ فارسی کے قصائد میں بھی اس قسم کے عزل و نصب انھوں نے اکثر کئے ہیں اور یہ کچھ عجیب بات نہیں۔ انوری وغیرہ اکثر شعراء نے ایسا کیا ہے ؂

لطیفہ۔ مولوی فضل حق صاحب مرزا کے بڑے دوست تھے۔ ایک دن مرزا اُن کی ملاقات کو گئے۔ اُن کی عادت تھی کہ جب کوئی بے تکلف دوست آیا کرتا تو خالق باری کا یہ مصرع پڑھا کرتے تھے۔ ع بیا برادر آؤ رے بھائی ؂ چنانچہ مرزا صاحب کی

تعظیم کو اُٹھ کھڑے ہوئے اور یہی مصرع کہہ کر بٹھایا۔ ابھی بیٹھے ہی تھے کہ مولوی صاحب کی رنڈی بھی دوسرے دالان سے اُٹھ کر پاس آن بیٹھی۔ مرزا نے فرمایا۔ ہاں صاحب اب وہ دوسرا مصرع بھی فرما دیجئے۔ ع

بنشیں مادر بیٹھ رہی مائی

لطیفہ۔ مرزا کی قاطع برہان کے بہت شخصوں نے جواب لکھے ہیں۔ اور بہت زبان درازیاں کی ہیں۔ کسی نے کہا کہ حضرت آپ نے فلاں شخص کی کتاب کا جواب نہ لکھا۔ فرمایا بھائی اگر کوئی گدھا تمھارے لات مارے تو تم اُس کا کیا جواب دو گے؟

لطیفہ۔ بہن بیمار تھیں۔ آپ عیادت کو گئے۔ پوچھا کیا حال ہے۔ وہ بولیں کہ مرتی ہوں قرض کی فکر ہے کہ گردن پر لئے جاتی ہوں۔ آپ نے کہا کہ بوا! بھلا یہ کیا فکر ہے! خدا کے ہاں کیا مفتی صدرالدین خاں بیٹھے ہیں۔ جو ڈگری کر کے پکڑوا بلائیں گے +

لطیفہ۔ ایک دن مرزا کے شاگرد رشید نے آکر کہا۔ حضرت آج میں امیر خسرو کی قبر پر گیا۔ مزار پر کھرنی کا درخت ہے۔ اُس کی کھرنیاں میں نے خوب کھائیں۔ کھرنیوں کا کھانا تھا کہ گویا فصاحت و بلاغت کا دروازہ کھل گیا۔ دیکھئے تو میں کیسا فصیح ہو گیا۔ مرزا نے کہا ارے میاں تین کوس کیوں گئے۔ میرے پچھواڑے کے پیپل کی پیپلیاں کیوں نہ کھا لیں۔ چودہ طبق روشن ہو جاتے +

لطیفہ[1]۔ بعض بعض شاگردوں نے مرزا سے کہا کہ آپ نے حضرت علیؓ کی مدح میں بہت قصیدے اور بڑے بڑے زور کے قصیدے کہے۔ صحابہ میں سے کسی کی تعریف میں کچھ نہ کہا۔ مرزا نے ذرا تامل کر کے کہا کہ ان میں سے کوئی ایسا دکھا دیجئے تو اُس کی تعریف بھی کہہ دوں۔ مرزا صاحب کی شوخی طبع ہمیشہ انھیں اس رنگ میں شوربور رکھتی تھی۔ جس سے ناواقف لوگ انھیں الحاد کی تہمت لگائیں۔ اور چونکہ یہ رنگ اُن کی شکل و شان پر عجیب معلوم ہوتا تھا۔ اس لئے اُن کے دوست

---

[1] یہ لطیفہ کئی شاعروں کی طرف منسوب ہے +

ایسی باتوں کو سُن کر چونکتے تھے۔ جوں جوں وہ چونکتے تھے وہ اور بھی زیادہ چھینٹے اُڑاتے تھے۔ اُن کی طبیعت سرور شراب کی عادی تھی۔ لیکن اُسے گناہ الٰہی سمجھتے تھے۔ اور یہ بھی عہد تھا کہ محرّم میں ہرگز نہ پیتے تھے +

لطیفہ۔ غدر کے چند روز بعد پنڈت موتی لعل کہ اُن دنوں میں مترجم گورنمنٹ پنجاب کے تھے۔ صاحب چیف کمشنر پنجاب کے ساتھ دلی گئے اور حبّ الوطن اور محبّت فن کے سبب سے مرزا صاحب کی ملاقات کی۔ اُن دنوں پنشن بند تھی۔ دربار کی اجازت نہ تھی۔ مرزا بسبب دل شکستگی کے شکوہ شکایت سے لبریز ہو رہے تھے۔ اثنائے گفتگو میں کہنے لگے۔ عمر بھر میں ایک دن شراب نہ پی ہو تو کافر۔ اور ایک دفعہ بھی نماز پڑھی تو مسلمان نہیں۔ پھر میں نہیں جانتا کہ مجھے سرکار نے باغی مسلمانوں میں کس طرح شامل سمجھا +

لطیفہ۔ بھوپال سے ایک شخص دلی کی سیر کو آئے۔ مرزا صاحب کے بھی مشتاق ملاقات تھے۔ چنانچہ ایک دن ملنے کو تشریف لائے۔ وضع سے معلوم ہوتا تھا کہ نہایت پرہیزگار اور پارسا شخص ہیں۔ اُن سے بہ کمال اخلاق پیش آئے۔ مگر معمولی وقت تھا۔ بیٹھے سرور کر رہے تھے۔ گلاس اور شراب کا شیشہ آگے رکھا تھا۔ اُن بے چارہ کو خبر نہ تھی کہ آپ کو یہ شوق بھی ہے۔ انھوں نے کسی شربت کا شیشہ خیال کر کے ہاتھ میں اُٹھا لیا۔ کوئی شخص پاس سے بولا کہ جناب یہ شراب ہے۔ بھوپالی صاحب نے جھٹ شیشہ ہاتھ سے رکھ دیا۔ اور کہا کہ میں نے تو شربت کے دھوکے میں اُٹھایا تھا۔ مرزا صاحب نے مسکرا کر اُن کی طرف دیکھا اور فرمایا کہ زہے نصیب دھوکے میں نجات ہو گئی +

لطیفہ۔ ایک دفعہ رات کو انگنائی میں بیٹھے تھے۔ چاندنی رات تھی۔ تارے چھٹکے ہوئے تھے۔ آپ آسمان کو دیکھ کر فرمانے لگے کہ جو کام بے صلاح و مشورہ ہوتا ہے بے ڈھنگا ہوتا ہے۔ خدا نے ستارے آسمان پر کسی سے مشورہ کر کے

نہیں بنائے جبھی بکھرے ہوئے ہیں۔ نہ کوئی سلسلہ نہ زنجیرہ نہ بیل نہ بوٹہ ۔

لطیفہ ۔ ایک مولوی صاحب جن کا مذہب سنّت وجماعت تھا۔ رمضان کے دنوں میں ملاقات کو آئے۔ عصر کی نماز ہو چکی تھی۔ مرزا نے خدمتگار سے پانی مانگا۔ مولوی صاحب نے کہا حضرت غضب کرتے ہیں رمضان میں روزے نہیں رکھتے۔ مرزا نے کہا سُنّی مسلمان ہوں۔ چار گھڑی دن سے روزہ کھول لیا کرتا ہوں۔

لطیفہ ۔ رمضان کا مہینا تھا۔ آپ نواب حسین مرزا کے ہاں بیٹھے تھے۔ پان منگا کر کھایا۔ ایک[1] صاحب فرشتہ سیرت۔ نہایت متقی و پرہیزگار اُس وقت حاضر تھے۔ انھوں نے متعجب ہو کر پوچھا کہ قبلہ آپ روزہ نہیں رکھتے مسکرا کر بولے شیطان غالب ہے ۔

یہ **لطیفہ** اہل ظرافت میں پہلے سے بھی مشہور ہے کہ عالمگیر کا مزاج سرود سے مکدّر تھا۔ اس لئے ہمیشہ اُس کا خیال رکھتے تھے۔ چنانچہ قاضی قوی جو اس عہد میں قاضی شہر تھا۔ اُس نے ایک موقع پر سرمد کو بھنگ پیتے ہوئے جا پکڑا۔ اول بہت سے لطائف وظرائف کے ساتھ جواب سوال ہوئے۔ آخر جب قاضی نے کہا کہ نہیں! شرع کا حکم اسی طرح ہے۔ کیوں حکم الٰہی کے برخلاف باتیں بناتا ہے۔ اُس نے کہا کیا کروں بابا شیطان قوی ہے ۔

لطیفہ ۔ جاڑے کا موسم تھا۔ ایک دن نواب مصطفےٰ خاں صاحب مرزا کے گھر آئے۔ آپ نے اُن کے آگے شراب کا گلاس بھر کر رکھ دیا۔ وہ اُن کا مُنہ دیکھنے لگے۔ آپ نے فرمایا کہ لیجئے۔ چونکہ وہ تائب ہو چکے تھے۔ اُنھوں نے کہا کہ میں نے تو توبہ کی۔ آپ متعجب ہو کر بولے کہ ہیں کیا جاڑے میں بھی ۔

لطیفہ ۔ ایک صاحب نے اُن کے سُنانے کو کہا کہ شراب پینی سخت گناہ ہے۔

---

[1] مرزا صفدر علی صاحب مرحوم مرزا عسکری مرحوم کے پوتے تھے جن کا امام باڑہ ابھی تک نٹوؤں کے کوچہ میں کھنڈر پڑا ہے

آپ نے ہنس کر کہا کہ بھلا جو پئے تو کیا ہوتا ہے۔ انھوں نے کہا کہ ادنیٰ بات یہ ہے کہ دُعا نہیں قبول ہوتی۔ مرزا نے کہا کہ آپ جانتے ہیں شراب پیتا کون ہے؟ اوّل تو وہ کہ ایک بوتل اولڈ ٹام کی۔ با سامان سامنے حاضر ہو۔ دوسرے بےفکری۔ تیسرے صحت۔ آپ فرمائیے کہ جسے یہ سب کچھ حاصل ہو اُسے اور چاہئے کیا جس کے لئے دعا کرے ٭

مرزا صاحب کو مرنے سے ۲۰ برس پہلے اپنی تاریخ فوت کا ایک مادّہ ہاتھ آیا وہ بہت بھایا اور اُسے موزوں فرمایا ؎

تاریخ فوت

منکہ باشم کہ جاوداں باشم ٭ چوں نظیری نماند و طالب مُرد
در بپرسند کہ در کدامیں سال؟ ٭ مرد غالب بگو کہ غالب مُرد

اس حساب سے ۱۲۷۷ھ میں مرنا چاہئے تھا۔ اسی سال شہر میں سخت وبا آئی۔ ہزاروں آدمی مر گئے۔ اُن دنوں دلّی کی بربادی کا غم تازہ تھا۔ چنانچہ میر مہدی صاحب کے جواب میں آپ فرماتے ہیں۔ وبا کو کیا پوچھتے ہو؟ قدر انداز قضا کے ترکش میں یہی ایک تیر باقی تھا۔ قتل ایسا عام۔ لوٹ ایسی سخت۔ کال ایسا بڑا۔ وبا کیوں نہ ہو؟ لسان الغیب نے دس برس پہلے فرمایا ہے[1] ؎

ہو چکیں غالب بلائیں سب تمام ٭ ایک مرگِ ناگہانی اور ہے

میاں! ۱۲۷۷ھ کی بات غلط نہ تھی۔ مگر میں نے وبائے عام میں مرنا اپنے لائق نہ سمجھا۔ واقعی اس میں میری کسر شان تھی۔ بعد رفع فساد ہوا کے سمجھ لیا جائے گا ٭

---

[1] اپنے تئیں لسان الغیب قرار دیا ٭

غزلیں

شمارِ سبحہ مرغوبِ بتِ مشکل پسند آیا　تماشائے بیک کف بُردنِ صد دل پسند آیا
فیضِ بیدلی نومیدیٔ جاوید آساں ہے　کشایش کو ہمارا عقدۂ مشکل پسند آیا
ہوائے سبزِ گل آئینۂ بے مہریٔ قاتل
کہ اندازِ بخوں غلطیدنِ بسمل پسند آیا

دہر میں نقشِ وفا وجہ تسلّی نہ ہوا　ہے یہ وہ لفظ کہ شرمندۂ معنی نہ ہوا
سبزۂ خط سے ترا کاکلِ سرکش نہ دبا　یہ زمرّد بھی حریفِ دمِ افعی نہ ہوا
میں نے چاہا تھا کہ اندوہِ وفا سے چھوٹوں　وہ ستمگر مرے مرنے پہ بھی راضی نہ ہوا
دل گزرگاہِ خیالِ مے و ساغر ہی سہی　گر نفس جادۂ سر منزلِ تقویٰ نہ ہوا
ہوں ترے وعدہ نہ کرنے پہ راضی کہ کبھی　گوش منت کشِ گلبانگ تسلّی نہ ہوا
کس سے محرومیٔ قسمت کی شکایت کیجے　ہم نے چاہا تھا کہ مر جائیں سو وہ بھی نہ ہوا
مر گیا صدمۂ یک جنبشِ لب سے غالبؔ
ناتوانی سے حریفِ دمِ عیسےٰ نہ ہوا

کل کے لئے کر آج نہ خسّت شراب میں　یہ سوءِ ظن ہے ساقیٔ کوثر کے باب میں
ہیں آج کیوں ذلیل کہ کل تک نہ تھی پسند　گستاخیٔ فرشتہ ہماری جناب میں
جاں کیوں نکلنے لگتی ہے تن سے دمِ سماع　گر وہ صدا سمائی ہے چنگ و رُباب میں
رَو میں ہے رخشِ عمر کہاں دیکھئے تھمے　نے ہاتھ باگ پر ہے نہ پا ہے رکاب میں
اتنا ہی مجکو اپنی حقیقت سے بُعد ہے　جتنا کہ وہمِ غیر سے ہوں پیچ و تاب میں
اصلِ شہود و شاہد و مشہود ایک ہے　حیراں ہوں پھر مشاہدہ ہے کس حساب میں
ہے مشتمل نمودِ صُوَر پر وجودِ بحر　یاں کیا دھرا ہے قطرۂ موجِ حُباب میں
شرم اک ادائے ناز ہے اپنی ہی سے سہی　ہیں کتنے بے حجاب کہ ہیں یوں حجاب میں
آرائشِ جمال سے فارغ نہیں ہنوز　پیشِ نظر ہے آئنہ دائم نقاب میں

ہے غیب غیب جس کو سمجھتے ہیں ہم شہود
ہیں خواب میں ہنوز جو جاگے ہیں خواب میں

غالب ندیم دوست سے آتی ہے بوئے دوست
مشغولِ حق ہوں بندگیٔ بوتراب میں

آہ کو چاہیے اک عمر اثر ہوتے تک
کون جیتا ہے تری زلف کے سر ہوتے تک

دام ہر موج میں ہے حلقۂ صد کامِ نہنگ
دیکھیں کیا گذرے ہے قطرے پہ گہر ہوتے تک

عاشقی صبر طلب اور تمنا بیتاب
دل کا کیا رنگ کروں خونِ جگر ہوتے تک

ہم نے مانا کہ تغافل نہ کرو گے لیکن
خاک ہو جائیں گے ہم تم کو خبر ہوتے تک

پرتوِ خور سے ہے شبنم کو فنا کی تعلیم
میں بھی ہوں ایک عنایت کی نظر ہوتے تک

یک نظر بیش نہیں فرصتِ ہستی غافل
گرمیٔ بزم ہے اک رقصِ شرر ہوتے تک

غمِ ہستی کا اسدؔ کس سے ہو جز مرگ علاج
شمع ہر رنگ میں جلتی ہے سحر ہوتے تک

یہ نہ تھی ہماری قسمت کہ وصالِ یار ہوتا
اگر اور جیتے رہتے یہی انتظار ہوتا

ترے وعدہ پر جیے ہم تو یہ جان جھوٹ جانا
کہ خوشی سے مر نہ جاتے اگر اعتبار ہوتا

تری نازکی سے جانا کہ بندھا تھا عہد بودا
کبھی تو نہ توڑ سکتا اگر استوار ہوتا

کوئی میرے دل سے پوچھے ترے تیرِ نیم کش کو
یہ خلش کہاں سے ہوتی جو جگر کے پار ہوتا

یہ کہاں کی دوستی ہے کہ بنے ہیں دوست ناصح
کوئی چارہ ساز ہوتا کوئی غمگسار ہوتا

رگِ سنگ سے ٹپکتا وہ لہو کہ پھر نہ تھمتا
جسے غم سمجھ رہے ہو یہ اگر شرار ہوتا

غم اگرچہ جاں گسل ہے پہ کہاں بچیں کہ دل ہے
غمِ عشق گر نہ ہوتا غمِ روزگار ہوتا

کہوں کس سے میں کہ کیا ہے شبِ غم بری بلا ہے
مجھے کیا برا تھا مرنا اگر ایک بار ہوتا

ہوئے مر کے ہم جو رسوا ہوئے کیوں نہ غرقِ دریا
نہ کبھی جنازہ اٹھتا نہ کہیں مزار ہوتا

اُسے کون دیکھ سکتا کہ یگانہ ہے وہ یکتا
جو دوئی کی بو بھی ہوتی تو کہیں دوچار ہوتا

یہ مسائلِ تصوف یہ ترا بیان غالب
تجھے ہم ولی سمجھتے جو نہ بادہ خوار ہوتا

درد منت کشِ دوا نہ ہوا — میں نہ اچھا ہوا بُرا نہ ہوا
جمع کرتے ہو کیوں رقیبوں کو — اک تماشا ہوا گِلا نہ ہوا
ہم کہاں قسمت آزمانے جائیں — تو ہی جب خنجر آزما نہ ہوا
کتنے شیریں ہیں تیرے لب کہ رقیب — گالیاں کھا کے بے مزا نہ ہوا
ہے خبر گرم اُن کے آنے کی — آج ہی گھر میں بوریا نہ ہوا
کیا وہ نمرود کی خدائی تھی — بندگی میں مرا بھلا نہ ہوا
جان دی دی ہوئی اسی کی تھی — حق تو یہ ہے کہ حق ادا نہ ہوا
زخم گر دب گیا لہو نہ تھما — کام گر رُک گیا روا نہ ہوا
رہزنی ہے کہ دل ستانی ہے — لیکے دل دلستاں روانہ ہوا

کچھ تو پڑھئے کو لوگ کہتے ہیں
آج غالب غزل سرا نہ ہوا

کوئی اُمّید بر نہیں آتی — کوئی صورت نظر نہیں آتی
موت کا ایک دن مُعیّن ہے — نیند کیوں رات بھر نہیں آتی
آگے آتی تھی حالِ دل پہ ہنسی — اب کسی بات پر نہیں آتی
جانتا ہوں ثوابِ طاعت و زُہد — پر طبیعت اِدھر نہیں آتی
ہے کچھ ایسی ہی بات جو چُپ ہوں — ورنہ کیا بات کر نہیں آتی
کیوں نہ چیخوں کہ یاد کرتے ہیں — میری آواز گر نہیں آتی
داغِ دل گر نظر نہیں آتا — بُو بھی اے چارہ گر نہیں آتی
ہم وہاں ہیں جہاں سے ہم کو بھی — کچھ ہماری خبر نہیں آتی
مرتے ہیں آرزو میں مرنے کی — موت آتی ہے پر نہیں آتی

کعبہ کس مُنہ سے جاؤ گے غالب
شرم تم کو مگر نہیں آتی

حُسن مہ گرچہ بہنگام کمال اچھا ہے — اس سے میرا مہِ خورشید جمال اچھا ہے

بوسہ دیتے نہیں اور دل پہ ہے ہر لحظہ نگاہ — جی میں کہتے ہیں کہ مُفت آئے تو مال اچھا ہے

اور بازار سے لے آئے اگر ٹوٹ گیا — ساغرِ جم سے مرا جام سفال اچھا ہے

بے طلب دیں تو مزا اس میں سوا ملتا ہے — وہ گدا جس کو نہ ہو خوئے سوال اچھا ہے

اُن کے دیکھے سے جو آجاتی ہے منہ پر رونق — وہ سمجھتے ہیں کہ بیمار کا حال اچھا ہے

دیکھئے پاتے ہیں عشاق بتوں سے کیا فیض — اک برہمن نے کہا ہے کہ یہ سال اچھا ہے

ہم سخن تیشہ نے فرہاد کو شیریں سے کہا — جس طرح کا کہ کسی میں ہو کمال اچھا ہے

قطرہ دریا میں جو مل جائے تو دریا ہو جائے — کام اچھا ہے وہ جس کا کہ مآل اچھا ہے

خضر سلطاں کو رکھے خالقِ اکبر سرسبز — شاہ کے باغ میں یہ تازہ نہال اچھا ہے

ہم کو معلوم ہے جنت کی حقیقت لیکن
دل کے خوش رکھنے کو غالب یہ خیال اچھا ہے

منظور تھی یہ شکل تجلّی کو نور کی — قسمت کھُلی ترے قد و رُخ کے ظہور کی

اک خونچکاں کفن میں کروڑوں بناؤ ہیں — پڑتی ہے آنکھ تیرے شہیدوں پہ حور کی

واعظ نہ تم پیو نہ کسی کو پلا سکو — کیا بات ہے تمھاری شرابِ طہور کی

لڑتا ہے مجھ سے حشر میں قاتل کہ کیوں اُٹھا — گویا ابھی سُنی نہیں آوازِ صُور کی

آمد بہار کی ہے جو بُلبُل ہے نغمہ سنج — اُڑتی سی اک خبر ہے زبانی طیُور کی

گو واں نہیں پہ واں کے نکالے ہوئے تو ہیں — کعبہ سے اِن بُتوں کو بھی نسبت ہے دُور کی

کیا فرض ہے کہ سب کو ملے ایک سا جواب — آؤ نہ ہم بھی سیر کریں کوہِ طُور کی

گرمی سہی کلام میں لیکن نہ اس قدر — کی جس سے بات اُس نے شکایت ضرور کی

غالب گو اس سفر میں مجھے ساتھ لے چلیں
حج کا ثواب نذر کروں گا حضور کی

نویدِ امن ہے بیدادِ دوست جاں کے لئے — رہی نہ طرزِ ستم کوئی آسماں کے لئے

بلا سے گر مژۂ یار تشنۂ خوں ہے — رکھوں کچھ اپنی بھی مژگانِ خونفشاں کے لئے

وہ زندہ ہم ہیں کہ ہیں روشناسِ خلق اے خضر — نہ تم کہ چور بنے عمرِ جاوداں کے لئے

رہا بلا میں بھی میں مبتلائے آفتِ رشک — بلائے جاں ہے ادا تیری اک جہاں کے لئے

فلک نہ دور رکھ اس سے مجھے کہ میں ہی نہیں — درازدستیٔ قاتل کے امتحاں کے لئے

مثال یہ مری کوشش کی ہے کہ مرغِ اسیر — کرے قفس میں فراہم خس آشیاں کے لئے

گدا سمجھ کے وہ چپ تھا مری جو شامت آئے — اٹھا اور اٹھ کے قدم میں نے پاسباں کے لئے

بقدرِ شوق نہیں ظرف تنگنائے غزل — کچھ اور چاہیئے وسعت مرے بیاں کے لئے

دیا ہے خلق کو بھی تا اُسے نظر نہ لگے — بنا ہے عیش تجمل حسین خاں کے لئے

زباں پہ بارِ خدایا یہ کس کا نام آیا — کہ میرے نطق نے بوسے مری زباں کے لئے

نصیرِ دولت و دیں اور معینِ ملت و ملک — بنا ہے چرخِ بریں جس کے آستاں کے لئے

زمانہ عہد میں اُس کی ہے محوِ آرائش — بنیں گے اور ستارے اب آسماں کے لئے

ورق تمام ہوا اور مدح باقی ہے — سفینہ چاہیئے اِس بحرِ بیکراں کے لئے

ادائے خاص سے غالبؔ ہوا ہے نکتہ سرا
صلائے عام ہے یارانِ نکتہ داں کے لئے

مرزا سلامت علی دبیرؔ

خاندانی شاعر نہ تھے[1]۔ لڑکپن میں مرثیہ پڑھتے تھے۔ اس شوق نے منبر کی سیڑھی سے مرثیہ گوئی کے عرش الکمال پر پہنچا دیا۔ میر مظفر حسین ضمیرؔ کے شاگرد ہوئے

---

[1] تذکرۂ سراپا سخن میں لکھا ہے کہ ان کے والد مرزا آغا جان کاغذ فروش تھے۔ پھر ایک جگہ اسی کتاب میں لکھتے ہیں۔ دبیرؔ ولد غلام حسین متعلقان مرزا آغا جان کاغذ فروش سے ہیں۔ مصنف موصوف کو شوق ہے کہ ہر شخص کے باب میں کچھ نہ کچھ نکتہ طنز کا نکال لیتے ہیں اس لئے خاندان کے باب میں نہ یقین ہے نہ شک +

اور جو کچھ اُستاد سے پایا اُسے بلند اور روشن کرکے دکھایا۔ تمام عمر میں کسی اتفاقی سبب سے کوئی غزل یا شعر کہا ہو۔ ورنہ مرثیہ گوئی کے فن کو لیا اور اس درجہ تک پہنچا دیا جس سے آگے ترقی کا رستہ بند ہوگیا۔ ابتدا سے اِس شغل کو زادِ آخرت کا سامان سمجھا۔ اور نیک نیتی سے اُس کا ثمرہ لیا۔ طبیعت بھی ایسی گداز پائی تھی۔ جو کہ اس فن کے لئے نہایت موزوں اور مناسب تھی۔ ان کی سلامت روی۔ پرہیزگاری۔ مسافرنوازی اور سخاوت نے صفت کمال کو زیادہ تر رونق دی تھی +

شاگردان الٰہی کی طبیعت بھی جذبۂ الٰہی کا جوش رکھتی ہے۔ بچپن سے دل چونچال تھا۔ ابتدائے مشق میں کسی لفظ پر اُستاد کی اصلاح پسند نہ آئی۔ شیخ ناسخ زندہ تھے۔ مگر بوڑھے ہوگئے تھے۔ ان کے پاس چلے گئے۔ وہ اُس وقت گھر کے صحن میں مونڈھے بچھائے جلسہ جمائے بیٹھے تھے۔ انھوں نے عرض کی کہ حضرت! اس شعر میں میں نے تو یہ کہا ہے اور اُستاد نے یہ اصلاح دی ہے۔ اُنھوں نے فرمایا کہ اُستاد نے ٹھیک اصلاح دی ہے۔ اُنھوں نے پھر کہا کہ حضرت کتابوں میں تو اس طرح آیا ہے۔ اُنھوں نے کہا کہ نہیں جو تمھارے اُستاد نے بنایا ہے وہی درست ہے۔ اُنھوں نے پھر عرض کی کہ حضرت آپ کتاب کو ملاحظہ تو فرمائیں۔ شیخ صاحب نے جھنجھلا کر کہا۔ ارے تو کتاب کو کیا جانے! ہمارے سامنے کتاب کا نام لیتا ہے! ہم کتابیں دیکھتے دیکھتے خود کتاب بن گئے ہیں۔ ایسے غصے ہوئے کہ لکڑی سامنے رکھی تھی وہ لے کر اُٹھے۔ یہ بھاگے۔ انھیں بھی ایسا جوش تھا کہ دروازہ تک ان کا تعاقب کیا۔

لکھنؤ کے لڑانے اور چمکانے والے غضب تھے۔ آخر مرزا کا عالمِ شباب تھا اور کمال بھی عین شباب پر تھا۔ کہ جوانی کا بڑھاپے سے معرکہ ہوا۔ نواب شرف الدولہ میر ضمیر کے بڑے قدرداں تھے۔ اُن سے ہزاروں روپے کے سلوک کرتے تھے۔ ابتدا میں اُن کے سبب سے اور پھر مرزا کے جواہر کمال کے باعث سے اُن کی بھی قدردانی کرتے تھے۔ ان کی مجلس میں اوّل مرزا۔ بعد اُن کے میر ضمیر پڑھا کرتے تھے +

ایک موقع پر مرزا نے ایک مرثیہ لکھا جس کا مطلع ہے۔ ع
دستِ خدا کا قوّتِ بازو حسین ہے

میر ضمیر کے سامنے جب اصلاح کے لئے پیش کیا تو اُنھیں اس کے نئے خیالات اور طرزِ بیان اور ترتیب مضامین پسند آئی۔ اُسے توجہ سے بنایا اور اسی اثنا میں نواب کے ہاں ایک مجلس ہونے والی تھی۔ رشید شاگرد سے کہا کہ بھئی اس مرثیہ کو ہم اُس مجلس میں پڑھیں گے۔ یہ تسلیم کر کے تسلیم بجالائے اور مرثیہ اُنہی کو دیدیا۔ گھر میں آئے تو بعض احباب سے حال بیان کیا۔ مسودہ پاس تھا وہ بھی سنایا۔ کچھ تو یاروں کا چمکانا۔ کچھ اس سبب سے کہ ذوق و شوق کے پھول ہمیشہ شبنم تعریف کے پیاسے ہیں اور نواب کو خبر پہونچ گئی تھی۔ اُدھر کے اشاروں میں انعام کی ہوا آئی۔ غرض انجام یہ ہوا۔ کہ اُستاد مرثیہ صاف کر کے لے گئے کہ وہی پڑھیں گے +

بموجب معمول کے اوّل مرزا صاحب منبر پر گئے اور وہی مرثیہ پڑھا۔ بڑی تعریفیں ہوئیں اور مرثیہ خوب سرسبز ہوا۔ اُستاد ہمیشہ شاگرد کے پڑھنے پر باغ باغ ہوا کرتے تھے۔ اور تعریفیں کر کے دل بڑھاتے تھے اب خاموش بیٹھے ہیں۔ کچھ غصّہ۔ کچھ بے وفائیِ زمانہ کا۔ کچھ اپنی محنتوں کا افسوس اور فکر یہ کہ اب میں پڑھوں گا تو کیا پڑھوں گا۔ اور اس سے بڑھ کر کیا پڑھوں گا۔ جس میں اُستادی کا رُتبہ بڑھے۔ نہیں تو اپنے درجہ سے گرے بھی تو نہیں۔ غرض اُن کے بعد یہ پڑھے اور کمال کی دستار صحیح سلامت لے کر منبر سے اُترے۔ لیکن اُس دن سے دل پھر گیا۔ یار لوگوں نے شاگرد کو نقطۂ مقابل کر کے بجائے خود اُستاد بنا دیا اور وہی صورت ہو گئی۔ کہ ایک مجلس میں دونوں کا اجتماع موقوف ہو گیا۔ زمانہ نے اپنے قاعدے کے بموجب چند روز کے مقابلوں سے شاگرد کا دل بڑھایا۔ اور آخر بڑھاپے کی سفارش سے اُستاد کو آرام کی اجازت دی۔ وہ اپنے حریف

میر خلیق کے سامنے گوشۂ عزلت کا مقابلہ کرنے لگے اور یہاں میر انیس اور مرزا دبیر کے معرکے گرم ہو گئے۔

دونوں کے کمال نے حُسن شناسوں کے ہجوم کو دو حصّوں میں بانٹ لیا۔ آدھے انیسیئے ہو گئے۔ آدھے دبیرئے۔ اُن کے کلام میں محاکمہ کرنے کا لُطف جب ہے کہ ہر اُستاد کے ۲۔۴۔۵۔۵ سو مرثیے بجائے خود پڑھو۔ اور پھر مجلسوں میں سُن کر دیکھو کہ ہر ایک کا کلام اہل مجلس پر کس قدر کامیاب یا ناکام رہا۔ بے اس کے مزا نہیں۔ میں اس نکتہ میں میر انیس کے حال میں کاوش کروں گا۔ مگر اتنا یہاں بھی کہتا ہوں کہ میر انیس صاحب صفائی کلام۔ لطف زبان۔ چاشنیِ محاورہ۔ خوبیِ بندش۔ حُسن اسلوب۔ مناسبت مقام۔ طرز ادا اور سلسلہ کی ترتیب میں جواب نہیں رکھتے۔ اور یہی رعایتیں ان کی کم گوئی کا سبب تھیں۔ مرزا دبیر صاحب۔ شوکت الفاظ۔ مضامین کی آمد۔ اُس میں جابجا غم انگیز اشارے۔ درد خیز کنائے۔ المناک اور دل گداز انداز جو مرثیہ کی غرض اصلی ہے۔ اِن وصفوں میں بادشاہ تھے۔ یہ اعتراض حریفوں کا درست ہے کہ بعض ضعیف روایتیں اور دل خراش مضامین ایسے نظم ہو گئے ہیں جو مناسب نہ تھے۔ لیکن انسان کی طبیعت ایسی واقع ہوئی ہے کہ جب ایک مقصود کو مدِّ نظر رکھ کر اس پر متوجہ ہوتا ہے تو اور پہلوؤں کا خیال بہت کم رہتا ہے۔ اُنھیں ایسی مجلسوں میں پڑھنا ہوتا تھا جہاں ہزارہا آدمی دوست دشمن جمع ہوتا تھا۔ تعریف کی بنیاد گریہ و بکا اور لطف سخن اور ایجاد مضامین پر ہوتی تھی۔ کمال یہ تھا کہ سب کو رُلانا اور سب کے مُنہ سے تحسین کا نکالنا۔ اس شوق کے جذبہ اور فکر ایجاد کی محویت میں جو کچھ قلم سے نکل جائے تعجب نہیں۔ نکتہ چینی ایک چھوٹی سی بات ہے جہاں چاہا دو حرف لکھ دئے۔ جب انسان تمام عمر اُس میں کھپا دے۔ تب معلوم ہوتا ہے کہ کتنا کہا

اور کیسا کہا۔ ایجاد و اختراع کے لفظ پر ایک لطیفہ یاد آیا کہ اصول فن سے متعلق ہے۔ اہل ذوق کے ملاحظہ کے لئے لکھتا ہوں +

آتشی لطیفہ۔ مرزا دبیر کی جوانی تھی اور شاعری بھی عین جوانی پر تھی کہ ایک دھوم دھام کا مرثیہ لکھا۔ اُس کا نمودار تمہید سے چہرہ باندھا۔ رزمیہ و بزمیہ مضامین پر خوب زور طبع دکھایا۔ تازہ ایجاد یہ کیا کہ لشکر شام سے ایک بہادر پہلوان تیار کر کے میدان میں لائے۔ اُس کی ہیبت ناک صورت بدمہورت۔ آمد کی آن بان اُس کے اسلحۂ جنگ اُن کے خلاف قیاس مقادیر و وزن سے طوفان باندھے۔ پہلے اس سے کہ یہ مرثیہ پڑھا جائے شہر میں شہرہ ہو گیا۔ ایک مجلس قرار پائی۔ اس میں علاوہ معمولی سامعین کے سخن فہم اور اہل کمال اشخاص کو خاص طور پر بھی اطلاع دی گئی۔ روز معہود پر ہجوم خاص و عام ہوا۔ طلب کی تحریکیں اس اسلوب سے ہوئی تھیں کہ خواجہ آتش باوجود پیری و آزادی کے تشریف لائے۔ مرثیہ شروع ہوا۔ سب لوگ بموجب عادت کے تعریفوں کے غُل مچاتے رہے۔ گریہ و بکا بھی خوب ہوا۔ خواجہ صاحب خاموش سر جھکائے دو زانو بیٹھے جھومتے رہے۔ مرزا صاحب مرثیہ پڑھ کر منبر سے اُترے۔ جب دلوں کے جوش دھیمے ہوئے تو خواجہ صاحب کے پاس جا بیٹھے اور کہا کہ حضرت! جو کچھ میں نے عرض کیا آپ نے سُنا۔ فرمایا ہوں بھئی سُنا۔ اُنھیں اتنی بات پر قناعت کب تھی؟ پھر کہا۔ آپ کے سامنے پڑھنا گستاخی ہے۔ لیکن آپ نے ملاحظہ فرمایا؟ اُنھوں نے فرمایا۔ بھئی سُنا تو سہی مگر میں سوچتا یہ ہوں کہ مرثیہ تھا یا لندھور بن سعدان[1] کی داستان تھی (واہ رے اُستاد کامل اتنے سے فقرہ میں عمر بھر کے لئے اصلاح دے گیا) +

مرزا صاحب نے ۲۹ محرم ۱۲۹۲ھ کو ۷۲ برس کی عمر میں انتقال کیا۔ اِس

---

[1] ملک لندھور کی خلاف عقل طاقتیں اور فوق العادت گاڑ زوریاں امیر حمزہ کے قصہ کی شان و شکوہ اس طرح بڑھاتی ہیں کہ رستم و اسفندیار شاہنامہ کے صفحوں میں منہ چھپا لیتے ہیں +

مدت میں کم سے کم ۳ ہزار مرثیہ لکھا ہوگا۔ سلاموں اور نوحوں اور رباعیوں کا کچھ شمار نہیں۔ ایک مرثیہ بے نقط لکھا جس کا مطلع ہے ؎

ہم طالعِ ہما مرادِ ہم رسا ہوا

اس میں اپنا تخلص بجائے دبیر کے عُطارد لکھا ہے۔ اور کچھ شک نہیں کہ اُن کے ساتھ ہندوستان میں مرثیہ گوئی کا خاتمہ ہوگیا۔ نہ اب ویسا زمانہ آئے گا نہ ویسے صاحب کمال پیدا ہوں گے +

میر ببر علی انیس

لکھنؤ میں تعلیم[1] و تربیت پائی اور ضروریات فن سے آگاہی حاصل کی۔ اپنے خاندانی کمال میں باپ کے شاگرد تھے اور جس طرح عمر میں دونوں بھائیوں سے بڑے تھے۔ اسی طرح کمال میں بھی فائق تھے۔ ابتدا میں انھیں بھی غزل کا شوق تھا۔ ایک موقع پر کہیں مشاعرہ میں گئے۔ اور غزل پڑھی۔ وہاں بڑی تعریف ہوئی۔ شفیق باپ خبر سُن کر دل میں تو باغ باغ ہوا۔ مگر ہونہار فرزند سے پوچھا کہ کل رات کو کہاں گئے تھے؟ انھوں نے حال بیان کیا۔ غزل سُنی اور فرمایا کہ بھائی! اب اس غزل کو سلام کرو۔ اور اس شغل میں زور طبع کو صرف کرو۔ جو دین و دُنیا کا سرمایہ ہے۔ سعادتمند بیٹے نے اُسی دن اُدھر سے قطع نظر کی۔ غزل نہ کور کی طرح میں سلام لکھا۔ دنیا کو چھوڑ کر دین کے دائرہ میں آگئے۔ اور تمام عمر اسی میں صرف کردی۔ نیک نیتی

[1] مولوی حیدر علی صاحب منتہی الکلام۔ انہی کے محلہ میں رہتے تھے اور پڑھایا کرتے تھے۔ میر انیس مرحوم فرماتے تھے کہ ابتدائی کتابیں میں نے انہی سے پڑھی تھیں +

کی برکت نے اسی میں دین بھی دیا اور دُنیا بھی۔ اس وقت تک یہ اور ان کے ہمعصر اپنے اُستادوں کی اطاعت کو طاعت سمجھتے تھے۔ سلام۔ مرثئے۔ نوحے۔ رباعیاں کہتے تھے۔ اور مرثیہ کی مقدار ۳۵۔ ۴۰ سے ۵۰ بند تک تھی +

زمانہ کی خاصیت طبعی ہے کہ جب نباتات پُرانے ہوجاتے ہیں تو اُنھیں نکال کر پھینک دیتا ہے اور نئے پودے لگاتا ہے۔ میر ضمیر اور میر خلیق کو بڑھاپے کے پلنگ پر بٹھایا۔ میر انیس کو باپ کی جگہ منبر پر ترقی دی۔ اُدھر مرزا دبیر اُن کے مقابلہ کے لئے نکلے۔ یہ خاندانی شاعر نہ تھے۔ مگر میر ضمیر کے شاگرد رشید تھے۔ جب دونوں نوجوان میدان مجالس میں جولانیاں کرنے لگے تو فن مذکور کے ترقی کے بادل گرجتے اور برستے اُٹھے۔ اور نئے اختراع اور ایجادوں کے مینہ برسنے لگے۔ بڑی بات یہ تھی کہ بادشاہ سے لے کر اُمرا اور غربا تک شیعہ مذہب رکھتے تھے۔ نوجوانوں کے کمال کو جو خوش اعتقاد قدردان ملے وہ بزرگوں سے شمار میں زیادہ اور وزن میں بہت بھاری تھے۔ کلام نے وہ قدر پیدا کی کہ اس سے زیادہ بہشت ہی میں ہو تو ہو! قدردانی بھی فقط زبانی تعریف اور تعظیم و تکریم میں ختم نہ ہوجاتی تھی بلکہ نقد و جنس کے گراں بہا انعام تحائف اور نذرانوں کے رنگ میں پیش ہوتے تھے۔ ان ترغیبوں کی بدولت فکروں کی پرواز اور ذہنوں کی رسائی اُمید سے زیادہ بڑھ گئی۔ دونوں باکمالوں نے ثابت کردیا کہ حقیقی اور تحقیقی شاعر ہم ہیں کہ ہر رنگ کے مضمون۔ ہر قسم کے خیال۔ ہر ایک حال کا اپنے الفاظ کے جوڑ بند سے ایسا طلسم باندھ دیتے ہیں کہ چاہیں رُلادیں۔ چاہے ہنسادیں۔ چاہیں تو حیرت کی مورت بناکر بٹھادیں +

یہ دعوے بالکل درست تھے کیونکہ مشاہدہ اُن کی تصدیق کو ہر وقت

حاضر رہتا تھا۔ دلیل کی حاجت نہ تھی۔ سکندر نامہ جس کی تعریف میں لوگوں کے لب خشک ہیں اس میں چند میدان جنگ ہیں۔ رزم زنگبار۔ جنگ دارا۔ جنگ روس جنگ فور۔ جنگ فغفور۔ اسی طرح بزم کی چند تمہیدیں اور جشن ہیں۔ شاہنامہ کہ ۶۰ ہزار شعر فردوسی کی عمر بھر کی کمائی ہیں۔ انھوں نے ایجاد مضامین کے دریا بہادئے۔ ایک مقرری مضمون کو سیکڑوں نہیں ہزاروں رنگ سے ادا کیا۔ ہر مرثیہ کا چہرہ نیا۔ آمد نئی۔ رزم جدا۔ بزم جدا اور ہر میدان میں مضمون اچھوتا۔ تلوار نئی۔ نیزہ نیا۔ گھوڑا نیا۔ انداز نیا۔ مقابلہ نیا۔ اور اس پر کیا منحصر ہے۔ صُبح کا عالم دیکھو تو سُبحان اللہ۔ رات کی رخصت۔ سیاہی کا پھٹنا۔ نور کا ظہور۔ آفتاب کا طلوع۔ مرغزار کی بہار۔ شام ہے تو شام غریباں کی اُداسی۔ کبھی رات کا سناٹا۔ کبھی تاروں کی چھاؤں کو چاندنی اور اندھیرے کے ساتھ رنگ رنگ سے دکھایا ہے۔ غرض جس حالت کو لیا ہے۔ اُس کا سماں باندھ دیا ہے۔ آمد مضامین کی بھی انتہا نہ رہی۔ جن مرثیوں کے بند ۴۰۔ ۵۰ سے زیادہ نہ ہوتے تھے وہ ۱۵۰ سے گذر کر ۲۰۰ سے بھی نکل گئے۔ میر صاحب مرحوم نے کم سے کم دس ہزار مرثیہ ضرور کہا ہوگا۔ اور سلاموں کا تو کیا شمار ہے۔ رُباعیاں تو باتیں تھیں +

دونوں اُستادوں کے ساتھ طرفداروں کے دو جتھے ہوگئے۔ ایک **انیسئے** کہلاتے تھے۔ ایک **دبیریے**۔ اگرچہ ان کے فضول فخریوں اور اعتراضوں نے بے جا تکراریں اور جھگڑے پیدا کئے۔ مگر بہ نسبت نقصان کے فائدہ زیادہ ہوا۔ کیونکہ بے حد تعریفوں نے دونوں استادوں کے فکروں کو شوق ایجاد اور مشق پرواز میں عرش سے بھی اونچا اُچھال دیا۔ دونوں آمتیں جو اپنے دعووں پر دلیلیں پیش کرتی تھیں کوئی وزن میں زیادہ ہوتی تھی کوئی مساحت میں۔ اس لئے یک طرفی فیصلہ نہ ہوتا تھا +

انیسی امت اپنے سخن آفریں کی صفائی کلام۔ حُسن بیان اور لطف محاورہ پیش کر کے نظیر کی طلبگار ہوتی تھی +

دبیری اُمت ۔ شوکت الفاظ۔ بلند پردازی۔ اور تازگی مضامین کو مقابلہ میں حاضر کرتی تھی +

انیسی اُمت کہتی تھی کہ جسے تم فخر کا سرمایہ سمجھتے ہو یہ باتیں دربارِ فصاحت میں نامقبول ہو کر خارج ہو چکی ہیں کہ فقط کوہ کندن اور کاہ برآوردن ہے +

دبیری امت کہتی تھی کہ تم اسے دُشواری کہتے ہو۔ یہ علم کے جوہر ہیں۔ اسے بلاغت کہتے ہیں۔ تمھارے سخن آفریں کے بازوؤں میں علم کی طاقت ہو تو پہاڑوں کو چیرے اور یہ جواہر نکالے۔ انیس کے کلام میں ہے کیا؟ فقط زبانی باتوں کا جمع خرچ ہے +

انیسی امت اس جواب پر چمک اُٹھتی تھی اور کہتی تھی۔ کون سا خیال تمھارے سخن آفریں کا ہے جو ہمارے معنی آفریں کے ہاں نہیں؟ تم نہیں جانتے! جسے باتوں کا جمع خرچ کہتے ہو یہ صفائی کلام اور قدرت بیان کی خوبی ہے! اسے سہل ممتنع کہتے ہیں! یہ جوہر خداداد ہے۔ کتابیں پڑھنے اور کاغذ سیاہ کرنے سے نہیں آتا +

دبیریے اس تقریر کو سُن کر کسی مرثیے کی تمہید۔ یا میدان کی آمد۔ یا رجز خوانی کے بند پڑھنے شروع کر دیتے۔ جن میں اکثر آیتوں یا حدیثوں کے فقرے تضمین ہوتے تھے +

انیسیے کہتے تھے۔ اس سے کس کافر کو انکار ہے مگر اتنا ہی پڑھئے گا آگے نہ پڑھئے گا۔ دوسرے مطلب کی طرف انتقال کیجئے گا تو سلسلہ میں ربط بھی نصیب نہ ہوگا۔ حضرت! فقط لفاظی کی دھوم دھام سے کچھ نہیں ہوتا۔ ادائے مطلب اصل شے ہے۔ اس پر گفتگو کیجئے گا تو پوری بات بھی نہ ہو سکے گی۔

یہ قادر الکلام باکمالوں کا کام ہے۔ جن کو اس فن کے اصول بزرگوں سے سینہ بسینہ پہنچے ہیں وہی اس کام کو جانتے ہیں +

دبیر نے اس کے جواب میں اپنے سخن آفریں کی آمد طبیعت۔ مضامین کا وفور لفظوں کی بہتات دکھاتے تھے۔ اور جاؤ وبیجا کہتے جاتے تھے۔ کہ دیکھئے کیا محاورہ ہے! دیکھئے صاف بول چال ہے۔ ساتھ اس کے یہ بھی کہتے تھے کہ کس کا منہ ہے جو رات کو بیٹھے اور سَو بند کہہ کر اُٹھے۔ برس دن تک خامہ فرسائی کی اور محرم پر۔ ۱۰۔ ۱۵ مرثیے لکھ کر تیار کئے تو کیا کئے۔ وہ بھی دو اور بھائیوں کے مشورے ملاکر اور مباحثوں کے پسینے بہاکر +

انیسؔ کہتے تھے درست ہے۔ جو رات بھر میں سَو بند کہتے ہیں وہ بے ربط اور بے اصول ہی ہوتے ہیں اور جب ادائے مطلب پر آتے ہیں تو اتنے بھی نہیں رہتے۔ ساتھ اس کے بعض مصرع بھی پڑھ دیتے ہیں جن پر بے محاورہ ہونے کا اعتراض ہوتا تھا۔ یا تشبیہیں ناقص ہوتی تھیں یا استعارے بے ڈھنگے ہوتے تھے +

اعتراضوں کی ردّ و بدل یہاں تک ہوتی تھی کہ دبیر کے لیے کہتے تھے کہ جو قبولیت خدا نے ہمارے سخن آفریں کو عطا کی ہے کب کسی کو نصیب ہوتی ہے۔ جس مجلس میں ان کا کلام پڑھا گیا۔ کہرام ہو گیا۔ کیسے غم انگیز اور درد خیز مضامین ہیں۔ ان کے لفظوں کو دیکھو اعتقاد کے آب حیات میں ڈوبے ہوئے ہیں +

انیسؔ کہتے تھے۔ وہ کیا پڑھیں گے! اُن کی آواز تو دیکھئے۔ اور انہیں مرثیہ پڑھنا تو آتا ہی نہیں۔ غرض جھگڑالو دعویداروں کو کوئی تقریر خاموش نہ کر سکتی تھی۔ البتہ مجبوری کہ دونوں کے گلے تھکا کر آواز بند کر دیتی تھی۔ اور منصفی بیچ میں آکر کہتی تھی۔ دونوں اچھے۔ دونوں اچھے۔ کبھی کہتی وہ آفتاب

ہیں یہ ماہ۔ کبھی یہ آفتاب وہ ماہ +

لکھنؤ کے بے فکرے لڑانے میں کمال رکھتے تھے۔ اور تماشے کے عاشق۔ دبیر تو غیر تھے۔ بھائی کو بھائی سے لڑا دیا۔ مدت تک بگڑی رہی۔ میر انیس کے پاس آتے تو کہتے حضور جب تک اصلاحی مرثیے ہیں۔ پڑھے جائیں۔ جس دن آپ کا بن دیکھا مرثیہ پڑھا قلعی کھل جائے گی۔ دوسرے بھائی سے کہتے۔ حضور عمر کی بزرگی اور شے ہے۔ لطفِ زبان اور شے ہے۔ یہ نعمت آپ کا حصّہ ہے +

الغرض یہ پاک روحیں جن کی بدولت ہماری نظم کو قوت اور زبان کو وسعت حاصل ہوئی۔ صلہ ان کا سخن آفرینِ حقیقی عطا کرے۔ ہمارے شکریہ کی کیا بساط ہے۔ لیکن یہ بات جتانے کے قابل ہے کہ اقلیم سخن میں جو دائرہ ان کے زیر قلم تھا۔ ان کے جوش طبع میں اُس کا بہت سا حصّہ سخن آرائی اور رزم بزم لے دبا لیا۔ مرثیت کا میدان بہت تنگ رہ گیا۔ اور افسوس کہ اصل مدعا اُن کا وہی تھا۔ جسے آپ کھو بیٹھے +

جب تک لکھنؤ آباد رہا۔ جب کسی اور شہر میں جانے کا ذکر ہوتا تو دونوں صاحب یہی فرماتے تھے کہ اس کلام کو اسی شہر کے لوگ سمجھ سکتے ہیں۔ اور کوئی اس کی قدر کیا جانے گا۔ اور ہماری زبان کے لطف کو کیا سمجھے گا۔ لیکن تباہی لکھنؤ کے بعد اوّل ۱۸۵۸ء میں مرزا دبیر صاحب مرشد آباد بُلائے گئے۔ وہ گئے۔ اور ہمیشہ الہ آباد اور بنارس میں جاتے رہے۔ میر انیس مرحوم اوّل ۱۸۵۹ء اور پھر ۱۸۶۰ء میں نواب قاسم علی خاں کی طلب اور اصرار سے عظیم آباد بھی جاتے رہے۔ پھر ۱۸۷۱ء میں جب کہ ارسطو جاہ غفران پناہ کے خلف الرشید مولوی سید شریف حسین خاں صاحب حیدرآباد میں تھے تو ان کی تحریک سے نواب تہوّر جنگ بہادر نے میر انیس کو طلب فرمایا۔ اب بھی ان کی پابندیٔ وضع

انھیں نکلنے نہ دیتی تھی مگر مولوی صاحب موصوف کے کہنے کو بھی ٹال نہ سکتے تھے اس لئے مجبور ہو گئے۔ اہل حیدرآباد نے ان کے کمال کی ایسی قدر کی جیسی کہ چاہئے۔ مجلسوں میں لوگ اس کثرت سے آتے تھے کہ عالی شان مکان کی وسعت بھی جگہ نہ دے سکتی تھی۔ دروازہ پر پہرے کھڑے کر دیتے تھے کہ مستند اور سخن فہم لوگوں کے سوا کسی کو آنے نہ دو۔ اور کسی امیر کے ساتھ دو متوسلوں سے زیادہ آدمی نہ آنے پائیں۔ اس پر بھی لوگ اس کثرت سے آتے تھے کہ کھڑے رہنے کو غنیمت سمجھتے تھے اور اسی میں خوش تھے کہ ہم نے سنا تو سہی +

میر انیس صاحب جب وہاں سے پھرے تو حسب وعدہ الہ آباد میں اُترنا پڑا۔ ایک مجلس بڑی شان و شوکت کے ساتھ منعقد ہوئی۔ میرے شفیق قدیم مولوی ذکاء اللہ صاحب کہ میور کالج میں پروفیسر ہیں۔ نکتہ فہم و نکتہ شناس اُن سے زیادہ تر کون ہوگا؟ اس مجلس کا حال خود مجھ سے بیان کرتے تھے کہ خاص و عام ہزاروں آدمی جمع تھے۔ کمال اور کلام کی کیا کیفیت بیان کروں محویت کا عالم تھا۔ وہ شخص منبر پر بیٹھا پڑھ رہا تھا۔ اور یہ معلوم ہوتا تھا کہ جادو کر رہا ہے۔ مقطع کی ٹیپ پڑھتے تھے اور مزے لیتے تھے:-

عمر گزری ہے اسی دشت کی سیاحی میں پانچویں پشت ہے شبیر کی مداحی میں

ان کی بلکہ ان کے گھرانے کی زبان اُردوئے معلیٰ کے لحاظ سے تمام لکھنؤ میں سند تھی اور اُنھیں بھی اس بات کا خیال تھا۔ لیکن طبیعت میں نہایت انکسار تھا۔ حسن اخلاق گفتگو میں ان کی تقریر کو اتنا بچائے ہوئے لے چلتا تھا کہ باتیں

شیخ ابراہیم ذوق کے مطلع کے باب میں جو انھوں نے فرمایا دیکھو صفحہ ۴۷۴۔ چونکہ میں نے اپنا حال ظاہر نہ کیا تھا اس لئے ان سے پوچھا کہ شیخ موصوف کے باب میں آپ کی کیا رائے ہے۔ فرمایا کہ میاں سید میر کے بعد پھر دلی میں ایسا شاعر کون ہوا ہے؟ بزرگوں سے زبان بزبان خواجہ میر درد کے لئے یہی نام ان کی زبان پر چڑھا ہوا تھا۔ معلوم ہوا کہ اس عہد کے لوگ انھیں میاں خواجہ میر کہتے تھے +

خطِ اعتدال سے بھی نیچے ہی رہتی تھیں۔ اس پر ایک ایک لفظ کانٹے کے تول کسی جلسہ میں اپنا کلام سناتے تو بعض محاورہ پر اتنا کہہ اُٹھتے تھے کہ یہ میرے گھر کی زبان ہے۔ حضراتِ لکھنؤ اس طرح نہیں فرماتے۔ اس سے یہ بھی معلوم ہوا کہ اپنے تئیں لکھنؤ کا باشندہ نہ کہنا چاہتے تھے +

مولوی شریف حسین خاں صاحب کہتے تھے کہ حیدرآباد میں ایک دن چند معزز اشخاص بیٹھے تھے۔ ایک صاحبؒ ان کی شاعری کی تعریف کرنے لگے۔ فرمایا۔ بھئی شاعر کون ہے؟ دُکھڑے کا کہنے والا ہوں۔ وہ بھی نہیں معلوم کہ جس طرح چاہئے ہوتا ہے یا نہیں۔ میں ۱۸۵۷ء میں خود بھی اُن سے ملا اور لوگوں سے بھی سُنا۔ کم سخن تھے اور بولتے تو وہ فقرہ کہ موتی کی طرح ٹانکنے کے قابل۔ ارسطو جاہ مولوی رجب علی خاں بہادر حسب الطلب صاحب چیف کمشنر بہادر لکھنؤ میں تھے۔ ایک دن بعض عمائدِ شہر موجود۔ میر انیس صاحب بھی تشریف رکھتے تھے۔ کہیں سے آم آئے۔ چونکہ عمدہ تھے مولوی صاحب ممدوح نے طاسوں میں پانی بھروا کر رکھوا دئے۔ اور سب صاحبوں کو متوجہ فرمایا۔ ایک حکیم صاحب اُسی جلسہ میں حرارت کی شکایت کر رہے تھے مگر شریکِ چاشنی ہوئے۔ کسی بزرگ نے کہا حکیم صاحب! آپ تو ابھی علالت کی شکایت فرماتے تھے۔ حکیم جی تو بغلیں جھانکنے لگے۔ میر انیس نے فرمایا:۔

فِعْلُ الْحَکِیْمِ لَا یَخْلُوْا عَنِ الْحِکْمَۃِ +

جس طرح ان کا کلام لاجواب دیکھتے ہو اُسی طرح اُن کا پڑھنا بھی بے مثال ہی تھا۔ اُن کی آواز۔ ان کا قد و قامت۔ ان کی صورت کا انداز۔ غرض ہر شے اس کام کے لئے ٹھیک اور موزوں واقع ہوئی تھی۔ ان کا اور ان کے بھائیوں کا بھی قاعدہ تھا کہ ایک بڑا آئینہ سامنے رکھ کر خلوت میں بیٹھتے تھے۔ اور مرثیہ پڑھنے کی مشق کرتے تھے۔ وضع۔ حرکات سکنات۔

اور بات بات کو دیکھتے تھے۔ اور آپ اُس کی موزونی و ناموزونی کو اصلاح دیتے تھے۔

ذوق ؎

بنا کے آئینہ دیکھے ہے پہلے آئینہ گر ہنرور اپنے ہی عیب و ہنر کو دیکھتے ہیں

یہ بات درست ہے کہ مرزا دبیر کے پڑھنے میں وہ خوش ادائی نہ تھی۔ لیکن حُسنِ قبول اور فیضِ تاثیر خدا نے دیا تھا۔ ان کا مرثیہ کوئی اور بھی پڑھتا تھا تو اکثر رونے رولانے میں کامیاب ہوتا تھا کہ یہی اس کام کی علتِ غائی ہے +

خاتمۂ کتاب

پانچواں دور بھی ہو چکا مگر سب سوگوار بیٹھے ہیں کہ دور نہیں ہو چکا۔ ہندوستان کی پُرانی ہمدم یعنی عاشقانہ شاعری ہو چکی۔ اور اس کی ترقی کا چشمہ بند ہوا۔ اہل مشاعرہ نوحہ خوانی کر رہے ہیں کہ اے صدر نشینو! تم چلے اور حُسن و عشق کے چرچے اپنے ساتھ لے چلے۔ کیونکہ متاعِ عشق کے بازار تھے تو تمھارے دم سے تھے۔ نگارِ حُسن کے سنگار تھے تو تمھارے قلم سے تُمھی قیس و کوہکن کے نام لینے والے تھے۔ اور تُمھی لیلیٰ و مجنوں کے جوبن کو جلوہ دینے والے۔ لیکن اجسام فانی کی پرستش کرنے والے ہیں جو کہتے ہیں کہ تم گئے اور مشاعرے ہو چکے۔ نہیں نہیں۔ تمھاری تصنیفیں۔ تالیفیں۔ حکایتیں اور روایتیں جب تک موجود ہیں۔ تم آپ موجود ہو۔ تمھارے فخر کی

دستاریں ایسے تحسین و آفرین کے پھولوں سے تاجدار ہیں جو ہمیشہ لہلہاتے رہینگے۔ اور گلے میں اُنکا سدا بہار پھولوں کے ہار ہیں۔ جن تک کبھی خزاں کا ہاتھ نہ پہونچے گا۔

حیات دوام کا خدائی چشمہ جاری ہے۔ جس کے کنارے پر عہد بعہد پانچوں جلسے بجے ہوتے ہیں۔ آب حیات کا دور چل رہا ہے۔ چشمہ کا پانی زمانہ کے گزرنے کی تصویر کھینچتا ہے۔ اور موجیں ظاہری زندگی کو الوداع کہتی چلی جاتی ہیں۔ تمھارے جلسے اپنے اپنے عہد کی حالت خاموشی کی بولی میں بیان کر رہے ہیں۔ تمھارے مقالات و حالات اِس زمانہ کی جیتی جاگتی بولتی چالتی تصویریں ہیں۔ گویا بے زبان مورتیں مُنہ سے بول رہی ہیں۔ خیالی صورتیں اپنی چال ڈھال ایسی بے تکلف دکھا رہی ہیں کہ کوئی زندہ انسان اس طرح کھُلے دل سے کام نہیں کرتا۔ تمھاری زندگی عجب لطف کی زندگی ہے۔ کوئی بُرا کہے تمھیں رنج نہیں۔ اچھا کہے تو خوشی نہیں۔ تمھیں کوئی آزار نہیں دے سکتا۔ تم سے کسی کو رنج نہیں پہنچ سکتا۔ اللہ اللہ امن امان کی دُنیا کے لوگ ہو کہ چُپ چاپ۔ آرام کے عالم میں نچنت گُذران کرتے ہو۔ تم میں آواز نہیں۔ مگر رنگا رنگ کی بولیاں بول رہے ہو۔ تم وہ ہو کہ نہیں ہو۔ مگر ہو۔ مر گئے ہو۔ پھر بھی زندہ ہو۔ اے کاغذی خانقاہوں کے بسنے والو۔ تمھاری تصنیفات تمھارے آباد گھر ہیں۔ جب آنکھیں کھولتا ہوں تم نقوش و حروف کے لباس پہنے، ہنستے بولتے پھرتے چلتے نظر آتے ہو۔ اور ویسے ہی نظر آتے ہو جیسے کہ تھے۔ زمانہ سالہا سال کی مسافت دور نکل آیا۔ اور سینکڑوں برس آگے بڑھا اور بڑھ جائے گا۔ مگر تم اپنی جگہ بدستور قائم ہو۔ تمھارے اعمال و افعال کے پتلے تمھاری تصنیفیں ہیں۔ ان کی زبانی آیندہ نسلوں سے اپنے دل کی باتیں کہتے رہو گے۔ نصیحتیں کرو گے۔ سمجھاتے رہو گے۔ غمگین دلوں کو بہلاؤ گے۔ مُردہ طبیعتوں میں جان ڈالو گے۔ مدّھم آرزوؤں کو چمکاؤ گے۔

سوتے دلوں میں گدگدی کرو گے۔ خوشی کو اُداسی کر دو گے۔ اُداسی کو خوشی کر دو گے +

اے با اقبال گداؤ! اے شاہ نشان خاکسارو! تمھاری نیک نیتی اچھے وقت تمھیں لائی۔ مگر افسوس کہ تمھاری شاعری نے بہت کم عمر پائی۔ قسمت نے تمھیں اچھے سامان اور اچھے قدر دان دئے۔ جن کی بدولت جوہر طبعی اور جوش اصلی کو اپنے اور اپنے شوق کے پورا کرنے کے سامان ملے اب نہ وہ سامان ہوں گے اور نہ ویسے قدر دان ہوں گے۔ نہ کوئی اُس شاخ کو ہرا رکھ سکے گا۔ نہ تم سے بڑھ کر اُس میں پھل پھول لگا سکے گا۔ ہاں تمھاری لکیروں کے فقیر تمھارے ہی ہجر و وصل اور خط و خال کے مضمون لیں گے۔ انہی لفظوں کو اُلٹیں پلٹیں گے۔ اور تمھارے چبائے ہوئے نوالوں کو منہ میں چباتے رہیں گے +

تم نے شہرت عام اور بقائے دوام کے ایسے عالی شان محل تعمیر کیے ہیں کہ صدہا سال کی مسافت سے دکھائی دیتے رہیں گے۔ وہ فلک کے صدموں اور انقلاب کے طوفانوں کو خاطر میں نہیں لاتے۔ اور زمانہ کے زلزلوں کو ہنس کر کہتے ہیں کہ بھلا آؤ تو سہی!

اگرچہ زیادہ تر عمارتیں تمھارے حسن و عشق کے جلوس کے لئے ہیں۔ مگر ان میں بھی تم نے ایسے سامان اور مصالح لگا دئے ہیں کہ آیندہ نسلیں جس غرض سے چاہیں گی عمارتیں بنائیں گی۔ اور تمھاری صنعتوں سے بہت کچھ مدد پائیں گی۔ جن پتھروں کو تم نے منبّت اور گلکاری سے تراش کر فقط خوشنمائی کے لئے لگایا تھا۔ ہم اُسے وہاں سے نکال لیں گے۔ شکریہ کے ساتھ آنکھوں سے لگائیں گے۔ اور اس سے کسی ایسی محراب کو زینت دیں گے جو اپنی مضبوطی سے ایک ایک ملکی ایوان کو استحکام دے۔ اور دلوں کو خوش نمائی سے شگفتہ

کرے۔ کیونکہ تمھارے لفظوں کی عمدہ تراشیں اور اُن کی پسندیدہ ترکیبیں استعارے اور تشبیہیں اگرچہ عاشقانہ مضامین میں ہیں۔ پھر بھی اگر ہم سلیقہ اور امتیاز سے کام میں لائیں گے تو علوم۔ فنون۔ تاریخ وغیرہ عام مطالب میں ہمارے ادائے مقاصد اور انداز بیان کے لئے عمدہ معاون اور کارآمد ہوں گے۔ اے ہمارے رہنماؤ! تم کیسے مبارک قدموں سے چلے تھے۔ اور کیسے برکت والے ہاتھوں سے رستہ میں چراغ رکھتے گئے تھے کہ جہاں تک زمانہ آگے بڑھتا ہے تمھارے چراغوں سے چراغ جلتے چلے جاتے ہیں۔ اور جہاں تک ہم آگے جاتے ہیں تمھاری ہی روشنی میں جاتے ہیں۔ ذرا ان برکت والے قدموں کو آگے بڑھاؤ کہ میں آنکھوں سے لگاؤں۔ اپنا مبارک ہاتھ میرے سرپر رکھو اور میرے سلام کا تحفہ قبول کرو +

کوہ نور پرنٹنگ ورکس الٰہ آباد-۳